ص۲۴۲

فتاویٰ عثمانی جلد ۲ ص ۲۴۲ کی تیسری سطر میں یہ عبارت آئی ہے کہ:

''اگر عبدالکریم زینت کے علاوہ غلام علی کی کسی اور بیوی کے بطن سے ہے اور اس نے زینت کا دودھ بھی نہیں پیا تو فاطمہ اور عبدالکریم کے درمیان کوئی رضاعی رشتہ نہیں ہے''۔

اس جواب میں غلطی ہوئی ہے، صحیح جواب یہ ہے:

اگر عبدالکریم زینت کے علاوہ غلام علی کی کسی اور بیوی کے بطن سے ہے تب بھی عبدالکریم کا فاطمہ سے نکاح نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس صورت میں بھی عبدالکریم غلام علی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اگرچہ حقیقۃً فاطمہ کا چچازاد بھائی ہے تاہم رضاعت کی نسبت سے عبدالکریم فاطمہ کا باپ شریک رضاعی چچا ہے، لہٰذا ہر دو صورت میں فاطمہ عبدالکریم پر حرام ہے اور دونوں کے درمیان نکاح نہیں ہوسکتا۔ لحرمة لبن الفحل۔

اس کے مطابق آئندہ ایڈیشن میں تبدیلی کردی گئی ہے، جن حضرات نے اس طرف توجہ دلائی ہے بندہ ان کا شکرگزار ہے۔

(البلاغ)
شوال ۱۴۲۹ھ

پینتالیس سالہ خود نوشتہ فتاویٰ کا مجموعہ

جلد دوم

کتاب الزکاۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج، کتاب النکاح
کتاب الطلاق، کتاب الایمان والنذور، کتاب الوقف

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ترتیب وتخریج
مولانا محمد زبیر حق نواز
استاذ جامعہ دار العلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

فہرستِ موضوعات فتاویٰ عثمانی جلد دوم

صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی صدقة الفطر﴾ ۷۷

(صدقہ فطر کے مسائل کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی الطّلاق بالکنایات﴾ ۳۶۶

(کنایاتِ طلاق کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی تعلیق الطّلاق﴾ ۳۸۷

(طلاق کو کسی شرط پر معلق کرنے کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی تفویض الطّلاق﴾ ۴۰۲

(کسی کو طلاق واقع کرنے کا حق دینے کا بیان)

﴿فصل فی الطّلاق الثلٰث وأحکامہ﴾ ۴۱۱

(تین طلاق کے اَحکام)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿باب العدّة وأحكامها﴾ ۴۷۶

(عدّت اور اُس کے اَحکام)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتابُ الوقف﴾ ۵۰۳

(وقف کے مسائل)

﴿فصل فی أحکام المساجد وآدابها﴾ ۵۱۱

(مسجد کے اَحکام اور آداب کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، اَمَّا بَعْدُ:

اُستاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے فتاویٰ کی جلد اوّل آج سے کچھ عرصہ قبل طبع ہوکر منظرِ عام پر آئی جسے علماء وطلباء کے علاوہ عوام الناس نے بھی ہاتھوں ہاتھ لیا، اور الحمدللہ اہلِ فتویٰ نے اسے فتویٰ کا ماخذ بناکر اس کی روشنی میں اہم فتاویٰ تحریر کئے، اُمت کے علمی حلقوں میں بلاشبہ اس سے اہم دِینی نفع حاصل کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت اُستاذِ محترم دامت برکاتہم کو صحت و عافیت کے ساتھ عمرِ دراز عطا فرمائیں اور ان کے علم و تفقہ کی روشنی پوری دُنیا میں پھیلائیں اور ان کے علوم و معارف اور فیوض کو تاقیامت جاری و ساری رکھیں، آمین۔

اب حضرت اُستاذِ محترم دامت برکاتہم العالیہ کے فتاویٰ کی دُوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس جلد میں زکوٰۃ، صوم، اِعتکاف، حج، نکاح، طلاق، وقف، اَحکام المساجد اور اَیمان و نذور سے متعلق مسائل شامل ہیں۔ جن کی اجمالی اور تفصیلی فہرست کتاب کے شروع میں درج ہے۔ تیسری جلد اِن شاء اللہ ''کتاب الشرکۃ والمضاربۃ'' اور اس سے اگلے اَبواب پر مشتمل ہوگی۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ سے متعلق تفصیل اور اس جلد میں بھی کام کی ترتیب وہی ہے جو جلدِ اوّل میں تھی، جس کی تفصیل جلدِ اوّل میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے پیش لفظ اور عرضِ مرتب میں درج ہے۔ تفصیل کے لئے اس کی طرف مراجعت مناسب ہے، تاہم اس جلد میں درج ذیل نئے اُمور کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

* مذکورہ ابواب سے متعلق کئی مکرّر مسائل کو ضخامت وطوالت سے بچنے کے لئے حذف کردیا گیا ہے، مثلاً کتاب الطّلاق کی فصل فی الطلاق الثلاث وأحکامہ میں ''تین طلاقوں'' سے متعلق کئی مسائل کو حضرتِ والا دامت برکاتہم کے مشورے سے حذف کردیا گیا ہے، تاہم ایک ہی موضوع سے متعلق ایسے مسائل کو باقی رکھا گیا ہے جن میں کوئی نیا علمی فائدہ ہو۔

٭ چونکہ یہ تمام فتاویٰ خود حضرتِ والا دامت برکاتہم کے تحریر فرمودہ ہیں، لہٰذا حضرتِ والا دامت برکاتہم کے حکم سے کتاب کی ضخامت سے بچنے کے لئے ہر فتویٰ کے آخر میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کا نام نقل کرنے کی بجائے صرف تاریخ اور فتویٰ نمبر لکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ تاہم جہاں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتویٰ پر اکابر بزرگوں میں سے کسی کے تصدیقی دستخط ہیں وہاں فتویٰ کے آخر میں حضرت کے نام کے ساتھ مصدق کا نام بھی درج کیا گیا ہے۔

٭ جلدِ اوّل کی طرح جلدِ ثانی میں بھی ضخامت سے بچنے کے لئے سائل کا نام حذف کیا گیا ہے، تاہم سائل اگر خواص اہلِ علم میں سے کوئی ہیں تو ان کا نام ذکر کیا گیا ہے تاکہ سوال و جواب پڑھتے ہوئے سائل کی شخصیت اور ان کا علمی مقام ملحوظ رہے۔

٭ اس جلد کی کتاب الزکوٰۃ میں ''حکومت کا بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا شرعی حکم'' سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تحقیق جو پہلے فقہی مقالات میں شائع ہوئی تھی وہ اب کتابوں کے مروّجہ اور متداول نسخوں کی تخریج کے ساتھ اس مجموعہ میں شامل ہے، اس تحقیق میں ''بینکوں کی رقوم کے اموالِ ظاہرہ میں شامل'' ہونے سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ایک تازہ وضاحتی نوٹ تحریر فرمایا ہے۔ یہ اہم نوٹ اس تحقیق کے آخر میں درج ہے۔

٭ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے کئی حضرات کو جوابی خطوط میں کئی فقہی سوالوں کے جوابات دیئے ہیں، اس پر کئی حضرات نے توجہ دِلائی کہ ان خطوط میں موجود فقہی مسائل کو بھی فتاویٰ کے اس مجموعہ میں شامل کرلیا جائے۔ مگر چونکہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے ذاتی خطوط دار الافتاء میں نہیں آتے اس لئے ایسے فتاویٰ تک رسائی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ چنانچہ جلدِ اوّل میں ان خطوط میں موجود فتاویٰ شاملِ اشاعت نہ ہوسکے، مگر حال ہی میں جب حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اپنے دفتر کی ''سوال و جواب'' اور ''قابلِ حفاظت خطوط'' کی فائلیں بندہ کو عنایت فرمائیں تو اس میں کئی ایسے خطوط نکلے جن میں اہم فقہی تحقیقات اور سوالوں کے جوابات تھے، جن میں بعض تفصیلی جوابات بھی تھے، نمونے کے طور پر اس جلد میں کتاب النکاح کی فصل فی الجهاز والمهر میں ایک تفصیلی فتویٰ ''مہر اعزازیہ ہے یا عوض اور اُجرت؟'' ملاحظہ فرمائیں۔ ان خطوط میں جلدِ اوّل سے متعلق جو مسائل تھے وہ اِن شاء اللہ جلدِ اوّل کے اگلے ایڈیشن میں شامل کئے جائیں گے، جو مسائل جلدِ ثانی سے متعلق تھے وہ متعلقہ ابواب کے تحت اس میں شامل کردیئے گئے ہیں اور حاشیہ میں ایسے مسائل کی نشاندہی کردی گئی ہے۔ اور اگلی جلدوں سے متعلق ایسے مسائل اِن شاء اللہ اگلی جلدوں میں شاملِ اشاعت ہوں گے۔

٭ جلدِ اوّل کی اشاعت اور جلدِ ثانی کے مسودہ پر نظرِ ثانی کے بعد حضرتِ والا دامت برکاتہم

نے جس طرح پسندیدگی اور مسرّت کا اظہار فرمایا اور اپنی مشفقانہ دُعاؤں سے نوازا، بلاشبہ بندہ کے لئے وہ دُعائیں دُنیا و آخرت کا حقیقی سرمایہ ہیں۔ اور حلقۂ قارئین میں جلدِ اوّل کی مقبولیت اور نافعیت اور ان کے اصرار و طلب کے پیشِ نظر خواہش اور حتی المقدور کوشش ہے کہ بقیہ جلدیں بھی جلد منظرِ عام پر آجائیں۔ قارئین سے دُعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کی جلد تکمیل فرمادیں اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کے ساتھ ساتھ بندہ کے لئے بھی اس کام کو ذریعہ مغفرت اور ذخیرۂ آخرت بنادیں، آمین ثم آمین۔

اہم اعلان

قارئین سے درخواست ہے کہ اگر کسی کے پاس حضرتِ والا دامت برکاتہم کے ایسے خطوط موجود ہوں جن میں حضرتِ والا دامت برکاتہم نے کسی فقہی سوال کا جواب عنایت فرمایا ہو تو برائے کرم ایسے خطوط احقر کو دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی یا ''مکتبہ معارف القرآن کراچی'' کے پتے پر فوٹواسٹیٹ اور ڈاک خرچ کی وضاحت کے ساتھ ارسال فرمائیں تاکہ فتاویٰ کے اس مجموعہ میں متعلقہ ابواب کے تحت انہیں بھی شامل کیا جاسکے۔ ایسے فتاویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے علاوہ خط بھیجنے والے حضرات کے لئے بھی اِن شاء اللہ صدقۂ جاریہ ہوں گے۔ والسلام

بندہ
محمد زبیر حق نواز
رفیق دار الافتاء
جامعہ دار العلوم کراچی
۲۱ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

کتاب الزکوٰۃ

(مالِ تجارت، نقدی، سونا، چاندی، استعمالی اشیاء،
زمینوں اور مشینوں پر زکوٰۃ کا حکم)

پانچ تولہ سونا اور کچھ نقدی پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- ایک آدمی کے پاس پانچ تولہ سونا اور کچھ نقدی دس، بیس روپے ہیں تو کیا حولانِ حول کے بعد اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی؟

جواب:- جی ہاں، فرض ہوگی، اگر سونے کے ساتھ تھوڑی سی چاندی یا نقدی موجود ہو تو سونے کی قیمت لگا کر چاندی کے نصاب کا حساب کرنا چاہئے، یعنی اگر سونا اور نقدی مل کر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت بن گئی تو زکوٰۃ واجب ہے۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۴ھ

۱:- مشینری اور آلات پر زکوٰۃ نہیں
۲:- چوزوں اور مرغیوں پر زکوٰۃ کا حکم

سوال ا:- دوائیاں بنانے کیلئے جو مشین یا آلات استعمال کئے جاتے ہیں کیا ان پر زکوٰۃ ہے؟

جواب ا:- مشینری اور آلات پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔[2]

سوال:- پولٹری فارم میں چوزے خرید کر ان کو پالا جاتا ہے ۲۲ ہفتوں کے بعد وہ انڈے دینے کے قابل ہوتے ہیں اور ۸۶ ہفتہ انڈا دیتے ہیں، اس کے بعد انڈا دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے انڈے اور ان مرغیوں پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب:- صورت مسئولہ میں انڈوں کی قیمت پر تو زکوٰۃ ہے لیکن چوزوں اور مرغیوں پر زکوٰۃ

---

(۱) فی الهداية ج:۱ ص:۱۷۹ (طبع مکتبه رشيديه كونته) وتضم قيمة العروض الى الثمنين، والذهب الى الفضة قيمة كذا في الكنز حتى لو ملك مائة درهم وخمسة دنانير قيمتها مائة درهم تجب الزكوة عنده خلافاً لهما ولو ملك مائة درهم وعشرة دنانير أو مائة وخمسين درهما وخمسة دنانير او خمسة عشر دينارا وخمسين درهما تضم اجماعا.
وكذا في الهداية ج:۱ ص:۱۹۲ (مكتبه شركت علميه ملتان) وكذا في الطحطاوى على مراقى الفلاح ص:۳۹۰ (طبع نور محمد كتب خانه). وفى الهداية ج:۱ ص:۱۹۲ (طبع شركت علميه) ويضم الذهب الى الفضة للمجانسة من حيث الثمنية.
وفى الدر المختار ج:۲ ص:۲۹۹ (طبع ايچ ايم سعيد) ولو بلغ باحدهما نصابا دون الأخر تعين ما يبلغ به ولو بلغ باحدهما نصابا وخمسا وبالأخر اقل قومه بالانفع للفقير. وكذا فى التاتارخانية ج:۲ ص:۲۳۷ وفى المبسوط للسرخسى ج:۲ ص:۱۹۱.
(۲) وفى الدرالمختار ج:۲ ص:۲۶۴و۲۶۵ (ايچ ايم سعيد): ولا (زكاة) فى ثياب البدن ... وكذلك آلات المحترفين، الخ. وفى الهداية ج:۱ ص:۱۸۲ (مكتبة شركت علميه ملتان) وليس فى دور السكنى .... زكاة .... وآلات المحترفين الخ.

نہیں ہے البتہ جب ان کو فروخت کردیا جائے گا تو ان سے حاصل ہونے والے معاوضے پر زکوٰۃ ہوگی، اگر سال اسی وقت پورا ہو رہا ہو تو اسی وقت، آئندہ کبھی پورا ہو تو اس وقت اس میں سے جتنی رقم باقی رہے اس پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

لما فی الدر المختار والأصل أن ماعدا الحجرین والسوائم إنما یزکی بنیة التجارة...... وشرط مقارنتها لعقد التجارة وهو کسب المال بالمال بعقد شراء أو إجارة أو استقراض، ولو نوی التجارة بعد العقد أو اشتری شیئا للقنیة ناویا أنه إن وجد ربحاً باعه لا زکاة علیه (شامی قبیل باب السائمة)۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ

دوران سال رقم کی کمی بیشی سے زکوٰۃ میں کوئی فرق نہیں پڑتا

سوال:- کیا زکوٰۃ کی رقم جو پہلے سال ۱۳۹۶ھ میں دس ہزار تھی اس پر زکوٰۃ ادا کی گئی اور ۱۳۹۷ھ میں بیس ہزار ہوگئی، اب زکوٰۃ دس ہزار پر دینا ہوگی، یا بیس ہزار روپے پر، دس ہزار کی زکوٰۃ ۱۳۹۶ھ میں ادا کردی گئی تھی؟

جواب:- سال پورا ہونے پر جتنی رقم موجود ہو اس سب پر زکوٰۃ واجب ہے خواہ اس رقم کا کچھ حصہ صرف ایک دن پہلے ہی آیا ہو چنانچہ صورت مسئولہ میں پورے بیس ہزار روپے پر زکوٰۃ فرض ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ

زمین، مکان اور کار، کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں البتہ ان کے کرایہ پر زکوٰۃ لازم ہے

سوال:- میرے پاس مندرجہ ذیل رہائشی پلاٹ ہیں ان میں سے کس کس پر زکوٰۃ عائد ہے واضح رہے کہ ہم کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں۔

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۳، ۲۷۴ (طبع ایچ ایم سعید) وفی البدائع ج:۲ ص:۲۱، واما صفة هذا النصاب فهی أن یکون معدا للتجارة وهو ان یمسکها للتجارة وذلک بنیة التجارة مقارنة لعمل التجارة الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۸۸ (طبع ایچ ایم سعید) والمستفاد ولو بهبة أو ارث وسط الحول یضم الی نصاب من جنسه فیزکیه بحول الاصل. وفی الشامیة (قوله ولو بهبة او ارث) ادخل فیه المفاد بشراء او میراث أو وصیة وما کان حاصلا من الاصل کالأولاد والربح الخ. وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۷۵ (رشیدیه) ومن کان له نصاب فاستفاد فی اثناء الحول مالا من جنسه ضمه الی ماله وزکاه، سواء کان المستفاد من نمائه اولا وبأی وجه استفاد، ضمه الخ. وفی مراقی الفلاح علی الطحطاوی (کتاب الزکوة) ص:۳۸۹ (طبع نور محمد کتب خانه) وشرط وجوب ادائها حولان الحول علی النصاب الأصلی واما المستفاد فی أثناء الحول فیضم الی مجانسه ویزکی بتمام الحول الاصلی سواء استفید بتجارة أو میراث او غیره الخ. (محمد زبیر حق نواز)

الف:- ایک پلاٹ جو ہمارے پاس ۱۲ سال پرانا ہے اور ہم نے رہائش کی غرض سے لیا لیکن اس علاقے میں مناسب آبادی نہیں ہوئی جس کی وجہ سے زمین کی قیمت بھی نہیں بڑھی اور اس کے خریدار بھی عام طور پر نہیں ملتے۔

ب:- ایک چھوٹا قطعہ زمین جو تقریباً ڈیڑھ سال پہلے اس مقصد کے لئے لیا تھا کہ زمین کی قیمت بڑھ جائے گی اور جب بھی ضرورت ہوگی مثلاً شادی، مکان، یا کسی اور مقصد کے لئے تو اس کو بیچ کر رقم استعمال کرلیں گے۔

ج:- تقریباً سات ماہ قبل ایک قطعہ زمین لیا ہے اور ارادہ ہے کہ یہاں مکان تعمیر کرائیں گے لیکن اگر کل اثاثہ بھی اکٹھا کرلیا جائے تو تعمیرِ مکان کے لئے رقم نہیں ہے۔

د:- ہمارے دفتر میں ایک کوآپریٹو سوسائٹی بنائی گئی ہے جس نے مل کر ایک بڑا قطعہ زمین لاہور میں خریدا ہے جس میں سے ایک پلاٹ میں نے بھی لینے کا ارادہ کیا ہے اس قطعہ زمین کا قبضہ ابھی سوسائٹی کو نہیں ملا میں نے ابھی پلاٹ کی رقم کا کچھ حصہ ادا کیا ہے اور ابھی یہ میری ذاتی ملکیت میں نہیں آیا اگر ان میں سے کسی پر زکوٰۃ لاگو ہے تو ان کی قیمت کا تعین کس طرح کیا جائے؟ واضح رہے کہ ابھی ان پلاٹوں کا سرکاری ٹیکس وغیرہ کا کچھ حصہ واجب الاداء ہے۔

سوال ۲:- اگر اپنے ذاتی استعمال کے لئے اسکوٹر یا موٹر کار رکھی جائے تو کیا اس کی مالیت پر بھی زکوٰۃ عائد ہوگی؟

جواب:- اس سلسلے میں ایک اصول سمجھ لیجئے کہ زمین، مکان، کار یا اسکوٹر کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور ان پر صرف اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی جب انہیں خالص تجارت کی غرض سے خریدا یا حاصل کیا ہو، اور اپنی ملکیت میں لاتے وقت ہی نیت تجارت کی ہو، یہاں تک کہ اگر زمین کو محض لے ڈالنے کیلئے خریدا اور دل میں یہ خیال بھی تھا کہ اگر کچھ نفع بخش ہوا تو اسے فروخت بھی کردیں گے تب بھی اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، اس اصول کے تحت ''الف''، ''ج'' اور ''د'' پر زکوٰۃ یقیناً واجب نہیں ہے، البتہ ''ب'' کے بارے میں یہ دیکھیں کہ کیا یہ پلاٹ تجارت کی غرض سے خریدا تھا، یا لے کر ڈالنے کی غرض سے کہ شاید کبھی نفع دے جائے پہلی صورت میں زکوٰۃ اس کی موجودہ مالیت پر ڈھائی فی صد کے حساب سے واجب ہوگی، اور دوسری صورت میں نہیں، اور چونکہ ان دونوں میں امتیاز کرنا بعض اوقات مشکل ہوتا ہے اس لئے اس پر احتیاطاً زکوٰۃ دے ہی دیں تو زیادہ بہتر ہے:-

فی الدر المختار وشرط مقارنتها لعقد التجارة وهو كسب المال بالمال بعقد شراء أو إجارة او استقراض ولو نوى التجارة بعد العقد أو اشترى شيئا للقنيه ناوياً أنه إن وجد ربحا

باعه لا زکوٰة علیه، شامی۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۸/۹ھ

استعمالی زیورات پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- ایسے زیورات سونے کے جو استعمال میں ہوں یا ایسے برتن (سونے چاندی) کے ان کے اوپر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

جواب:- سونا چاندی خواہ زیور کی شکل میں ہو یا برتنوں کی شکل میں اس پر زکوٰۃ واجب ہے،[2] جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ استعمالی زیوروں پر زکوٰۃ نہیں ہے ان کی بات درست نہیں، البتہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سونے یا چاندی کے برتنوں کا استعمال جائز نہیں ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۹۱/۲۷ء)

میکے اور سسرال کی طرف سے ملنے والے زیور پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- اس مسئلہ میں علماء دین کیا فرماتے ہیں کہ عورت کا جو زیور سونے کا ہے جو اس کی ماں نے دیا اور جو سسرال والوں کی طرف سے پڑا اس کی زکوٰۃ کس کے ذمہ واجب ہے؟ برائے کرم پوری تفصیل سے آگاہ کریں مہربانی ہوگی؟

جواب:- میکے سے جو زیور ملا اس کی زکوٰۃ خود عورت پر فرض ہے،[4] اور جو سسرال کی طرف سے ملا، اگر وہ عورت کی ملکیت کر دیا گیا تھا تو عورت پر فرض ہے، ورنہ اس کے شوہر پر۔

واللہ تعالیٰ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۹۷/۳۰و)

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۳و۲۷۴ (طبع سعید) وفی البدائع ج:۲ ص:۲۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) واما صفة هذا النصاب فهی أن یکون معدا للتجارة وهو أن یمسکها للتجارة وذلک بنیة التجارة مقارنة لعمل التجارة.
وفی الدر المختار (طبع سعید کراچی) ج:۲ ص:۲۶۷، او نیة التجارة فی العروض اما صریحا ولا بد من مقارنتها لعقد التجارة ... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۹۸ (طبع سعید کراچی) (ومعموله ولو تبرا أو حلیا مطلقا) مباح الاستعمال أولا ولو للتجمل والنفقة لأنهما خلقا أثمانا فیزکیهما کیف کانا.... الخ. وفی الشامیة قوله ومعموله ای ما یعمل من نحو ..... والأوانی وغیرها

(۳) وفی الدر المختار ج:۶ ص:۳۴۱ (طبع ایچ ایم سعید) وکره الأکل والشرب والادهان والتطیب من إناء ذهب وفضة للرجل والمرأة لإطلاق الحدیث .... الخ. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۱۲۸۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

(۴) دیکھئے اسی صفحے کا حاشیہ نمبر۲۔

(زکوٰۃ سے متعلق متفرق سوالات)

جہیز کے لئے خریدی ہوئی چند اشیاء، زمین اور قرض پر زکوٰۃ کا حکم

سوال ۱:- وہ قیمتی سامان جو بچوں کی شادی کے لئے خریدا گیا ہو مثلاً پارچہ جات، ٹی وی، ریفریجریٹر اور دیگر گھریلو استعمال کی مشینیں وغیرہ ان پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- بچوں کی شادی میں دینے کے لئے جس سامان کا سوال میں ذکر ہے اس پر زکوٰۃ نہیں[۱]، البتہ زیور خواہ بچوں کی شادی میں دینے کے لئے خریدا ہو اس پر زکوٰۃ ہے۔

سوال ۲:- ایسی رقم جو کاروباری مقاصد کے لئے زمین کی خریداری کی مد میں ادا کی گئی ہو ابھی کافی رقم کی ادائیگی اور زمین کی ملکیت کی منتقلی باقی ہو اس رقم پر زکوٰۃ ہے؟

جواب ۲:- جب تک زمین کی بیع نہیں ہوئی اس وقت تک اس رقم پر زکوٰۃ فرض ہے، البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب رقم واپس مل جائے یا زمین کی بیع آپ کے نام ہوجائے اس وقت جتنے سال رقم کی زکوٰۃ ادا نہیں کی گئی اتنے سالوں کی زکوٰۃ یک مشت ادا کرنی ہوگی،[۲] تاہم اگر ہر سال اپنے دوسرے اثاثوں کے ساتھ اس رقم کی زکوٰۃ بھی ادا کرتے رہیں تو زکوٰۃ ادا ہوتی رہے گی[۳] اور زمین اگر اس غرض کے لئے خریدی ہے کہ اسے بیچ کر نفع حاصل کریں گے تو زمین کی مالیت پر بھی زکوٰۃ ہر سال فرض ہوگی،[۴] اور ہر سال اُس وقت کی بازاری قیمت کا ڈھائی فی صد زکوٰۃ میں دینا ہوگا۔

سوال ۳:- ایسی زمین جو مستقبل میں رہائشی دکان یا کاروباری دفتر کے لئے خریدی گئی ہو کوئی رقم واجب الاداء نہ ہو اور زمین کی ملکیت منتقل ہوچکی ہو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب ۳:- جس روز اس زمین کی بیع آپ کے نام ہوئی اس دن کے بعد سے نہ اس رقم پر زکوٰۃ فرض ہے اور نہ اس زمین کی مالیت پر کیونکہ وہ رہائشی مقصد کے لئے لی گئی ہے لیکن بیع ہونے سے

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۳ (طبع سعید کراچی) (ولا فی ثیاب البدن وأثاث المنزل و دور السکنی ونحوها) .... اذا لم تنو للتجارة، وفی الشامیة تحت (قوله وأثاث المنزل) .... ای کثیاب البدن الغیر المحتاج الیها وکالحوانیت والعقارات. وفی الهدایة ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع مکتبه شرکت علمیه ملتان) ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنزل ودواب الرکوب وعبید الخدمة وسلاح الاستعمال زکوة.

(۲) اس کا حوالہ اگلے سوال کے جواب میں آرہا ہے۔

(۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۶ و ۲۶۷ (طبع سعید کراچی) ولو کان الدین علی مقر ملیٍ او علی معسر او مفلس .... فوصل الی ملکه لزم زکوة ما مضی.

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۷ (طبع سعید کراچی) او نیة التجارة فی العروض اما صریحاً، ولا بد من مقارنتها لعقد التجارة.

پہلے جو رقم زمین کی خریداری کے لئے دے رکھی تھی اس پر زکوٰۃ فرض تھی اور بیع مکمل ہونے پر اس کی ادائیگی لازم ہے لقول الشامی: **الظاهر أن منه مال المرصد المشهور في ديارنا لأنه إذا انفق المستأجر لدار الوقف على عمارتها الضرورية بأمر القاضي للضرورة الداعية إليه يكون بمنزلة استقراض المتولي من المستأجر، فإذا قبض ذلک کله أو أربعين درهما منه ولو باقتطاع ذلک من أجرة الدار، تجب زکوٰته لما مضى من السنين والناس عنه غافلون (شامی)۔**[1]

سوال۴:- ایسی رقم جو زرعی زمین کی خریداری کے لئے ادا کی گئی ہو، اس زمین کی ملکیت حاصل ہوگئی ہو لیکن زمین کسی کام میں نہ آ رہی ہو؟

جواب۴:- اس کا جواب بھی نمبر تین کی طرح ہے کہ جس دن بیع مکمل ہوئی اس دن نہ رقم پر زکوٰۃ ہے نہ زمین پر لیکن بیع ہونے سے پہلے پہلے رقم پر زکوٰۃ فرض تھی اگر وہ ادا نہیں کی ہے تو ادا کی جائے۔

سوال۵:- کاروباری جگہ کی پگڑی کی مد میں ادا کی ہوئی رقم جو ہر سال بڑھ رہی ہو؟

جواب۵:- یہ سوال واضح نہیں ہے واضح کر کے لکھئے تو جواب دیا جائے۔

سوال۶:- کاروبار کی جگہ میں نصب شدہ فرنیچر پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب۶:- یہ فرنیچر اگر فروخت کرنے کی غرض سے نہیں خریدا گیا تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔[2]

سوال۷:- کاروباری استعمال میں آنے والی اشیاء اور مشین پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب۷:- یہ چیزیں بھی اگر برائے فروخت نہیں خریدی گئیں تو ان پر زکوٰۃ نہیں۔[3]

سوال۸:- ایسا زیور جو اہلیہ کے روزمرہ اور تقریبات کے مواقع پر استعمال ہوتا ہو؟

جواب۸:- اس پر ہر سال زکوٰۃ فرض[4] ہے اور جس روز زکوٰۃ ادا کی جا رہی ہو اس روز

---

(۱) رد المحتار ج ۲ ص:۳۰۵ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲،۳) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۴ و۲۶۵ (ایچ ایم سعید) ولا في ثياب البدن .. . وأثاث المنزل ودور السكنى ونحوها ....اذا لم تنو للتجارة ... وكذلک آلات المحترفين. وفي الهداية كتاب الزكوٰة ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع شركت علميه) وليس في دور السكنى .... زكوٰة .... وعلى هذا .... آلات المحترفين .

(۴) وفي سنن أبي داؤد باب الكنز ما هو وزكوٰة الحلي ج:۱ ص:۲۲۵ (طبع مكتبه حقانيه ملتان) عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده ان امرأة أتت رسول الله صلى الله عليه وسلم ومعها ابنة لها وفي يد ابنتها مسكتان غليظتان من ذهب فقال: اتعطين زكوة هذا؟ قالت: لا، قال: أيسرک أن يسورک الله بهما يوم القيمة سوارين من نار؟ قال فخلعتهما فالقتهما الى النبي صلى الله عليه وسلم وقالت: هما لله ولرسوله، (وكذا في الدراية في تخرج احاديث الهداية على الهداية ج:۱ ص:۱۹۲ طبع شركت علميه) وفي سنن أبي داؤد ج:۱ ص:۲۲۵ (طبع مكتبه حقانيه ملتان) عن عبدالله بن شداد بن الهاد أنه قال: دخلنا على عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم فقالت: دخلت على رسول الله صلى الله عليه وسلم فرأى في يدي فتخات من ورق، فقال: ما هذا يا عائشة؟ فقلت: صنعتهن أتزين لک يا رسول الله! قال: أتؤدين زكاتهن؟ قلت: لا، أو ما شاء الله، قال: هو حسبک من النار.............................. (باقی اگلے صفحے پر)

سونے کی بازاری قیمت پر ڈھائی فی صد زکوٰۃ نکالنی ہوگی بشرطیکہ وہ زیور نصاب تک پہنچتا ہو اور نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت ہے۔

سوال۹:- ایسا زیور جو نابالغ بچی کے روزہ مرہ اور تقریبات کے مواقع پر استعمال ہوتا ہو اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں اگر ہے تو کون اس کی زکوٰۃ نکالے؟

جواب۹:- اگر وہ زیور نابالغ بچی کے باپ یا ماں کی ملکیت ہے تو جس کی ملکیت ہے اس پر زکوٰۃ فرض ہے[1] بشرطیکہ اس کا کل مملوکہ زیور نصاب تک پہنچتا ہو اور اگر وہ زیور نابالغ بچی کو ہبہ کر کے اسی کو اس کا مالک بنا دیا گیا ہے تو پھر جب تک بچی نابالغ ہے اس وقت تک اس پر زکوٰۃ کسی کے ذمے نہیں،[2] بالغ ہونے کے بعد بچی پر واجب ہوگی۔

سوال۱۰:- خام سونا جو بچوں کی شادیوں کیلئے رکھا گیا ہو؟

جواب۱۰:- اس کا بھی وہی حکم ہے جو ۹ میں گزرا۔

سوال۱۱:- ایسی رقم جو دوسروں کو قرض کے طور پر دی گئی اور اس کو کئی سال ہو گئے اور وہ رقم واپس ملنے کی اُمید ہو؟

جواب۱۱:- اس پر زکوٰۃ فرض ہے لیکن ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب وہ رقم واپس مل جائے گی تو جتنے سال رقم مقروض کے پاس رہی ہے اتنے سالوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی یک مشت واجب ہوگی،[3] لیکن اگر رقم ملنے سے پہلے ہی ہر سال اپنے دوسرے اثاثوں کے ساتھ اس کی زکوٰۃ بھی نکال دیا کریں تو زکوٰۃ ادا ہوتی رہے گی بلکہ بہتر ہوگا۔[4]

سوال۱۲:- ایسی رقم جو دوسروں کو قرض کے طور پر دی گئی اور اس کو کئی سال ہو گئے اور وہ رقم

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)... وراجع للتفصیل اعلاء السنن ج:۹ ص:۵۲-۵۴. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۹۸ (طبع سعید کراچی) ومعموله ولو تبرًا أو حليا مطلقا مباح الاستعمال أو لا ولو للتجمل والنفقة لأنهما خلقا أثمانا فيزكيهما كيف كانا الخ.
وکذا فی البدائع ج:۲ ص:۱۷ وفتح القدير ج:۲ ص:۱۶۵ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

(۱) سابقہ حوالہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۵۸ و ۲۵۹ (طبع سعيد) وشرط افتراضها عقل وبلوغ واسلام، وفی رد المحتار تحت (قوله عقل وبلوغ) فلا تجب على مجنون وصبي لانها عبادة محضة وليسا مخاطبين بها
وفی الهداية ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان) وليس على الصبي والمجنون زكاة (إلى قوله) ولنا انها عبادة فلا تتأدى الا بالاختيار تحقيقا لمعنى الابتلاء ولا اختيار لهما لعدم العقل.

(۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۵ (طبع سعيد كراچی) واعلم أن الديون عند الامام ثلثة قوی، ومتوسط، وضعيف (فتجب) زكوتها اذا تم نصابا وحال الحول، لكن لا فورًا بل (عند قبض أربعين درهما من الدين) القوی كقرض (وبدل مال تجارة) فكلما قبض اربعين درهما يلزمه درهم.

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۹۳ (طبع سعيد كراچی) (ولو عجل ذو نصاب) زكوته (لسنين او لنصب صح) لوجود السبب وفی رد المحتار (قوله لوجود السبب) ای سبب الوجوب وهوملك النصاب النامی فيجوز التعجيل لسنة واكثر الخ وكذا فی الهداية ج:۱ ص:۱۷۶.

واپس ملنے کی اُمید نہ ہو؟

جواب۱۲:- اگر قرض کے وصول ہونے کی اُمید نہ ہو تو جب تک وہ وصول نہ ہو جائے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، تاہم چونکہ بعض فقہاء یہ کہتے ہیں کہ اگر قرض پر عدالتی ثبوت موجود ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ وصول ہونے پر تمام گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کردی جائے۔(۱)

کما فی الدر المختار أو علی جاحد علیه بینة، وعن محمد لا زکاة وهو الصحیح، وقال الشامي: الحاصل أن فیه اختلاف التصحیح.(۲)

ثم قال في باب المصرف: ومال الرحمتي الی هذا، وقال بل في زماننا یقر المدیون بالدین وبملائته، ولا یقدر الدائن علی تخلیصه منه فهو بمنزلة العدم،(۳) وبه أفتی حکیم الامۃ في امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۳۱، ۳۲۔(۴)

سوال۱۳:- ایسی رقم جو کئی برس گزر جانے کے باوجود کاروباری لین دین کے سلسلے میں واجب الوصول ہو اور اس کی وصولی کی امید ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟

جواب۱۳:- اگر وصولی کی امید ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب رقم وصول ہو جائے البتہ وصول یابی پر کل گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ فرض ہوگی۔(۵)

سوال۱۴:- ایسی رقم جو کئی برس گزر جانے کے باوجود کاروباری لین دین کے سلسلہ میں واجب الوصول ہو اور اس کی وصولی کی امید نہ ہو؟

جواب۱۴:- اس کا جواب (۱۲) کی طرح ہے۔

سوال۱۵:- ایسی رقم جو ذاتی رہائش کے لئے مکان کی خرید کے سلسلے میں ادا کی گئی ہو، مکان کا قبضہ لے کر رہائش اختیار کرلی گئی ہو، کل قیمت کا ایک معمولی حصہ ادا کرنا باقی ہو اور مکان ہنوز سابق مالک کے نام ہو، اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب۱۵:- جب تک مکان کی بیع مکمل نہیں ہوئی تھی اس وقت تک رقم پر زکوٰۃ فرض تھی

---

(۱) وفی الهدایة ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع شرکت علمیه ملتان) ولوکان الدین علی مقر ملیء أو معسر تجب الزکاة لإمکان الوصول الیه ابتداءً وبواسطة التحصیل وکذا لوکان علی جاحد وعلیه بینة.

وفی الدر المختار (کتاب الزکوة ج:۲ ص:۲۶۶، ۲۶۷ ولو کان الدین علی مقر ملیء او علی معسر او مفلس ... او علی جاحد علیه بینة ....فوصل الی ملکه لزم زکوة ما مضی. وکذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۶ ص:۹۰.

(۲) الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۷.

(۳) رد المحتار ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید).

(۴) ص:۳۳ و ۳۴ (طبع مکتبه دار العلوم کراچی).

(۵) دیکھئے حاشیہ نمبر۱۔

لیکن جب بیع مکمل ہوگئی تو نہ رقم پر زکوٰۃ ہے نہ مکان پر خواہ کاغذات میں وہ مکان کسی دوسرے کے نام پر ہو لیکن جب بیع کا ایجاب وقبول ہوگیا تو بیع ہوگئی اب جو رقم دینی باقی ہے اس پر زکوٰۃ نہیں بلکہ وہ اس شخص کے ذمے قرض ہے جسے وہ اپنے کل قابلِ زکوٰۃ سرمایہ سے منہا کرسکتا ہے۔

سوال ۱۶:- موٹر جو ذاتی گھریلو استعمال کے علاوہ کاروباری مقاصد کے لئے بھی استعمال ہوتی ہو اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب ۱۶:- موٹر جب تک فروخت کرنے کی غرض سے نہ خریدی گئی ہو اس پر زکوٰۃ نہیں۔[1]

سوال ۱۷:- وہ قیمتی سامان جو گھریلو استعمال کے لئے خریدا گیا ہو مثلاً ٹی وی، ریفریجریٹر، قالین، فرنیچر وغیرہ ان پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ اور جس چیز پر زکوٰۃ فرض ہے اس پر کتنی زکوٰۃ ادا کرنی ہوتی ہے؟

جواب ۱۷:- اس سامان پر زکوٰۃ نہیں،[2] اور مذکورہ چیزوں میں سے جتنی اشیاء پر زکوٰۃ فرض ہے ان سب پر زکوٰۃ کی شرح ڈھائی فی صد ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۳۸/۳۲ج)

جی پی فنڈ کی رقم سے خریدے گئے مکان کے کرایہ پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- سائل ایک محکمہ سے ریٹائرڈ ہوا ہے اس محکمہ نے کچھ رقم دی جو کہ جی پی فنڈ کی صورت میں اس کی تنخواہ سے کاٹی جاتی تھی کچھ رقم سے مکان بنوائے اور کرایہ پر دیدئے کچھ رقم بینک اور ڈاکخانے میں اس لئے رکھ دی کہ ایک تو رقم محفوظ رہے گی دوسری بات یہ ہے کہ اس کی آمدنی سے گزر اوقات ہوتا رہے گا اب دونوں کے بارے میں سود اور زکوٰۃ کے شرعی احکام بتائیں اور مکان کی آمدنی کی بچت پر زکوٰۃ ہوگی یا کل مکان کی قیمت پر؟

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۴،۲۶۵ ولا فی ثیاب البدن .... وأثاث المنزل .... وکذلک الات المحترفین ....الخ. وفی الھدایة ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع شرکت علمیه ملتان) ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن وأثاث المنازل .... زکوٰة .... والات المحترفین.... الخ.

(۲) ایضاً۔

(۳) وفی الھندیة ج:۱ ص:۱۷۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه)، تجب فی کل مائتی درھم خمسة دراھم وفی کل عشرین مثقال ذھب نصف مثقال، وایضًا فی الھندیة ج:۱ ص:۱۷۹ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) ثم فی کل اربعین درھما درھم وفی کل أربعة مثاقیل قیراطان. ...الخ.

جواب:- جی پی فنڈ کی رقم سے آپ نے جو مکان بنوا کر کرایہ پر دیدئے تو اس کی آمدنی آپ کے لئے جائز ہے لیکن جو رقم بینک یا ڈاک خانہ میں رکھی ہے اس پر جو سود لگتا ہے اس کا لینا حلال نہیں صرف اپنی اصل رقم وصول کر سکتے ہیں، اضافہ نہیں بلکہ بہتر یہ ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائیں جس پر سود نہیں لگتا اور مکان سے جو کرایہ ملے گا اس پر زکوٰۃ ہوگی، مکان کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۲۹/ ۲۸ ج)

بینک کی طرف سے ملنے والے سود پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- بینک یا ڈاک خانہ میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ ہوگی یا اس کے منافع پر؟

جواب:- بینک یا ڈاک خانے میں جتنی اصل رقم رکھی ہے اس پر زکوٰۃ فرض ہے لیکن جو اضافہ بینک یا ڈاک خانے نے دیا ہو وہ سود ہے اس کا لینا حلال نہیں اور غلطی سے لیا ہو تو اس کو صدقہ کرنا واجب ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۲۹/ ۲۸ ج)

زکوٰۃ کن چیزوں پر فرض ہے؟

سوال:- زکوٰۃ صرف رقم پر ہوتی ہے اور سونے چاندی پر بھی ہوتی ہے، لیکن اس کے علاوہ پر بھی زکوٰۃ ہے یا نہیں اگر نہیں تو کیوں؟

جواب:- شرعاً زکوٰۃ صرف سونے چاندی، نقدی، مالِ تجارت، زرعی پیداوار اور مویشیوں پر فرض ہوتی ہے دوسری چیزوں پر نہیں، اور ''کیوں؟'' کا مختصر جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اسی طرح ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۲۹/ ۲۸ ج)

سونا اور این آئی ٹی یونٹ پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- میں نے مبلغ بیس ہزار روپے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لیا اور اس سے N.I.T یونٹس اور سونا خرید لیا، کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟ میری عمر ۵۵ سال ہے اس بیس ہزار روپے قرض کی قسط اپنی تنخواہ سے ہر ماہ کٹوانا پڑتی ہے، اور مجھے پراویڈنٹ فنڈ ۵ سال کے بعد ملے گا؟

جواب:- صورت مسئولہ میں آپ نے جو سونا خریدا اور جو این آئی ٹی یونٹ حاصل کیے ان پر زکوٰۃ آپ کے ذمے واجب ہے، آپ نے اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے جو رقم لی ہے وہ شرعاً قرض نہیں ہے بلکہ اپنے باقی ماہانہ حق کی وصولی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۹/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۸۱/۱۹ ج)

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے بطور قرض لی گئی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- زید کے پاس ۴۰ ہزار روپے کے حصص ہیں، اور واجب الاداء زکوٰۃ ۱۰۰۰ روپیہ ادا کرنے کے لئے زید کے پاس نقد رقم نہیں ہے وہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے قرض لینا چاہتا ہے اس طرح قرض ایک ہزار روپیہ لے کر زکوٰۃ ادا کرنی ہے۔ تو کیا ۴۰ ہزار روپیہ پر زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی یا ۳۹ ہزار پر؟ یا یوں کہیئے کہ ۱۰۰۰ روپیہ زکوٰۃ میں ادا کرنا ہے یا ۹۷۵ روپے ادا کرے گا؟

جواب:- صورت مسئولہ میں اس کو پورے چالیس ہزار کی زکوٰۃ یعنی ایک ہزار روپے ادا کرنے ہوں گے جو روپے زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے قرض لئے گئے انہیں قابلِ زکوٰۃ رقم سے منہا نہیں کیا جائے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۹/۲۳ھ

کچھ زمین، دو تولہ سونا اور کچھ رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- میرے پاس زمین تھی میں نے گزشتہ سال اسی مہینے میں پچیس ہزار میں بیچ دی تھی یعنی خریدار نے روپے میری جیب میں رکھ دیئے اور میں نے کاغذات اس کے حوالے کر دیئے لیکن نام کی تبدیلی خریدار کے نام چار مہینے کے بعد ہوئی اس سے پہلے میرے پاس کچھ نہیں تھا صرف دو تولہ سونا تھا اس پچیس ہزار روپے میں سے بیس ہزار اپنے بیٹے کو دوسرے ملک بھیج دیئے بیٹے کے پاس رہنے کے لئے مکان نہیں تھا اس نے اس پیسے سے مکان خرید لیا شعبان کے مہینے میں زمین بیچنے کی بات ہوگئی تھی روپے پارٹی نے ۵ آدمیوں کے بیچ میں رکھ دیئے تھے اس کے بعد رمضان کا مہینہ آگیا، رمضان میں میں نے زکوٰۃ نہ نکالی تھی کیونکہ میرے پاس پیسے نہیں تھے دو مہینے کے بعد روپے ملے ملتے ہی بیس ہزار، بیٹے نے بھیج دیئے اب سارے روپے کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی یا نہیں؟

جواب:- اگر زمین فروخت کرنے سے پہلے دو تولہ سونے کے علاوہ کچھ چاندی یا نقد رقم بھی آپ کے پاس موجود تھی خواہ وہ پانچ دس روپے ہی کیوں نہ ہوں، تو آپ پر رمضان کے بعد سونے

کے علاوہ پورے پچیس ہزار کی زکوٰۃ نکالنی فرض ہے پوری رقم کی زکوٰۃ نکال دیں[1] اور اگر دو تولہ سونے کے علاوہ کوئی نقد رقم موجود نہ تھی تو مسئلہ دوبارہ پوچھ لیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۸۹۲/۲۸ ج)

سونے چاندی کی زکوٰۃ قیمتِ فروخت کے اعتبار سے نکالی جائے گی

سوال:- تقریباً ۲۰ سال سے کسی عورت نے جس کے پاس ساڑھے سات تولہ سونے سے زیادہ کے زیورات ہیں مگر زکوٰۃ نہیں نکالی اور اب زکوٰۃ نکالنا چاہتی ہیں تو کیا طریقہ کار ہوگا؟ کیا سونے کی موجودہ قیمت لگائی جائے گی یا جس سال کی زکوٰۃ نکالنا ہے اس سال جو سونے کی قیمت ہوگی اس پر زکوٰۃ نکالی جائے گی؟

جواب:- اس عورت پر واجب ہے کہ جتنے سالوں کی زکوٰۃ اس نے ادا نہیں کی ان تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے، واضح رہے کہ زکوٰۃ کا وجوب اس وقت سے شمار ہوگا، جب سے عورت کے پاس بقدرِ نصاب مال آئے ہوئے ایک سال پورا ہوا ہو، البتہ پچھلے ہر سال کی زکوٰۃ موجودہ قیمت[2] کے اعتبار سے ادا کی جائے گی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۵/۲۷ و)

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال:- کیا پراویڈنٹ فنڈ پر سال بہ سال زکوٰۃ نکالی جائے گی جبکہ وہ اس ملازم کے قبضہ میں نہیں اور ملازمت کے اختتام کے بعد ہی اس ملازم کو ادا کیا جائے گا؟

جواب:- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوتی ہے جب وہ ملازم کے قبضے

---

(۱) دیکھئے ص:۳۹ کا حاشیہ نمبر:۱۔

(۲) والخلاف فی زکاۃ المال، فتعتبر القیمۃ وقت الاداء فی زکاۃ المال علی قولهما، وهو الاظهر، وقال ابوحنیفۃ یوم الوجوب (کما فی البرهان غنیۃ ذوی الاحکام فی بغیۃ درر الحکام لأبی الخلاص الشرنبلالی من حاشیۃ درر الحکام ج:۱ ص:۱۸۱)۔ وفی البرهان شرح مواهب الرحمن ج:۱ ص:۵۰۷ (مخطوطۃ) واعتبراهما یوم الاداء اذا الاصل هو اداء اجزاء من النصاب وللمزکی حق النقل الی القیمۃ فیعتبر یوم النقل، وهو وقت الاداء، وصار کما لو نقصت بعفوته وکالسوائم وهو الأظهر، لما قلنا. وکذا فی بدائع الصنائع ج:۲ ص:۲۲ (طبع سعید)۔
وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۸٦ (طبع سعید کراچی) وتعتبر القیمۃ یوم الوجوب وقالا: یوم الاداء وفی السوائم یوم الاداء اجماعاً وهو الاصح، ویقوم فی البلد الذی المال فیه الخ وفی الشامیۃ تحته وفی المحیط یعتبر یوم الأداء بالإجماع وهو الأصح فهو تصحیح للقول الثانی الموافق لقولهما وعلیه فاعتبار یوم الأداء یکون متفقاً علیه عنده وعندهما.

میں آجائے اس سے پہلے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں اور قبضے میں آنے کے بعد بھی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی بلکہ اسی سال کی واجب ہوگی جس میں وہ قبضے میں آیا ہے۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۵/ ۲۷و)

ریڈیو، فرتج اور فرنیچر پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- کیا زکوٰۃ ریڈیو، صوفہ سیٹ، میز، کرسی، پھولدان، ٹیلی ویژن، فرتج یا اس قسم کی دوسری اشیاء پر بھی ان کی قیمت خرید یا موجودہ بازاری قیمت پر نکالی جائے گی؟ اگر ان اشیاء پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟

جواب:- ریڈیو، فرنیچر، ڈیکوریشن کے سامان اور ریفریجریٹر اگر گھریلو استعمال کے لئے ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں[2] البتہ تجارت کے لئے ہوں تو ان کی بازاری قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۵/ ۲۷و)

مکان پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- ذاتی مکان جو قرض لے کر بنایا گیا ہے اور قرض ابھی ادا نہیں ہوا، اس کے ایک حصہ میں رہائش ہے اور باقی حصے کرایہ پر ہیں، اور رہائش پر اس کو ادارہ جہاں وہ ملازم ہے کرایہ ماہوار ادا کرتا ہے تو کیا اس مکان پر زکوٰۃ نکالی جائے گی اور اگر نکالی جائے گی تو طریقہ کار کیا ہوگا؟

جواب:- مکان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے،[3] البتہ اس کے کرایہ کی جو رقم اخراجات سے بچا کر رکھ لی جائے اس پر دوسری رقموں کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہے،[4] اور جتنا قرض انسان پر واجب ہو اتنی رقم کی زکوٰۃ بھی واجب نہیں۔[5] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶-۱۱-۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵۵/ ۲۷)

---

(۱) مکمل تفصیل کے لئے دیکھئے "پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ وسود کا مسئلہ" مرتبہ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ مطبوعہ دارالاشاعت۔
(۲) دیکھئے ص:۴۷ کا حاشیہ نمبر۱۔
(۳) وفی الهداية ج:۱ ص:۱۸۶ (مكتبه شركت علميه) وليس في دور السكنى .... زكوٰة.
(۴) اذا اجر دارا، أو عبده بمائتي درهم لا تجب الزكوة ما لم يحل الحول بعد القبض في قول أبي حنيفةؒ (قاضی خان ج:۱ ص:۲۵۳).
(۵) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۰ (طبع رشيديه كوئته) (شرط وجوب الزكاة) فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد، سواء كان لله كزكاة وخراج أو للعبد .... الخ . وفي الهداية كتاب الزكوٰة ج:۱ ص:۱۸۶ (مكتبه شركت علميه ملتان) ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكوٰة عليه . . . وان كان ماله اكثر من دينه زكى الفاضل اذا بلغ نصابًا.

قومی دفاعی سرٹیفکیٹ پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- ملازمت سے جو تنخواہ وغیرہ ملتی ہے اس پر حکومت کا آمدنی ٹیکس (انکم ٹیکس) دیا جاتا ہے زیادہ آمدنی پر ٹیکس سے بچنے کیلئے قومی دفاعی سرٹیفکیٹ مرکزی حکومت کے جاری کردہ خرید لئے جاتے ہیں جن کو ۵ سال تک اس لئے فروخت نہیں کیا جاتا کہ اس دوران اس مالیت پر آمدنی ٹیکس میں چھوٹ مل جاتی ہے اگر ۵ سال سے قبل فروخت کر دیئے جائیں تو پھر فروخت شدہ سرٹیفکیٹ سے حاصل شدہ رقم پر آمدنی ٹیکس دینا ہوتا ہے یہ مجبوراً خریدے جاتے ہیں، خانگی اخراجات میں خاص کمی کر کے۔ جواب تحریر فرمادیں کہ کیا ایسے خرید کردہ قومی دفاعی سرٹیفکیٹ کی مالیت پر زکوٰۃ سال بہ سال جب تک وہ فروخت نہ کئے جائیں نکالی جائے گی؟

جواب:- قومی دفاعی سرٹیفکیٹ دراصل ایک قرض ہے جو حکومت کو دیا جاتا ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب ہے[1] کیونکہ وہ دَینِ قوی ہے خواہ یہ قرض کسی مجبوری سے دیا گیا ہو۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ

زکوٰۃ میں قیمتِ خرید کا حساب ہے یا قیمتِ فروخت کا؟

سوال ۱:- ہم اپنے حساب کتاب کی سہولت کے پیشِ نظر زکوٰۃ کا حساب ہر سال دسمبر کے مہینہ میں کرتے ہیں، لہٰذا اس وقت جو مال ہمارے پاس ہوتا ہے اس وقت مال کی قیمت بازار کے بھاؤ سے، قیمت خرید سے زیادہ ہوتی ہے اور کچھ کی کم، کیا ہم قیمت خرید کے حساب سے زکوٰۃ ادا کریں یا بازار کے بھاؤ کے حساب سے؟

جواب ۱:- جس تاریخ میں زکوٰۃ کا سال پورا ہوتا ہے اس تاریخ میں مال کا جتنا اسٹاک موجود ہے اس کی قیمت اسی تاریخ کے بازار کے نرخ کے لحاظ سے لگائی جائے گی[2] قیمتِ خرید کے لحاظ سے نہیں، البتہ زکوٰۃ کے لئے قمری مہینے کی کوئی تاریخ مقرر کرنی ضروری ہے۔

سوال ۲:- ہمارا ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی ہے جس میں ہم کپڑا بناتے ہیں زکوٰۃ نکالتے وقت

---

(۱) وفی البدائع ج:۲ ص:۱۰، اما القوی فھو الذی وجب بدلًا عن مال التجارۃ کثمن عرض التجارۃ ....الی قولہ ... ولا خلاف فی وجوب الزکوۃ فیہ الا انہ لا یخاطب باداء شیء من زکوۃ ما مضی ما لم یقبض اربعین درھما وکذا فی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۵ (طبع سعید) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۵ واعلم ان الدیون عند الامام ثلاثۃ، قوی ومتوسط وضعیف فتجب زکاتھا اذا تم نصابا وحال الحول لکن لا فورًا بل عند قبض اربعین درھما من الدین القوی کقرض وبدل مال تجارۃ.... الخ. تاہم ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ کی اصل رقم کے علاوہ زائد رقم سود ہے، اس کا لینا ناجائز ہے۔

(۲) دیکھئے ص:۵۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

کارخانہ میں مندرجہ ذیل مال پڑے ہوتے ہیں ۱:- سوت، ۲:- خام کپڑا جو ہم نے بنایا ہے، ۳:- رنگین کپڑا جو خام کپڑے کو اپنے کارخانہ میں رنگا ہے، ۴:- تیار کپڑے کی گانٹھیں جو تیار پڑی ہوتی ہیں تا کہ جہاز سے باہر ملکوں کو روانہ کریں، ان پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

جواب ۲:- سوت، خام کپڑے، رنگین کپڑے اور تیار کپڑے میں سے ہر ایک پر زکوٰۃ واجب ہے اور ان میں سے ہر ایک چیز کی قیمت اس تاریخ کی بازاری قیمت کے لحاظ سے لگائی جائے گی، قیمت خرید کے اعتبار سے نہیں۔[1]

سوال ۳:- کیا سوت پر زکوٰۃ قیمت خرید کے اعتبار سے ادا کریں یا وقت کی مارکیٹ قیمت پر۔ دوسرے ۲ اور ۳ نمبر (یعنی خام کپڑا اور رنگین کپڑا) اس پر زکوٰۃ اپنی لاگت جو اس پر پڑی ہے اس پر ادا کریں یا اس قیمت پر جس پر ہم فروخت کریں گے؟ اس میں کچھ مال آرڈر کے ہوتے ہیں اور کچھ مال بغیر آرڈر کے تیار ویسے ہی ہوتے ہیں؟

جواب ۳:- قیمت نہ لاگت کے لحاظ سے ہوگی نہ خوردہ نرخ کے لحاظ سے بلکہ یہ مال اگر آپ اس تاریخ میں اکٹھا فروخت کریں تو جتنی قیمتِ فروخت ہوسکتی ہو، وہ قیمت لگائی جائے گی۔[2]

سوال ۴:- تیسری بات یہ کہ ۴ نمبر (یعنی تیار کپڑے کی گانٹھوں) پر زکوٰۃ ہم اپنی لاگت پر ادا کریں یا اس قیمت پر جس پر یہ مال جہاز پر روانہ ہوکر ہم کو گاہک سے رقم وصول ہوکر ملے گی، عموماً جہاز کے انتظار میں مال پڑا رہتا ہے؟

جواب ۴:- اس کا جواب نمبر ۳ میں آچکا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۶۷/ ۲۸ ب)

زیورات پر زکوٰۃ

سوال:- ہندہ کے پاس اتنے زیورات ہیں کہ اگر اس کو فروخت کیا جائے تو حج فرض ہوجائے گا، جبکہ نقدی اس کے پاس بالکل نہیں ہے، زکوٰۃ و قربانی کیسے ہوگی؟

جواب:- صورت مسئولہ میں ہندہ پر حج، زکوٰۃ و قربانی فرض ہے،[3] اگر نقد رقم موجود نہ ہو تو کسی کو زیور فروخت کر کے اس سے یہ فرائض ادا کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۷/۱۲/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۴۵/ ۱۱۸ الف)

(۱،۲) دیکھئے ص:۵۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔ (۳) دیکھئے ص ۴۴ کا حاشیہ نمبر ۴۔

زکوٰۃ قرض منہا کرنے کے بعد نکالی جائے گی اور زکوٰۃ میں یومِ اداء کی قیمت کا اعتبار ہے

سوال:- مندرجہ ذیل املاک پر زکوٰۃ فرض ہوگی یا نہیں؟

۱:- دو عدد مکان، ایک دُکان جس سے ماہانہ آمدنی ۱۲۷۵/ روپیہ ہے۔

۲:- سونا اہلیہ کا مقدار تیس تولہ بمعہ کھوٹ، بینک میں ۱۲۰۰۰/ ہزار کے عوض گروی رکھا ہوا ہے، اگر اس زیور پر زکوٰۃ ہے تو کس حساب سے ہے؟

۳:- بینک کا ملازم ہوں، تنخواہ ۵۰۰/ روپے ملتی ہے۔

۴:- نقد دو چار سو ہیں جن پر سال نہیں گزرا۔

۵:- مجموعی طور پر باون ہزار سودی قرضہ اور پچاس ہزار غیر سودی قرضہ ہے جس کی ماہانہ اقساط کرایۂ مکان و دُکان سے ادا کرتا ہوں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی اہلیہ کے پاس جو سونا ہے وہ اگر آپ کی ملکیت ہے تو آپ پر زکوٰۃ فرض ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سونے کی موجودہ مالیت اور آپ کا نقد روپیہ (جتنا بھی ہو) مل کر آپ کے تمام قرضوں کی رقم سے اتنا زیادہ ہو کہ اس سے ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جاسکے[1] لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو آپ پر زکوٰۃ واجب نہیں[2]، پہلی صورت میں آپ سونے کی قیمت اس دن کے نرخ کے مطابق لگائیں جس دن آپ کا سال پورا ہو رہا ہے[3] پھر مجموعی قیمت جوڑ کر اس میں اپنے اس نقد روپے کا اضافہ کرلیں جو اس تاریخ میں آپ کے پاس موجود ہے، (پہلے کتنا رہا؟ اس سے بحث نہیں) پھر اس مجموعی قیمت سے اپنے ذمے جو قرضے باقی ہیں ان کو منہا کرلیں، جتنی رقم بچے اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اس کا چالیسواں حصہ نکال دیجئے۔ اور اگر یہ زیور آپ کی بیوی کی ملکیت ہے تو زکوٰۃ ان پر فرض ہے (بشرطیکہ ان کے ذمہ اتنا قرض نہ ہو جس میں پورا زیور خرچ ہوجائے یا اتنا خرچ ہوجائے کہ بقدرِ نصاب باقی نہ بچے)، اس صورت میں اگر آپ کے پاس کبھی بھی سو دو سو روپے سے زیادہ جمع نہیں ہوئے تو آپ پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، مکان اور دُکان کی عمارت اور زمین کی قیمت پر کوئی زکوٰۃ نہیں، ہاں ان کا جو کرایہ وصول ہو اس پر مذکورہ تفصیل کے مطابق زکوٰۃ ہے، زکوٰۃ کے مفصل احکام

(۱، ۲) وفی الهداية كتاب الزكوة ج:۱ ص:۱۸۶ (مكتبه شركت علميه)، ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكوة عليه .. وان كان ماله اكثر من دينه زكى الفاضل اذا بلغ نصابًا.

(۳) دیکھئے ص:۵۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

کے لئے بہشتی زیور کا مطالعہ فرمائیں یا رسالہ اَحکامِ زکوٰۃ مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مہتمم دارالعلوم کراچی کا مطالعہ فرمائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۹/۲۸ ج)

مشترکہ کاروبار میں ایک شریک کا زکوٰۃ ادا نہ کرنا

سوال:- کچھ عرصہ کے بعد میرے والد صاحب میری طرف متوجہ ہوئے، الحمدللہ تبلیغی جماعت میں شرکت کرتا ہوں انہوں نے پچیس ہزار روپے کاروبار کے لئے دیئے ہیں جس کا نفع و نقصان نہیں مانگتے (واضح رہے کہ رقم نہ تو ہبہ کی ہے اور نہ قرض دی ہے) رقم استعمال ہوتے ہوتے ایک سال ہوگیا والد صاحب زکوٰۃ نہیں دیتے ہیں اگر میں زکوٰۃ دیدوں تو شدید ناراض ہوں گے کیا میں اس رقم کی زکوٰۃ ادا کروں یا نہیں، میری ملکیت میں کچھ زیورات ہیں کیا ان کی زکوٰۃ مذکورہ بالا کاروبار کے منافع سے ادا کردوں تو ادا ہوجائے گی یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ سال کے ختم پر حساب لگا کر یہ متعین کریں کہ کاروبار میں آپ کے سرمایہ اور منافع کی مالیت کتنی ہے، جتنی مالیت آپ کی ثابت ہواتنی مالیت کی زکوٰۃ ادا کرکے آپ عنداللہ بری ہوجائیں گے[1]، والد صاحب کو آپ اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کیجئے کہ وہ بھی اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کردیں لیکن اگر وہ ادا نہ کریں تو اس کا عذاب و ثواب ان پر ہے آپ اپنی زکوٰۃ نکالنے کے بعد بری الذمہ ہیں اور آپ کا کاروبار حلال ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۶/۵/۱۳۹۷ھ

قرض، مملوکہ مال سے زائد ہونے کی صورت میں زکوٰۃ واجب نہیں

سوال:- میرے پاس مبلغ دس بارہ ہزار روپے تھے، حسبِ معمول زکوٰۃ ادا کرتا رہا، اس دوران میں نے ایک مکان خریدا پچیس ہزار کا کچھ گھر کے زیورات تھے ان کو بھی فروخت کردیا، علاوہ اس کے پندرہ ہزار روپیہ اپنے ایک بھائی سے قرضہ لے کر ان میں شامل کردیا مکان کا کرایہ دوسو پچیس روپیہ ماہوار آتا ہے، نیز مذکورہ قرضے سے اب تک ایک پیسہ بھی ادا نہیں کیا گیا اب میرے پاس کچھ

---

(۱) فی التاتارخانیة ج:۲ ص:۲۹۷ فی شرح الطحاوی فان کان نصیب کل واحد منهما علی الانفراد یبلغ نصابًا کاملًا تجب الزکاة والا فلا سواء کانت شرکتهما شرکة عنان او مفاوضة او شرکة بالإرث وغیره من اسباب. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۱۸۱ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) وکذا فی امدادالفتاوی ج:۲ ص:۵۲۵ سوال نمبر ۴۷ (مکتبہ دارالعلوم)

پیسہ کرایہ وغیرہ کا جمع ہوا ہے، جو تقریباً دو ہزار چھ سو چالیس روپیہ ہے اور پانچ تولے سونا بھی ہے زکوٰۃ کیوں اور کیسے ادا ہو؟

جواب:- صورت مسئولہ میں چونکہ قرضہ کی رقم سائل کے پاس موجود مال سے بہت زائد ہے اس لئے اگر اس کے پاس مذکورہ مال (یعنی پانچ تولہ سونا اور ۲۶۴۰ روپیہ نقد) کے سوا کچھ اور مال نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔[۱] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۷/۳/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۹/۱۸ الف)

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

سوال:- ہر سرکاری ملازم کی تنخواہ میں سے ایک آنہ فی روپیہ بمد پراویڈنٹ فنڈ کٹتا ہے، اور اس کو ملازمت کے اختتام کے بعد وہ روپیہ سود کے ساتھ مل جاتا ہے، یہ تمام رقم حکومت کی تحویل میں رہتی ہے، اور ملازم کو یہ پتہ ذرا مشکل سے چلتا ہے کہ اس فنڈ میں اس کا کتنا روپیہ ہے ایسی صورت میں کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب:- اس معاملے میں اہل علم کی تحقیق یہ ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم جب تک ملازم کو وصول نہ ہوجائے اس وقت تک اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اور رقم وصول ہونے کے بعد بھی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، ایسی رقم پر زکوٰۃ کا وجوب اس وقت سے شروع ہوتا ہے جس وقت سے وہ رقم وصول ہوئی ہے، البتہ جو پراویڈنٹ فنڈ جبری نہ ہو، اور ملازم نے اپنے اختیار سے اس کے لئے رقم کٹوائی ہو اس کے معاملے میں احتیاط اسی میں ہے کہ رقم وصول ہونے پر سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ ادا کردی جائے۔

مختصراً اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاءؒ نے دَین کی جو تین قسمیں قوی، متوسط اور ضعیف قرار دی ہیں[۲] پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ان میں سے دَینِ ضعیف ہی میں داخل ہوسکتی ہے، اور دَینِ ضعیف پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ اس مسئلے کی مکمل تحقیق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے امداد الفتاویٰ جلد سوم ص:۶۴۸ تا ۶۵۰ مطبوعہ کراچی میں لکھ دی ہے،[۳] اور حضرت حکیم الأمت مولانا اشرف

---

(۱) وفي الهداية ج:۱ ص:۱۸۶ (مكتبه شركت علميه) ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكوة عليه وقال الشافعي يجب .... ولنا انه مشغول بحاجته الأصليّة فاعتبر معدومًا.

وفي الهندية كتاب الزكوة ج:۱ ص:۱۷۲ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) قال اصحابنا رحمهم الله تعالى كل دين له مطالب من جهة العباد يمنع وجوب الزكاة سواء كان الدين للعباد كالقرض الخ.

(۲) دیکھئے الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۵ (طبع سعید)۔

(۳) مکمل تفصیل کیلئے "پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ" مرتبہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

علی صاحب تھانویؒ نے اس کی تصدیق فرما کر اپنے سابقہ فتویٰ سے رجوع فرمایا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۷/۵/۲۴ھ[1]

تنخواہ میں ترقی کی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- زید ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہے زید صاحبِ نصاب ہے مثلاً سال پورا ہونے کی تاریخ ۳۰/مارچ ہے اس دن زید کو زکوٰۃ کے لئے حساب کرنا ہے کہ کتنی زکوٰۃ کل رقم پر بنتی ہے اب دریافت طلب اَمر یہ ہے کہ زید کی ترقی مثلاً ۲۰/مارچ سے ہوجاتی ہے اور اس سلسلے میں کاغذی کارروائی ۲۰/مارچ کو کردی جاتی ہے، اب زید کو ترقی والی رقم ملنی ہے اگر ۳۰/مارچ سے پہلے پہلے مل جائے تو سابقہ نصاب میں شامل کی جاسکتی ہے لیکن حساب کر کے کاغذات دفتر سے پاس ہوکر ۳۰/مارچ کے بعد ہی آئیں گے اور اس کے ہاتھ ۲، ۳/اپریل یا ۱۵/اپریل کو ملیں گے تو کیا کاغذی احکامات کی بناء پر ۳۰/مارچ کو حساب شدہ زکوٰۃ کی رقم میں اس کو بھی شامل کیا جائے یا نہیں؟ چونکہ حکم ترقی کا ۲۰/مارچ کو ہوچکا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں تنخواہ میں ترقی کی رقم جب زید کو مل جائے گی اس وقت اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی محض کاغذی طور پر استحقاق پیدا ہونے سے اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی لہٰذا ۲۰/مارچ کو جتنی رقم زید کی ملکیت میں ہے صرف اس پر زکوٰۃ نکالنی ہوگی بلکہ اب اس کی زکوٰۃ آئندہ سال نکلے گی، یعنی آئندہ سال زکوٰۃ کی تاریخ میں جتنی رقم ملکیت میں ہوگی اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی جس میں یہ فرق کی رقم بھی شامل ہوجائے گی۔ **لأن الأصح أن الاجرة دَین ضعیف لا تجب علیه الزکوٰة حتی یقبض کالمهر۔**[2]

لیکن یہ مسئلہ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک پر ہے صاحبینؒ کے نزدیک چونکہ ہر قسم کے دَین پر زکوٰۃ واجب ہے اس لئے احتیاطاً ۱۲/اپریل کو ملنے والی رقم کی زکوٰۃ اسی سال کے نصاب میں شمار کر کے نکال دی جائے تو بہتر ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۰/۲۸ ب)

---

(۱) یہ فتویٰ البلاغ کے شمارہ جمادی الثانیہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۶ (ایچ ایم سعید) .... وعند قبض مائتین مع حولان الحول بعدہ ای بعد القبض (من) دین ضعیف وهو (بدل غیر مال) کمهر ودیة وبدل کتابة وخلع الا اذا کان عندہ ما یضم إلی الدین الضعیف.
وفی البدائع ج:۲ ص:۱۰ (طبع سعید) واما الدین الضعیف فهو الذی وجب له بدلاً عن شیٔ سواء وجب له بغیر صنعه کالمیراث او بصنعه کالوصیة او وجب بدلا عما لیس بمال کالمهر وبدل الخلع والصلح عن القصاص وبدل الکتابة ولا زکوٰة فیه ما لم یقبض کله ویحول علیه الحول بعد القبض. (محمد زبیر)

نقد رقم پر زکوٰۃ واجب ہونے کا اُصول

سوال:- نقد رقم کی زکوٰۃ میں کچھ اِشکال پیدا ہوا ہے، سونے چاندی، مویشی، اجناس اور تجارتی مال کا نصابِ زکوٰۃ تو بہت واضح ہے۔

البتہ نقد رقم کی صورت میں اِشکال ہے، بہشتی زیور کے باب الزکاۃ کو پورے غور سے پڑھا جس کے مسئلہ (۴) سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچاس روپیہ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اور مسئلہ (۵) اور مسئلہ (۱۱) میں ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سو روپیہ پر زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے۔

نقد کے نصاب کے سلسلے میں ترجمان القرآن جلد ۲۹ شمارہ مارچ ۱۳۶۸ھ میں پڑھا جس میں بتایا گیا ہے کہ نقد رقم کا نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر رقم ہے، آپ فرمایئے کیا صورت حال ہے؟

جواب:- نقد رقم پر زکوٰۃ کے سلسلے میں اصول یہ ہے کہ اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کا نقد روپیہ ضروریاتِ اصلیہ سے زائد موجود ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے[1] اور ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت چونکہ بدلتی رہتی ہے لہٰذا ہر زمانے کی قیمت کا اس زمانے میں اعتبار ہوگا۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۶/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مکان کی تعمیر کے لئے جمع کی گئی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- زید تعمیرِ مکان کے لئے رقم جمع کرتا ہے، کیا اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

جواب:- اگر یہ رقم ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت تک پہنچ جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہے۔[2]

واللہ اعلم
۱۳۸۷/۱۲/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۴۵/۱۸ الف)

---

(۱) حوالہ کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں: الدر المختار ج:۲ ص:۲۹۹ (طبع ایچ ایم سعید)، فتاویٰ ہندیہ ج:۱ ص:۱۷۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)، ہدایۃ ج:۱ ص:۱۹۶ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان)، فتاویٰ تاتارخانیہ ج:۲ ص:۲۳۷ (طبع ادارۃ القرآن)۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۷ وثمنية المال كالدراهم والدنانير لتعينهما للتجارة بأصل الخلقة فتلزم الزكوٰة كيفما أمسكهما ولو للنفقة. وفی الشامية ج:۲ ص:۲۶۲ (ایچ ایم سعید) ... ان الزكوٰة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة وكذا في البدائع، في بحث النماء التقديري. وفي البحر الرائق ج:۲ ص:۲۰۲ ...ان الزكوة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة.

وفي الخانية ج:۱ ص:۲۵۲، وقال أبو حنيفة اذا وجبت عليه الزكوٰة في أحد الوجهين ولم تجب في الوجه الآخر كان عليه الزكوة. نیز دیکھئے امداد الفتاوی سوال نمبر ۵۰ ج:۲ ص:۲۹. (محمد زبیر)

ترکہ کی دُکان پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

سوال:- ہمارے والد صاحب کا انتقال پچھلی بقرعید سے تین دن پہلے ہوگیا تھا دُعا کیجئے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کی اور ہم سب کی مغفرت فرمائے، آمین۔ نقد اور دوسرا سامان وغیرہ سب شرعی طریقے سے تقسیم ہوگیا ہے اب ایک دُکان باقی ہے، یہ دُکان کرائے پر دی ہوئی ہے، اس کا کرایہ ماہ بماہ حساب سے آپس میں تقسیم کرلیا جاتا ہے کیونکہ آج کل دُکان کے دام کم مل رہے ہیں اس لئے دام صحیح ہونے کا انتظار ہے جس وقت بھی مناسب دام مل گئے اس کو فروخت کرکے حساب سے سب میں تقسیم کردیا جائے گا، معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا اس دُکان پر زکوٰۃ واجب ہے؟ اگر ہے تو اس کی قیمت کس طرح سمجھیں کوئی کہتا ہے کہ اتنے کی بکے گی اور کوئی کچھ کہتا ہے، یعنی بالکل صحیح قیمت کا تعین شاید فروختگی کی صورت میں ہی ہوگا اگر اس دُکان (کی مالیت) پر زکوٰۃ واجب ہے اور سال پورا ہونے کے بعد کسی ایک کے پاس یا سب کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرسکے تو اس کے لئے کیا حکم ہے (یعنی اس کے پاس اس کا آیا ہوا کرایہ بھی خرچ ہوگیا ہے)۔ ہم سب لوگ شعبان/ رمضان میں زکوٰۃ کا حساب کرتے ہیں تو زکوٰۃ واجب ہونے کی صورت میں ہم کو کس طرح حساب کرنا ہے؟

جواب:- جو دُکان کرائے پر چڑھی ہوئی ہے، اس کی مالیت پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، البتہ جو کرایہ ملتا ہے، ہر شخص اپنے سالِ زکوٰۃ کے ختم پر دیکھے کہ اس کا جتنا حصہ اس وقت خرچ سے بچ گیا ہے وہ اگر اپنے دوسرے قابلِ زکوٰۃ اثاثوں کے ساتھ مل کر نصاب تک پہنچ جاتا ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی، ورنہ نہیں۔ (۱)

واللہ اعلم

۱۴۲۰/۱۲/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۳/۸۳)

سونے چاندی دونوں کی مجموعی قیمت، چاندی کے نصاب کو پہنچے تو زکوٰۃ واجب ہے

سوال ا:- زید کے پاس پانچ تولہ سونا اور دو تولہ چاندی بصورتِ زیور ہے۔ اگر نصاب دیکھا جائے تو نصابِ زکوٰۃ کو نہ سونا پہنچتا ہے نہ چاندی اور اگر دو تولہ چاندی کی قیمت لگا کر اسے سونا فرض کیا جائے تب بھی نصابِ زکوٰۃ کو نہیں پہنچتا، دوسری طرف سونے کی قیمت لگا کر اس کو چاندی

---

(۱) وفی التاتارخانیة ج:۲ ص:۲۹۷، فی شرح الطحاوی: فان کان نصیب کل واحد منهما علی الإنفراد یبلغ نصابًا کاملًا نحب الزکوٰة والا فلا سواء کانت شرکتهما شرکة عنان او شرکة مفاوضة او شرکة بالإرث وغیره من اسباب الملک۔ الخ۔ نیز دیکھئے امداد الفتاوی ج۲ ص ۵۱، ۵۲ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

بنالیا جائے تو وہ فرض کی ہوئی چاندی ساڑھے باون تولہ چاندی سے بڑھ جائے گی، فتویٰ درکار ہے آیا زید پر زکوٰۃ فرض ہوگی یا نہیں؟

جواب ۱:- صورت مسئولہ میں زکوٰۃ فرض ہے اور وہ اس طرح کہ سونے کی قیمت لگا کر اسے چاندی کے ساتھ ملایا جائے گا[۱] دونوں کی مجموعی قیمت چاندی کے نصاب سے بڑھ جاتی ہے اس لئے زکوٰۃ فرض ہے۔

سوال ۲:- زید کے پاس صرف پانچ تولہ سونا ہے چاندی بالکل نہیں، اسے قیمت سمجھ کر چاندی فرض کرلیں تو نصابِ زکوٰۃ چاندی کا ساڑھے باون تولہ بن جاتا ہے، آیا اس پر زکوٰۃ فرض ہے؟

جواب ۲:- چاندی بالکل نہ ہو تو کچھ نہ کچھ نقدی ضرور ہوتی ہے اور وہ بھی چاندی کے حکم میں ہے اس لئے سونے کی قیمت لگا کر اس صورت میں بھی زکوٰۃ فرض ہے۔[۲]

سوال ۳:- زید کے پاس پانچ تولہ سونا ہے علاوہ ازیں پانچ دس روپے نقد بھی ہیں جو سال بھر اس کے پاس موجود رہے آیا اس پر سال گزرنے پر زکوٰۃ فرض ہوگی؟ کیونکہ ان روپوں کو چاندی اور اس مذکورہ پانچ تولہ سونے کو چاندی فرض کرنے سے چاندی کا نصاب پورا ہوجائے گا۔

جواب ۳:- جس سال کی یہ بات ہے اس کی قیمت کے لحاظ سے اگر ایک ہزار روپے میں ساڑھے باون تولے چاندی آجاتی ہو تو زکوٰۃ فرض ہے ورنہ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۱/۱۰/۱۳۶۹ھ
(فتویٰ نمبر ۶۸۸/۳۰ د)

قرض منہا کرنے کے بعد جو رقم بچے اگر وہ بقدرِ نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے

سوال:- زید کے پاس اس کی اپنی رقم ۵ ہزار روپے ہے جو کاروبار میں لگا رکھی ہے اور دس ہزار قرض لیا ہے علاوہ ازیں کچھ زیور بطورِ استعمال بھی قرض لے کر بنوایا گیا ہے، زید کو کس رقم پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کو یہ چاہیے کہ اس کے پاس جتنا نقد روپیہ ہے یا جتنا مالِ تجارت یا زیور ہے خواہ وہ قرض روپیہ لے کر ہی حاصل کیا گیا ہو، ان سب کی قیمت لگا کر ان املاک کا مجموعہ نکالے اس کے بعد جتنا قرض اس پر واجب ہے اس کو اس مجموعے سے منہا کرے، جتنی مالیت

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۳ (طبع سعید) و یضم الذهب إلى الفضة وعكسه بجامع الثمنية قيمة وقالا بالأجزاء وفي الهداية ج:۱ ص:۱۹۶ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان) و يضم الذهب الى الفضة للمجانسة من حيث الثمنية. (محمد زبیر حق نواز)

قرض کی منہائی کے بعد باقی بچے اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ کے طور پر ادا کردے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۲۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۹۳/۲۷ھ)

نصابی سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہے

سوال:- گزشتہ سال میں نے ۴۴ ہزار روپیہ کی ادھاری اور کچھ نقدی کمائی سب کی زکوٰۃ میں نے پورا حساب کر کے نکال دی تھی اور اب وہ ادھاری گھٹ کر ۳۳ ہزار رہ گئی ہے اور کچھ نقدی جمع ہے اب مجھے زکوٰۃ کس طرح سے دینی چاہئے؟

جواب:- جس تاریخ میں آپ کی زکوٰۃ کا نصابی سال پورا ہوتا ہے اس تاریخ میں جو کچھ نقد روپیہ، زیور، مالِ تجارت اور لوگوں کو دیئے ہوئے قرضے ہوں گے سب پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لوگوں کے ذمے آپ کے قرضے اگر اب گھٹ کر ۳۳ ہزار رہ گئے ہیں تو اب ۳۳ ہزار پر زکوٰۃ ہوگی۔[۲]

سوال۲:- اگر ادھار میں رقم ڈوبی ہوئی ہو تو اس صورت میں کیا کیا جائے گا؟

جواب۲:- ایسے مال پر ابھی زکوٰۃ واجب نہیں لیکن اگر خلافِ اُمید مل گیا تو پچھلے سالوں کی زکوٰۃ نکلے گی یا نہیں؟ یہ مسئلہ اسی وقت معلوم کرلیں، اور اس میں پہلے یہ بتائیں کہ ڈوبنے کی وجہ کیا تھی؟

سوال۳:- اگر رقم لین دین میں چل رہی ہو تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟

جواب۳:- اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رقم آپ نے کسی اور کو قرض دے رکھی ہے تو اس کا حکم نمبر۱ میں گزرا کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہے، اگر کچھ اور مطلب ہے تو دوبارہ واضح طریقے پر سوال لکھ کر مسئلہ معلوم کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۵۶/۲۸ج)

صرف سو روپے پر زکوٰۃ نہیں

سوال:- زکوٰۃ ہر اس شخص پر واجب ہے جس کے پاس ساڑھے سات تولہ خالص سونا

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۳ (ایچ ایم سعید)، (فلا زکوٰۃ علی مکاتب.... ومدیون للعبد بقدر دینه) فیزکی الزائد ان بلغ نصابًا.... الخ. وفی الهدایة کتاب الزکوٰۃ ج:۱ ص:۱۸۶ (مکتبه شرکت علمیه) ومن کان علیه دین یحیط بماله فلا زکوٰۃ علیه.... وان کان ماله اکثر من دینه زکی الفاضل اذا بلغ نصابًا

(۲) وفی الدر المختار ج ۲ ص.۳۰۵ (طبع سعید) واعلم أن الدیون عند الامام ثلثة قوی ومتوسط وضعیف فتجب زکوتها اذا تم نصابا وحال الحول لکن لا فورا بل عند قبض اربعین درهما من الدین (القوی) کقرض وبدل مال تجارة ... الخ. وفی الشامیة تحت (قوله اذاتم نصابا) . والمراد اذا بلغ نصابًا بنفسه او بما عنده مما یتم به النصاب.

(ایک سال گزرنے پر) یا ساڑھے باون تولہ خالص چاندی ہو (ایک سال گزرنے پر) ان اوزان میں اگر ایک ایک رتی سونا یا چاندی کم ہو تو ایسے شخص پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ شریعت تو یہ کہتی ہے کہ اتنا سونا چاندی ہو تو زکوٰۃ نکالے گا۔

دوسری طرف علماء کہتے ہیں کہ اگر ۱۰۰ روپے موجود ہوں اور سال گزر گیا ہے تو اس کی بھی ڈھائی فیصد زکوٰۃ نکالے، جب نصاب مقرر ہے تو ۱۰۰ روپیہ رکھنے والا کیوں زکوٰۃ نکالے؟

جواب:- آج کل کسی شخص کے پاس ۱۰۰ روپے ہوں اور سونا بالکل نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، جس شخص نے اس پر زکوٰۃ فرض قرار دی ہے اس نے غلط کہا ہے۔ البتہ اگر کسی شخص کے پاس کچھ سونا بھی موجود ہو اور کچھ چاندی یا نقدی روپیہ بھی، اور ان دونوں کی مجموعی قیمت ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے،[1] مثلاً کسی کے پاس دو تولہ سونا ہے جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہے اور اس کے ساتھ سو روپے نقد بھی ہیں تو اب اس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی لیکن جب سونا بالکل نہ ہو صرف سو روپے ہوں تو زکوٰۃ فرض نہیں۔ واللہ اعلم

۹/۷/۱۳۷۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۱/۲۸ ج)

۱:- سال کے آخر میں موجود تمام رقم پر زکوٰۃ واجب ہے
۲:- دیئے گئے قرض پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- میں ایک تاجر ہوں، تجارت کی ابتداء کئے ہوئے ۱۲ یا ۱۴ ماہ ہوئے ہیں، زکوٰۃ کا مسئلہ دریافت کرنا ہے۔

۱:- تجارت میں سال کے آخر میں جتنا نقد ہوتا ہے اس پر زکوٰۃ ہوتی ہے یا صرف اس حصہ پر جو کہ سال بھر میں نقد کی صورت میں ہمارے پاس رہے۔ مثلاً سال کے آخر میں ۵ ہزار روپے ہوتے ہیں، چار ہزار روپے ایک ماہ پہلے ملے تھے تو اب زکوٰۃ /۵۰۰۰ پر یا ایک ہزار پر ادا کرنا ہوگی؟

۲:- اُوپر کے مسئلے کی طرح مالِ تجارت کو لیجئے کیا یہاں بھی وہی اُصول لاگو ہوگا یا کچھ مختلف ہے؟

جواب ۱، ۲:- اگر سال کے شروع اور آخر میں انسان کی قابلِ زکوٰۃ ملکیت ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت سے کم نہ ہو تو سال پورا ہونے کی تاریخ میں اس کے پاس جس قدر نقد یا مالِ تجارت موجود ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، سال کے دوران جو کمی بیشی ہوتی رہی ہو اس کا کچھ اعتبار

(۱) دیکھئے ص:۳۹ کا حاشیہ نمبر ۱۔

نہیں، چنانچہ آپ نے جو مثال دی ہے اس میں زکوٰۃ پورے پانچ ہزار پر ہوگی، ایک دن پہلے جو رقم آئی ہے وہ بھی شامل کی جائے گی، اور ایک دن پہلے جو رقم چلی گئی ہے وہ شامل نہ ہوگی، یہی معاملہ مالِ تجارت کا بھی ہے سال پورا ہونے کی تاریخ میں جتنی مالیت موجود ہے اس پر زکوٰۃ آئے گی۔ (۱)

سوال۳:- کیا اس رقم پر بھی زکوٰۃ ہوگی جو ہمارے مقروضوں کے ذمے ہے اگر زکوٰۃ ہے تو کیا اس رقم میں سے وہ رقم گھٹائی جائے گی جو ہمارے اُوپر قرض ہے دوسرے لوگوں کی؟ مثلاً ہم کو ۸۰۰۰ روپے وصول کرنے ہیں اور ۶۰۰۰ روپے دینے ہیں تو کیا دو ہزار روپے پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی؟

جواب۳:- جی ہاں، جو رقم دوسرے لوگوں پر قرض ہے اس پر زکوٰۃ آپ کے ذمے ہے اگرچہ اس کی ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب وہ وصول ہوجائے، (۲) لیکن اس وقت تمام پچھلے سالوں کا حساب کرنا ہوگا لہٰذا سہولت اسی میں رہتی ہے کہ ہر سال جتنی رقم کہیں قرض کی گئی ہے اس کی زکوٰۃ بھی ادا کی جاتی رہے اور اسی طرح اگر آپ پر کسی کا جو قرض ہے وہ آپ کی پوری مالیت سے مستثنیٰ کیا جائے گا اور اسے مستثنیٰ کرنے کے بعد جتنی مالیت آپ کے پاس بچے گی اس پر زکوٰۃ ہوگی، مثلاً آپ کی نقد رقم دس ہزار ہے اور آپ پر پانچ ہزار کے قرضے واجب ہیں تو آپ پر صرف پانچ ہزار کی زکوٰۃ نکالنی ہوگی۔ (۳)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۳/۲۸ ج)

مقروض کو زکوٰۃ دے کر اپنے قرض میں واپس لینے کا حکم

سوال:- ایک مال دار آدمی ہے جو ایک غریب آدمی کو زکوٰۃ دینا چاہتا ہے اور اس شخص پر اس آدمی کا قرضہ ہے، وہ مال دار آدمی اس وقت اپنا قرضہ اس شخص سے لے سکتا ہے جس کو ابھی زکوٰۃ دی ہو؟

جواب:- اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے مال دار آدمی غریب کو زکوٰۃ کی رقم سپرد کردے اس

(۱) وفی بدائع الصنائع ج:۲ ص:۱۵ (طبع ایچ ایم سعید) ولکن هذا الشرط یعتبر فی أول الحول وفی آخره لا فی خلاله .... الخ. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۸۸، والمستفاد (ولو بهبة أو إرث) وسط الحول یضم إلی نصاب من جنسه فیزکیه بحول الأصل. وفی الشامیة قوله إلی نصاب .... وأشار الیٰ انه لابد من بقاء الأصل .... فان وجد منه شیئا قبل الحول ولو بیوم ضمه وزکی الکل .... الخ.

(۲) دیکھئے سابقہ حوالہ صفحہ:۴۵ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۳ (طبع سعید کراچی) (فلا زکوٰة علی مکاتب .... ومدیون للعبد بقدر دینه) فیزکی الزائد ان بلغ نصابًا .... الخ. وفی الهدایة کتاب الزکوٰة ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع شرکت علمیه) ومن کان علیه دین یحیط بماله فلا زکوٰة علیه .... وان کان ماله اکثر من دینه زکی الفاضل اذا بلغ نصابًا

کے بعد اگر غریب آدمی اس رقم میں سے قرضہ ادا کردے تو جائز ہے۔[۱] واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۹ھ

سونے چاندی کی کتنی مقدار پر زکوٰۃ لازم ہے؟

سوال:- ایک شخص کے پاس تیس تولہ چاندی اور دوسرے کے پاس چاندی اور کچھ سونا ہے، ان دونوں آدمیوں پر زکوٰۃ فرض ہوگی یا نہیں اور کتنی مقدار چاندی اور سونے میں زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے؟

جواب:- اگر کسی کے پاس سونا بالکل نہیں تو زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب ساڑھے باون تولہ چاندی اس کے پاس اپنی ضروریات سے زائد ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے، اور اگر سونا بھی ہے تو سونے اور چاندی دونوں کی قیمت لگائی جائے، دونوں کی قیمت مل کر اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہوجائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔ واللہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۹ھ

قرض پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- زید نے عارف سے مثلاً ایک لاکھ روپیہ اُدھار لئے، عارف پہلے ہی صاحبِ نصاب تھا اب زید نے عارف کو یہ رقم دس سال کے بعد ادا کی، کیا عارف کو ایک لاکھ روپے پر ۱۰ سالوں کی علیحدہ علیحدہ کرکے مثلاً ایک سال کے ۲۵۰۰ روپے اور دس سالوں کے پچیس ہزار روپے بطور زکوٰۃ دینا پڑیں گے یا جس سال ملے صرف اسی سال کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی اور ۹ سالوں کی نہیں دینی پڑے گی کیا حکم ہے؟

جواب:- قرض دَینِ قوی ہے،[۲] لہٰذا اس پر ہر سال زکوٰۃ واجب ہوتی رہتی ہے، البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت واجب ہوتی ہے جب رقم وصول ہو۔ صورتِ مسئولہ میں عارف پر واجب ہے کہ وہ ایک لاکھ روپے وصول ہونے پر گزشتہ پورے دس سال کی زکوٰۃ ادا کرے صرف ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرنا کافی نہیں۔[۳] واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۱/ ۲۸ ب)

کرنسی کے تبادلے کے لئے دی ہوئی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- زید غیر ملک میں پاکستانی سفارت خانہ میں ملازم ہے، ملازمت کا حصہ ختم ہونے

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع سعید) وحیلة الجواز أن یعطی مدیونه الفقیر زکاته ثم یأخذها عن دینه.

(۲،۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۵ واعلم أن الدیون عند الامام ثلثة قوی ومتوسط وضعیف، فتجب زکوتها اذاتم نصابا وحال الحول لکن لا فوزا بل عند قبض أربعین درهما من الدین القوی کقرض وبدل مال تجارة.
نیز دیکھئے ص:۳۶ کا حاشیہ نمبر ۱

پر سفارت خانہ میں ۲۰۰۰ روبل گھریلو سامان فروخت کر کے اور پانچ ہزار روبل اپنی کار فروخت کر کے یہ رقوم حکومت کے پاس جمع کرادیں کہ پاکستان آ کر حکومت سے ان کے بدلے پاکستانی روپے لے لے گا۔ روبل رُوسی سکہ ہے ایک روبل کے سرکاری طور پر ۱۴ روپے ملتے ہیں اس لحاظ سے تقریباً ۲۸۰۰۰ روپے گھریلو سامان کے، اور کار کے ۷۰۰۰۰ روپے ہوئے، اب زید نے پاکستان آ کر اپنے پرانے دفتر میں کام کرنا شروع کردیا جہاں سے وہ سفارت خانے میں کام کرنے گیا تھا، پاکستان میں کچھ قانونی رُکاوٹوں کی وجہ سے زید کو مثلاً دو سال بعد کار کی رقم ستر ہزار مل گئی، زید نے اس رقم کی زکوٰۃ رقم ملنے سے ایک سال پہلے ہی دیدی، اب دوسرے سال کی دینے لگا ہے مگر زید کو قانونی رُکاوٹوں کی وجہ سے ۲۸۰۰۰ ہزار روپے نہیں ملے، اب یہ معلوم کرنا ہے کہ اٹھائیس ہزار روپے مثلاً ابھی مل جاتے ہیں تو اس کی دوسرے سال کی زکوٰۃ (جبکہ زید پہلے ہی ایک سال کی رقم اور اس کی زکوٰۃ دے چکا ہے) تو ابھی دینی ہے لیکن یہی رقم اگر زید کو زکوٰۃ کا سال ختم ہونے کے بعد ملے تو کیا صرف اس سال کی زکوٰۃ دینا پڑے گی یا پچھلے سال کی بھی یعنی جس سال رقم ملے اس سال کی زکوٰۃ دینا ہوگی یا پچھلے سال کی بھی؟

جواب:- مذکورہ اٹھائیس ہزار روپے آپ کی ملکیت میں آچکے ہیں، اس کے بعد آپ نے وہ سفارت خانے کو تبادلے کے لئے دیئے ہیں لہٰذا ان پر ہر سال زکوٰۃ واجب ہوتی رہے گی اور وہ روپے جب بھی آپ کو وصول ہوں پچھلے سالوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی بھی آپ پر واجب ہوگی مثلاً پانچ سال گزرنے کے بعد وصول ہوئے تو آپ کو ۳۵۰۰ روپے زکوٰۃ میں نکالنے ہوں گے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۱/ ۲۸ ب)

پنشن کی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- میں ایک ملازم پیشہ شخص ہوں حال ہی میں اپنے محکمہ سے ریٹائرڈ ہوا ہوں، ریٹائرمنٹ پر مجھے حکومت کی طرف سے ۳۶۰۵۱ روپے ملے میں نے وہ رقم گھر میں غیر محفوظ سمجھ کر بینک میں جمع کرادی، میرا اپنا مکان نہیں ہے اور بسر آمدنی بھی اتنی نہیں ہے کہ خرچ پورا ہو سکے، تنگ دستی سے وقت بسر کرتا ہوں، یہ رقم میرے پاس آئے ہوئے صرف دو دن ہوئے تھے کہ بینک والوں نے اس سے ۹۰۲/۵۰ زکوٰۃ کے کاٹ لئے، شرعاً مجھ پر زکوٰۃ واجب ہے؟

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۵ (طبع سعید کراچی) واعلم أن الديون عند الامام ثلثة قوی ومتوسط وضعيف، فتجب زكوتها اذاتم نصابًا وحال الحول لكن لا فورًا بل عند قبض أربعين درهما من الدين القوى كقرض وبدل مال تجارة.
نیز دیکھئے ص:۳۶ کا حاشیہ نمبر۱

جواب:- جس شخص کے پاس اپنی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا زیور یا تجارتی سامان ہو اس کو صاحبِ نصاب کہتے ہیں، جو شخص سال بھر صاحبِ نصاب رہا ہو یا سال کے شروع اور آخر میں صاحبِ نصاب ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، جو شخص سال کے شروع میں صاحبِ نصاب ہو اگر سال کے دوران اس کے پاس کچھ نئی رقم اس نصاب کے علاوہ آجائے تو اس نئی رقم کی زکوٰۃ بھی سابقہ نصاب کے ساتھ ادا کرنی لازم ہوتی ہے، مذکورہ صورت میں آپ اس رقم کے آنے سے کم از کم ایک سال پہلے صاحبِ نصاب تھے یا نہیں، اگر صاحب نصاب تھے تو بینک میں جو زکوٰۃ وضع کی گئی وہ درست ہوگئی[1] اور اگر مہینہ رمضان ۱۴۰۰ھ کو آپ صاحبِ نصاب نہیں تھے اور اس رقم کے آنے کے بعد صاحبِ نصاب بنے تو پھر اس رقم سے زکوٰۃ وضع کرنا جائز نہیں، اب آپ درخواست دے کر اس رقم کی واپسی کا مطالبہ کرسکتے ہیں اور حکام پر واجب ہے کہ وہ یہ رقم واپس کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۳۴ ج)

۱:- زیورات پر زکوٰۃ موجودہ قیمت کے حساب سے لازم ہے
۲:- زیورات میں ٹانکہ اور بنوائی کی قیمت پر زکوٰۃ کا حکم

سوال۱:- سونے چاندی کی زکوٰۃ موجودہ بھاؤ کے حساب سے قیمت لگا کر دینی چاہئے؟

جواب۱:- جی ہاں۔[2]

سوال۲:- زیورات میں ٹانکہ اور بنوائی کی قیمت کو نکالنا ہوگا یا نہیں؟

جواب۲:- بنوائی کی قیمت کو نکالنا ہوگا، ٹانکے کی قیمت کو نہیں (جبکہ خود اسی چاندی سے زکوٰۃ ادا کی جائے، اور اگر قیمت لگا کر زکوٰۃ نکالی گئی، تو بازار کے نرخ کے مطابق لگے گی جس میں ٹانکے کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ۱۲محمد شفیع) والمعتبر وزنهما اداءً ووجوبًا (شامی ج:۲ ص:۴۰)۔[3]

سوال۳:- عام طور پر سونے کے زیورات کو جب فروخت کرنے جاتے ہیں تو کم قیمت پر فروخت ہوتے ہیں، کیا اس بات کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا؟

---

(۱) تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب ''جدید فقہی مقالات'' ج۲ ص۵۷ تا ۱۳۵ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی بدائع الصنائع كتاب الزكوٰة فصل وأما صفة الواجب فی أموال التجارة ج:۲ ص:۲۲ (ایچ ایم سعید) لأن الواجب الأصلی عندهما هو ربع عشر العين، وانما له ولاية النقل الى القيمة يوم الأداء فيعتبر قيمتها يوم الاداء، والصحيح ان هذا مذهب جميع اصحابنا .... الخ، نیز دیکھئے ص:۵۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۳) الدر المختار باب زكوٰة المال ج:۲ ص:۲۹۷ (طبع ایچ ایم سعید)، وفی البدائع ج:۲ ص:۲۰ وانما المعتبر فيهما الوزن .... الخ. (محمد زبیر)

جواب۳:- جس قیمت پر بازار میں فروخت ہوسکتا ہے اسی قیمت کا اعتبار کر کے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔[1] (محمد شفیع عفی عنہ)

واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۲۵/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

سرکاری ٹیکسوں کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

سوال:- جو لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں کیا وہ ٹیکس بھی ادا کریں یا نہیں، دونوں صورتوں میں زبردست مالی خسارہ ہوتا ہے زکوٰۃ نہ دینے کی صورت میں مجرمِ خدا ہوجاتے ہیں، ٹیکس نہ دیں تو حکومت پیچھا نہیں چھوڑتی، کیا ٹیکس کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ اب ٹیکس سے بچنے کے لئے اگر کوئی رجسٹروں میں کمی بیشی کرے تو کوئی صورت ہے؟

جواب:- سرکاری ٹیکسوں کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی[2] حکومت کو صرف ایسے ٹیکس لگانے چاہئیں جو عوام پر بار نہ بنیں، اگر حق وانصاف سے زائد ٹیکس لگائے گئے ہیں تو ان سے اخفاء کے ذریعہ نجات حاصل کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں جھوٹ وغیرہ کا گناہ مول نہ لیا جائے۔

واللہ اعلم
۱۳۸۷/۱۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۸۷/۱۸ الف)

زکوٰۃ کا وجوب قمری سال سے ہوتا ہے

سوال:- زکوٰۃ کا وجوب قمری سال سے ہوتا ہے یا شمسی سال سے؟

جواب:- زکوٰۃ کا وجوب، قمری سال سے ہوتا ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸/۷۵)

زکوٰۃ کی ادائیگی میں قیمتِ فروخت کا اعتبار ہے

سوال۱:- زکوٰۃ، جس چیز پر واجب ہو اس کی موجودہ بازاری قیمت دیکھی جائے گی یا خرید کی قیمت؟ مثلاً پہلے جب سونے کا ایک تولہ لیا تھا تو سستا ملا تھا، اب ۵۰۰ روپے کا تولہ ہے کونسی قیمت

---

(۱) دیکھئے: سابقہ صفحے کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) وفی الشامیة ج:۲ ص:۳۱۰ (ایچ ایم سعید): مطلب لا تسقط الزکاۃ بالدفع الی العاشر فی زماننا: واعلم ان بعض فسقة التجار یظن ان ما یؤخذ من المکس یحسب عنه اذا نوی به الزکوة وهذا ظن باطل .... الخ.

(۳) وفی الدر المختار قبیل باب زکوة المال ج:۲ ص:۲۹۴ (طبع سعید) وحولها ای الزکوة قمری .... لا شمسی الخ.

کا اعتبار کیا جائے؟

۲:- اگر قیمتِ خرید کی رعایت کی جائے گی تو کیا سامانِ تجارت میں بھی اس کا لحاظ کیا جائے گا؟

جواب ۱:- قیمتِ خرید معتبر نہیں، بلکہ جس دن سال پورا ہو رہا ہو اس دن کی قیمت معتبر ہے،[1] چنانچہ صورتِ مسئولہ میں ایک تولہ سونا ۵ سو روپے کے حساب سے لگایا جائے گا۔

۲:- دُکان کے سامان میں اعتبار اس کا ہے کہ اگر یہ پورا سامان آج فروخت کیا جائے تو کیا قیمت لگے گی؟ قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں۔[2]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۲ھ

کمپنی کے ''ریزرو فنڈ'' پر زکوٰۃ کا حکم

سوال ۱:- عرصہ سولہ سال سے میں ایک کمپنی میں بحیثیت تقسیم کار کے کاروبار کرتا ہوں، گزشتہ سال تک تو سرمایہ کافی تھا مگر اب کام کی وسعت کی وجہ سے یہ سرمایہ بالکل قلیل ہے، شرکاء نے مجبوری سے بینک سے بذریعہ اوور ڈرافٹ روپیہ لینا شروع کیا۔

مندرجہ بالا ادارہ ایک مخصوص رقم بطور ریزرو فنڈ محفوظ رکھتا ہے اس کی کوئی شریک زکوٰۃ نہیں ادا کرتا، اس کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- اصل یہ ہے کہ مشترک کاروبار میں ہر حصہ دار پر اتنے مال کی زکوٰۃ فرض ہوتی ہے جتنا کاروبار میں سے اس کے حصے میں آئے،[3] جس میں ریزرو فنڈ میں اس کا حصہ بھی شامل ہے[4] (تقسیم شدہ منافع کی زکوٰۃ اس کے علاوہ ہے) لہٰذا اگر ہر حصہ دار اپنے اپنے کل حصے کی زکوٰۃ نکال دے تو ریزرو فنڈ کی زکوٰۃ بھی اس میں خود بخود آجائے گی۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۵ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۱۲/۱۸ الف)

زکوٰۃ کی رقم کاروبار میں لگانے کا حکم

سوال:- میرے پاس گاؤں کے مدرسہ کا فنڈ ہے چونکہ دار العلوم کی کوئی مستقل آمدن نہیں ہے صدقات اور زکوٰۃ سے کام چلاتے ہیں، آج کل میرے پاس پچاس ہزار روپے ہیں۔ شوریٰ والے کہتے ہیں کہ اگر اس رقم کو کسی جائز اور منافع بخش کاروبار میں لگادیں تو اصل بھی محفوظ رہے گا اور منافع

(۱، ۲) دیکھئے: سابقہ صفحہ نمبر ۵۰ اور ۶۶ کا حاشیہ نمبر ۲۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

(۳) حوالہ کے لئے سابقہ صفحہ نمبر: ۵۵ کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) ''ریزرو فنڈ'' کی زکوٰۃ پر حضرت والا دامت برکاتہم کا مستقل فتویٰ آگے ص: ۷۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔

بھی ملتا رہے گا، اس طرح دارالعلوم کی رقم کاروبار میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب :- اگر کاروبار میں نفع کا تقریباً یقین ہو تو فنڈ کی فاضل رقم اس میں لگانے کی گنجائش ہے، لیکن دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں، ایک یہ کہ اگر نقصان ہوگیا تو لگانے والے کو اپنی جیب سے بھرنا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ زکوٰۃ کی رقم کو زیادہ عرصہ تک کاروبار میں لگائے رکھنا ٹھیک نہیں ہے اسے جلد از جلد مستحقین کو پہنچانا ضروری ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۸/۱/۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۷۵/۵۸)

انکم ٹیکس کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی

سوال ۱:- جو لوگ انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں اور زکوٰۃ نہیں ادا کرتے ضرور خدا کے مجرم ہیں۔ اور اگر زکوٰۃ ادا کریں اور ٹیکس سے جان چھڑانا چاہیں تو حکومت چھوڑتی نہیں ہے۔ دونوں ادا کرتے ہیں تو زبردست مالی خسارہ اُٹھانا پڑتا ہے، کیا کیا جائے؟

جواب ۱:- انکم ٹیکس کا زکوٰۃ سے کوئی تعلق نہیں، زکوٰۃ عبادت اور اللہ کا حق ہے، اور انکم ٹیکس ایک حکومت کا ٹیکس ہے، لہٰذا ایک کی ادائیگی سے دوسرے کی ادائیگی نہیں ہوتی،[1] انکم ٹیکس کے لئے حقیقی سرمایہ کو چھپانے میں جب جھوٹ بولنا پڑے یا جھوٹی شہادت دینا پڑے تو وہ جائز نہیں۔

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۴/۱۱/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰۱/ ۱۸الف)

۱:- بغیر سلے ہوئے کپڑے پر زکوٰۃ کا حکم
۲:- صرف پانچ تولہ سونے پر زکوٰۃ کا حکم
۳:- ساڑھے باون تولہ چاندی کے بقدر نقدی پر زکوٰۃ کا حکم
۴:- زکوٰۃ کے لئے قمری سال کا اعتبار ہے

سوال ۱:- میں صاحب نصاب ہوں میرے پاس کچھ کپڑا بغیر سلا ہوا ایک سال سے زائد عرصہ سے پڑا ہوا ہے اس پر زکوٰۃ دی جانی چاہئے یا نہیں؟

(۱) دیکھئے سابقہ صفحہ نمبر ۶۷ کا حاشیہ نمبر۲۔

۲:- صرف ۵ تولہ سونا ہے، نقدی وغیرہ اور کچھ نہیں ہے کیا اس پر بھی زکوٰۃ دی جائے؟

۳:- زید کے پاس نہ سونا ہے نہ چاندی ہے، ہاں اتنی رقم ہے کہ جس سے ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جاسکتی ہے اس پر زکوٰۃ فرض ہوئی یا نہیں؟

۴:- مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ شمسی سال سے دو، مولانا زکریا صاحب لکھتے ہیں فضائل صدقات میں کہ قمری سال سے دو، کس کی بات مانیں؟

جواب ۱:- اگر یہ کپڑا بغرضِ تجارت نہیں لیا گیا تھا تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ (۱)

۲:- پانچ تولہ سونے کے ساتھ اگر ایک روپیہ کے برابر نقدی بھی ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور اتنی نقدی تو ہوتی ہی ہے۔ ہاں اگر واقعۃً ایک روپیہ کے برابر بھی نقدی نہ ہو تو بے شک صرف سونے پر زکوٰۃ اس وقت تک نہ ہوگی جب تک وہ ساڑھے سات تولے نہ ہو جائے۔ (۲)

۳:- جی ہاں فرض ہے۔

۴:- زکوٰۃ کے لئے قمری سال کا اعتبار ہے، **لقولہ تعالیٰ: یسئلونک عن الأھلة قل ھی مواقیت للناس والحج۔** (۳) عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں نیز بزرگانِ دین کے زمانے میں قمری سال ہی کے مطابق زکوٰۃ کا حساب ہوتا رہا ہے، اور اس پر اُمت کا اجماع ہے، جو صاحب شمسی سال سے زکوٰۃ کا حساب کرنے کے قائل ہوں وہ سخت غلطی پر ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۹/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۰۱/۲۹ ج)

کینیڈا میں مکان خریدنے والے مقروض شخص پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- مکرمی محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کینیڈا میں مکانوں کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی بیک وقت ادائیگی مشکل ہے اس لئے مجبوراً قرض پر مکان خریدنا پڑتا ہے اور یہ قرض قسطوں میں 30,25 سال میں ادا کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا صورت میں یعنی مکان کا قرضہ بھی ہر ماہ قسط کی صورت میں اداء ہو رہا ہے، اس کے

---

(۱) وفی رد المحتار کتاب الزکوٰۃ ج:۲ ص:۲۶۲ قولہ وفارغ عن حاجتہ الأصلیة .... وھی ما یدفع الھلاک عن الانسان تحقیقًا کالنفقة ودور السکنی وآلات الحرب والثیاب المحتاج الیھا لدفع الحر او البرد.

وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۴، ۲۶۵ (طبع سعید) ولا فی ثیاب البدن .... ودور السکنی ونحوھا .... اذا لم تنو للتجارة.

وفی الھدایة ج:۱ ص:۱۸۶ (مکتبہ شرکت علمیہ) ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن ....وسلاح الاستعمال زکوٰۃ .... الخ.

(۲) وفی البدائع کتاب الزکوٰۃ ج:۲ ص:۱۸ (طبع ایچ ایم سعید) فاما اذا کان لہ ذھب مفرد فلا شئ فیہ حتیٰ یبلغ عشرین مثقالاً، فاذا بلغ عشرین مثقالاً ففیہ نصف مثقال .... الخ.

(۳) سورۃ البقرۃ:۱۸۹ وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۹۴ (طبع سعید کراچی) وحولھا ای الزکوٰۃ قمری لا شمسی وسیجئی الفرق .... الخ، وفی الھندیة ج:۱ ص:۱۷۵ (مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) العبرۃ فی الزکوٰۃ للحول القمری .... الخ.

باوجود 5یا10 ہزار ڈالر جمع ہوگئے ہیں، کیا ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی؟ اور حج بھی فرض ہوگا؟

جواب:- اس رقم پر زکوٰۃ دینی چاہئے کیونکہ مکان کا قرض مؤجل ہے اور قرض مؤجل علی الاصح مانع وجوبِ زکوٰۃ نہیں، وعن ابی حنیفۃ لا یمنع وقال الصّدر الشهید لا روایة فیه ولکل من المنع وعدمه وجة زاد القهستانی عن الجواهر والصحیح انه غیر مانع (شامی ج:۲ ص:۵)۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵۰/۳۰ د)

بیمہ کمپنی میں جمع کرائی گئی رقم پر زکوٰۃ واجب ہے
کمپنی کے شیئرز پر زکوٰۃ واجب ہے

سوال:- بیمہ کمپنی میں جو مال جمع شدہ ہو اس پر ہر سال زکوٰۃ دی جائے گی؟ اگر اس پر زکوٰۃ ہے تو زکوٰۃ دیتے وقت اپنے مال میں اسے شمار کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- بیمہ کی جو رقم کمپنی میں لگی ہوئی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ہر سال زکوٰۃ ادا کرتے وقت اسے اپنے مال میں ضرور شمار کریں۔

سوال:- کسی کمپنی کے شیئرز خریدنے اگر جائز ہیں تو اس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

جواب:- کمپنی کے حصص خریدنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کا کاروبار جائز ہو اور حصص کی قیمت پر زکوٰۃ بھی واجب ہے۔[۲]

فقط واللہ اعلم
۱۳۸۸/۵/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۱۹ الف)

فروخت شدہ زمین کی رقم اور کمپنیوں کے حصص پر زکوٰۃ کا حکم
زکوٰۃ پورے سرمایہ پر لازم ہے یا صرف منافع پر؟

سوال ۱:- زرعی زمین فروخت کردی جائے اور روپے بینک میں رکھیں تو اس پر زکوٰۃ ہوگی یا کسی منافع بخش کاروبار میں لگانے سے زکوٰۃ لازم ہوگی؟

۲:- اگر زرعی زمین کی آمدنی پورے سال نہ رکھی جائے بلکہ خرچ کی جائے تو کیا اس پر زکوٰۃ

---

(۱) ج:۲ ص:۲۶۱ (طبع سعید)۔
(۲) شیئرز کی خرید وفروخت کی شرائط اور اس پر زکوٰۃ کے وجوب سے متعلق تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب "اسلام اور جدید معیشت وتجارت" صفحہ نمبر ۸۵ تا ۹۴، اور رسالہ "شیئرز کی خرید وفروخت کے احکام" ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

واجب ہوگی؟

۳:- اگر زرعی آمدنی حاصل ہونے کے بعد یہ رقم دورانِ سال کسی کمپنی کے حصص کی خرید پر لگادی جائے تو پورے سرمایہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا ان حصص کی سالانہ آمدنی (نفع) پر؟

۴:- اگر زرعی آمدنی کی رقم کسی تجارت میں لگادی جائے تو پورے سرمایہ پر زکوٰۃ ہوگی یا صرف سالانہ نفع پر اور اس نفع کا سال بھر ہمارے پاس رہنا ضروری ہے؟

جواب ۱:- نقد روپیہ کے بارے میں اُصول یہ ہے کہ سال کے اختتام پر جتنا روپیہ جمع ہے خواہ وہ کہیں سے حاصل ہوا ہو اس کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکال دیا جائے، زرعی زمینیں فروخت کرکے جو رقم حاصل ہوئی اس میں سے جو رقم اختتامِ سال پر موجود ہو اس پوری رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۲:- نمبر ۱ میں بتایا گیا ہے کہ سال کے ختم پر جتنی رقم ہو اس کی زکوٰۃ نکال دی جائے، جو رقم دورانِ سال خرچ ہوگئی اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

۳:- کمپنیوں کے حصص جتنی مالیت کے ہوں اتنی مالیت کو اور ان پر جو سالانہ منافع حاصل ہو ان کو نقد رقم میں شامل کرلیا جائے پھر مجموعے کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔[1]

۴:- پورے مالِ تجارت پر زکوٰۃ ہوگی[2] لیکن مالِ تجارت میں عمارت، دُکان، مشین، فرنیچر شامل نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۱۱/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۸/۲۱ الف)

قرضے سے زائد رقم بقدرِ نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں

سوال:- ایک شخص کے پاس بیس ہزار کا زیور ہے اور رہائشی مکان کی تعمیر کے سلسلے میں ستر ہزار کا مقروض ہے کیا یہ قرض ہوتے ہوئے اس کو اس بیس ہزار کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی اور اگر سونے کی قیمت قرض کی رقم سے زیادہ ہو تو پھر زکوٰۃ اور صدقہ فطر واجب ہوگا یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب تک اس کے پاس ستر ہزار سے بقدرِ نصاب زائد رقم یا زیور نہ ہو، اس پر زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر واجب نہیں۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۱۰ھ

(۱،۲) وفی الهندية ج: ۱ ص: ۱۷۵ (رشيديه كوئته) ومن كان له نصابًا فاستفاد في أثناء الحول مالًا من جنسه ضمه الى ماله وزكاه سواء كان المستفاد من نمائه اولا وبأى وجه استفاد ضمه .... الخ.

(۳) دیکھئے صفحہ نمبر ۵۱ کا حاشیہ نمبر ۵۔

کمپنی کے ریزروفنڈ پر زکوٰۃ کا حکم اور طریقہ

سوال: - محترمی ومکرمی حضرت العلام مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بعد سلام مسنون! اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر و عافیت ہوگا یہاں بحمد اللہ تعالیٰ سب بخیر و عافیت ہیں دُعا گو طالبِ دعا ہیں۔

ضروری گزارش یہ ہے کہ بنگلہ دیش میں اسلامی بینکوں کے نفع میں سے ایک معینہ حصہ قانوناً ریزروفنڈ (Reserve Fund) کے نام سے رکھا جاتا ہے اب اس ریزروفنڈ کی رقم پر ادائے زکوٰۃ واجب ہونے نہ ہونے پر یہاں کے علمائے کرام میں اختلاف ہو رہا ہے معدودے چند علماء کی رائے زکوٰۃ ادا کرنے کی طرف ہے جیسے بعض عرب علماء کی رائے ہے اس کے لئے بینک کو شخصِ قانونی قرار دے کر ادائے زکوٰۃ کو واجب کہا گیا ہے۔

دوسرے علمائے کرام کی رائے یہ ہے کہ زکوٰۃ عبادت ہے اس کے لئے عاقل، بالغ، مسلم ہونا ضروری ہے اس لئے نابالغ ومجانین کے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں اسی طرح ریزروفنڈ کی رقم پر بھی چونکہ مالکان کو تصرف کا قانوناً اختیار نہیں ہے اس لئے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

اس بارے میں حضرت محترم کی رائے سے مطلع ہونے کا خواہش مند ہوں۔ والسلام

مفتی عبد الرحمٰن

مرکز الفکر اسلامی بنگلہ دیش، گلشن ڈھاکہ

جواب: - مخدوم گرامی قدر حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آنجناب کا گرامی نامہ بینکوں کے ریزروفنڈ پر زکوٰۃ کے بارے میں موصول ہوا، میں اس وقت سفر پر تھا، اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی، معذرت خواہ ہوں۔

یہ مسئلہ صرف بینکوں کے ریزروفنڈ کا نہیں، بلکہ مشترک سرمائے کی تمام کمپنیوں کے ریزروفنڈ کا ہے، اس مسئلے پر جتنا کچھ بندہ نے غور کیا ہے، اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں:

ریزروفنڈ عرفاً وقانوناً کمپنی ہی کے اثاثوں کا حصہ ہے، جسے آئندہ کے خسارے وغیرہ کی تلافی کے لئے شرکاء نے تقسیم کرنے کی بجائے الگ کر کے رکھ لیا ہے، لیکن وہ انہی کی ملک ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے مملوک اموال کا کچھ حصہ الگ اُٹھا کر اس لئے رکھ دے کہ آئندہ جب کوئی

بیماری پیش آئے گی اس کو خرچ کرے گا، رہا یہ کہ جب تک کوئی رقم ریزروفنڈ کا حصہ ہے اس پر شرکاء کو تصرف کا اختیار نہیں ہوتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ پابندی خود شرکاء نے باہمی رضامندی سے لگائی ہے، اور وہ جب چاہیں حصہ داروں کی عمومی میٹنگ بلاکر اس شرط کو ختم کر سکتے ہیں، لہٰذا ان کا تصرف اس لحاظ سے برقرار ہے۔ نیز جب بھی کمپنی ختم ہوگی تو دوسرے اثاثوں کی طرح ریزروفنڈ کے اثاثے بھی انہی شرکاء پر تقسیم ہوں گے، نیز اگر کوئی شخص کمپنی کے ختم ہونے سے پہلے اپنا حصہ فروخت کرے گا تو اس کی قیمت میں ریزروفنڈ میں اس کا جو حصہ ہے وہ بھی منعکس ہوگا۔ لہٰذا ریزروفنڈ یقیناً حصہ داروں کی ملکیت ہے، اور قابلِ زکوٰۃ ہے۔

البتہ ائمہ ثلاثہ، خصوصاً امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق کمپنی پر خلطۃ الشیوع کی بنیاد پر بحیثیت کمپنی زکوٰۃ واجب ہے، لہٰذا وہ اپنے تمام قابلِ زکوٰۃ اثاثوں کی قیمت لگا کر اس پر زکوٰۃ ادا کرے گی جس میں ریزروفنڈ بھی شامل ہوگا۔

لیکن حنفیہ کے مسلک میں چونکہ خلطۃ الشیوع معتبر نہیں ہے لہٰذا کمپنی پر بحیثیت کمپنی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، بلکہ ہر حصہ دار کے اپنے حصے پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ہر حصہ دار اپنی وجوبِ زکوٰۃ کی تاریخ میں اپنے حصے کی بازاری قیمت معلوم کرے، پھر اگر اس نے وہ حصے فروخت کرنے کی نیت سے خریدے ہیں تو کل بازاری قیمت کا چالیسواں حصہ ادا کرے۔ چونکہ بازاری قیمت میں کمپنی کے تمام اثاثے بشمول ریزروفنڈ، منعکس ہوتے ہیں، اس لئے ریزروفنڈ کی زکوٰۃ الگ سے نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر فروخت کی نیت سے نہیں، بلکہ شرکت جاری رکھنے کے لئے خریدے ہیں، تو اسے یہ حق ہے کہ کمپنی کے ناقابلِ زکوٰۃ اثاثوں کا تناسب اپنے حصے کی کل بازاری قیمت سے منہا کرلے مثلاً کمپنی کے ناقابلِ زکوٰۃ اثاثے (عمارت، فرنیچر، گاڑیاں وغیرہ) اگر کل اثاثوں کا بیس فیصد ہیں تو وہ اپنے حصے کی بازاری قیمت میں سے بیس فیصد منہا کرسکتا ہے۔ ریزروفنڈ چونکہ قابلِ زکوٰۃ اثاثوں میں شامل ہے، اس لئے اسے ناقابلِ زکوٰۃ اثاثوں کے تناسب میں شامل کر کے منہا نہیں کیا جائے گا۔ واللہ سبحانہ اعلم

محمد تقی عثمانی

۱۴۲۵/۵/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶/۸۰ ۷)

مشترکہ دُکان میں سے اپنے حصے کی زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ

سوال:- مشترکہ دُکان کی زکوٰۃ ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ مثلاً ایک دُکان میں میرا حصہ ۳۵ پیسے ہے، اس کی زکوٰۃ ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟　　طلعت محمود (راولپنڈی)

جواب:- برادرعزیز ومکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محبت نامہ موصول ہوا، زکوٰۃ کے بارے میں آپ نے جو وضاحت طلب کی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اگر دُکان میں آپ کا حصہ صرف ۳۵ پیسے ہے، باقی کسی اور کا ہے تو آپ پر صرف ۳۵ پیسے کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔[1] باقی زکوٰۃ اس کے ذمہ ہوگی جو اس کا مالک ہے۔ واللہ اعلم

۳۰/۲/۱۴۰۴ھ[2]

دُکان کی زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ اور واجب الاداء وقابلِ وصول قرضوں اور نقد پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- میں اپنی دُکان کی زکوٰۃ کس طرح ادا کروں اور کب ادا کیا کروں؟ اور اس کے سامان کی قیمت کون سی لگاؤں؟ کچھ قرضے لوگوں نے مجھے دینے ہوتے ہیں، کچھ میں نے دینے ہیں، اور کتنی رقم ہونے پر زکوٰۃ ادا کروں؟ طلعت محمود (راولپنڈی)

جواب:- زکوٰۃ کا طریقہ یہ ہے کہ قمری حساب سے[3] جس تاریخ کو آپ نے دُکان قائم کی ہو اس کا محتاط اندازہ کرلیں، پھر ہر سال جب بھی وہ تاریخ آئے تو پہلے یہ دیکھیں کہ اس تاریخ کو نقد روپیہ کتنا موجود ہے؟ اور بیچنے کے لائق سامان کتنا ہے؟ اس کی ہول سیل قیمت لگالیں، پھر جتنی رقمیں دُوسروں کے ذمے واجب الادا ہیں وہ جوڑ لیں، ان تینوں چیزوں کی مجموعی قیمت لکھ لیں، پھر آپ کے اُوپر جو قرضے واجب ہیں وہ اس مجموعی قیمت میں سے منہا کرلیں۔[4] جو رقم باقی بچے، اگر وہ ۵۲½ تولہ چاندی کی قیمت کے برابر یا اس سے زائد ہو تو اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ نکال دیں۔[5]

دُعا میں یاد رکھنے کی درخواست ہے۔ والسلام واللہ اعلم

۱۲ربیع الاوّل ۱۴۰۷ھ[6]

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۵۹ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۲) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم نے ایک جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۷۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۴) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۵۱ کا حاشیہ نمبر۵۔

(۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۹ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۶) یہ جواب حضرت والا دامت برکاتہم نے خط کی صورت میں دیا۔

قرض پر وجوبِ زکوٰۃ کی تفصیل اور کس قسم کے قرض پر زکوٰۃ واجب ہے؟

سوال:- میرا کسی پر قرض ہے، لیکن اس مقروض کی طرف سے ادائیگی کا پتہ نہیں، دے گا یا نہیں؟ کیونکہ اب اس کی استطاعت شاید نہیں ہے، اگر وہ ادا کردے کبھی، تو کیا مجھے اس رقم کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟ اور اگر دینی ہوگی تو پچھلے تمام سالوں کی دینی ہوگی؟ طلعت محمود (راولپنڈی)

جواب:- جہاں سے رقم ملنے سے بالکل مایوسی ہوگئی ہو، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں،[1] اگر آئندہ کبھی مل جائے تو صرف اسی سال کی زکوٰۃ دینی ہوگی، جس سال ملی ہے۔ ہاں! اگر بالکل مایوسی نہ ہوئی ہو بلکہ دونوں احتمال ہوں کہ ملے یا نہ ملے تو اس کی زکوٰۃ مؤخر کرسکتے ہیں، لیکن جب ملے اس وقت پچھلے سالوں کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔[2]

واللہ اعلم

۱۴۱۴/۹/۱۸ھ[3]

(۱، ۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۶ کا جواب نمبر۱۲، و نمبر۱۳، اور اُس کا حاشیہ نمبر۱ تا ۵۔

(۳) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم نے ایک جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

﴿فصل فی صدقۃ الفطر﴾
(صدقہ فطر کے مسائل کا بیان)

چاول سے ''صدقۃ الفطر'' ادا کرنے کا طریقہ اور حکم

سوال:- حضرت والا کو جیسا کہ معلوم ہے کہ برمی اور بنگالی لوگوں کی خوراک چاول ہے لہٰذا ایک صاع گندم یا نصف صاع آٹے کی بجائے ایک صاع چاول درجہ اوّل یا نصف صاع چاول کا آٹا، فطرہ میں دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نصوص میں چاول کی مقدار وارد نہیں ہوئی، لہٰذا اگر چاول سے صدقۃ الفطر نکالنا ہو تو پہلے نصف صاع گندم کی قیمت معلوم کی جائے، اس کے بعد اس قیمت میں جتنے چاول آتے ہوں، اتنے چاول نکال دیئے جائیں، لما فی الدر المختار وما لم ینص علیہ کذرۃ وخبز یعتبر فیہ القیمۃ (شامی)۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۲۹/ ۲۷ و)

زکوٰۃ اور فطرہ میں فرق

سوال:- زکوٰۃ مقبولہ اور صدقہ فطر میں کیا فرق ہے؟

جواب:- زکوٰۃ سالانہ مالی فریضہ ہے اور صدقۃ الفطر خاص عید کے دن کا فریضہ ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۱۸ھ

صدقہ فطر کی مقدار

سوال:- ''حیات الاسلام'' نے صدقہ فطر فی کس دو روپیہ اعلان کیا ہے صحیح رقم کیا ہوتی ہے؟

جواب:- اصل میں فطرہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ہے، اس سال (۱۳۹۷ھ میں) پونے تین روپے تھی۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۲۴/ ۲۸ ج)

---

(۱) کتاب الزکوۃ باب صدقۃ الفطر ج: ۲ ص: ۳۶۴ (طبع سعید کراچی) نیز دیکھئے کفایت المفتی ج: ۴ ص: ۳۱۲ (جدید ایڈیشن دار الاشاعت)۔

(۲) وفی تنویر الابصار (طبع سعید) ج:۲ ص:۳۶۴ نصف صاع من بر او دقیقہ او سویقہ او زبیب وکذا فی الھندیۃ ج:۱ ص:۱۹۱.

صدقۂ فطر اور قربانی کے وجوب میں اپنے اور اپنے عیال کا نفقہ حوائجِ اصلیہ میں داخل ہے یا نہیں؟

سوال:- صدقۂ فطر یا قربانی واجب ہونے میں قوتِ نفس خود و عیال، حوائجِ اصلیہ میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر داخل ہے تو کتنے روز کا؟ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ''قوتِ یومیہ'' سے کیا مراد ہے؟

جواب:- اپنے اور اپنے عیال کا نفقہ بتصریح جمیع فقہاء حوائجِ اصلیہ میں داخل ہے، لیکن کتنے یوم کا نفقہ حوائجِ اصلیہ میں شمار ہوگا؟ اس کی تصریح فقہاءؒ کے کلام میں نہیں ملی۔

صدقۃ الفطر کے معاملے میں ایک دن سے زائد کا نفقہ حاجتِ اصلیہ میں شمار نہیں ہوگا۔ اور لفظِ ''قوت'' لغۃً بھی ''نفقۃ الیوم'' کے لئے بولا جاتا ہے، حنفیہؒ کی طرف سے وجوبِ صدقہ کے لئے ملکِ نصاب کی جو شرط عائد کی گئی ہے اس کی دلیل میں لا صدقة الّا عن ظهر غنًى، واليد العليا خيرٌ من اليد السفلىٰ کی حدیث ذکر کی گئی ہے (فتح القدیر ج:۲ ص:۳۱)۔[1]

اور حرمتِ سوال، قوتِ یوم کی موجودگی میں ثابت ہے، ويؤيّده ما فى الاشباه والنظائر الزكٰوة واجبة بقدرة ميسّرة فتسقط بهلاك المال بعد الحول وصدقة الفطر وجبت بقدرة ممكّنة فلو افتقر بعد يوم العيد لم تسقط. (الاشباه والنّظائر مع شرحه ج:۱ ص:۲۲۵ الفن الثانى)۔[2]

امامِ شافعیؒ کے نزدیک قوتِ یومیہ سے مراد مطلق ہے خواہ بغیر ملکِ نصاب کے ہو، لاستدلاله بحديث ابن عمرؓ عناية علىٰ هامش الفتح ج:۲ ص:۳۱۔[3]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۹ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۳/۱۹ الف)

---

(۱) ج:۲ ص:۲۱۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه)۔
(۲) (طبع ادارة القرآن كراچى)۔
(۳) عناية علىٰ فتح القدير ج:۲ ص:۲۱۹ (طبع رشيديه كوئٹه)۔

جس زمانے میں حکومت نے زکوٰۃ وعشر آرڈیننس کے نفاذ کا اعلان کیا تھا، اور اس آرڈیننس میں بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، اس پر غور کرنے کے لئے مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ کے تین اجلاس ہوئے، جن میں:

* حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب
مفتی ومہتمم دارالافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی۔
* حضرت مولانا مفتی محمد ولی حسن صاحبؒ
مفتی جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی۔
* حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
مفتی دارالعلوم کراچی۔
* حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب
اُستاذ وناظمِ تعلیمات جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی۔
* حضرت مولانا مفتی سحبان محمود صاحب
مفتی وشیخ الحدیث دارالعلوم کراچی ۱۴۔
* حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب
معین مفتی دارالعلوم کراچی ۱۴۔

شامل تھے، مجلس کی طرف سے جو متفقہ تحریر تیار کی گئی تھی وہ پیشِ خدمت ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکومت کا بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا شرعی حکم

(پہلا حصہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، اَمَّا بَعْدُ!

حکومتِ پاکستان نے سرکاری سطح پر زکوٰۃ اور عشر کی وصولی اور تقسیم کے لئے ایک آرڈیننس نافذ کیا ہے، جس کے ذریعے مسلمانوں پر واجب الاداء زکوٰۃ کا ایک حصہ حکومت وصول کرکے اس کی تقسیم کا انتظام کرے گی۔

زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام اسلامی حکومت کی ایک اہم ذمہ داری ہے، اور اگر حکومت یہ انتظام ٹھیک احکام کے مطابق قائم کرنے میں کامیاب ہوجائے تو یہ نفاذِ شریعت کی طرف ایک نہایت مثبت قدم ہوگا اور انشاء اللہ اس ملک کے مسلمان اس کی دنیوی اور اخروی برکات سے بہرہ ور ہوسکیں گے، لیکن اس نظام کو سرکاری سطح پر جاری کرتے وقت حکومت کو یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ نظامِ زکوٰۃ کا نفاذ اسلامی معیشت کے قیام کے لئے جتنا ضروری اور اہم ہے اتنا ہی نازک اور توجہ طلب بھی ہے، زکوٰۃ دوسرے محاصل یا ٹیکسوں کی طرح کوئی ٹیکس نہیں ہے، بلکہ یہ وہ عظیم الشان عبادت ہے جو اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک اہم رُکن قرار دی گئی ہے، لہٰذا اس میں عبادت اور اطاعتِ خداوندی کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

حکومت، زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام اپنے ذمے لے کر ایک ایسی گراں بار اور نازک ذمہ داری اپنے سر لے رہی ہے جو اس کے دینی جذبے، اس کے اخلاص اور اس کے حسنِ انتظام کے لئے ایک زبردست آزمائش اور امتحان کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں حکومت کو ایک طرف تو اس بات کا پورا لحاظ رکھنا ہوگا کہ کسی مسلمان کے ساتھ زکوٰۃ کی وصولی میں کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے، اور جتنی رقم

اس کے ذمے شرعاً واجب الاداء ہے اس سے ایک پائی بھی زائد وصول نہ ہو، کیونکہ حدیثِ پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

اَلْمُعْتَدِیْ فِی الصَّدَقَةِ كَمَانِعِهَا.(1)

یعنی زکوٰۃ وصول کرنے میں زیادتی کرنے والا ایسا ہی گنہگار ہے جیسے زکوٰۃ ادا نہ کرنے والا۔

اور دوسری طرف اس بات پر کڑی نظر رکھنی ہوگی کہ زکوٰۃ سے حاصل ہونے والی یہ مقدس رقوم ٹھیک شریعت کے مطابق اس کے صحیح مستحقین تک پہنچیں، اور اس میں کوئی خیانت، خورد برد، بدعنوانی یا شرعی احکام سے تجاوز نہ ہونے پائے، زکوٰۃ کے تقدس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے مصارف کا تعین انبیاء علیہم السلام پر بھی نہیں چھوڑا، بلکہ اسے بذاتِ خود قرآنِ کریم میں متعین فرمادیا ہے، چنانچہ جب تک زکوٰۃ کو ان مصارف پر صحیح طور سے خرچ کرنے کا اطمینان بخش انتظام نہ ہوجائے زکوٰۃ کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا، لہٰذا اگر حکومت زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم دونوں کا نظام صحیح طور سے مقرر کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو یہ اس کا ایک عظیم کارنامہ ہوگا، جس کی برکات ان شاء اللہ کھلی آنکھوں محسوس ہوں گی!

لیکن اگر خدانخواستہ زکوٰۃ کی ان مقدس رقوم کو مستحقین تک پہنچانے کا انتظام صحیح نہ ہوسکا تو کروڑوں مسلمانوں کی عبادت خراب ہونے کا وبال بھی حکومت پر دُنیا وآخرت میں بڑا سنگین ہوسکتا ہے، ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکومت کو اس کڑی آزمائش میں پورا اُترنے کی توفیقِ کامل عطا فرمائے اور اس نازک مرحلے کو اس کے لئے آسان فرمائے، آمین۔

لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ زکوٰۃ وعشر کا جو قانون نافذ کیا گیا ہے، وہ شرعی اعتبار سے درست ہو اور اس میں شرعی لحاظ سے کوئی سقم باقی نہ رہے، اور دوسرا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اس قانون کے مطابق عمل بھی درست ہو، جہاں تک قانون کا تعلق ہے مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ کے اجلاس میں حالیہ زکوٰۃ وعشر آرڈیننس پر غور کیا گیا اور شرعی نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لینے کے بعد مندرجہ ذیل تبصرہ اتفاقِ رائے کے ساتھ منظور کیا گیا۔

نصابِ زکوٰۃ

اس آرڈیننس کی سب سے زیادہ سنگین غلطی یہ ہے کہ اس میں ہر اس شخص پر زکوٰۃ کی

---

(۱) جامع الترمذی باب المعتدی فی الصدقة ج:۱ ص.۱۴۰ (طبع ایچ ایم سعید).

ادائیگی لازم کردی گئی ہے، جس کے بینک اکاؤنٹ میں زکوٰۃ منہا کرنے کے دن ایک ہزار روپے سے زائد رقم جمع ہو، اور بینکوں کے علاوہ دوسرے مالیاتی اداروں میں یہ ایک ہزار روپے کی قید بھی نہیں ہے، بلکہ ان اثاثوں کے حامل افراد کو ان کے اثاثوں کی مالیت کا لحاظ کئے بغیر لازمی طور پر زکوٰۃ کا مستوجب قرار دے دیا گیا ہے، یہ شرعی لحاظ سے انتہائی سنگین غلطی ہے، اور عملاً اس قانون سے بہت سے لوگوں کے ساتھ یہ زیادتی ہوسکتی ہے کہ ان پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہ ہونے کے باوجود ان سے زکوٰۃ وصول کرلی جائے۔

شریعت کی رُو سے زکوٰۃ صرف اس شخص پر فرض ہے جو نصاب یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی یا اتنی ہی مالیت کی نقدی یا سونے یا مالِ تجارت کا مالک ہو یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر اس کی ملکیت میں ہو، البتہ اگر کسی شخص کے پاس سونے کے سوا کوئی چیز موجود نہ ہو تو اس کا نصاب ساڑھے سات تولہ سونا ہے، پھر اگرچہ شرعاً زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر رقم پر علیحدہ سال پورا ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ سال کی ابتداء میں اور آخر میں کم از کم بقدرِ نصاب مالیت کا مالک رہا ہو، آرڈیننس میں زکوٰۃ کی ان بنیادی شرائط کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

لہٰذا اگر نظامِ زکوٰۃ کو واقعۃً شرعی اُصولوں کے مطابق قائم کرنا ہے تو آرڈیننس میں ایسی ترمیم ناگزیر ہے، جس کی رُو سے زکوٰۃ صرف انہی افراد سے وصول کی جاسکے جن کے ذمے شرعاً زکوٰۃ فرض ہے، اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ دفعہ ۲ ذیل ۲۳ میں ''صاحبِ نصاب'' کی جو تعریف لکھی گئی ہے یعنی:-

> صاحب نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کے ذمے اس آرڈیننس کی رُو سے زکوٰۃ واجب الاداء ہو۔

اسے تبدیل کرکے ''صاحبِ نصاب'' کی تعریف اس طرح کی جائے:-

''صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا سونا یا سامانِ تجارت ہو، یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ مل کر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو۔''

پھر ہر سال تاریخِ زکوٰۃ سے پہلے ساڑھے باون تولہ چاندی کی جو قیمت ہو اس کا اعلان کرکے اس کی قیمت کو وصولیٔ زکوٰۃ کا معیار مقرر کیا جائے، یعنی صرف ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے جن کی اتنی مالیت کی رقوم بینکوں یا دیگر مالیاتی اداروں میں جمع ہوں۔

سال گزرنے کا مسئلہ

زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مقدارِ نصاب پر پورا سال گزر چکا ہو، پورا سال گزرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص ایک مرتبہ صاحبِ نصاب ہوجائے اور سال کے اختتام پر صاحبِ نصاب رہے (درمیانِ سال اگرچہ نصاب سے کم رہ جائے، البتہ بالکل ختم نہ ہو) تو سال کے اختتام پر جتنی بھی رقم اس کی ملکیت میں ہوگی اس ساری رقم پر شرعاً زکوٰۃ واجب الاداء ہوتی ہے، خواہ اس رقم کا کچھ حصہ ایک دن پہلے ہی اس کی ملکیت میں آیا ہو، لہٰذا ہر ہر رقم پر سال گزرنا ضروری نہیں ہے۔

موجودہ آرڈیننس کے تحت ایسی صورتیں عملاً ممکن ہیں کہ جس تاریخ میں کسی شخص کے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ وضع کی جائے، اس سے صرف چندروز پہلے ہی وہ صاحب نصاب بنا ہو، ایسی صورت میں اس سال ایسے شخص سے جبراً زکوٰۃ وضع کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

لہٰذا آرڈیننس میں ایسی گنجائش موجود ہونی چاہئے کہ اگر کوئی شخص یہ ثابت کردے کہ اسے مقدارِ نصاب کا مالک بنے ہوئے سال پورا نہیں ہوا تو اس کی زکوٰۃ وضع نہ کی جائے!

قرضوں کا مسئلہ

آرڈیننس میں قرضہ جات کو قابلِ زکوٰۃ مالیت سے منہا کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی، اس سلسلے میں فقہائے اُمت کے مذاہب کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر طرح کے قرضے زکوٰۃ سے منہا کرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، امام شافعیؒ کا قدیم قول بھی یہی ہے، امام مالکؒ کے نزدیک قرضے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ سے مانع ہیں، اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ سے نہیں، اور امام شافعیؒ کا قولِ جدید یہ ہے کہ کسی بھی طرح کا قرض زکوٰۃ سے منہا نہیں ہوگا۔ (ملاحظہ ہو المجموع شرح المذہب ج:۵ ص:۳۱۳، ۳۱۴)۔[1]

موجودہ حالات ایسے ہیں کہ جس کسی شخص نے اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے کوئی قرض لیا ہو، اس کو زکوٰۃ سے منہا نہ کرنا اس شخص پر زیادتی ہوگی۔ البتہ یہ مسئلہ ہمیشہ اہلِ علم کے نزدیک زیرِ غور رہا ہے کہ آج کل بڑے بڑے سرمایہ دار اپنی پیداواری اغراض کے لئے جو قرضے لیتے ہیں، اگر ان سب کو منہا کیا جائے تو ان پر بعض صورتوں میں شاید کبھی بھی زکوٰۃ واجب نہ ہو، جو مقاصدِ شریعت کے بالکل خلاف ہے، اس لئے ایسے قرضوں کے بارے میں اگر امام شافعیؒ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ وہ زکوٰۃ سے منہا نہیں کئے جائیں گے تو یہ مناسب ہے۔

---

(۱) المجموع شرح المذهب (الشرح) الدين هل يمنع وجوب الزكوة فيه .... الخ ح:۵ ص:۳۴۴ طبع دار الفكر للطباعة.

۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۹۹ ہجری کو زکوٰۃ آرڈیننس کے جس مسودے کو رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے مشتہر کیا گیا تھا، اس میں بھی قرضوں کی منہائی کی گنجائش موجود تھی، اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ''مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ'' نے اس وقت بھی یہی رائے ظاہر کی تھی (ملاحظہ ہو ماہنامہ ''بینات'' جمادی الثانیہ ۱۳۹۹ھ صفحہ: ۸)۔

لہٰذا مجلس کی رائے میں نصاب، حولانِ حول اور قرضوں کے بارے میں تجاویز کو مدِنظر رکھتے ہوئے، آرڈیننس کی دفعہ ۳ مجوزہ ترمیم کے بعد اس طرح ہونی چاہئے:-

> آرڈیننس کے دُوسرے اَحکام کے تابع ہر مسلمان صاحبِ نصاب شخص سے شیڈول نمبر ا میں دی ہوئی تفصیل کے مطابق ہر سال زکوٰۃ کے اختتام پر لازماً زکوٰۃ وصول کی جائے گی، شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ تاریخِ زکوٰۃ کے دن اس کے قابلِ زکوٰۃ جملہ مملوکات کو نصاب کی مقدار تک پہنچے ہوئے پورا سال نہیں گزرا تو اس کے مذکورہ اثاثوں سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی، مزید شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ وہ مقروض ہے اور اس نے قرضہ کسی پیداواری غرض سے نہیں لیا تو اس کے قرضے کی رقم کو قابلِ زکوٰۃ رقم سے منہا کیا جائے گا۔

اموالِ ظاہرہ و باطنہ

بینک اکاؤنٹ اور دوسرے مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ منہا کرنے پر ایک علمی اشکال یہ ہے کہ فقہائے کرامؒ کی تصریح کے مطابق حکومت کو اموالِ ظاہرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہوتا ہے، اموالِ باطنہ سے نہیں، عام طور پر فقہاءؒ نے مفت چراگاہوں میں چرنے والے مویشیوں، کھیتوں اور باغات کی پیداوار اور اس مالِ تجارت کو جو شہر سے باہر لے جایا جارہا ہو، اموالِ ظاہرہ میں شمار کیا ہے اور نقدی، زیورات وغیرہ باقی تمام قابلِ زکوٰۃ اموال کو اموالِ باطنہ قرار دیا ہے بینک اکاؤنٹس چونکہ بصورتِ نقد ہوتے ہیں، اس لئے علمی طور پر یہ سوال قابلِ غور ہے کہ حکومت ان سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق رکھتی ہے یا نہیں؟

اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد مجلس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ:-

موجودہ دور میں بینک اکاؤنٹس کو اموالِ ظاہرہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

اس مسئلے کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے عہدِ مبارک میں اموالِ ظاہرہ و باطنہ کی کوئی تفریق نہیں تھی، بلکہ دونوں قسم کے

اموال سے زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی جاتی تھی، لیکن حضرت عثمان غنیؓ کے عہدِ خلافت میں جب قابلِ زکوٰۃ اموال کی کثرت ہوگئی اور آپ نے یہ محسوس فرمایا کہ اگر عاملینِ زکوٰۃ لوگوں کے گھروں اور دُکانوں میں پہنچ کر ان کی املاک کی چھان بین کریں گے تو اس سے لوگوں کو تکلیف ہوگی، اور اس سے ان کے مکانات، دُکانوں، گوداموں اور محفوظ شخصی مقامات کی نجی حیثیت مجروح ہوگی تو آپ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ صرف ان اموال کی زکوٰۃ حکومت کی سطح پر وصول کی جائے جن کی زکوٰۃ وصول کرنے میں یہ مضرّت لاحق نہ ہو، اور جن کا حساب کرنے کے لئے گھروں اور دُکانوں کی تلاشی نہ لینی پڑے، ایسے اموال اس زمانے میں صرف دو قسم کے تھے، یعنی مویشی اور زرعی پیداوار، چنانچہ صرف ان کی زکوٰۃ آپؓ نے سرکاری سطح پر وصول کرنے کا اعلان فرمایا اور باقی اموال کو اموالِ باطنہ قرار دے کر ان کی زکوٰۃ کی ادائیگی خود مالکان کی ذمہ داری قرار دے دی۔

بعد میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور آیا تو انہوں نے شہروں کے باہر ایسی چوکیاں مقرّر فرمائیں کہ جب کوئی شخص مالِ تجارت لے کر وہاں سے گزرے تو اس سے وہیں زکوٰۃ وصول کرلی جائے، اس موقع پر شہر سے باہر جانے والے مالِ تجارت کو بھی اموالِ ظاہرہ میں شمار کرلیا گیا، کیونکہ حکومت کو اس کی زکوٰۃ وصول کرنے اور اس کا حساب کرنے کے لئے مالکان کے گھروں، دُکانوں اور نجی مقامات کی تلاشی کی ضرورت نہیں تھی۔

مذکورہ بالا صورتِ حال کی وضاحت کے لئے حضرات فقہاء کرامؒ کی تصریحات درج ذیل ہیں:-

۱:- علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

ظاهر قوله تعالىٰ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (الأية) توجب حق اخذ الزكاة مطلقاً للامام، وعلى هذا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتان بعده، فلما ولى عثمانؓ وظهر تغير الناس كره ان تفتش السعاة على الناس مستور اموالهم، ففوض الدفع الى الملاك نيابة عنه، ولم تختلف الصحابةؓ عليه في ذلك، وهذا لا يسقط طلب الامام اصلاً، ولهذا لو علم أن اهل بلدة لا يؤدون زكاتهم طالبهم بها. (فتح القدير ج:۱ ص:۴۸۷)[۱]

۲:- امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

وقوله تعالىٰ: خذ من اموالهم صدقة، يدل على أن اخذ الصدقات إلى الامام وانه متى اداها من وجبت عليه الى المساكين لم يجزه، لان حق

(۱) طبع قديم مطبعة كبرى اميريه مصر

الامام قائم فی اخذها فلا سبیل له الی اسقاطه، وقد کان النبی صلی الله علیه وسلم یوجّه العمال علی صدقات المواشی ویأمرهم بأن یاخذوها علی المیاه فی مواضعها.

آگے تحریر فرماتے ہیں:-

اما زکوٰة الأموال فقد کانت تحمل الی رسول الله صلی الله علیه وسلم وابی بکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ ثم خطب عثمانؓ فقال "هذا شهر زکاتکم، فمن کان علیه دین فلیؤدّه، ثم لیزک بقیة ماله" فجعل لهم اداءها الی المساکین، وسقط من اجل ذلک حق الامام فی اخذها، لأنه عقد عقده امام من ائمة العدل، فهو نافذ علی الاُمة لقوله علیه السلام : ویعقد علیهم اولهم، ولم یبلغنا انه بعث سعاة علی زکاة الأموال کما بعثهم علی صدقات المواشی والثمار فی ذلک، لأن سائر الأموال غیر ظاهرة للامام، وانما تکون مخبوءة فی الدور والحوانیت والمواضع الحریزة ولم یکن جائزاً للسعاة دخول احرازهم ولم یجز ان یکلفوهم احضارها.

...... ولما ظهرت هذه الأموال عند التصرف بها فی البلدان اشبهت المواشی فنصب علیها عمالًا یأخذون منها ما وجب من الزکاة، ولذالک کتب عمر بن عبدالعزیزؒ الی عماله أن یأخذوا مما یمر به المسلم من التجارات من کل عشرین دینارا نصف دینار.

(احکام القرآن ج:۳ ص:۱۵۵، مطبوعه استنبول ۱۳۳۵ھ)[1]

۳:- فقہِ حنفی کی معروف کتاب الاختیار میں ہے:-

لأن الأخذ کان للإمام وعثمان رضی الله تعالیٰ عنه فوّضه الی الملاک وذلک لا یسقط حق طلب الامام، حتی لو علم ان اهل بلدة لا یؤدّون زکاتهم طالبهم بها ولو مر بها علی الساعی کان له اخذها.

(الاختیار ج:۱ ص:۱۰۰)[2]

۴:- اور صاحبِ ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:-

---

(۱) وکذا فی طبع سهیل اکیڈمی لاهور.

(۲) طبع مکتبه مصطفی البابی مصر.

ومن مر علی عاشر بمائة درهم واخبره ان له فی منزله مائة اخری وقد حال علیها الحول لم یزک التی مر بها لقلتها، وما فی بیته لم یدخل تحت حمایته. (فتح القدیر ج:۲ ص:۵۳۶)[۱]

فقہاءِ کرامؒ کی مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ نقد روپیہ اور سامانِ تجارت اس وقت تک اموال باطنہ رہتے ہیں جب تک وہ پوشیدہ نجی مقامات پر مالکان کے زیرِ حفاظت ہوں، ایسے اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے میں چونکہ ان نجی مقامات میں دخل اندازی کرنی پڑتی ہے، اس لئے انہیں حکومت کی وصولیابی سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، لیکن جب یہی اموال مالکان خود نجی مقامات سے نکال کر باہر لے آئیں، اور وہ حکومت کے زیرِ حفاظت آجائیں تو وہ اموالِ ظاہرہ کے حکم میں آجاتے ہیں، اور حکومت کو ان سے زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار ہوجاتا ہے، گویا کسی مال کے اموالِ ظاہرہ میں شمار ہونے کے لئے دو بنیادی امور ضروری ہیں:-

ایک یہ کہ وہ ایسے نجی مقامات پر رکھے ہوئے نہ ہوں جہاں سے ان کا حساب کرنے کے لئے نجی مقامات کی تفتیش کرنی پڑے، **کما فی العبارة الأولی والثانية**، اور دوسرے یہ کہ وہ حکومت کے زیرِ حفاظت آجائیں، **کما فی العبارة الرابعة**۔

اگر اس معیار پر موجودہ بینک اکاؤنٹس کا جائزہ لیا جائے تو ان میں یہ دونوں باتیں پوری طرح موجود ہیں، ایک طرف تو یہ وہ اموال ہیں جنہیں ان کے مالکان نے اپنی حرز (حفاظت) سے نکال کر خود حکومت پر ظاہر کردیا ہے، اور ان کے حساب میں نجی مقامات کی تفتیش کی ضرورت نہیں ہے، دوسرے یہ کہ یہ اموال حکومت کے زیرِ حمایت ہی نہیں، بلکہ زیرِ ضمانت آچکے ہیں، بالخصوص جبکہ بینک سرکاری ملکیت میں ہیں اور ان کو جو سرکاری تحفظ حاصل ہے وہ عاشر پر گزرنے والے اموال کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، اس لئے مجلس کی رائے یہ ہے کہ بینک اکاؤنٹس اور دوسرے مالیاتی اداروں میں رکھے ہوئے اموال، اموالِ ظاہرہ کے حکم میں ہیں اور حکومت ان سے زکوٰۃ وصول کرسکتی ہے۔

اور اگر بالفرض انہیں یا ان میں سے بعض کو اموالِ باطنہ ہی قرار دیا جائے تب بھی فقہائے کرامؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ جس علاقے کے لوگ ازخود زکوٰۃ ادا نہ کریں تو وہاں حکومت اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کا بھی مطالبہ کرسکتی ہے، جیسا کہ فتح القدیر اور الاختیار کی عبارتوں میں اس کی تصریح گزر چکی ہے اور یہی مسئلہ بدائع الصنائع جلد:۲ صفحہ:۷ میں بھی موجود ہے۔

---

(۱) فتح القدیر ج:۱ ص:۵۳۶ طبع مکتبہ کبریٰ امیریہ مصر۔

زکوٰۃ کی نیت کا مسئلہ

بینک اکاؤنٹس اور دیگر مالیاتی اداروں سے جبراً زکوٰۃ وضع کرنے کے بارے میں ایک دوسرا علمی اِشکال یہ ہوسکتا ہے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور دُوسری عبادتوں کی طرح اس کی ادائیگی میں بھی نیت ضروری ہے، لیکن جب مذکورہ اداروں میں جبراً زکوٰۃ وضع کی جائے گی تو اس میں مالکان کی طرف سے شاید نیت نہ ہوسکے؟

فقہائے کرامؒ کی تصریحات میں اس اِشکال کا بھی حل موجود ہے، اور وہ یہ کہ حکومت کو جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے، ان میں حکومت کا وصول کرلینا بذاتِ خود نیت کے قائم مقام ہوجاتا ہے، چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وفی مختصر الکرخی رحمه الله تعالیٰ اذا اخذها الامام کرها فوضعها موضعها اجزأ لان له ولایة اخذ الصدقات فقام اخذه مقام دفع المالک، و فی القنیة: فیه اشکال، لان النیة فیه شرط ولم توجد منه اھ قلت: قول الکرخی رحمه الله تعالیٰ فقام اخذه الخ یصلح للجواب، تامل.

(رد المحتار ج۲ ص۳۳۰)(۱)

بینک اکاؤنٹس کے قرض ہونے کی حیثیت

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر تیسرا شبہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بینکوں میں جو رقوم جمع کرائی جاتی ہیں، وہ فقہی اعتبار سے قرض کے حکم میں ہیں اور مقروض کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ وہ قرض خواہ کی رقم سے زکوٰۃ وصول کرلے۔

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرض بن جانے کے بعد تو یہ اموال مضمون ہونے کی بناء پر اور زیادہ سرکاری تحفظ میں آگئے ہیں، اس لئے قرض ہونے سے حکومت کے وصولیٔ زکوٰۃ کے حق پر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا، یہ بلا شبہ دَینِ قوی ہے، جس پر بالاتفاق زکوٰۃ فرض ہے، اور بینکوں کے سرکاری ملکیت ہونے کی وجہ سے یہ رقوم حکومت کے صرف علم ہی میں نہیں، بلکہ اس کے قبضے اور ضمانت میں آجاتی ہیں، اس لئے اگر حکومت ولایتِ عامہ کی بناء پر ان سے زکوٰۃ وضع کرلے تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

محتاط طریقہ

لیکن ''مجلس'' یہ سمجھتی ہے کہ بینک اکاؤنٹس اور دیگر مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا

---

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۲۹۰ (طبع ایچ ایم سعید).

محتاط طریقہ یہ ہوگا کہ جب کوئی شخص ان اداروں میں اپنی رقم رکھوانے کے لئے آئے تو وہ ایک فارم پُر کرے جس میں اس کی طرف سے متعلقہ ادارے کو یہ اختیار دیا گیا ہو کہ وہ تاریخِ زکوٰۃ آنے پر اس کی رقم سے زکوٰۃ منہا کر کے زکوٰۃ فنڈ میں دے دے، اس طرح یہ ادارے مالکان کی طرف سے باقاعدہ وکیل باداء الزکوٰۃ بن جائیں گے، پھر اس میں نہ اموالِ باطنہ کی بنیاد پر کوئی اِشکال باقی رہے گا، نہ نیت کی بنیاد پر، اور نہ اکاؤنٹس کے قرض ہونے کی بنیاد پر۔

سودی اکاؤنٹس اور زکوٰۃ

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر ایک اور خلجان بعض ذہنوں میں یہ رہتا ہے کہ یہ سودی اکاؤنٹس ہیں، اور سود اور زکوٰۃ دونوں کیسے جمع ہوسکتے ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اسلامی حکومت میں سودی کاروبار کا وجود اس کے ماتھے پر کلنک کا شرمناک ٹیکہ ہے اور بالخصوص زکوٰۃ کا نظام جاری کرنے کے بعد اس حرام و ناپاک ذریعۂ آمدنی کو باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے، لہٰذا یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ بعجلتِ ممکنہ مسلمانوں کو سودی نظام کی اس لعنت سے نجات دلائے۔

لیکن جہاں تک زکوٰۃ کی ادائیگی کا تعلق ہے فقہی اعتبار سے اگر کسی شخص کی آمدنی حلال وحرام سے مخلوط ہو اور وہ مجموعے پر سے زکوٰۃ نکال دے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ حلال آمدنی کا ڈھائی فی صد شرعاً زکوٰۃ ہوگا اور حرام آمدنی کا ڈھائی فی صد زکوٰۃ نہیں ہوگا، بلکہ وہ صدقہ سمجھا جائے گا جو حرام آمدنی سے جان چھڑانے کی غرض سے کیا جاتا ہے، اصل شرعی حکم یہ ہے کہ سود لینا حرام ہے، لیکن اگر کوئی شخص سود وصول کرلے تو وہ سارے کا سارا واجب التصدق ہے، اب اگر حکومت نے اس میں سے ڈھائی فی صد زکوٰۃ فنڈ میں دے دیا ہے (جبکہ زکوٰۃ فنڈ میں صدقاتِ نافلہ اور عطیات بھی شامل ہیں) تو مالکان پر شرعاً واجب ہے کہ باقی ماندہ سود بھی صدقہ کردیں نہ یہ کہ اس کی بناء پر اصل مال کی زکوٰۃ بھی ادا نہ کریں۔

مثال کے طور پر ایک شخص کے ایک ہزار روپے بینک میں جمع ہیں اور اس پر سو روپے سود کا اضافہ ہوگیا تو حکومت پورے گیارہ سو روپے پر ڈھائی فی صد کے حساب سے ساڑھے ستائیس روپے وصول کرے گی، ان ساڑھے ستائیس روپوں میں سے پچیس روپے تو اس شخص کے اصل ایک ہزار روپے کی زکوٰۃ ہے اور ڈھائی روپے زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ سود کی جو رقم پوری کی پوری صدقہ ہونی چاہئے تھی اس کا کچھ حصہ ہے، اگر یہ بھی زکوٰۃ فنڈ میں چلا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ اس کا مصرف بھی فقراء ہی ہیں۔

نابالغ کی زکوٰۃ

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وجوبِ زکوٰۃ کے لئے صاحبِ نصاب کا عاقل و بالغ ہونا شرط ہے، جبکہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک نابالغ اور فاتر العقل کے مال پر بھی زکوٰۃ لازم ہے، آرڈیننس میں چونکہ بالغ یا نابالغ کے اکاؤنٹس میں کوئی فرق نہیں کیا گیا اس لئے اس میں غالباً شافعی مسلک اختیار کیا گیا ہے، اور لوگوں کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر اگر ضرورت داعی ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

ترکے کا مال

البتہ بینک اکاؤنٹس میں بعض اموال ایسے ہو سکتے ہیں جو کسی مرحوم شخص کا ترکہ ہوں، چونکہ مرحوم کے انتقال کے ساتھ ہی ان اموال پر ورثاء کا حق ثابت ہو جاتا ہے اور ورثاء میں سے ہر ایک کا صاحبِ نصاب ہونا ضروری نہیں، اس لئے اس مال سے بھی زکوٰۃ وصول کرنا دُرست نہیں ہوگا، لہٰذا آرڈیننس میں یہ استثناء بھی ہونا چاہئے کہ:

> جو شخص زکوٰۃ وضع کرنے کے دن انتقال کر چکا ہو، اس کے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ وضع نہیں کی جائے گی۔

کمپنیاں اور شیئرز

آرڈیننس میں ''کمپنیوں'' کو بھی صاحبِ نصاب قرار دیا گیا اور کمپنیوں کے حصص کو بھی شیڈول نمبر (۱) میں درج کر کے ان سے زکوٰۃ وضع کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر کمپنی کے بینک اکاؤنٹ سے بحیثیت فردِ قانونی الگ زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور اس کمپنی کے حصہ داروں سے ان کے حصص پر الگ زکوٰۃ وصول ہوگی، اگر واقعہ یہی ہے تو یہ طریقہ شریعت کے خلاف ہے، کیونکہ اس میں ایک ہی مال سے سال میں دو مرتبہ زکوٰۃ وصول ہونے کا احتمال ہے جو کسی طرح جائز نہیں، لہٰذا اگر کمپنیوں سے زکوٰۃ وصول کی جارہی ہے تو حصہ داروں سے الگ زکوٰۃ وصول نہ کی جائے، اور اگر حصہ داروں سے وصول کی جارہی ہے، تو کمپنیوں سے وصول نہ کی جائے، ان دونوں صورتوں میں سے مجلس کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ حصص پر وصول کی جائے۔

عشر بصورت نقد

آرڈیننس میں عشر کا بھی ایک حصہ لازماً وصول کرنے سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، مثلاً بارانی زمینوں کی پیداوار کا پانچ فی صد اور اس کے علاوہ ہر قسم کی زمینوں میں کاشت کار کا حصہ مستثنیٰ رکھا گیا،

لیکن ساتھ ہی یہ تصریح کردی ہے کہ ان پر شرعاً عشر واجب ہے جسے مالکان اپنے طور پر ادا کریں گے، اس حکم میں شرعاً کوئی خرابی نہیں، البتہ آرڈیننس کی دفعہ ۵ ذیل ۵ میں صراحت کی گئی ہے کہ عشر بصورتِ نقد وصول کیا جائے گا، صرف گندم اور دھان کے بارے میں یہ استثناء رکھا گیا ہے کہ اگر صوبائی زکوٰۃ کونسل چاہے تو اسے بصورتِ جنس وصول کرلے۔

مجلس کی رائے میں یہ حصہ بھی لائقِ ترمیم ہے کیونکہ شرعاً عشر کو بصورتِ نقد ادا کرنا لازم نہیں بلکہ شریعت نے اس میں مالکِ پیداوار کی سہولت کو ملحوظ رکھا ہے، لہٰذا یہ پابندی ختم کرکے اس معاملے کو مالکِ پیداوار کی صوابدید پر چھوڑنا چاہئے۔

چوتھائی پیداوار کا عشر سے استثناء

آرڈیننس میں زرعی پیداوار کے چوتھائی حصے کو اخراجات کی مد میں عشر سے مستثنیٰ کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے، اگرچہ بعض ائمہ کے اقوال اس قسم کے منقول ہیں کہ زرعی پیدوار کے چوتھائی حصے کو اخراجات کی مد میں سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے (ملاحظہ ہو فتح الباری، باب خرص التمر ج:۳ ص:۳۴۷)[1] لیکن فقہائے حنفیہ اور اکثر فقہاء کے مسلک میں یہ چھوٹ نہیں ہے، لہٰذا اگر حکومت یہ چوتھائی حصہ لازمی وصولی سے مستثنیٰ کرنا چاہتی ہے تو ساتھ ہی یہ اعلان بھی کرنا چاہئے کہ اس حصے کا عشر مالکان خود ادا کریں۔

تاریخِ زکوٰۃ

موجودہ آرڈیننس کے مطابق ہر زکوٰۃ کا سال یکم رمضان المبارک سے شروع ہوکر شعبان کے آخری دن پر ختم ہوگا، اور یہ بات اطمینان بخش ہے کہ شریعت کے مطابق زکوٰۃ کی تقسیم کے لئے ہجری سال کو اختیار کیا گیا ہے، لیکن مختلف اثاثوں کی قیمت لگانے کے لئے شیڈول نمبر (۱) میں مختلف تاریخیں مقرر کی گئی ہیں، یہ صورت حال شرعاً درست نہیں ہے، شرعی صورت یہ ہے کہ جب کوئی شخص صاحبِ نصاب بن جائے تو اس کی ہر رقم کے لئے الگ سال شمار نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کے تمام اثاثوں کے لئے زکوٰۃ کے وجوب کی ایک ہی تاریخ ہوتی ہے، لہٰذا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تمام اثاثوں میں قیمت لگانے کی تاریخ ایک ہی رکھی جائے۔

البتہ اس قیمت کی بنیاد پر زکوٰۃ وضع کرنے کی تاریخیں مختلف اثاثوں کے لحاظ سے مختلف ہوسکتی ہیں۔

---

(۱) فتح الباری باب خرص التمر ج:۳ ص:۳۴۳ الی ص ۳۴۷ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور۔

قیمتی پتھروں اور مچھلیوں کی زکوٰۃ

آرڈیننس کے شیڈول نمبر (۲) میں ان اشیاء کی فہرست دی گئی ہے جن پر حکومت لازماً زکوٰۃ وصول نہیں کرے گی، بلکہ مالکان پر بطورِ خود ان کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، اس فہرست میں قیمتی پتھروں اور مچھلیوں پر بھی زکوٰۃ عائد کی گئی ہے حالانکہ ان دونوں اشیاء پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں ہے جب تک تجارت کی نیت سے انہیں خریدا نہ گیا ہو، لہٰذا ان دونوں اشیاء کو اس شیڈول سے خارج کرنا چاہئے، کیونکہ بہ نیتِ تجارت خریداری کی صورت میں ''اموالِ تجارت'' میں شامل ہوجائیں گے، جن کا ذکر شیڈول نمبر (۲) میں موجود ہے۔

مصارفِ زکوٰۃ

مصارفِ زکوٰۃ کے بیان میں آرڈیننس میں براہِ راست فقراء کو زکوٰۃ پہنچانے کے ساتھ مختلف اداروں کے توسط سے فقراء کی امداد کا بھی ذکر ہے، اس میں یہ وضاحت ہونی چاہئے کہ:

ہر صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی مستحقِ زکوٰۃ کو باقاعدہ مالک بنا کر کی جائے گی۔

یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ آرڈیننس کے اُردو ترجمے سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ مذکورہ ادارے اسے تعمیر اور عملے کی تنخواہوں پر صرف کرسکیں گے، جو شرعاً جائز نہیں، انگریزی متن اگرچہ نسبۃً بہتر ہے، لیکن اس میں بھی یہ وضاحت ضروری ہے۔

خلاصۂ تجاویز برائے حکومت

۱:- صاحبِ نصاب کی موجودہ تعریف کی جگہ حسبِ ذیل تعریف لکھی جائے:-

صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ، سونا یا سامانِ تجارت ہو یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ مل کر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو۔

پھر ہر سال تاریخِ زکوٰۃ سے پہلے ساڑھے باون تولہ چاندی کی جو قیمت ہو اس کا اعلان کرکے اس قیمت کو وصولیٔ زکوٰۃ کا معیار مقرّر کیا جائے، یعنی صرف ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے جن کی اتنی مالیت کی رقوم بینکوں یا دیگر مالیاتی اداروں میں جمع ہوں۔

۲:- آرڈیننس کی دفعہ نمبر (۳) میں ترمیم کرکے اس کو اس طرح بنایا جائے:-

آرڈیننس کے دوسرے احکام کے تابع ہر مسلمان صاحبِ نصاب شخص سے شیڈول نمبر (۱) میں دی ہوئی تفصیل کے مطابق زکوٰۃ ہر سال کے اختتام پر لازماً

وصول کی جائے گی۔

شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ تاریخِ زکوٰۃ کے دن اس کی قابلِ زکوٰۃ جملہ مملوکات کو نصاب کی مقدار تک پہنچے ہوئے پورا سال نہیں گزرا تو اس کے مذکورہ اثاثوں سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی۔

مزید شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ وہ مقروض ہے اور اس نے قرضہ کسی پیداواری غرض سے نہیں لیا ہے تو اس کے قرضے کی رقم کو قابلِ زکوٰۃ رقم سے منہا کیا جائے گا۔

مزید شرط یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں باضابطہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے ذریعہ یہ ثابت ہوجائے کہ وہ زکوٰۃ وضع کرنے کی تاریخ میں انتقال کرچکا تھا تو بھی اس کے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ وضع نہیں کی جائے گی۔

۳:- بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں میں رقم رکھوانے والوں سے ایک وکالت نامہ تحریر کرایا جائے جس میں وہ متعلقہ مالی اداروں کو یہ اختیار دے دیں کہ تاریخِ زکوٰۃ آنے پر وہ ادارہ ان کی طرف سے زکوٰۃ وضع کر کے زکوٰۃ فنڈ میں جمع کرادے۔

۴:- کمپنیوں اور ان کے حصص پر الگ الگ زکوٰۃ وصول نہ کی جائے، بلکہ اگر کمپنیوں سے وصول کی جارہی ہے تو حصص پر الگ الگ زکوٰۃ وصول نہ کی جائے، اور اگر حصص پر وصول کی جارہی ہے تو کمپنیوں سے وصول نہ کی جائے، ان دونوں صورتوں میں سے بہتر یہ ہے کہ حصص پر وصول کی جائے۔

۵:- عشر کے بصورتِ نقد وصول کرنے کی پابندی ختم کی جائے، بلکہ یہ امر مالکِ پیداوار پر چھوڑا جائے کہ وہ چاہے تو بصورتِ جنس ادا کرے اور چاہے تو بصورتِ نقد۔

۶:- ہر زرعی پیداوار میں سے چوتھائی حصہ جو حکومت بطورِ منہائی اخراجات چھوڑ رہی ہے، اس کے بارے میں یہ اعلان کیا جائے کہ اس حصے کا عشر مالکان خود ادا کریں۔

۷:- شیڈول نمبر (۱) کے تمام اثاثوں کے لئے قیمت مقرر کرنے کی تاریخ (ویلیویشن ڈیٹ) ایک ہی مقرر کی جائے اور مختلف اثاثوں کے لئے مختلف تاریخیں نہ رکھی جائیں، البتہ زکوٰۃ وضع کرنے کی تاریخیں مختلف اثاثوں کے لحاظ سے مختلف ہوسکتی ہیں۔

۸:- قیمتی پتھروں اور مچھلیوں کو شیڈول نمبر (۲) سے خارج کیا جائے۔

۹:- شیڈول نمبر (۲) میں مویشیوں کی زکوٰۃ کی شرح بیان کرتے ہوئے پانچ سے پچیّس اُونٹ تک کی شرح بہت مجمل ہے، جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پانچ سے پچیّس اُونٹوں تک ایک

اُونٹ واجب ہے، اس کی اصلاح کرکے واضح طور پر لکھنا چاہئے کہ پانچ سے پچیّس اُونٹوں تک ہر پانچ اُونٹوں پر ایک بکری واجب ہوگی۔

۱۰:- مصارفِ زکوٰۃ میں یہ وضاحت کی جائے کہ ہر صورت میں مستحقِ زکوٰۃ کو زکوٰۃ کا مالک و قابض بنایا جائے گا اور ادارے یہ رقمیں تعمیرات اور اساتذہ کی تنخواہوں میں صرف نہیں کرسکیں گے۔

یہ چند تجاویز ہیں، جو آرڈیننس کے فوری مطالعے سے سامنے آئیں۔

﴿وَلَعَلَّ اللہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا﴾

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

دستخط

- حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب
  مفتی و مہتمم دار الافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی
- حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
  مفتی و مہتمم دار العلوم کراچی ۱۴
- حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب
  خادم دار الافتاء دار العلوم کراچی ۱۴
- حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب
  مفتی جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
- حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر صاحب
  استاذ و ناظم تعلیمات جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی
- حضرت مولانا مفتی سحبان محمود صاحب
  دار العلوم کراچی ۱۴
- حضرت مولانا مفتی عبد الرؤف صاحب
  نائب مفتی دار العلوم کراچی ۱۴

***

بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ کا مسئلہ
(دوسرا حصہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، اَمَّا بَعْدُ!

''مجلس تحقیق مسائل حاضرہ'' نے اپنے ۲۱رشعبان ۱۳۹۹ھ کے اجلاس میں زکوٰۃ وعشر آرڈیننس پر تبصرہ کرتے ہوئے جو تحریر مرتب کی تھی، اسے اظہارِ رائے کے لئے ملک بھر کے معروف اہلِ فتویٰ علماء کی خدمت میں بھیج دیا گیا تھا، الحمدللہ! ان میں سے اکثر کے جوابات موصول ہوگئے، مندرجہ ذیل حضرات نے اس تحریر پر اصل مسئلے میں کسی ترمیم کے بغیر مجلس کی آراء سے اتفاق کرتے ہوئے تصدیقی دستخط ثبت فرمادیئے:-

۱:- شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب، مہتمم دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک۔
۲:- حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب، مفتی ومہتمم مدرسہ قاسم العلوم، ملتان۔
۳:- حضرت مولانا مفتی عبدالحکیم صاحب، مفتی مدرسہ اشرفیہ، سکھر۔
۴:- حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم، مہتمم جامعہ فاروقیہ ڈرگ کالونی، کراچی (آپ نے نیت کے مسئلے میں قدرے تردّد فرمایا، اور باقی اُمور سے اتفاق فرمایا)۔
۵:- حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ صاحب، مہتمم جامعہ رشیدیہ، ساہیوال۔
۶:- حضرت مولانا مفتی محمد سعید صاحب، مفتی مدرسہ مطلع العلوم، بروری روڈ، کوئٹہ۔
۷:- حضرت مولانا فضل محمد صاحب، مہتمم مدرسہ مظہر العلوم، مینگورہ، سوات۔
۸:- حضرت مولانا مفتی محمد وجیہ صاحب، مفتی دارالعلوم الاسلامیہ، ٹنڈو الہ یار، سندھ۔
۹:- حضرت مولانا مفتی محمد خلیل صاحب، مدرسہ اشرف العلوم، باغبان پورہ، گوجرانوالہ۔
۱۰:- حضرت مولانا حبیب الحق صاحب، مدرس مدرسہ اشرف العلوم، باغبان پورہ گوجرنوالہ۔
۱۱:- حضرت مولانا قاضی سعداللہ صاحب، رکن مجلسِ شوریٰ قلات ڈویژن، مستونگ بلوچستان (وحال رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)
۱۲:- حضرت مولانا قاضی بشیر احمد صاحب، دارالافتاء راولاکوٹ، آزاد کشمیر۔
۱۳:- حضرت مولانا مقبول الرحمٰن صاحب قاسمی، دارالافتاء راولاکوٹ، پونچھ، آزاد کشمیر۔

۱۴:- حضرت مولانا عبداللہ صاحب، ناظم دارالعلوم تعلیم القرآن، باغ، پونچھ آزاد کشمیر۔

۱۵:- حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب خطیب جامع مسجد باغ، پونچھ، آزاد کشمیر۔

ان حضرات کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات نے مجلس کی تحریر پر مفصل یا مختصر تبصرہ تحریر فرمایا، اور اس کے بعض نکات سے اختلاف بھی فرمایا:-

۱:- حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی، مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور۔

۲:- حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب، مفتی خیر المدارس، ملتان۔

۳:- حضرت مولانا عبدالشکور صاحب ترمذی، دارالعلوم حقانیہ، ساہیوال ضلع سرگودھا۔

۴:- حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر، مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔

ان حضرات میں سے بعض نے کچھ تو مجلس کی تحریر کی چند فروگزاشتوں پر مجلس کو متنبہ فرمایا، جس پر مجلس ان حضرات کی تہ دل سے ممنون ہے، وہ فروگزاشتیں درج ذیل ہیں:-

۱:- مجلس کی تحریر میں ''حولانِ حول'' کی شرط کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا گیا تھا کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لئے یہ ضروری ہے کہ مالِ نامی ''بقدر نصاب'' سارے سال کسی شخص کی ملکیت میں موجود رہا ہو، حالانکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر سال کے اوّل و آخر میں نصاب کامل ہو اور اثناء حول میں ناقص ہوجائے تب بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، مجلس کی تحریر سابق میں یہاں نقص[1] رہ گیا تھا، اب اس عبارت کو مجلس کی طرف سے کالعدم سمجھا جائے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لئے کامل نصاب کا سارے سال ملکیت میں رہنا ضروری ہے۔

۲:- صاحبِ نصاب کی تعریف سابقہ تحریر میں اس طرح کی گئی تھی:-

> صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی ہو یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا سونا یا سامانِ تجارت ہو یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو۔

اس تعریف میں اس صورت کا حکم بیان سے رہ گیا تھا جس میں کسی شخص کے پاس صرف سونا ہی سونا ہو، چاندی یا نقدی بالکل نہ ہو[2] ایسی صورت میں سونے کا نصاب یعنی ساڑھے سات تولہ سونا

(۱) جس کی وجہ یہ ہوئی کہ عباراتِ فقہاء میں مطلقاً مال نامی کو نصاب سے تعبیر کر کے قدرِ معہود کو ''نصاب کامل'' اور اس سے کم کو نصاب ناقص کہتے ہیں، بوقت تحریر لفظ ''نصاب'' پر نظر رہی اور ''بقدر'' کا لفظ سہواً تحریر میں آگیا، مقصد یہ ہے کہ مالِ نامی سارے سال موجود رہا ہو، مگر سال کے طرفین میں نصاب کا کامل ہونا شرط ہے، اگرچہ درمیان میں ناقص رہ گیا ہو۔

(۲) اس صورت کا حکم اگرچہ تعریف میں درج ہونے سے رہ گیا تھا، مگر تعریف سے پہلے کی عبارت میں اس کی صراحت کردی گئی تھی۔

(حواشی از حضرت والا دامت برکاتہم) مرتب۔

شرعاً معتبر ہوتا ہے، چنانچہ اس فروگزاشت پر متنبہ ہونے کے بعد مجلس نے صاحبِ نصاب کی مجوزہ تعریف میں تبدیلی کر کے اسے اس طرح کر دیا ہے:-

زرعی پیداوار اور مویشیوں کے علاوہ دیگر قابلِ زکوٰۃ اموال میں صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ (۶۱۲٫۳۵ گرام) چاندی یا ساڑھے سات تولہ (۸۷٫۴۸ گرام) سونا یا ان دونوں میں سے کسی کی قیمت کے برابر روپیہ یا سامانِ تجارت ہو یا مذکورہ بالا اشیاء میں سے بعض کا یا سب کا مجموعہ مل کر سونے یا چاندی کے وزنِ مذکور کی قیمت کے برابر ہو جائے۔

مجلس نے اس ترمیم شدہ تعریف سے اسلامی نظریاتی کونسل کو بھی مطلع کر دیا تھا، چنانچہ اب حکومت نے جو نیا ترمیم شدہ زکوٰۃ آرڈی ننس ۱۹۸۰ء نافذ کیا ہے، اس میں بفضلہ تعالیٰ اس کی روشنی میں ترمیم کر دی گئی ہے[1] (ملاحظہ ہو زکوٰۃ وعشر ترمیمی آرڈیننس ۱۹۸۰ دفعہ ۳ ذیل الف)۔

۳:- مجلس کی تحریر میں لکھا گیا تھا کہ شہر سے باہر جانے والے اموالِ تجارت سے زکوٰۃ وصول کرنے لئے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے چوکیاں مقرر فرمائی تھیں، اس سے تأثر یہ ہوتا تھا کہ ان چوکیوں کا یہ سلسلہ سب سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے شروع فرمایا تھا، حالانکہ یہ بات دُرست نہیں، واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے ہی میں ان چوکیوں پر زکوٰۃ وصول کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، (ملاحظہ ہو مبسوط وکتاب الآثار وغیرہ)۔[2]

یہ تو چند جزوی فروگزاشتیں تھیں، لیکن مذکورہ چاروں حضرات نے بنیادی طور پر جس مسئلے سے اختلاف فرمایا ہے یا جس پر اپنے تردّد کا اظہار کیا ہے وہ بینک اکاؤنٹس یا دوسرے مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وضع کرنے کا مسئلہ ہے، اس سلسلے میں ان حضرات کے دلائل یا شبہات پر مجلس نے دوبارہ غور کیا، لیکن غور وتحقیق کے بعد اس مسئلے میں مجلس کی رائے تبدیل نہیں ہوئی، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے۔

بینک اکاؤنٹس اور دیگر مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے پر جن شبہات کا اظہار کیا گیا ہے، بنیادی طور پر وہ تین شبہات ہیں:-

۱:- حکومت کو صرف اموالِ ظاہرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے، اموالِ باطنہ سے زکوٰۃ

---

(۱) نئے آرڈیننس میں مجلس کی دُوسری بیشتر تجاویز بھی شامل کر لی گئی ہیں، مثلاً حولانِ حول کی شرط، میت کے ترکے کو مستثنیٰ کرنے کی شرط، تمام اثاثوں کے لئے ایک ویلویشن ڈیٹ کی تجویز وغیرہ۔ (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم)

(۲) المبسوط للسرخسی ج:۲ ص:۱۹۹ (طبع دار المعرفة بيروت). (مرتب)

وصول کرنے کا حق حکومت کو نہیں، بلکہ مالکان پر ان کی زکوٰۃ کی ادائیگی اپنے طور پر فرض ہے اور نقود چونکہ اموالِ باطنہ میں سے ہیں، اس لئے بینک اکاؤنٹس بھی اموالِ باطنہ میں سے ہوئے، ان سے حکومت کو زکوٰۃ وصول کرنے کا حق نہیں ہے۔

۲:- بینک اکاؤنٹس درحقیقت بینک کے ذمے اکاؤنٹ ہولڈروں کا قرض ہے، جب یہ رقم مالک نے بینک کو دے دی تو وہ اس کی ملکیت سے نکل گئی، اور بینک کی ملکیت میں داخل ہوگئی، اب اصل مالک پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ بینک سے اس کو واپس وصول کرے گا، اس سے پہلے جو زکوٰۃ بینک اکاؤنٹس سے وضع کی جارہی ہے وہ وجوبِ ادا سے پہلے ایک ایسے مال سے وصول کی جارہی ہے جس پر زکوٰۃ واجب الاداء نہیں، اور جو اکاؤنٹ ہولڈر کی ملکیت نہیں ہے، لہٰذا اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

۳:- زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے ادا کنندہ کا نیت کرنا ضروری ہے اور بینک اکاؤنٹس میں سے زکوٰۃ وضع کرتے وقت مالک کی نیت بسا اوقات نہیں ہوتی۔

ان تینوں مسائل پر قدرے تفصیل کے ساتھ ذیل میں بحث کی جاتی ہے۔

﴿واللہ سبحانہ الموفق﴾

اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ

جیسا کہ ''مجلس'' کی تحریرِ سابق میں امام ابوبکر جصاصؒ اور دوسرے فقہائے کرامؒ کی تصریحات کے حوالے سے عرض کیا گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہدِ مبارک میں اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی کوئی تفریق نہیں تھی، بلکہ ہر قسم کے قابلِ زکوٰۃ اموال سے سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی، لیکن حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں جب اموال اور آبادی کی کثرت ہوگئی اور اندیشہ ہوا کہ لوگوں کے نجی مکانات وغیرہ میں زکوٰۃ کے کارندوں کی مداخلت سے لوگوں کو تکلیف ہوگی، اور اس سے فتنے پیدا ہوں گے تو آپؓ نے صرف اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ کی تحصیل سرکاری سطح پر باقی رکھی اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کی ادائیگی میں مالکان کو حکومت کا نائب بنادیا۔

حضرات فقہائے کرامؒ کی تصریحات کی روشنی میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ کسی مال کے ''اموالِ ظاہرہ'' میں سے ہونے کے لئے دو اُمور ضروری ہیں:-

ایک یہ کہ ان اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مالکان کے نجی مقامات کی تفتیش کرنی نہ پڑے۔

دوسرے یہ کہ وہ اموال، حکومت کے زیرِ حمایت ہوں، پھر عرض کیا گیا تھا کہ بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں میں رکھوائی ہوئی رقموں میں یہ دونوں اُمور موجود ہیں، لہٰذا ان کو ''اموالِ ظاہرہ'' میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

اس پر بعض حضرات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ کسی مال کے ظاہر ہونے کی اصل علت "خروج من المصر" ہے، چونکہ اس دور میں شہر کے ناکوں پر حکومت کی طرف سے عاشر اس لئے بٹھائے جاتے تھے کہ وہ گزرنے والوں کی جان و مال کی حفاظت کریں، اس لئے شہر سے نکل کر تمام اموال حکومت کے زیرِ حمایت آجاتے تھے، اور اس بناء پر حکومت ان کی زکوٰۃ وصول کرتی تھی، نجی مقامات کی تلاشی وتفتیش کی ضرورت نہ ہونا اس حکم کی حکمت ہے، علت نہیں، لہٰذا حکم کا مدار "خروج من المصر" پر ہوگا اور چونکہ یہ علت بینکوں اور مالیاتی اداروں میں نہیں پائی جاتی، اس لئے ان کو اموالِ ظاہرہ میں داخل کرکے ان سے سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنا دُرست نہیں۔

مجلس نے اس نقطۂ نظر پر مکرّر غور کیا، اور اس مسئلے میں فقہ اور حدیث کے متعلقہ مواد کو سامنے رکھا، لیکن غور وتحقیق کے بعد یہ نتیجہ سامنے آیا کہ سرکاری سطح پر زکوٰۃ کی وصولی کے لئے "خروج من المصر" کو علت قرار دینا اور اس پر حکم کا مدار رکھنا دُرست نہیں، بلکہ اصل علت وہی ہے کہ وہ اموال ایسے ہوں جن سے زکوٰۃ کی وصولی کے لئے نجی مقامات کی تفتیش کی ضرورت نہ ہو، اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:-

حدیث اور فقہ کی کتابوں سے یہ بات ثابت ہے کہ حضراتِ خلفائے راشدینؓ اور بعد کے خلفاء واُمراء سالانہ تنخواہوں اور وظائف کی تقسیم کے وقت انہی تنخواہوں اور وظائف سے زکوٰۃ کاٹ لیا کرتے تھے، اور اس پر صحابہؓ وتابعینؒ اور دوسرے فقہاء نے نہ صرف یہ کہ کوئی نکیر نہیں فرمائی، بلکہ اس طریقے کی تصدیق وتائید فرمائی ہے، چنانچہ مؤطا امام مالکؒ میں روایت ہے:-

قال القاسم بن محمد: وکان ابوبکر الصدیقؓ اذا اعطی الناس اعطیاتھم سأل الرجل: ھل عندک من مال وجبت علیک فیہ الزکاۃ؟ فان قال نعم اخذ من عطاءہ زکاۃ ذلک المال، وان قال: لاء، سلم الیہ عطاءہ ولم یأخذ منہ شیئًا.

(مؤطا امام مالکؒ ص:۱۰۳ و۱۰۴ الزکاۃ فی العین من الذھب والورق[1] ومصنف ابن ابی شیبۃ ج:۳ ص:۱۸۴ ما قالوا فی العطاء اذا اخذ[2] ومصنف عبدالرزاق ج:۴ ص:۸۲[3] (کتاب الاموال لأبی عبید ص:۴۱۱)[4]

ترجمہ:- حضرت قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ جب

---

(۱) مؤطا امام مالکؒ ص:۲۷۲ (طبع نور محمد کتب خانہ). (۲) طبع ادارۃ القرآن کراچی.
(۳) طبع مجلس علمی کراچی. (۴) کتاب الأموال لأبی عبیدؒ الجزء الثالث ص:۴۱۶ دار الکتب العلمیہ بیروت.

لوگوں کو (بیت المال سے ملنے والی) تنخواہ یا وظائف دیتے تو ہر شخص سے پوچھتے کہ کیا تمہارے پاس کوئی ایسا مال ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہو؟ اگر وہ کہتا کہ ہاں تو اس کی تنخواہ سے اس مال کی زکوٰۃ لیتے، اور اگر وہ کہتا کہ "نہیں" تو اس کی تنخواہ پوری دے دیتے، اور اس میں سے کچھ نہ لیتے۔

اور امام ابوعبیدؒ نے اس روایت کے یہ الفاظ نقل فرمائے:-

فان اخبره ان عنده مالا قد حلت فيه الزكاة قاصه مما يريد ان يعطيه، وان اخبره ان ليس عنده مال قد حلت فيه الزكاة سلم اليه عطاءه.

(كتاب الأموال لأبي عبيد ص: ۴۱۱ فقره: ۱۱۲۵ باب فروض زكاة الذهب والورق)[1]

ترجمہ:- اگر وہ شخص یہ بتاتا کہ اس کے پاس ایسا مال ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہوچکی ہے تو جو تنخواہ آپ اسے دینا چاہتے اس میں سے زکوٰۃ کاٹ لیتے تھے، اور اگر وہ بتاتا کہ اس کے پاس ایسا مال نہیں ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہوگئی ہو تو اس کی تنخواہ اسے پوری دے دیتے تھے۔

نیز امام ابن ابی شیبہؒ نے حضرت عمرؓ کا یہ معمول نقل فرمایا ہے:-

عن عبدالرحمن بن عبدالقاری، وكان على بيت المال في زمن عمر مع عبيدالله بن الارقم: فاذا خرج العطاء جمع عمرؓ اموال التجارة، فحسب عاجلها وآجلها، ثم يأخذ الزكاة من الشاهد والغائب.

(مصنف ابن ابی شیبہ ج:۳ ص:۱۸۴)[2]

ترجمہ:- عبدالرحمٰن بن عبدالقاریؒ جو حضرت عمرؓ کے دور میں عبیداللہ بن ارقم کے ساتھ بیت المال پر مقرر تھے، فرماتے ہیں کہ جب (سالانہ) تنخواہوں کی تقسیم کا وقت آتا تو حضرت عمرؓ تمام اموالِ تجارت کو جمع فرما کر ان کے نقد اور اُدھار کا حساب فرماتے، پھر حاضر اور غائب ہر طرح کے مال سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے۔

اور امام ابوعبیدؒ نے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمائی ہے:-

فكان اذا خرج العطاء جمع اموال التجار، ثم حسبها شاهدها وغائبها، ثم

(۱) كتاب الأموال لأبي عبيدؒ، الجزء الثالث ص: ۴۱۶ دارالكتب العلميه بيروت.
(۲) طبع ادارة القرآن كراچی.

اخذ الزکاۃ من شاھد المال علی الشاھد والغائب.

(کتاب الأموال ص: ۴۲۵ فقرہ: ۱۱۷۸ باب الصدقۃ فی التجارات والدیون)[1]

ترجمہ:- جب تنخواہوں کی تقسیم ہوتی تو حضرت عمرؓ تمام تاجروں کے اموال جمع فرماکر اس میں سے حاضر و غائب سب کا حساب فرماتے، پھر موجود مال سے حاضر و غائب ہر طرح کے مال کی زکوٰۃ وصول فرماتے۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے اس روایت کے راویوں کی تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ:-

و سندہ حسن.

(اعلاء السنن ج: ۱۲ ص: ۴۳۰ کتاب السیر باب العطاء یموت صاحبہ بعد ما یستوھبہ)[2]

یعنی اس روایت کی سند حسن ہے۔

پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے دور میں اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی کوئی تفریق نہ تھی، اس لئے وہ ہر قسم کے اموال سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ، جنہوں نے یہ تفریق قائم فرمائی تھی، ان کے دور میں بھی تنخواہوں سے زکوٰۃ وضع کرنے کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا، چنانچہ مؤطا امام مالکؒ میں مروی ہے:-

عن عائشۃ بنت قدامۃ عن أبیھا أنہ قال: کنت اذا جئت عثمان بن عفانؓ اقبض عطائی، سألنی ھل عندک من مالک وجبت فیہ الزکاۃ؟ قال فان قلت: نعم، أخذ من عطائی زکاۃ ذلک المال، وان قلت: لا، دفع الیّ عطائی. (مؤطا امام مالکؒ ص: ۱۰۴[3] و مصنف عبدالرزاق ج: ۴ ص: ۷۷[4] حدیث: ۷۰۲۹ و کتاب الأم للشافعیؒ ج: ۲ ص: ۱۴، طبع بولاق، و کتاب الأموال لأبی عبیدؒ ص: ۴۱۲ فقرہ: ۱۱۲۷)[5]

ترجمہ:- عائشہ بنت قدامہ اپنے والد کا قول نقل فرماتی ہیں کہ جب میں حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس اپنی تنخواہ وصول کرنے جاتا تو وہ مجھ سے پوچھتے کہ کیا تمہارے پاس کوئی مال ایسا ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہو؟ چنانچہ اگر میں یہ کہتا کہ

---

(۱) کتاب الأموال لأبی عبیدؒ الجزء الثالث ص ۴۳۰ (دارالکتب العلمیہ بیروت).

(۲) اعلاء السنن ج: ۱۲ ص: ۵۶۱ (طبع ادارۃ القرآن کراچی).

(۳) مؤطا امام مالکؒ کتاب الزکوۃ، الزکوۃ فی العین من الذھب والورق ص: ۲۷۲ (طبع نور محمد کتب خانہ).

(۴) طبع مجلس علمی کراچی

(۵) ص: ۴۱۲ الجزء الثالث (دارالکتب العلمیہ بیروت).

''ہاں'' تو میری تنخواہ سے اس مال کی زکوٰۃ وصول فرما لیتے، اور میں کہتا کہ ''نہیں'' تو میری تنخواہ مجھے دے دیتے۔

نیز بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے زمانے میں بھی تنخواہ سے زکوٰۃ وضع کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا، البتہ ان کے بارے میں یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ صرف ان لوگوں کے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے، جن کی تنخواہیں یا وظائف بیت المال سے جاری ہوں، دوسرے لوگوں کی نہیں، حضرت معاویہؓ کا بھی یہی عمل تھا۔ (مؤطا امام مالک صفحہ:۲۷۳)[1] اور حضرت ابن عباسؓ وابن عامرؓ بھی اسی کے قائل تھے (حاشیہ مؤطا امام مالک صفحہ:۲۷۳)۔[2]

نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ وہ تنخواہیں تقسیم کرتے وقت خود تنخواہ کی زکوٰۃ بھی اسی تنخواہ میں سے وصول فرما لیتے تھے، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہؒ میں ہے:-

عن هبيرة قال: كان ابن مسعودؓ يزكي عطياتهم من كل الف خمسة وعشرين. (مصنف ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۱۸۴)[3]

ترجمہ:- حضرت ہبیرۃ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ لوگوں کی تنخواہوں کی زکوٰۃ (اس حساب سے) وصول فرمایا کرتے تھے کہ ہر ہزار پر پچیس وصول کر لیتے تھے۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے اس روایت کے راویوں کی تحقیق فرمانے کے بعد فرمایا ہے کہ:-

فالاسناد حَسَنٌ. (اعلاء السنن ج:۱۲ ص:۴۲۹، ۴۳۰)[4]

یعنی یہ سند حسن ہے۔

البتہ چونکہ یہاں زکوٰۃ ان تنخواہوں کی وصولی کی جاتی تھی، جو صاحبِ تنخواہ کی ملکیت میں قبضہ کرنے کے بعد آتی ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ پہلے تنخواہ دے دیتے، پھر اس سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، چنانچہ مصنف عبدالرزاق میں ہے:-

عن هبيرة بن يريم عن عبدالله بن مسعودؓ قال: كان يعطي ثم يأخذ زكاته.

(مصنف عبدالرزاق ج:۴ ص:۷۸ حديث: ۷۰۳۶ باب لا صدقة في مال حتى يحول عليه الحول)[5]

(۱، ۲) ص:۲۷۳ (طبع نور محمد کتب خانہ).

(۳) طبع ادارة القرآن كراچی.

(۴) اعلاء السنن كتاب السير باب العطاء يموت صاحبه بعد ما يستوجبه ج:۱۲ ص:۵۵۹ طبع ادارة القرآن كراچی.

(۵) طبع مجلس علمي. (محمد زبیر حق نواز)

ترجمہ:- ہبیرۃ بن یریم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ تنخواہ دے دیتے پھر اس کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔

اور معجم طبرانیؒ میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

كان يعطي العطاء ثم يأخذ زكاته. (۱)

اور علامہ نورالدین ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے:-

رجاله رجال الصحيح، خلا هبيرة، وهو ثقة. (۲)

نیز امام ابوعبیدؒ نے اس روایت کو زیادہ تفصیل اور وضاحت سے نقل فرمایا ہے:-

عن هبيرة بن يريم قال: كان عبدالله بن مسعودؓ يعطينا العطاء في زبل صغار، ثم يأخذ منه الزكاة. (كتاب الأموال ص:۴۱۲ فقره: ۱۱۲۸ باب فروض زكاة الذهب والفضة) (۳)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہمیں چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں تنخواہ دیتے پھر اس سے زکوٰۃ وصول فرماتے۔

تنخواہوں اور وظائف سے زکوٰۃ وصول کرنے کا سلسلہ خلفائے راشدینؓ کے بعد بھی جاری رہا، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہؒ میں روایت ہے:-

عن ابن عون عن محمد قال: رأيت الامراء اذا اعملوا العطاء زكوه.

(مصنف ابن ابی شیبہؒ ج:۳ ص:۱۸۵) (۴)

ترجمہ:- ابن عون حضرت محمدؒ (غالبا ابن سیرینؒ) کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے اُمراء کو دیکھا کہ جب وہ تنخواہ دیتے تو اس کی زکوٰۃ وصول کر لیتے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں اگرچہ اموالِ ظاہرہ و باطنہ کی تفریق قائم ہو چکی تھی، لیکن ان کے بارے میں بھی مروی ہے:-

عن عمر بن عبدالعزيز انه كان يزكي العطاء والجائزة.

(مصنف ابن ابی شیبہؒ ج:۳ ص:۱۸۵) (۵)

ترجمہ:- حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے کہ وہ تنخواہوں اور انعامات سے

(۱،۲) مجمع الزوائد للهيثميؒ، باب أخذ الزكوة من العطاء ج:۳ ص:۶۸ دار الكتاب العربي بيروت.
(۳) الجزء الثالث ص:۴۱۷ دار الكتب العلميه بيروت.
(۴) طبع ادارة القرآن كراچى
(۵) ايضاً.

زکوٰۃ وصول فرماتے تھے۔

اور مصنف عبدالرزاق میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

عن جعفر بن برقان ان عمر بن عبدالعزیز کان اذا اعطی الرجل عطائه او عمالته أخذ منه الزکاة. (مصنف عبدالرزاق ج:۴ ص:۷۸، فقرہ: ۷۰۳۲)(۱)

ترجمہ:- جعفر بن برقانؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب کسی شخص کو اس کا وظیفہ یا اس کی اُجرت دیتے تو اس سے زکوٰۃ وصول فرمالیتے تھے۔

یہ معاملہ صرف تنخواہوں اور وظائف کی حد تک محدود نہیں تھا، بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال پر جس کسی مسلمان کا کوئی مالی حق ہوتا تو اس کی ادائیگی کے وقت اس کی زکوٰۃ وصول کرنے کا معمول قرونِ اُولیٰ میں جاری تھا، چنانچہ مصنف ابنِ ابی شیبہؒ اور سننِ بیہقیؒ میں مروی ہے:-

عن عمرو بن میمون قال: اخذ الوالی فی زمن عبدالملک مال رجل من اهل الرقة یقال له ابوعائشة عشرین الفا فادخلت فی بیت المال، فلما ولی عمر بن عبدالعزیز اتاه ولده، فرفعوا مظلمتهم الیه فکتب الی میمون: ادفعوا الیهم اموالهم وخذوا زکاة عامهم هذا، فلولا انه کان مالا ضمارا اخذناه منه زکاة ما مضیٰ. (مصنف ابن ابی شیبۃ ج:۳ ص:۲۰۲ طبع ادارۃ القرآن کراچی (ما قالوا) فی الرجل یذهب له المال السنین واخرجه ایضا البیهقی فی السنن الکبریٰ ج:۴ ص:۱۵۰)

ترجمہ:- عمرو بن میمون فرماتے ہیں کہ عبدالملک(۲) کے زمانے میں اہلِ رقہ کے ایک شخص ابوعائشہ سے ایک گورنر نے زبردستی بیس ہزار وصول کرکے بیت المال میں داخل کردیئے تھے، جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو اس شخص کے لڑکوں نے آکر دادرسی چاہی، اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے میمون کو لکھا کہ: ان کو ان کے اموال دے دو اور اس سے اس سال کی زکوٰۃ وصول کرلو، اس لئے کہ اگر یہ مالِ ضمار نہ ہوتا تو ہم اس سے پچھلے سالوں کی زکوٰۃ بھی وصول کرتے۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے اس حدیث کی سند کی تحقیق فرما کر ثابت فرمایا ہے

---

(۱) طبع مجلس علمی کراچی۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ کے مطبوعہ نسخے میں عبدالملک لکھا ہے، لیکن دوسرے نسخے میں اور دوسری کتابوں میں ولید بن عبدالملک کا ذکر ہے اور وہی صحیح ہے۔ (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ)

کہ اس کے رجال ثقات ہیں اور سند متصل ہے۔ (اعلاء السنن ج:۹ ص:۹ باب لازکاۃ فی المال الضمار)[1]

نیز یہی واقعہ اجمالی طور پر دوسری سند سے مؤطا امام مالکؒ میں بھی مروی ہے، اور اس میں بھی ایک سال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا ذکر موجود ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:-

ان عمر بن عبدالعزیز کتب فی مال قبضه بعض الولاۃ ظلما یأمر برده الی اهله، وتؤخذ زکاته لما مضی من السنین، ثم عقب بعد ذلک بکتاب: لا تؤخذ منه الزکاۃ الا زکاۃ واحدۃ، فانه کان ضمارا۔

(مؤطا امام مالکؒ ص:۱۰۷ الزکاۃ فی الدین)[2]

ترجمہ:- حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک ایسے مال کے بارے میں جس پر بعض حکام نے ظلماً قبضہ کرلیا تھا، تحریر فرمایا کہ وہ مال اس کے مالکوں کو واپس کردیا جائے، اور اس کی پچھلے سالوں کی زکوٰۃ بھی وصول کی جائے، لیکن اس کے بعد ایک اور خط بھیجا کہ اس سے صرف ایک سال کی زکوٰۃ وصول کی جائے، پچھلے سالوں کی نہیں، کیونکہ وہ مالِ ضمار تھا۔

ان تمام واقعات میں نقد روپے کی زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی گئی، اور وہ بھی عاشر پر گزرنے کی صورت میں نہیں، اور نہ مال کے شہر سے باہر ہونے کی حالت میں، بلکہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل تو یہ تھا کہ وہ تنخواہیں جاری کرتے وقت ان اموال کی زکوٰۃ تنخواہ سے کاٹ کر باقی تنخواہ لوگوں کے حوالے کیا کرتے تھے، اور حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ انہی تنخواہوں کی زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، کیونکہ اگر مالک پہلے سے صاحبِ نصاب ہوتو تنخواہ کی اس رقم پر مال مستفاد ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب ہوتی تھی، البتہ یہ حضرات تنخواہوں سے زکوٰۃ کاٹنے کے بجائے پہلے تنخواہ حوالہ فرمادیتے، پھر مالک سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، بہر صورت! اس نقد رقم سے سرکاری طور پر زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی، اور یہ سلسلہ اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی تفریق قائم ہونے کے بعد بھی جاری رہا، بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان رقوم سے بھی زکوٰۃ وصول فرمائی جو بیت المال میں ظلماً داخل کردی گئی تھیں۔

اس طریقِ کار سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ کسی مال کے اموالِ ظاہرہ میں شمار

---

(۱) اعلاء السنن ج:۹ ص:۱۲، ۱۳ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔

(۲) مؤطا امام مالکؒ "الزکوۃ فی الدین" ص:۲۸۴ طبع نور محمد کتب خانہ، اور اس مطبع کے نسخہ میں لا تؤخذ منه الزکوۃ کے بجائے الا تؤخذ منه .... الخ ہے جو غلط ہے، صحیح عبارت وہ ہے جو اوجز المسالک کے حوالہ سے حضرت والا دامت برکاتہم نے اوپر تحریر فرمائی ہے۔ (محمد زبیر)

ہونے اور اس سے سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے اس کا شہر سے باہر لے جانا ضروری نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے نجی مقامات کی تلاشی یا تفتیش کی ضرورت پیش نہ آئے، اور وہ فی الجملہ حکومت کے زیرِ حفاظت آگئے ہوں۔

تنخواہوں وغیرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا یہ طریقہ اس دور میں بھی بلانکیر جاری رہا ہے، اور خود فقہائے حنفیہؒ نے بھی ان واقعات کو نقل کر کے اس کی تصدیق و تائید فرمائی ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کا تنخواہوں اور وظائف سے زکوٰۃ وصول کرنا خود امام محمدؒ نے بھی نقل فرمایا ہے اور لکھا ہے:-

قال القاسم: وكان ابوبكرؓ اذا اعطى الناس اعطياتهم سئل الرجل هل عندك من مال قد وجبت فيه الزكاة؟ فان قال: نعم، اخذ من عطاءه زكاة ذلك المال، وان قال: لا، سلم اليه عطاءه. قال محمد: وبهذا نأخذ، وهو قول ابی حنيفةؒ. (مؤطا امام محمدؒ ص: ۱۷۰ باب الرجل يكون له الدين هل عليه فيه الزكاة؟)[1]

اور اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کے بارے میں عائشہ بنت قدامہؓ کی وہ روایت نقل کی ہے جو پیچھے مؤطا امام مالک کے حوالے سے گزر چکی ہے۔

نیز علامہ ابن ہمامؒ اور شمس الائمہ سرخسیؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مذکورہ بالا واقعہ جس میں غصب شدہ مال کو واپس کرتے ہوئے اس سے زکوٰۃ وصول کرنے کا ذکر ہے، ذکر فرما کر اس سے مالِ ضمار پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کے مسئلے میں استدلال فرمایا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مال سے ایک سال کی جو زکوٰۃ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے وصول فرمائی، وہ حنفیہ کے نزدیک بھی معمول بہ ہے، ورنہ وہ اس کی تردید یا توجیہ فرماتے۔

بلکہ امام طحاویؒ کی ایک عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کے بارے میں بھی حنفیہ کے نزدیک امام کو مکمل اختیار ہے کہ وہ چاہے تو ان کی زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے مصدق بھیج کر سرکاری سطح پر ان کی زکوٰۃ وصول کرے، اور چاہے تو مالکوں کے حوالے کر دے کہ وہ اپنے طور پر زکوٰۃ ادا کر دیں چنانچہ انہوں نے شرح معانی الآثار میں ایک مستقل باب قائم فرمایا ہے: باب الزكاة يأخذها الامام ام لا؟ اور اس میں اپنی عادت کے مطابق دونوں نقطۂ نظر بیان فرمانے کے بعد آخر میں لکھا ہے:-

---

(۱) المؤطا للامام محمدؒ ص: ۱۷۴ طبع قديمی كتب خانه.

واما وجهه، من طريق النظر فانا قد رأيناهم انهم لا يختلفون ان للإمام أن يبعث الى ارباب المواشي السائمة حتى يأخذ منهم صدقة مواشيهم اذا وجبت فيها الصدقة وكذلك يفعل في ثمارهم يضع ذلك في مواضع الزكوات على ما أمره به عزوجل، لا يأبى ذلك أحد من المسلمين، فالنظر على ذلك أن يكون بقية الأموال من الذهب والفضة وأموال التجارات كذلك .... و هذا كله قول أبي حنيفةؒ وابي يوسفؒ ومحمدؒ.

(شرح معانی الآثار للطحاویؒ ج:۱ ص:۲۶۳، ۲۶۴)[1]

ترجمہ:- قیاس ونظر کے لحاظ سے بھی اس مسئلے میں صورتِ حال یہ ہے کہ علماء کا اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مفت چراگاہوں میں چرنے والے مویشیوں کے مالکان کے پاس بھیج کر ان کے مویشیوں کی زکوٰۃ وصول کرے جبکہ ان پر زکوٰۃ واجب ہو، اسی طرح ان کے پھلوں میں بھی یہ حق حاصل ہے، پھر وہ حاصل شدہ زکوٰۃ کو مصارفِ زکوٰۃ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے بموجب صرف کرے، اس بات سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرسکتا، لہٰذا نظر و قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ باقی اموال، سونا چاندی اور مالِ تجارت کا بھی یہی حکم ہو......اور یہ سب کچھ امام ابوحنیفہؒ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے۔

یہاں امام طحاویؒ نے کسی قید وشرط کے بغیر امام کا یہ حق بیان فرمایا ہے کہ وہ سونا، چاندی اور مالِ تجارت سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مصدق بھیج سکتا ہے، یہاں انہوں نے مصر یا غیرِ مصر کی بھی کوئی شرط نہیں لگائی، اور نہ عاشر کے پاس گزرنے کا کوئی ذکر فرمایا ہے، امام طحاویؒ کی عبارت کا یہ اطلاق فقہائے حنفیہ کی دوسری تصریحات سے بظاہر معارض معلوم ہوتا ہے، اور مذکورہ بالا عبارت کے سیاق وسباق میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ان کی یہ ساری گفتگو ما مرّ علی العاشر سے متعلق ہو، لیکن جہاں تک مذکورہ عبارت کا تعلق ہے، اس میں کوئی قید یا شرط نہیں ہے، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ امام طحاویؒ کا مقصد یہ ہے کہ ان اموالِ باطنہ سے بھی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حنفیہ کے نزدیک اصلاً امام کو ہے، البتہ اس مصلحت کے پیشِ نظر جو حضرت عثمان غنیؓ کے پیشِ نظر تھی کہ جہاں لوگوں کے نجی مقامات کی تلاشی یا پڑتال کی ضرورت پڑتی ہو، وہاں مالکوں کو خود زکوٰۃ ادا کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے اور جہاں یہ مصلحت داعی نہ ہو، وہاں وہ اپنے اصل حق کے مطابق زکوٰۃ وصول کرسکتا ہے، چونکہ

---

(۱) شرح معانی الآثار للطحاویؒ ج:۱ ص:۳۴۴ (طبع مکتبہ حقانیہ ملتان)

عاشر پر گزرنے والے اموال میں اس قسم کا کوئی مفسدہ نہیں ہے، اس لئے وہ اپنے اصل حق کے مطابق ان سے زکوٰۃ وصول کرسکتا ہے، اور اگر کچھ مزید اموال ایسے ہوں جن سے زکوٰۃ وصول کرنے میں یہ مفسدہ نہ ہو، وہاں بھی امام کا اصل حق عود کر آئے گا، اور وہ ان اموال سے زکوٰۃ وصول کر سکے گا، جس کی نظیریں تنخواہوں، وظائف اور مالِ مغصوب کے سلسلے میں پیچھے گزر چکی ہیں، بلکہ اگر کسی جگہ یہ معلوم ہو کہ لوگ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ نہیں دے رہے ہیں، وہاں اس مفسدے کے باوجود امام اپنے اصل حق کے مطابق ان اموال کی زکوٰۃ وصول کر سکے گا، کیونکہ ترکِ زکوٰۃ کا مفسدہ اس مفسدے سے شدید تر ہے، یہی بات تقریباً تمام فقہائے حنفیہؒ نے تحریر فرمائی ہے، مثلاً علامہ ابنِ ہمامؒ فرماتے ہیں:-

> ظاهر قوله تعالىٰ: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً الأية توجب حق اخذ الزكاة مطلقا للامام، وعلى هذا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتان بعده، فلما ولى عثمان وظهر تغير الناس كره ان تفتش السعاة على الناس مستور اموالهم، ففوض الدفع الى الملاك نيابة عنه، ولم تختلف الصحابة عليه في ذلك وهذا لا يسقط طلب الامام اصلا، ولهذا لو علم أن اهل بلدة لا يؤدون زكاتهم طالبهم بها۔ (فتح القدير ج:۱ ص:۴۸۷)(۱)
>
> ترجمہ:- آیتِ قرآنی: "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً الأية" کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام کو مطلقاً (ہر قسم کے اموال کی) زکوٰۃ وصول کرنا واجب ہے، اور اسی طرزِ عمل پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دو خلیفہ قائم رہے، لیکن جب حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے اور لوگوں کے حالات بدل گئے تو آپؓ نے یہ بات پسند نہ فرمائی کہ محصلینِ زکوٰۃ لوگوں کے پوشیدہ اموال کی تفتیش کریں، چنانچہ انہوں نے مالکوں کو ادائے زکوٰۃ کا حق سونپ کر اس معاملے میں انہیں اپنا نائب بنادیا، اور صحابہ کرامؓ نے اس معاملے میں ان سے اختلاف نہیں فرمایا، لیکن یہ طرزِ عمل امام کے حقِ مطالبہ کو بالکلیہ ساقط نہیں کرتا، چنانچہ اگر کسی شہر کے لوگوں کے بارے میں امام کو یہ معلوم ہو کہ وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تو وہ ان سے زکوٰۃ کا مطالبہ کرے گا۔

اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ اصلاً تمام اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق امام ہی کو ہے، اور اموالِ باطنہ کے سلسلے میں یہ حق ایک مصلحت سے چھوڑا گیا ہے، اور بالکلیہ اب بھی ساقط نہیں

---

(۱) فتح القدير كتاب الزكوة ج:۲ ص:۱۱۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

ہوا، بلکہ ان اموال کی زکوٰۃ جو مالکان ادا کرتے ہیں وہ بھی امام کے نائب کی حیثیت میں ادا کرتے ہیں، اصلاً ان کو یہ اختیار بھی نہیں تھا، اور اسی لئے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کے دَین کو فقہاء نے **له مطالب من جهة العباد** قرار دیا ہے۔

یہاں بعض حضرات کو یہ شبہ پیش آیا ہے کہ امام ابوبکر جصاصؒ نے حضرت عثمانؓ کے عمل کا ذکر فرما کر لکھا ہے:-

فجعل لهم اداءها الى المساكين وسقط من اجل ذلك حق الامام فى اخذها لأنه عقد عقده امام من ائمة العدل، فهو نافذ على الأُمة.

(احکام القرآن للجصاص ج:۳ ص:۱۹۰)[۱]

ترجمہ:- حضرت عثمان غنیؓ نے زکوٰۃ کے مالکوں کو یہ حق دے دیا کہ وہ مساکین کو اپنے طور پر زکوٰۃ دے دیا کریں، اور اس لئے اب ان اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کے سلسلے میں امام کا حق ساقط ہوگیا، اس لئے کہ ائمۂ عدل میں سے ایک امام کا کیا ہوا فیصلہ ہے، جو پوری اُمت پر نافذ ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے اس فیصلے کے بعد اموالِ باطنہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق کسی کو نہیں رہا، لیکن امام ابوبکر جصاصؒ کی پوری عبارت کو بغور پڑھنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ حقِ امام سے ان کی مراد ایسا حق ہے جس کے بعد مالکانِ اموال کو ازخود زکوٰۃ ادا کرنے کا اختیار باقی نہ رہے، اور ان کی ادائیگی کو شرعاً تسلیم نہ کیا جائے، چنانچہ ان کی مذکورہ عبارت سے پہلے ان کے الفاظ یہ ہیں:-

وقوله تعالى: خذ من أموالهم صدقة يدل على أن اخذ الصدقات الى الإمام، وانه متى اداها من وجبت عليه الى المساكين لم يجزه، لان حق الامام قائم فى اخذها فلا سبيل له الى اسقاطه.[۲]

ترجمہ:- اور باری تعالیٰ کا ارشاد: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے کا کام امام کے سپرد ہے اور یہ کہ اگر وہ شخص جس پر زکوٰۃ واجب ہے، زکوٰۃ اپنے طور پر مساکین کو ادا کردے تو یہ اس کے لئے جائز نہیں اس لئے کہ امام کا وصولیابی کا حق قائم ہے، اور اسے ساقط کرنے کا کوئی راستہ نہیں۔

مذکورہ جملے سے صاف واضح ہے کہ وہ امام کے ایسے حق کا تذکرہ فرمارہے ہیں جس کی

(۱، ۲) احکام القرآن للجصاصؒ ج:۳ ص:۱۵۵ طبع سهيل اكيڈمى لاهور.

موجودگی میں مالک کو ازخود زکوٰۃ ادا کرنا ناجائز ہی نہ ہو، بلکہ اس سے زکوٰۃ ادا بھی نہ ہو، پھر اسی حق کے بارے میں آگے لکھا ہے کہ چونکہ حضرت عثمانؓ ائمہ عدل میں سے تھے اور انہوں نے اموالِ باطنہ کی حد تک یہ حق ساقط کر دیا، اس لئے یہ حق اب ساقط ہوگیا[۱] جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ سے پہلے لوگوں کے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ ازخود مساکین کو دینا جائز نہیں تھا اور اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی تھی، حضرت عثمانؓ نے یہ اختیار انہیں دے دیا، اب یہ بات طے ہوگئی کہ ایسے اموال کے مالکان اگر ازخود زکوٰۃ ادا کر دیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امام کا حقِ اخذ بالکلیہ ساقط ہوگیا، اور اب وہ زکوٰۃ وصول کرنا چاہے تو وصول نہیں کرسکتا، چنانچہ فتح القدیر کی مذکورہ بالا عبارت اس پر صریح ہے کہ:-

وھذا لا یسقط طلب الامام اصلًا۔[۲]

امام ابوبکر جصاصؒ کی اس پوری بحث کو اور دوسرے فقہاء و محدثین کی عبارتوں اور روایات کو دیکھنے کے بعد اس سلسلے میں جو صورت حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ:-

* آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک اور حضرات شیخینؓ کے زمانوں میں اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ دونوں سے زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی جاتی تھی، البتہ اتنا فرق ضرور تھا کہ مویشیوں اور زرعی پیداوار کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مصدق بھیجے جاتے تھے، اور نقود اور اموالِ تجارت کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مصدق بھیجنے کے بجائے مالکوں کو حکم تھا کہ وہ خود زکوٰۃ لے کر آئیں، لیکن دونوں قسم کے اموال میں ادائے زکوٰۃ کا راستہ یہی تھا کہ وہ حکومت کو دی جائے۔

* حضرت عمرؓ نے شہر سے باہر جانے والے اموال کے بارے میں یہ تبدیلی فرمائی کہ اس کی وصولیابی کے لئے مصدق مقرر فرمائے، اور باقی اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ حسبِ سابق مالکان خود لا لاکر دیتے رہے۔

* حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اموالِ باطنہ کی کثرت ہوگئی، آبادی پھیل گئی اور انہوں نے محسوس فرمایا کہ اب اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کی سرکاری سطح پر وصولیابی کا یہ سلسلہ کہ اس کے بغیر ادائے زکوٰۃ جائز ہی نہ ہو، اگر باقی رکھا گیا تو اس کے لئے اموالِ ظاہرہ کی طرح مصدق مقرر کرنے پڑیں

---

(۱) چنانچہ مویشیوں کے بارے میں اب امام کا حق اسی نوعیت کا ہے کہ اس کی موجودگی میں مالک کو ازخود زکوٰۃ دینا جائز نہیں، بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک تو اس طرح زکوٰۃ ادا ہی نہیں ہوتی، مبسوط میں ہے "فان قال دفعتها الی المساکین لم یصدق وتؤخذ منه الزکاة عندنا ..... ولنا ان ھذا حق مالی یستوفیه الامام ولانه شرعیة فلا یملک من علیه اسقاط حقه فی الاستیفاء ولا یبرأ بالأداء الی الفقیر فیما بینه وبین ربه وھو اختیار بعض مشائخنا (مبسوط ج:۲ ص:۱۶۱، ۱۶۲ طبع دار المعرفة بیروت) (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم)۔

(۲) فتح القدیر ج:۲ ص:۱۱۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

گے، اور لوگوں کے نجی مقامات میں ان کی دخل اندازی سے لوگوں کو تکلیف ہوگی، لہٰذا آپؓ نے مالکان کو اجازت دے دی کہ وہ ان اموال کی زکوٰۃ خود ادا کرلیا کریں۔

* حضرت عثمانؓ کے اس عمل کے بعد لوگوں کو اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ اپنے طور پر ادا کرنے کی اجازت مل گئی، لیکن زکوٰۃ کی وصولیابی کا اصلی حق اب بھی امام ہی کو ہے، چنانچہ دو صورتوں میں اب بھی وہ زکوٰۃ کی وصولیابی کا اہتمام کرسکتا ہے، ایک یہ کہ کسی جگہ کے لوگوں کے بارے میں یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اپنے طور پر زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور دوسرے یہ کہ کچھ اموالِ باطنہ اس طرح اموالِ ظاہرہ میں شامل ہوجائیں کہ ان سے زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے نجی مقامات کی تفتیش کی ضرورت نہ پڑے۔

* چونکہ قدیم زمانے میں نجی مقامات کی تفتیش کے بغیر اموال کے ظاہر ہوجانے کی جو صورت کثرت سے پیش آتی تھی وہ یہ تھی کہ اموال کو ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاتے وقت وہ عاشر پر گزرتے تھے، اس لئے فقہائے کرامؒ نے اس صورت کے اَحکام تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے اور اس طرح تعبیر فرمایا کہ ''یہ اموال شہر سے باہر نکل کر اموالِ ظاہرہ میں شامل ہوگئے ہیں اور جو اموال شہر کے اندر ہیں وہ اموالِ باطنہ ہیں'' اس لئے یہ ''شہر سے باہر نکلنا'' اصل مدارِ حکم یا بطورِ علت نہیں، بلکہ اپنے عہد کے لحاظ سے اس واقعے کا بیان ہے، ورنہ اصل مدارِ حکم وہی ہے جس کی بناء پر اموالِ باطنہ کو زکوٰۃ کی سرکاری وصولیابی سے مستثنیٰ کیا گیا تھا، یعنی تفتیش کے بغیر ان کا ظاہر ہوجانا، چنانچہ قرونِ اُولیٰ میں ان اموال میں سے بھی زکوٰۃ وصول کی گئی جو شہر سے باہر نہیں ہوتے تھے، لیکن تفتیش کے بغیر ظاہر ہوتے تھے مثلاً تنخواہیں، وظائف اور حکومت کے اموالِ مغصوبہ، جس کی روایات پیچھے گزر چکی ہیں۔

یہاں بعض حضرات نے یہ شبہ ظاہر فرمایا ہے کہ بعض اموال حکومت پر تفتیش کے بغیر ظاہر ہوجاتے تھے لیکن اس کے باوجود حکومت ان سے زکوٰۃ وصول نہیں کرتی تھی، مثلاً عاشر پر گزرنے والا اگر اپنے نجی مقامات پر رکھے ہوئے اموال کے بارے میں اقرار کرلیتا تو ان کی زکوٰۃ وصول نہیں کی جاتی تھی، جس کی فقہاء نے تصریح فرمائی ہے۔

اس کے جواب میں عرض یہ ہے کہ اقرار کے ذریعے تو اموالِ باطنہ میں سے ہر مال ظاہر بن سکتا ہے، لیکن چونکہ جزوی واقعات کو کُلی اَحکام کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، اور عاشر کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ جس مال کو چاہے ظاہر قرار دے کر اس سے زکوٰۃ وصول کرلے، اس لئے اس کو یہ لگا بندھا اُصول بتادیا گیا ہے کہ جو کوئی شخص تمہارے پاس مال لے کر گزرے تو صرف اس مال سے زکوٰۃ وصول کرسکتے ہو جو اس وقت تمہارے سامنے آجائے، اور لوگوں کے گھروں یا دُکانوں پر جو مال ہے اس سے تعرض نہ کرو، اس اُصول کے تحت ''عاشر'' کو گھروں میں رکھے ہوئے مال سے تعرض کا اختیار نہیں دیا گیا، اور

جب یہ اُصول مقرّر ہوگیا تو اگر کسی جزوی واقعے میں کوئی شخص اپنے مالِ باطن کو عاشر پر اقرار کے ذریعے ظاہر بھی کردے تو یہ ایک استثنائی واقعہ ہوگا، جس سے اُصول تبدیل نہیں ہوسکتا، اس لئے اس صورت میں بھی بطورِ اُصول اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی۔

ہاں! اگر کچھ ایسے اموال پائے جائیں جن کی نوعیت ہی ایسی ہو کہ وہ سب کے سب بذاتِ خود حکومت پر بغیر تفتیش کے ظاہر ہوجاتے ہوں، اور حکومت ان تمام اموال کے بارے میں یہ طے کردے کہ ان تمام اموال سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی تو اس میں شرعی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ تنخواہوں، وظائف اور اموالِ مغصوبہ سے جو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی وہ اس کے جواز کی واضح نظیر ہے۔

دوسرے الفاظ میں "خروج من المصر" عاشر کے لئے زکوٰۃ وصول کرنے کی اجازت کی تو علت ہے لیکن امام کے لئے وصولیٔ زکوٰۃ کے اختیار کی علت نہیں، بلکہ اس کے لئے علت اموال کا تفتیش کے بغیر ظاہر ہوجانا ہے، چنانچہ جن اموال کی نوعیت ایسی ہو کہ وہ بغیر تفتیش کے ظاہر ہوجاتے ہوں، ان سے مَا مَرّ عَلَی العَاشر کی طرح وہ زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم جاری کرسکتا ہے، جیسا کہ تنخواہوں وغیرہ کے معاملے میں کیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرامؒ "خروج من المصر" کا تذکرہ "باب فیمن یمر علی العاشر" میں تو فرماتے ہیں، جس کا موضوع یہ ہے کہ عاشر کون سے اموالِ زکوٰۃ وصول کرسکتا ہے، لیکن جس جگہ امام کے وصولیٔ زکوٰۃ کے اختیار کا بیان ہے، وہاں عموماً "خروج من المصر" کو بطورِ علت ذکر نہیں کیا جاتا، بلکہ وہاں علت یہی بیان کی جاتی ہے کہ اموالِ باطنہ سے زکوٰۃ وصول کرنے میں لوگوں کے نجی مقامات میں دخل اندازی اور ان کی تفتیش لازم آجاتی ہے جس سے عوام کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے، جیسا کہ فتح القدیر کی عبارت پیچھے گزر چکی ہے، اور امام ابوبکر جصاصؒ کی عبارت مجلس کی تحریرِ سابق میں نقل کی جاچکی ہے۔

بینک اکاؤنٹس کے قرض ہونے کا مسئلہ

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص بینک میں رقم رکھواتا ہے تو شرعاً وہ رقم بینک کے ذمے قرض ہوتی ہے، امانت نہیں، اس لئے وہ بینک پر مضمون بھی ہوتی ہے اور اس پر زیادتی وصول کرنا سود ہوتا ہے، اور جب کسی شخص نے کوئی رقم کسی دوسرے فرد یا ادارے کو بطورِ قرض دے دی تو وہ اس شخص کی ملکیت سے نکل کر مقروض کی ملکیت میں داخل ہوگئی، اب

اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب وہ رقم اسے وصول ہوجائے گی، اس سے پہلے زکوٰۃ واجب الاداء نہیں، لہٰذا بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وضع کرنے پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ زکوٰۃ واجب الأداء ہونے سے پہلے ہی زکوٰۃ وضع کرلی گئی ہے، اور دوسرا اعتراض یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ دائن سے وصول کرنے کے بجائے مدیون کے مال سے وصول کی گئی ہے، حالانکہ اس کی کوئی نظیر معہود فی الشرع نہیں ہے کہ ایک شخص کی زکوٰۃ دوسرے کے مال سے وصول کی جائے۔

ذیل میں ان دونوں اعتراضات کی تحقیق مقصود ہے:-

ان دونوں مسائل کی تحقیق کے لئے پہلے بینک اکاؤنٹس کی صحیح حیثیت متعین کرنا ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فقہی اعتبار سے بینک اکاؤنٹ قرض ہے[1] لیکن دائن کے تصرف کے لحاظ سے یہ ایک بالکل نئی قسم کا قرض ہے جو فقہائے کرامؒ کے عہد میں موجود نہیں تھا اور جس کی نظیریں بھی اس دور میں کم ملتی ہیں، لہٰذا زکوٰۃ کے حق میں بینک اکاؤنٹس کو بالکلیہ دوسرے دیون اور قرضوں پر قیاس کرنا درست نہیں ہوگا، وجوبِ زکوٰۃ کے حق میں دَین کے اندر اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دائن کے لئے کس حد تک مرجو الوصول ہے، اور دائن کا تصرف اس پر کس حد تک برقرار ہے، اسی بناء پر فقہائے کرامؒ نے وجوبِ زکوٰۃ کے معاملے میں دَینِ قوی، دَینِ متوسط اور دَینِ ضعیف کی تقسیم فرمائی ہے، اور اسی بناء پر دَینِ مجحود کو مالِ ضمار میں شامل کرکے اسے زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، جب ہم اس نقطۂ نظر سے بینک اکاؤنٹس کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ دَین ہونے کے باوجود اس معاملے میں دوسرے عام دیون سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے، جس کی وجوہ درج ذیل ہیں:-

---

(۱) البتہ جن اکاؤنٹس پر سود کا لین دین طے ہوتا ہے، مثلاً سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈپازٹ، ان میں ایک اور بھی احتمال قابلِ غور ہے، اور وہ یہ کہ وہ شرکت فاسدہ یا مضاربتِ فاسدہ کا مال ہو، کیونکہ فقہاء کرامؒ لکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص سے شرکت یا مضاربت کرتے وقت نفع کے شائع حصے کے بجائے معین رقم طے کرلی جائے تو شرکت اور مضاربت فاسد ہوجاتی ہے شامی[1] اور شرکتِ فاسدہ اور مضاربتِ فاسدہ دونوں میں جب تک شریکین مال واپس نہ لیں ان کے درمیان شرکت فی الملک قائم ہوجاتی ہے، اور دونوں اپنے اپنے حصے کے مالک رہتے ہیں، وہ رقم دین نہیں بلکہ مالِ تجارت کے حکم میں رہتی ہے، اور غیر سودی اکاؤنٹس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ اصلاً ودیعت تھی، لیکن خلط بالاذن کی بناء پر وہ مال شرکتِ ملک بن گیا، چنانچہ درمختار کتاب الایداع میں تصریح ہے کہ ودیعت خلط بالاذن سے شرکتِ ملک بن جاتی ہے (شامی ج:۴ ص:۸ و ۴)[2] اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے سیونگ اکاؤنٹ کو اسی بناء پر شرکتِ ملک کا مال قرار دیا ہے (امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۳۰۹)[3] اگر ان اکاؤنٹس کی یہ توجیہ درست ہو تو ان اکاؤنٹس کے دَین ہونے کا مسئلہ ہی ختم ہوجاتا ہے، لیکن اس توجیہ میں تامل یہ ہے کہ اس کے مطابق ان اکاؤنٹس میں رکھی ہوئی رقم پھر مضمون نہ ہوگی، حالانکہ فریقین کی طرف سے مضمون ہونا شرط ہوتا ہے۔ فلیتامل

(حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم)

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۴ ص:۳۱۶ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) الدر المختار کتاب الایداع ج:۵ ص:۶۶۹ (طبع ایچ ایم سعید).

(۳) طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی (محمد زبیر)

۱:- عام قرضوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ مقرض کے قبضے سے نکلنے کے بعد ان پر مقرض کا کوئی تصرف باقی نہیں رہتا، بلکہ وہ مقروض کے رحم وکرم پر ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے اسے ادا کرے، اس کے برعکس بینک اکاؤنٹس میں مقرض کے طلب کرنے پر فوری ادائیگی نہ ہونے کا سوال ہی نہیں ہوتا، اور یہ بینک کی طرف سے صرف زبانی اقرار نہیں ہوتا، بلکہ بینکوں کا مسلسل بلاتخلف طرزِ عمل یہی ہے، جس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے، لہٰذا یہ قرض کی وہ قسم ہے جس میں مقرض اپنی رقم جب چاہے فوراً بلاتخلف واپس لے سکتا ہے، اور عملاً وہ ایسی ہی قابل اعتماد ہے جیسے اپنی تجوری میں رکھی ہوئی رقم، بلکہ اس سے بھی زیادہ، کہ تجوری کی رقم میں ہلاک ہونے کا خطرہ ہے، لیکن بینک اکاؤنٹ میں ایسا خطرہ بھی نہیں ہے۔

۲:- بینک اکاؤنٹس میں رکھی ہوئی رقم پر ہر اکاؤنٹ ہولڈر ٹھیک اسی طرح تصرف کرتا ہے جس طرح اپنی الماری میں رکھی ہوئی رقم پر تصرف کرتا ہے، اس وقت تجارت کا سارا کاروبار بینک اکاؤنٹس ہی پر چل رہا ہے اور بیشتر ادائیگیاں بینک ہی کے ذریعے ہوتی ہیں۔

۳:- عرفِ عام میں بھی بینک میں رقم رکھوانے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ اس نے یہ رقم کسی کو قرض دے دی ہے، بلکہ وہ اسے اپنی ہی رقم سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ اپنی رقم ہی کا سا معاملہ کرتا ہے، جب کوئی شخص اپنے حاضر وغائب مال کی فہرست بناتا ہے تو بینک اکاؤنٹس کو مالِ حاضر میں شمار کیا جاتا ہے، مالِ غائب میں نہیں۔

۴:- عام قرضوں کا حال یہ ہے کہ معاہدہ قرض کا محرک مستقرض ہوتا ہے، لیکن یہاں محرک مقرض ہوتا ہے، اور اس کا اصل منشاء قرض دینے کے بجائے اپنے مال کی حفاظت ہوتا ہے۔

عام قرضوں کے مقابلے میں بینک اکاؤنٹس کی ان وجوہِ فرق کو ذہن میں رکھ کر قرضوں پر زکوٰۃ کے مسئلے پر غور فرمایئے۔

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر پہلا اعتراض یہ کیا جارہا ہے کہ قرضے پر اگرچہ زکوٰۃ فرض تو ہوتی ہے، لیکن اس کی ادائیگی اس وقت واجب ہوتی ہے، جب وہ دائن کے قبضے میں واپس آجائے، اور زیرِ بحث صورت میں دائن کے قبضے میں آنے سے پہلے ہی زکوٰۃ وضع کی جارہی ہے۔

اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ قرضوں پر زکوٰۃ کا نفسِ وجوب تو متفق علیہ ہے، البتہ امام ابوحنیفہؒ نے مقرض کو یہ سہولت دی ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی اس پر واجب اس وقت ہوگی جب قرضے کی رقم اسے واپس ملے گی، چنانچہ جب بھی چالیس درہم کی مقدار اس کے پاس واپس آئے گی، ایک درہم بطور زکوٰۃ ادا کرنا اس پر واجب ہوگا، اس سہولت کا پسِ منظر اور اس کی اصل وجہ مندرجہ ذیل روایات سے واضح ہوتی ہے:-

۱:- امام بیہقیؒ روایت فرماتے ہیں:-

عن حمید بن عبدالرحمن بن عبدالقاری، وکان علی بیت مال عمرؓ قال: کان الناس یأخذون من الدین الزکاۃ، وذلک ان الناس اذا خرجت الاعطیۃ حبس لھم العرفاء دیونھم وما بقی فی ایدیھم اخرجت زکاتھم قبل ان یقبضوا، ثم داین الناس بعد ذلک دیونا ھالکۃ فلم یکونوا یقبضون من الدین الصدقۃ الا ما نص منہ ولکنھم کانوا اذا قبضوا الدین اخرجوا عنھا لما مضیٰ.

(السنن الکبریٰ للبیھقی ج:۴ ص:۱۵۰ باب زکاۃ الدین اذا کان علی معسر أو جاحد)[۱]

ترجمہ:- حمید بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ عبدالرحمٰن بن عبدالقاریؒ جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں بیت المال میں مقرّر تھے، فرماتے ہیں کہ لوگ دَین سے زکوٰۃ وصول کرتے تھے، جس کا طریقہ یہ تھا کہ جب لوگوں کی تنخواہوں کی ادائیگی کا وقت آتا تو عرفاء ان کے دیون کا حساب کرتے، اور جو باقی بچتا اس کی زکوٰۃ ان کے قبضہ کرنے سے پہلے ہی نکال لی جاتی، لیکن اس کے بعد لوگوں نے ایسے دیون کا معاملہ شروع کر دیا جو بعض اوقات ضائع ہو جاتے تھے، اس لئے حکام صرف اس دَین سے زکوٰۃ وصول کرتے جو نقد شکل میں آجاتا، لیکن لوگ جب اپنے قرضوں پر قبضہ کرتے تو زمانۂ گزشتہ کی زکوٰۃ بھی نکالتے تھے۔

اس روایت سے واضح ہے کہ اصلاً دیون کا حکم بھی یہی تھا کہ سال بہ سال ان کی زکوٰۃ ادا کی جائے، خواہ وہ قبضے میں نہ آئے ہوں، لیکن چونکہ بعض مرتبہ لوگ زکوٰۃ نکال دیتے ہیں، اور بعد میں دیون وصول نہیں ہوتے، اس لئے یہ سہولت دی گئی کہ دیون کی زکوٰۃ دیون وصول ہونے کے بعد دی جائے، لیکن جب ادا کی جائے تو سالہائے گزشتہ کی بھی ادا کی جائے، اس کے باوجود صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعینؒ کی ایک بڑی جماعت کا مسلک یہی رہا ہے کہ مدیون اگر قابلِ اعتماد ہے تو زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے وصولیابی کا انتظار نہ کیا جائے، بلکہ سال کے سال زکوٰۃ ادا کی جاتی رہے، چنانچہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت جابر بن زیدؒ، حضرت مجاہدؒ، حضرت ابراہیم نخعیؒ، حضرت میمون بن مہرانؒ، حضرت قتادہؒ اور حضرت سعید بن المسیبؒ وغیرہ کا مسلک یہی تھا۔

(کتاب الأموال لأبی عبید ص:۴۳۴ باب الصدقۃ فی التجارات والدیون فقرہ نمبر ۱۲۳۶[۲] ومصنف عبدالرزاق ج:۴ ص:۱۰۴ باب لا زکاۃ الا فی الناض)[۳]

---

(۱) طبع نشر السنۃ، ملتان.

(۲) کتاب الأموال لأبی عبیدؒ الجزء الثالث ص: ۴۳۹ (طبع دارالکتب العلمیہ بیروت).

(۳) طبع مجلس علمی.

اسی کو امام ابوعبیدؒ نے ترجیح دی ہے، اور یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔

(نهاية المحتاج ج:۳ ص:۱۳۰)[1]

لیکن امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ دَین خواہ کتنے قابلِ اعتماد شخص کے پاس ہو، اس میں چونکہ عدمِ ادائیگی کا احتمال بھی رہتا ہے، لہٰذا جب تک وہ مالک کے قبضے اور تصرف میں نہ آجائے اس وقت تک وجوبِ اداء نہیں ہوگا، اس کے لئے انہوں نے حضرت علیؓ کے اس ارشاد سے استدلال فرمایا ہے جسے امام محمدؒ نے روایت کیا ہے، امام محمدؒ فرماتے ہیں:-

عن علی بن ابی طالبؓ قال: اذا كان ذلك دين على الناس فقبضه فزكاه لما مضى قال محمدؒ: و به ناخذ وهو قول أبي حنيفةؒ.

(كتاب الآثار صفحه ۱۰۸)[2]

ترجمہ:- حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب کسی کا دَین لوگوں پر ہو اور وہ اس پر قبضہ کرلے تو زمانۂ ماضی کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس مسئلے میں اپنے مسلک کی بنیاد حضرت علیؓ کے ارشاد پر رکھی ہے۔

اور حضرت علیؓ کا یہ ارشاد امام بیہقیؒ[3] اور امام ابوعبیدؒ وغیرہ[4] نے ان الفاظ میں روایت فرمایا ہے:-

عن عليؓ في الدين الظنون قال: ان كان صادقا فليزكه اذا قبضه لما مضى.

ترجمہ:- جس دَین کی وصولیابی مشکوک ہو اس کے بارے میں حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: اگر دائن سچا ہے تو دین پر قبضہ کرنے کے بعد پچھلے سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے۔

امام ابوعبیدؒ نے ''دین ظنون'' کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ:-

هو الذى لا يدرى صاحبه أيقضيه الذى عليه الدين أم لا؟

(بيهقى ج:۴ ص:۱۵۰[5] وكتاب الأموال ص:۴۳۱ فقره:۱۲۲۰[6] ومصنف ابن ابى شيبةؒ ج:۳ ص:۱۶۳[7])

---

(۱) طبع احياء التراث العربى بيروت. (۲) كتاب الآثار للامام محمدؒ ص:۵۴ (طبع كتب خانه مجيديه ملتان).
(۳) دیکھئے السنن الكبرى للبيهقىؒ ج:۴ ص:۱۵۰ (طبع نشر السنة ملتان).
(۴) كتاب الأموال لأبى عبيدؒ الجزء الثالث ص:۴۳۶ (دار الكتب العلميه بيروت).
(۵) طبع نشر السنة ملتان. (۶) الجزء الثالث ص:۴۳۶ (دار الكتب العلمية بيروت). (۷) طبع ادارة القرآن كراچى.

یعنی یہ وہ دَین ہے جس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ مدیون اسے ادا کرے گا یا نہیں کرے گا؟

اور اس ارشاد کی تفصیل امام ابنِ ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں روایت فرمائی ہے:-

عن الحسن قال: سئل علي عن الرجل يكون له الدين على الرجل، قال: يزكيه صاحب المال فان توىٰ ما عليه وخشي أن لا يقضي، قال: يمهل فاذا خرج ادى زكاة ماله. (مصنف ابن ابی شیبۃ ج:۳ ص:۱۶۲)[1]

ترجمہ:- حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے یہ سوال کیا گیا کہ کسی شخص کا دَین دوسرے پر واجب ہو (تو وہ کیا کرے؟) آپؓ نے فرمایا کہ مالک اس کی زکوٰۃ نکالے، لیکن اگر اسے یہ اندیشہ ہو کہ مدیون ادا نہیں کرے گا تو وہ ٹھہر جائے اور جب دَین وصول ہو جائے تو اس وقت ادا کر دے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس باب میں حضرت علیؓ کا موقف وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کا ہے یعنی:-

أن عبدالله بن عباسٌ وعبدالله بن عمرٌ قالا: من أسلف مالًا فعليه زكاته في كل عام اذا كان في ثقة. (السنن الكبرىٰ للبيهقي ص:۱۴۹)[2]

ترجمہ:- عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی کو کوئی مال قرض دے تو اس پر ہر سال اس کی زکوٰۃ واجب ہے اگر وہ قابلِ اعتماد جگہ پر ہو۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مکمل الفاظ یہ ہیں:-

زكوا ما كان في أيديكم، وما كان من دَين في ثقة فهو بمنزلة ما في أيديكم، وما كان في دَين ظنون فلا زكاة فيه حتى يقبضه.

(بیہقیؒ ج:۴ ص:۱۵۰[3] ومصنف ابن ابی شیبۃ ج:۳ ص:۱۶۲)[4]

ترجمہ:- جو مال تمہارے ہاتھوں میں ہو اس کی زکوٰۃ نکالو اور جو دَین قابلِ اعتماد جگہ پر ہو، وہ ایسا ہی ہے جیسے تمہارے قبضے کا مال، اور جو دَین ظنون ہو تو اس پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں جب تک وہ قبضے میں نہ آجائے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس ارشاد کا ایک حصہ حضرت امام محمدؒ نے بھی نقل فرمایا ہے اور اس

---

(۱) طبع ادارۃ القرآن کراچی۔　(۲) ج:۴ طبع نشر السنۃ ملتان۔
(۳) ایضاً　(۴) طبع ادارۃ القرآن کراچی۔

سے دَین کے مسئلے میں مالکیہ کے خلاف استدلال فرمایا ہے:-

عن نافع عن ابن عمرؓ انه قال فی الدین یرجی، قال: زکه کل عام.

(کتاب الحجة علی اهل المدینة ج:۱ ص:۴۷۲)(۱)

ترجمہ:- حضرت ابنِ عمرؓ نے اس دَین کے بارے میں فرمایا جس کی وصولیابی کی اُمید ہو کہ اس کی زکوٰۃ ہر سال نکالو۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقہائے حنفیہؒ نے اس باب میں اپنے مسلک کی بنیاد حضرت علیؓ اور حضرت ابنِ عمرؓ کے اقوال پر رکھی ہے، اور ان کے نزدیک اگرچہ قبضے کے بعد زکوٰۃ کا وجوب صرف اس صورت میں ہے جبکہ دَین کی وصولیابی مظنون ہو، جہاں وصولیابی کا وثوق ہو، وہاں ان کے نزدیک وجوبِ ادا بھی قبضے سے پہلے ہی ہو جاتا ہے، لیکن فقہائے حنفیہؒ نے اس پہلو پر نظر فرمائی کہ معروف دیون میں سے ہر دَین میں، خواہ وہ کتنے ہی قابلِ اعتماد شخص کے پاس ہو، عدمِ ادائیگی کا کچھ نہ کچھ خطرہ ضرور ہوتا ہے، لہٰذا انہوں نے ہر دَینِ قوی کو ''دَینِ ظنون'' قرار دے کر یہ عام حکم لگا دیا کہ اس پر نفسِ وجوب تو ہو جاتا ہے، لیکن وجوبِ ادا قبضے کے بعد ہوگا۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر جب ہم بینک اکاؤنٹس کا جائزہ لیتے ہیں، اور عام دیون کے مقابلے میں ان کی جو وجوہِ فرق شروع میں بیان کی گئیں، ان کو دیکھتے ہیں تو واضح ہوجاتا ہے کہ یہ دَینِ قوی کی وہ قسم ہے جو فقہائے کرامؒ کے عہد میں موجود نہیں تھی، یا اس کی نظیریں شاذ و نادر تھیں، اور اس قسم کو ''دَینِ ظنون'' کسی طرح قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ یہ وصولیابی کے یقین، دائن کے آزادانہ تصرفات اور عرفِ عام کی رُو سے بالکل اس طرح دائن کی ملکیت اور تقدیری قبضے میں رہتا ہے جیسے اپنے گھر میں رکھا ہوا مال، لہٰذا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے الفاظ میں ''بمنزلة ما فی أیدیکم'' کا اطلاق اس سے زیادہ کسی دَین پر نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ اگر بینک اکاؤنٹس پر زکوٰۃ کے وجوبِ اداء کے لئے دوسرے دیون کی طرح ان کے نقد ہونے کی شرط لگائی جائے تو اس سے اتنی عملی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی کہ زکوٰۃ کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی بہت مشکل ہوجائے گی، امام ابوعبیدؒ نے تو عام دیون کے بارے میں بھی یہ فرمایا ہے کہ:-

وانما اختاروا. او من اختار منهم - تزکیة الدین مع عین المال لأن من ترک ذلک حتی یصیر الی القبض لم یکد یقف من زکاة دینه علی حد، ولم یقم بأدائها، وذلک ان الدین ربما اقتضاه ربه متقطعا، کالدراهم

(۱) طبع دار المعارف النعمانیة.

الخمسة والعشرة واكثر من ذلك واقل، فهو يحتاج في كل درهم يقتضيه فما فوق ذلك الى معرفة ما غاب عنه من السنين والشهور والايام، ثم يخرج من زكاته بحساب ما يصيبه وفي اقل من هذا ما تكون الملالة والتفريط، فلهذا اخذوا له بالاحتياط، فقالوا: يزكيه مع جملة ماله في رأس الحول، وهو عندى وجه الأمر.

(كتاب الأموال ص: ۴۳۴ فقره ۱۲۳۶)[1]

ترجمہ:- جن حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ دَین کی زکوٰۃ عین مال کے ساتھ ہی ادا کی جائے، انہوں نے اس مسلک کو اس لئے اختیار فرمایا کہ جو شخص دَین کی زکوٰۃ کو قبضہ ملنے تک مؤخر کرے گا وہ اپنے دیون کی زکوٰۃ کو حد کے مطابق معلوم کرکے اس کی صحیح ادائیگی نہ کرسکے گا، اس لئے کہ دَین بعض اوقات قسطوں میں وصول ہوتا ہے، مثلاً کبھی پانچ مل گئے، کبھی دس، کبھی زیادہ، کبھی کم، اب اسے جو درہم بھی حاصل ہوگا اس کے بارے میں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ کتنے سال، کتنے مہینے، کتنے دن اس کے قبضے سے خارج رہا ہے، پھر وہ اسی کے حساب سے زکوٰۃ نکالے گا، اور اس عمل میں مشقت اور کوتاہی کا بڑا امکان ہے، اس لئے ایسے شخص کے لئے علماء نے احتیاط پر عمل فرمایا، اور یہ حکم دے دیا کہ وہ ہر سال اپنے دوسرے مال کے ساتھ دَین کی زکوٰۃ بھی نکال دیا کرے، اور یہی میرے نزدیک صحیح طریقہ ہے۔

عام دیون کے بارے میں یہ دُشواری قابلِ لحاظ ہو یا نہ ہو، لیکن بینک اکاؤنٹس کے بارے میں تو اس قسم کا حساب وکتاب عملی اعتبار سے تقریباً ناممکن ہے، کیونکہ عام طور پر ان اکاؤنٹس سے بعض اوقات ایک ایک دن میں کئی کئی مرتبہ رقمیں نکالی اور نئی داخل کی جاتی ہیں، اور قبضے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت صرف یہی ہوسکتی ہے کہ ہر اکاؤنٹ ہولڈر اپنے اکاؤنٹ کے ہر ہر روپے کے بارے میں یہ ریکارڈ پوری طرح محفوظ رکھے کہ وہ کتنے عرصے بینک میں رہا ہے، تاکہ اس پر واجب ہونے والی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرسکے، اور جب کوئی رقم بینک سے نکالے تو پہلے یہ حساب کرے کہ یہ رقم کتنے سال بینک میں رہی ہے، اور اس پر کتنی زکوٰۃ واجب ہوئی ہے، پھر زکوٰۃ ادا کرے، اور اس میں جو عملی تعذر ہے وہ مخفی نہیں۔ اور خود فقہائے حنفیہؒ نے مالِ مستفاد کا الگ سال شمار نہ کرنے پر ایک دلیل

(۱) الجزء الثالث ص: ۴۳۹ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).

یہی عملی تعذر کی پیش کی ہے، چنانچہ امام محمدؒ نے تو مالِ مستفاد پر الگ سال شمار کرنے والوں پر طنز فرماتے ہوئے یہاں تک لکھا ہے کہ:-

ینبغی لصاحب هذا المال ان یقعد حساباً یحسبون زکاة ماله متی تجب؟ ارایتم الرجل اذا کان یفید الیوم الفاً وغدا الفین وبعد غد ثلاثة الاف، وبعد ذلک خمسة الاف وبعد ذلک بعشرین یوما عشرة الاف، أینبغی له ان یزکی کل مال من هذه الاموال علیٰ حدة؟ وهذا قول ضیق لا یوافق ما علیه الناس، ینبغی له ان یجمع ماله کله ثم یزکیه اذا وجبت الزکاة علی ماله الأول. (کتاب الحجة علی اهل المدینة ج:۱ ص:۴۹۱، ۴۹۲)(۱)

ترجمہ:- (ان حضرات کے قول کے مطابق) تو ہر صاحبِ مال کو چاہئے کہ وہ باقاعدہ محاسب اس کام کے لئے بٹھائے کہ وہ اس کی زکوٰۃ کا حساب کیا کریں کہ وہ کب واجب ہوگی؟ ذرا غور تو فرمایئے کہ ایک شخص کے پاس آج ایک ہزار آتے ہیں، کل دو ہزار، پرسوں تین ہزار، اس کے بعد پانچ ہزار، پھر بیس دن کے بعد دس ہزار، تو کیا وہ ان تمام رقموں کی الگ الگ زکوٰۃ نکالے گا؟ یہ تو بڑا تنگ قول ہے جو لوگوں کے طرزِ عمل کے موافق نہیں، اس کے بجائے اسے چاہئے کہ وہ اپنا سارا مال جمع کرے پھر سارے مال کی زکوٰۃ ایک ساتھ اسی وقت نکالے جب اس کے پہلے مال پر زکوٰۃ واجب ہوئی تھی۔

اور حضرت ابراہیم نخعیؒ ''جو فقہ حنفی کا بہت بڑا مأخذ ہیں'' ان کا ایک ارشاد امام ابن ابی شیبہؒ نے ان الفاظ میں روایت فرمایا ہے کہ:-

ومن کان له من دین ثقة فلیزکه، وما کان لا یستقر یعطیه الیوم ویأخذ الیٰ یومین فلیزکه. (مصنف ابن ابی شیبةؒ ج:۳ ص:۱۶۲)(۲)

ترجمہ:- جس شخص کا کوئی دَین کسی قابلِ اعتماد شخص پر ہو، اس کو چاہئے کہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے، اور جو دَین ایک حالت پر نہ رہتا ہو، آج وہ کسی کو دیتا ہو اور دو دن تک واپس لے لیتا ہو اس کی بھی زکوٰۃ نکالے۔

اس کا منشاء بھی غالباً یہی ہے کہ دیون کی جو رقمیں آتی جاتی رہتی ہوں ان کا الگ الگ حساب رکھنا چونکہ متعذر ہے، اس لئے ان سب کی زکوٰۃ ایک ساتھ ہی نکالنی چاہئے، اور اس قسم کے دیون کی

(۱) طبع دار المعارف النعمانیة. (۲) طبع نشر السنة ملتان.

جتنی مکمل مثال بینک اکاؤنٹس ہیں اتنی مکمل مثال شاید کوئی اور ممکن نہ ہو۔ لہٰذا ان تمام دلائل کی روشنی میں بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر یہ اعتراض دُرست نہیں رہتا کہ ان کی زکوٰۃ وجوبِ ادا سے پہلے وصول کرلی گئی ہے، بلکہ مذکورہ بالا دلائل کی رُو سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان اکاؤنٹس کا وجوبِ ادا بھی اسی وقت ہوجاتا ہے، جب دوسری رقموں کا سال پورا ہو۔

بینک اکاؤنٹس کے دَین ہونے کی بنیاد پر ان سے زکوٰۃ وضع کرنے پر دوسرا اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ جب ایک شخص نے کوئی رقم بینک کو قرض دے دی تو وہ اس کی ملکیت سے نکل کر بینک کی ملکیت میں آگئی، لہٰذا جس رقم سے حکومت زکوٰۃ وصول کر رہی ہے وہ بینک کی ملکیت ہے، اور اس کی کوئی نظیر شریعت میں نہیں ہے کہ ایک شخص کی زکوٰۃ دوسرے کے مال سے وصول کی جائے۔

اس اعتراض کے جواب میں عرض یہ ہے کہ جس دَین کی وصولیابی اتنی متیقن ہو جتنی بینک اکاؤنٹس میں متیقن ہوتی ہے، اس سے زکوٰۃ کی وصولیابی کی متعدد نظیریں موجود ہیں کہ اس کو تقدیراً دائن کے قبضے میں قرار دے کر اس سے زکوٰۃ وصول کی گئی ہے، چند نظائر درج ذیل ہیں:-

۱:- پیچھے گزر چکا ہے کہ حضرت صدیق اکبر، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم زکوٰۃ کی رقم، دی جانے والی تنخواہوں سے کاٹ لیتے تھے، امام ابوعبیدؒ کی روایت کے یہ الفاظ پیچھے گزرے ہیں کہ:-

فان أخبره أن عنده مالا قد حلت فيه الزكاة قاصه مما يريد أن يعطيه.

(کتاب الاموال ص: ۴۱۱)(۱)

ترجمہ:- اگر تنخواہ لینے والا یہ بتاتا کہ اس کے پاس ایسا مال ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہے تو حضرت صدیق اکبرؓ جو تنخواہ اسے دینا چاہتے تھے اس میں سے زکوٰۃ کاٹ لیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ تنخواہ کی وصولیابی سے پہلے وہ بیت المال پر دَین ہی تھا، اور چونکہ صاحبِ تنخواہ کا اس پر قبضہ نہیں ہوا تھا، اس لئے ابھی وہ حقیقۃً اس کی ملکیت اور قبضے میں نہیں آیا تھا، لیکن قبضے میں آنے سے پہلے ہی اس سے زکوٰۃ وضع کرنا اس لئے تھا کہ وہ دَین متیقن ہونے کی بناء پر تقدیراً صاحبِ تنخواہ کے قبضے میں آچکا تھا۔ چنانچہ امام محمدؒ نے یہ واقعہ موطا میں نقل کر کے اس پر ترجمۃ الباب یہ قائم فرمایا ہے کہ:-

باب الرجل يكون له الدين هل عليه فيه الزكاة؟

---

(۱) کتاب الأموال لأبی عبیدؒ الجزء الثالث ص:۴۱۲ (دار الکتب العلمیة بیروت).

اور پھر یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ:-

کان أبوبکر اذا اعطیٰ الناس اعطیاتھم یسئل الرجل ھل عندک من مال قد وجبت فیہ الزکاۃ؟ فان قال: نعم، أخذ من عطاءہ زکاۃ ذلک المال، وان قال: لا، سلم الیہ عطاءہ.

اور پھر فرمایا ہے:-

قال محمد: وبھذا نأخذ، وھو قول أبی حنیفۃ رحمہ اللہ.
(مؤطا امام محمد ص: ۱۷۰)[1]

اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ کے اس عمل کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:-

وفیہ دلالۃ علی أنھم کانوا یأخذون زکاۃ العطاء لکونہ دینا مستحقا علی بیت المال والا لم یکن لأخذ الزکاۃ منہ معنی. (اعلاء السنن ج:۱۲ ص: ۴۳۰ کتاب السیر، باب العطاء یموت صاحبہ بعد ما یستوجبہ)[2]

ترجمہ:- ان روایات سے معلوم ہوا کہ وہ تنخواہوں سے زکوٰۃ اس لئے وصول کرتے تھے کہ وہ بیت المال پر دَین ہوتی تھیں (حالانکہ دَینِ اُجرت، دَینِ قرض سے ضعیف ہے) ورنہ ان تنخواہوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کے کوئی معنیٰ نہیں تھے۔

ان تمام روایات وعبارات میں اس بات کی واضح دلیل موجود ہے کہ دَینِ متیقن کے قبضے میں آنے سے پہلے ہی اس سے زکوٰۃ وصول کی جاسکتی ہے، کیونکہ وہ متیقن ہونے کی بناء پر تقدیراً مالک کے قبضے میں ہے۔

۲:- حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں امام ابوعبیدؒ فرماتے ہیں کہ:-

عن نافع عن ابن عمرؓ ان کان یکون عندہ الیتامیٰ فیستسلف اموالھم لیحرزھا من الھلاک، ثم یخرج صدقتھا من اموالھم وھی دین علیہ.
(کتاب الأموال ص: ۴۵۱ فقرہ: ۱۳۰۹[3] مزید ملاحظہ ہو السنن الکبریٰ للبیہقیؒ ج:۴ ص: ۱۴۹[4] ومصنف عبدالرزاق ج:۴ ص: ۷۰ و ۹۸، ۹۹)[5]

---

(۱) المؤطا للامام محمدؒ ص: ۱۷۳ (طبع قدیمی کتب خانہ).
(۲) اعلاء السنن حکم الزکوٰۃ فی العطاء ج. ۱۲ ص: ۵۵۹ (ادارۃ القرآن کراچی).
(۳) ص: ۵۶۲ (دار الکتب العلمیۃ بیروت).
(۴) طبع ادارۃ القرآن کراچی.
(۵) طبع مجلس علمی کراچی.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی سرپرستی میں یتامیٰ ہوتے تھے، تو حضرت ابن عمرؓ ان کے اموال کو اپنے ذمے قرض بنالیتے تھے، تاکہ ان کو ضائع ہونے سے بچائیں، پھر ان کے اموال سے ان کی زکوٰۃ نکالتے تھے، درآنحالیکہ وہ مال ان کے ذمے دَین ہوتا تھا۔

یہاں یہ مسئلہ تو علیحدہ ہے کہ نابالغ کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اور مذکورہ واقعے میں "یتامیٰ" سے مراد نابالغ یتامیٰ ہیں یا بالغ یتامیٰ؟ لیکن یہاں جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ان یتامیٰ پر زکوٰۃ فرض سمجھتے تھے، اور ان کے اموال کو خود قرض لے لیتے تھے پھر ان سے قرض ہونے کی حالت ہی میں زکوٰۃ نکالتے تھے۔ یہ صورت موجودہ بینک اکاؤنٹس کی صورت سے بہت قریب ہے کہ دونوں جگہ رقم کو ودیعت کے بجائے قرض بنانے کا مقصد ان اموال کو مضمون بنانا ہے اور باوجودیکہ وہ رقمیں قرض لینے کے بعد حضرت ابنِ عمرؓ کی ملکیت میں آگئیں، لیکن انہوں نے انہی رقموں سے اصل مالکوں کی زکوٰۃ ادا فرمائی۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دَینِ متیقن کو تقدیراً دائن کے قبضے میں قرار دے کر اس سے زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے۔

زکوٰۃ کی نیت کا مسئلہ

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ کی وصولیابی پر تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ بینکوں سے جبراً زکوٰۃ وصول کرنے کی صورت میں اصحابِ اموال کی طرف سے نیت متحقق نہیں ہوگی، حالانکہ نیت ادائے زکوٰۃ کے لئے شرط ہے۔

اس سلسلے میں مجلس کی سابقہ تحریر میں عرض کیا گیا تھا کہ جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار حکومت کو ہے، ان میں حکومت کا وصول کرلینا بذاتِ خود نیت کے قائم مقام ہوجاتا ہے اور دلیل میں علامہ شامیؒ کی یہ عبارت بھی پیش کی گئی تھی کہ:-

وفی مختصر الکرخیؒ اذا اخذھا الامام کرھًا فوضعھا موضعھا اجزأ، لأن له ولایة أخذ الصدقات فقام أخذه مقام دفع المالک، وفی القنیة: فیه اشکال لأن النیة فیه شرط ولم توجد منه اھ قلت: قول الکرخیؒ فقام أخذه الخ یصلح للجواب - تامل. (شامی ج:۲ ص:۳۵)[1]

اس پر بعض حضرات نے یہ شبہ ظاہر فرمایا ہے کہ علامہ شامیؒ نے مذکورہ عبارت کے متصل بعد تحریر فرمایا ہے:-

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۲۹۰ (ایچ ایم سعید).

ثم قال في البحر: والمفتي به التفصيل: ان كان في الأموال الظاهرة يسقط الفرض لأن للسلطان أو نائبه ولاية أخذها وان لم يضعها لا يبطل أخذه، وان كان في الباطنة فلا.[1]

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ اگر جبراً وصول کرلی جائے تو وہ ادا نہیں ہوگی۔

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ مجلس نے اپنی تحریرِ سابق میں جو الفاظ لکھے تھے کہ ''حکومت کو جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے ان میں حکومت کا وصول کرلینا بذاتِ خود نیت کے قائم مقام ہوجاتا ہے۔'' وہ اسی عبارت کے پیشِ نظر لکھے تھے، کیونکہ مذکورہ عبارت میں مدار اس پر ہے کہ سلطان کو ''ولایتِ اخذ'' حاصل تھی یا نہیں؟ اور بینک اکاؤنٹس سے ''ولایتِ اخذ'' کے دلائل پیچھے تفصیل کے ساتھ بیان کئے جاچکے ہیں، لہٰذا زیرِ بحث مسئلے میں مذکورہ عبارت سے حکم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

اور جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حکومت کو ہے ان میں حکومت کی وصولی کا نیت کے قائم مقام ہوجانا ائمہ اربعہ کے نزدیک مُسلّم ہے، اگرچہ ائمہ ثلاثہ نیت کے معاملے میں اتنے سخت ہیں کہ بعض صورتوں میں دلالۃً نیت کو بھی معتبر نہیں مانتے، مثلاً اگر کوئی شخص اپنا سارا مال بغیر نیتِ زکوٰۃ کے صدقہ کردے تو حنفیہ کے نزدیک اس کی زکوٰۃ ساقط ہوجاتی ہے۔ (عالمگیریہ ج:۱ ص:۱۷)[2]

لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نیت کے فقدان کی وجہ سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی۔

(المغني لابن قدامه ج:۲ ص: ۶۳۹[3] **والحطاب ج:۲ ص:۳۵۷)**[4]

لیکن حکومت کی وصولیابی کے سلسلے میں ائمہ ثلاثہ بھی اس پر متفق ہیں کہ وہ نیت کے قائم مقام ہوجاتی ہے، چنانچہ فقہ مالکی کی معروف کتاب ''مواہب الجلیل'' میں ہے:-

اذا أخرج رجل الزكاة بغير علم من هي عليه وغير اذنه في ذلك، فان كان مخرج الزكاة الامام فالزكاة مجزئة.

(مواهب الجليل للحطاب ج:۲ ص:۳۵۶)[5]

اور فقہ شافعیؒ کی معروف کتاب ''نهاية المحتاج'' میں ہے:-

الأصح عند الشافعية ان نية السلطان تكفي اذا أخذ زكاة الممتنع.

(نهاية المحتاج ج:۳ ص:۱۳۸)[6]

---

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۲۹۰ (ایچ ایم سعید). (۲) طبع مکتبه حقانیه پشاور.
(۳) المغني لابن قدامه مسئله:۳۲۲ ج:۳ ص:۸۹ (طبع دار عالم الكتب، رياض).
(۴) طبع دار الفكر. (۵) طبع دار الفكر.
(۶) طبع دار احياء التراث العربي بيروت.

اور علامہ ابنِ قدامہؒ لکھتے ہیں:-

ولا یجوز اخراج الزکاۃ الا بنیۃ الا أن یأخذھا الامام منہ قھرًا.

(المغنی لابن قدامہ ج:۲ ص:۲۳۸)(۱)

پھر یہ ساری تفصیل تو زکوٰۃ کی وصولیابی کے وقت زکوٰۃ کی ادائیگی میں ہے، اور اگر کسی کو اس میں شبہ ہی ہو تو اس کے لئے یہ راستہ موجود ہے کہ وہ زکوٰۃ وضع ہونے کے فوراً بعد نیت کرلے، کیونکہ اگر کوئی فضولی کسی کے مال سے زکوٰۃ ادا کردے تو جب تک مال، فقیر (یا اس کے وکیل) کے قبضے میں ہو، اس وقت تک اصل مالک زکوٰۃ کی نیت کرکے اس کی اجازت دے سکتا ہے، اس کی تصریح فقہائے حنفیہؒ کے کلام میں موجود ہے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

رجل ادی زکٰوۃ غیرہ عن مال ذلک الغیر، فأجازہ المالک، فان کان المال قائما فی ید الفقیر جاز وإلا فلا، کذا فی السراجیۃ.

(عالمگیریۃ ج:۱ ص:۱۷۱)(۲)

واللہ سبحانہ وتعالٰی أعلم بالصواب!

دستخط

۱:- حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب
دار الافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، کراچی

۲:- حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب
دار الافتاء والارشاد، ناظم آباد، کراچی

۳:- حضرت مولانا مفتی سحبان محمود صاحب
دار العلوم کراچی

۴:- حضرت مولانا مفتی عبدالحکیم صاحب
مدرسہ اشرفیہ، سکھر

۵:- حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
مہتمم دار العلوم کراچی

۶:- حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
دار العلوم کراچی

۷:- حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب
دار العلوم کراچی

۸:- حضرت مولانا مفتی وجیہ اللہ صاحب
دار العلوم بھاگ، ضلع کچھی، بلوچستان

اہم وضاحتی نوٹ

(از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

نوٹ! بینک ڈپازٹ کو اَموالِ ظاہرہ میں شامل کرنے کی جو گنجائش اس فتوے میں دی گئی ہے، اُس کے بارے میں یہ تصریح مناسب ہے کہ یہ مسئلہ بندہ کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بھی آیا تھا۔ حضرت

(۱) المغنی لابن قدامہ مسئلہ: ۴۲۲ ج:۴ ص:۸۸ (طبع دار عالم الکتب، ریاض).
(۲) طبع مکتبہ حقانیہ پشاور.

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی تحریر تو اس بارے میں بندہ کو نہیں ملی، لیکن زبانی طور پر اُن سے یہ سُنا یاد ہے کہ بینکوں کے ڈپازٹس کو اَموالِ ظاہرہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس بارے میں ایک تحریر بھی شائع ہوئی ہے جو انہوں نے ایک سوال نامے کے جواب میں تحریر فرمائی تھی اور ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' اور ماہنامہ ''الصدیق'' ملتان میں شائع ہوئی تھی، اس میں حضرتؒ کے الفاظ درج ذیل ہیں:-

''حکومت کو اَموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کے مطالبے کا حق نہیں (إلَّا بالضرورۃ شدیدۃ) بلکہ وہ صرف اَموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کی حق دار ہے، جیسے مویشیوں کی زکوٰۃ جو سال کے زیادہ حصے میں گھر پر نہیں بلکہ جنگل میں چرتے ہوں اور ان تاجروں کے تجارتی مال کی زکوٰۃ جو ایک شہر سے دُوسرے شہر میں مال لے جاتے ہوں اور باہر سے مال منگاتے ہوں، نیز عشری و خراجی زمینوں کا عشر و خراج بھی اموالِ ظاہرہ سے ہیں، اور جو تاجر اپنے شہر ہی میں تجارت کرتا ہے نہ باہر سے مال منگاتا ہے، نہ بھیجتا ہے اس کا تجارتی مال اموالِ باطنہ میں داخل ہے، اسی طرح جو نقد اور زیور کسی کے گھر میں ہے وہ بھی اموالِ باطنہ سے ہے، البتہ جو روپیہ بینک یا لمیٹڈ کمپنیوں میں ہے اس کو اموالِ ظاہرہ میں داخل کیا جاسکتا ہے۔'' (''ترجمان القرآن'' جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ ص:۳۵۵ و ۳۵۶ جلد:۴۳ عدد:۵)

﴿فصل فی العشر والخراج﴾

(عشر اور خراج سے متعلق مسائل کے بیان میں)

پاکستان کی عشری وخراجی زمینوں کا حکم

سوال:- عشر کس زمین پر واجب ہے؟ سرکار جو خراج لیتی ہے کیا اس زمین پر عشر واجب رہتا ہے اور کتنا ہوتا ہے؟ مزارع اور زمیندار میں سے ہر ایک الگ الگ دے یا ایک پر لازم ہے؟ عشر مدرسہ یا مسجد کو دینا جائز ہے اگر دینا جائز ہو تو ملازمینِ مدرسہ کو دینا اور کتب برائے مدرسہ خریدنا جائز ہے؟ عشر دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے؟

جواب:- پاکستان کی بیشتر اراضی عشری ہیں، جن زمینوں کا خراجی ہونا کسی خاص دلیل سے ثابت نہ ہو ان کو عشری ہی سمجھنا چاہئے، لہٰذا اگر وہ بارانی ہو یعنی صرف بارش سے سیراب ہوتی ہو تو اس کی پیداوار میں سے دسواں حصہ اور اگر نہری ہو یعنی ان کی آبپاشی پر محنت یا خرچ کرنا پڑتا ہو تو بیسواں حصہ بطورِ عشر نکالنا واجب ہے،[1] اس عشر کا حکم زکوٰۃ کا سا ہے لہٰذا اسے مصارفِ زکوٰۃ ہی میں صرف کیا جاسکتا ہے۔ حکومت جو ٹیکس وصول کرتی ہے اس سے عشر ادا نہیں ہوتا،[2] عشر الگ نکالنا ضروری ہے۔

الجواب صحیح — واللہ اعلم

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ — احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۴۱/۱۱۹ الف)

عشر ادا کی گئی پیداوار کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہونے کا حکم

سوال:- ایک زمیندار آدمی کے پاس پہلے سے رقم موجود ہے جو حولانِ حول کی بناء پر قابلِ ادائیگیٔ زکوٰۃ ہے، اسی دوران سال میں دوسری فصل کی پیداوارِ زمین فروخت کر کے کچھ رقم حاصل ہوئی جس سے ۱/۱۰ حصہ یا ۱/۲۰ حصہ کی شرح سے عشر بھی ادا کیا گیا ہے، اب صورت یہ ہوئی کہ چار مہینے یا آٹھ

---

(۱) وفی التنویر مع شرحہ ج:۲ ص:۳۲۵ الی ۳۲۸ (طبع ایچ ایم سعید) یجب العشر فی .... (مسقی سماء) ای مطر و (سیح) .... ویجب نصفه فی مسقی غرب أی دلو کبیر (ودالیة) ای دولاب لکثرة المؤنة ..... الخ.

(۲) دیکھئے صفحہ نمبر ۶۷ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۲۔

مہینے کے بعد سالِ اوّل کی رقم پر سال پورا ہوکر زکوٰۃ قابلِ ادا ہوگئی مگر دورانِ سال مال سے (یعنی پیداوار سے) جو رقم حاصل ہوئی ہے، اس پر پورا سال نہیں گزرا ہے اور عشر بھی ادا کیا گیا ہے، تو کیا آخر الذکر رقم کو اوّل الذکر رقم کے ساتھ جمع کیا جائے گا جس پر زکوٰۃ فرض ہے یا اس سال میں اس رقم پر زکوٰۃ نہ ہوگی؟ بعض علماء کی رائے ہے کہ ایک چیز پر ایک وقت میں دو وظیفے لاگو نہیں ہوسکتے کہ دورانِ سال عشر بھی ادا کیا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرے، آپ صحیح صورت حال تحریر فرمائیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زمینی پیداوار کو فروخت کرکے جو رقم سال کے دوران حاصل ہوئی ہے اس کو اصل نقد رقم کے ساتھ ملایا جائے گا اور جب اصل نقد رقم کا سال پورا ہو تو اس کی زکوٰۃ بھی اصل رقم کے ساتھ ادا کی جائے گی، اس سے پہلے جو عشر ادا کیا گیا ہے اس کی بناء پر اس رقم کی زکوٰۃ ساقط نہ ہوگی، کیونکہ عشر زمین کا وظیفہ ہے، نقد کا نہیں، چنانچہ تمام فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے، علامہ ابنِ ہمام لکھتے ہیں: **واتفقوا علی ضم ثمن طعام ادی عشره ثم باعه وثمن ارض معشورة وثمن عبد ادّی صدقة فطره، اما عندهما فظاهر واما عنده فلان البدل لیس بدلا لمال الزکوٰة لان العشر لا یجب باعتبار الملک.** (فتح القدیر ج:۱ ص:۵۱۱)[1] **ومثله فی البحر**[2] **وقال الشامی لو ادی عشر طعام او ارض او صدقة فطر عبد ثم باع حیث تضم اثمانها اجماعًا.** (شامی ج:۲ ص:۳۲)[3]۔

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۳۲/۱۱۹ الف)

حکومتِ برطانیہ کی طرف سے کسی کو دی گئی زمین پر عشر واجب ہوگا یا نہیں؟

سوال:- ایک جگہ پاکستان بننے سے پہلے جنگل تھی۔ حکومتِ برطانیہ نے اس جنگل کی زمین کو چند سو روپیہ مربع پر عوام کے نام الاٹ کردیا تھا اور مالک اس زمین کے، عوام مسلمان ہیں تو اس کی پیداوار پر عشر لازم ہے یا نہیں؟ سنا ہے کہ کافر سے خرید کردہ زمین پر عشر لازم نہیں ہے؟

(۱) فتح القدیر ج:۲ ص:۱۴۸ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔
(۲) البحر الرائق ج:۲ ص:۲۲۳ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۳) رد المحتار ج:۲ ص:۲۸۸ (طبع سعید) نیز دیکھئے احسن الفتاویٰ ج:۴ ص:۲۶۰۔

جواب:- مذکورہ زمین جس وقت حکومتِ برطانیہ کی طرف سے دی گئی اس وقت وہ بنجر تھی، لہٰذا وہ غیر مملوک ہوئی، اور مسلمانوں نے ہی اس کا احیاء کیا، اس بناء پر اس زمین پر عشر ہی واجب ہوگا۔

لما فی الدر المختار وموات احیاه ذمی باذن الإمام او رضخ له کما مر خراجی ولو أحیاه مسلم اعتبر قربهٗ شامی۔[1] کافر سے خریدنے کی صورت میں خراج اس وقت آتا ہے جبکہ کافر نے زمین کو آباد کیا ہو، پھر وہ مسلمان کو بیچ دے، مذکورہ صورت میں چونکہ مسلمانوں نے آباد کیا اس لئے یہ زمین عشری ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۸/۲۲ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱:- ٹیوب ویل سے سیراب کی جانے والی زمین پر نصف عشر واجب ہے
۲:- اخراجات نکالے بغیر عشر دیا جائے گا

سوال ۱:- نہری آبادی پر بیسواں حصہ ادا کرتے ہیں، حالانکہ نہری کی بہ نسبت ٹیوب ویل پر زیادہ خرچ آتا ہے اور ٹیوب ویل پر بھی بیسواں حصہ ادا کرتے ہیں جبکہ خرچہ زیدہ آنے کی وجہ سے عشر اس سے کم ہونا چاہئے۔

۲:- اب کاشت پر کھاد کے زیادہ استعمال کا رواج ہے، اور اس کے بغیر پیداوار حاصل کرنا ناممکن ہے، کھاد کا خرچ فی ایکڑ ۷۰ تا ۸۰ روپے آتا ہے، اسی حساب سے پورے ایکڑ مربع پر خرچ آتا ہے۔ اس پیداوار کا عشر کس حساب سے ادا کیا جائے؟ اور کھاد کے اخراجات نکال کر عشر ادا کرنا دُرست ہے؟

جواب ۱:- ٹیوب ویل سے جو زمین سیراب کی جاتی ہے اس کی پیداوار کا بیسواں حصہ ہی بطورِ عشر نکالا جائے گا۔ ٹیوب ویل پر جو زیادہ اخراجات ہوتے ہیں ان کی وجہ سے عشر کی شرح اس سے کم نہیں ہوگی۔

۲:- کاشت پر جو اخراجات آتے ہیں انہیں نکال کر عشر کا حساب کرنا غلط ہے، عشر کل پیداوار پر ہوتا ہے، کھاد وغیرہ کے اخراجات عشر سے مستثنیٰ نہیں کئے جاسکتے۔

یجب العشر فی الأوّل ونصفه فی الثانی بلا رفع أجرة العمال ونفقة البقر وکری

---

(۱) رد المحتار کتاب الجهاد باب العشر والخراج والجزية ج:۴ ص: ۱۸۴ (طبع سعید)

الأنهار واجرة الحافظ ونحو ذلک. د (شامی ج:۲ ص:۵۱)۔[1] کھاد پر اگر اخراجات بڑھتے ہیں تو پیداوار بھی بڑھتی ہے، پھر عشر میں کمی کرنے کی فکر نہ ہونی چاہئے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۵۴۵/۲۲الف)

پاکستانی زمینوں میں عشری اور خراجی زمینوں کی تعیین اور ان کا حکم

سوال:- واضح فرمائیں کہ عشری اور غیر عشری زمین سے کیا مراد ہے؟

جواب:- عشر کا مسئلہ یہ ہے کہ جو زمینیں پاکستان بننے کے بعد آباد ہوئیں وہ سب عشری ہیں اور جو پہلے سے آباد ہیں ان میں سے صرف وہ خراجی ہیں جو کسی غیر مسلم کے قبضہ میں ہوں یا کسی مسلمان نے انہیں کسی غیر مسلم سے خریدا ہو، اور عشر کا مطلب یہ ہے کہ بارانی زمین ہو تو پیداوار کا دسواں حصہ اور نہری یا چاہی زمین ہو تو بیسواں حصہ ادا کیا جائے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۰/۱/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۸/۳۰د)

زمین خود کاشت کرنے یا ٹھیکے پر دینے کی صورت میں زکوٰۃ کا حکم

سوال ۱:- اگر زمین خود کاشت کی جائے تو اس کی پیداوار پر زکوٰۃ کی شرح کیا ہے؟

۲:- اگر زمین ٹھیکہ پر دی گئی ہو اور اس سے سالانہ آمدنی حاصل ہو تو اس پر زکوٰۃ کس شرح سے واجب ہے؟

جواب ۱:- پاکستان کی بیشتر زمینیں عشری ہیں، لہٰذا اگر وہ بارانی ہیں یعنی بارش سے سیراب ہوتی ہیں تو پیداوار کا دسواں حصہ نکالنا واجب ہوگا، اور اگر انسانی ذرائع سے سیراب کی جاتی ہیں تو بیسواں حصہ۔[2]

۲:- ٹھیکہ کی اُجرت اگر نقد وصول کی گئی ہے تو وہ نقد رقم میں شامل ہوگی اور اس پر نقد ہی کے حساب سے (یعنی چالیسواں حصہ) زکوٰۃ آئے گی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۱۱/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۸/۲۱الف)

***

---

(۱) ردالمحتار باب العشر ج:۲ ص:۳۲۸ (طبع سعید)

(۲) وفی التنویر مع شرحه باب العشر ج:۲ ص.۳۲۵ إلیٰ ۳۲۸ یجب العشر ... فی مسقی سماء ای مطر وسیح ..... ویجب نصفه فی مسقی غرب ای دلو کبیر ودالیة ای دولاب لکثرة المؤنة ..... الخ.

﴿فصل فی مصارف الزکوٰۃ والعشر وصدقۃ الفطر﴾

(زکوٰۃ، عشر اور صدقۂ فطر کے مصارف کے بیان میں)

مستحقِ زکوٰۃ کون ہے؟

سوال:- میں ایک نہایت غریب آدمی ہوں، پاکستان ٹوبیکو کمپنی میں ایک ادنیٰ ملازم ہوں اور مجھے چار سو پینسٹھ (465) روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے، میرے دس بچے ہیں اور دونوں میاں بیوی کو ملا کر اس طرح بارہ آدمیوں کے خاندان کی گزر اوقات کے لئے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ 465 روپے ماہانہ میں کس طرح گزر ہوتی ہوگی، مکان کا کرایہ اور آمد و رفت کا خرچ نکال کر کھانے پینے کا خرچ بھی پورا نہیں ہوتا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے کئی ہزار روپے کا مقروض بھی ہوگیا ہوں جس کی ادائیگی کی کوئی صورت نہیں ہے، میرے ایک کرم فرما صاحبِ ثروت شریف آدمی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر مہتمم صاحب دارالعلوم یہ فرمادیں کہ تم زکوٰۃ کے مستحق ہو تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں کیونکہ میرے پاس زکوٰۃ کی رقم موجود ہے، اب میں اس درخواست کے ذریعہ آپ سے اِلتجا کرتا ہوں کہ آپ میری مندرجہ بالا حیثیت اور حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ فرمادیں کہ یہ زکوٰۃ کا مستحق ہے، یہ بھی عرض کردوں کہ میں سیّد نہیں ہوں۔

جواب:- اگر آپ کے پاس اتنا نقد روپیہ یا زیور یا زائد از ضرورت سامان موجود نہیں ہے کہ آپ اگر اس کے ذریعہ اپنا قرض ادا کردیں تو ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت پھر بھی بچی رہے تو آپ مستحقِ زکوٰۃ ہیں، اور آپ کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔[1]

والله سبحانہ اعلم

۱۴۰۰/۶/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴/۷۳۱ ب)

حقیقی بہن کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- کیا حقیقی بہن کو زکوٰۃ دینا جائز ہے؟

جواب:- حقیقی بہن اگر صاحبِ نصاب نہیں تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔[2]

واللہ اعلم

۱۴۱۴/۹/۱۸ھ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید کراچی) مصرف الزکاۃ (هو فقیر وهو من له أدنی شئی) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة. وفیه ایضًا ج:۲ ص:۳۴۳ (ومدیون لا یملک نصابًا فاضلًا عن دینه).

(۲) حوالہ کے لئے صفحہ نمبر ۱۳۳ اور ۱۵۲ کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

برما کے مظلوم مسلمانوں کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- برما میں ظالم کافروں کے خلاف مجاہدوں کی جو جماعت ہے اگر اس میں زکوٰۃ لینے والے مستحق افراد بھی شامل ہوں تو زکوٰۃ کی رقم ان مستحقین کو دینے سے زکوٰۃ ادا ہوجائیگی یا نہیں؟

جواب:- ان مستحقینِ زکوٰۃ افراد کو بلاشبہ زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۹/۸/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۸۸۲/۲۲ ج)

عشر وصدقۃ الفطر امامت کی تنخواہ میں دینے کا حکم

سوال:- والیانِ ریاست کی جانب سے کوئی زمین امام مسجد کو دی گئی، وہ وقف ہوگی اس کا عشر اور فطرانہ امامِ مسجد کو دیا جاتا ہے، اور دیگر چھ ماہ امامِ مسجد گاؤں کی امامت بہ شکل ملازمت کر کے عشر اور فطرانہ لیتا ہے، اس پر وہ دُعا کرتا ہے اگر دُعا نہ کرے تو مقتدی ناراض ہوتے ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ امامِ مسجد کو چرمِ قربانی، عشر، فطرانہ دینا جائز نہیں ہے، شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب:- عشر یا صدقۃ الفطر کو امامت کی اُجرت میں مقرّر کرنا ہرگز جائز نہیں ہے،[1] امامت کی تنخواہ الگ مقرّر کرنی چاہئے، پھر اگر تنخواہ پانے کے باوجود امام، صاحبِ نصاب نہ ہو یعنی اس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت یا اس قیمت کا زائد از ضرورت سامان نہ ہو تو اسے عشر اور صدقۃ الفطر بھی دیا جاسکتا ہے،[2] لیکن اس کا امامت سے کوئی تعلق نہیں، نہ اس کو تنخواہ کا جزء بنایا جاسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۵/۱۰/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۳۶/۲۸ ج)

زکوٰۃ کے واجب ہونے یا مستحقِ زکوٰۃ ہونے کا معیار

سوال:- سیزنل فیکٹریاں جن میں کپاس بیلنے کے کارخانے، رائس ملیں، شوگر ملیں، برف کے کارخانے وغیرہ شامل ہیں، ایسے کارکن جن کو سیزن ختم ہونے پر فارغ کردیا جاتا ہے یعنی بیکار ہوجاتے ہیں ان میں چند ایک جو بند سیزن یعنی کارخانہ بند ہونے کی صورت میں چند ماہ کے لئے کوئی دُوسرا کام تلاش کرلیتے ہیں، باقی بیکار رہتے ہیں اور آئندہ سیزن کا کام شروع ہونے پر تمام کارکن

---

(۱) وفی الهندية كتاب الزكوة باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (مكتبه رشيديه كوئٹه) ولو نوى الزكوة بما يدفع المعلم الى الخليفة ولم يستاجره إن كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضًا أجزأه والا فلا.... الخ.

وفيها ايضًا كتاب الزكوة ج:۱ ص:۱۷۰ فهي تمليك المال من فقير مسلم غير هاشمي ولا مولاه بشرط قطع المنفعة عن المملك من كل وجه لله تعالىٰ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعيد كراچی) مصرف الزكوة (هو فقير وهو من له أدنىٰ شيء) أى دون نصاب أو قدر نصاب غير تام مستغرق في الحاجة .... الخ.

دوبارہ کام پر آجاتے ہیں، اس طرح مذکورہ کارکنوں کی آمدنی عام آدمی سے نصف، اور غربت دُگنی ہوتی ہے، اس طرح کہ چند ماہ جو لوگ کام کر کے تنخواہ لیتے ہیں، وہ حکومت کے مقرّر کردہ گریڈ کے مطابق تمام الاؤنس وغیرہ شامل کر کے ۲۵۰ روپے ماہوار بنتی ہے اور چالو سیزن کا عرصہ عام طور پر تین چار ماہ ہوتا ہے اس طرح اگر چھ ماہ بھی سیزن چلے تو ایک کارکن کی کل آمدنی ۱۵۰۰ روپے بنتی ہے اور اگر ایک آدھ ماہ کا بونس بھی اس میں شامل کردیا جائے تو ایک سیزنل ورکر کی تمام سال کی آمدنی ۱۷۵۰ روپے ہے جبکہ یہ حکومت کے یکم رمضان المبارک کو زکوٰۃ کاٹنے کے سلسلے میں اعلان کئے گئے نصاب مبلغ ۲۰۰۰ روپے سے بھی ۲۵۰ روپے کم ہے، پھر کیا ایسے افراد کو اجتماعی طور پر مستحقِ زکوٰۃ قرار دیا جانا جائز ہے؟

جواب:- زکوٰۃ کے واجب ہونے یا مستحقِ زکوٰۃ ہونے کے لئے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کسی شخص کی سالانہ آمدنی کیا ہے؟ بلکہ اگر کوئی شخص ساڑھے باون تولے چاندی یا اسکی قیمت کے زائد از ضرورت سامان کا مالک ہو تو وہ مستحقِ زکوٰۃ نہیں ہوتا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ان سیزنل افراد میں سے جو صاحبان ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی قیمت کے، ضرورت سے زائد سامان کے مالک ہوں وہ مستحقِ زکوٰۃ نہیں، البتہ جو صاحبان اس معیار پر نہ اُترتے ہوں ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے،[1] زائد از ضرورت سامان میں ٹی وی اور زیورات داخل ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۲/۳/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۵۳/۳۲ ج)

زکوٰۃ کی ادائیگی میں اپنے مستحق اعزاء واقارب کو مقدم رکھنا چاہیئے

سوال:- (پچھلے سوال میں) مذکورہ کارخانوں کے مالکوں یا انتظامیہ کو اس بات کا پابند کیا جانا جائز ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ کی رقم مذکورہ بیکار افراد میں تقسیم کریں؟

جواب:- اصل مسئلہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کا جو حصہ مالکان خود ادا کرتے ہوں اس میں انہیں اختیار ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف میں سے جس مصرف میں چاہیں زکوٰۃ کی رقم لگادیں، لیکن ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے عزیز واقارب میں سے ضرورت مند افراد کو مقدم رکھیں، اس کے بعد اپنے پڑوسیوں کو ترجیح دیں،[2] صورتِ مسئولہ میں یہ بے کار افراد اسی اُصول کے تحت عزیز واقارب کے بعد

---

(۱) وفی تنویر الأبصار ج:۲ ص:۲۹۵ و ۲۹۸ (طبع سعید کراچی) نصاب .... الفضة مائتا درهم .... او فی عرض تجارة قیمته نصاب.

وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید) مصرف الزکوٰة (هو فقیر وهو من له ادنیٰ شیٔ) ای دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة (ومسکین من لا شیٔ له) علی المذهب الخ.

(۲) وفی الشامیة ج:۲ ص:۳۵۳ (طبع سعید کراچی) عن أبی هریرةؓ مرفوعا الی النبی صلی الله علیه وسلم انه قال: یا امة محمد! والذی بعثنی بالحق لا یقبل الله صدقة من رجل وله قرابة محتاجون الی صلته ویصرفها الی غیرهم والذی نفسی بیده! لا ینظر الله الیه یوم القیامة ... وفی القریب جمع بین الصلة والصدقة وفی القهستانی والأفضل اخوته وأخواته ثم أولادهم ثم أعمامه وعماته ثم أخواله وخالاته ثم ذوو أرحامه ثم جیرانه ثم أهل سکنه ثم أهل بلده.

وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۹۰ (رشیدیه کوئٹه) والأفضل فی الزکوٰة والفطر والنذور الصرف أولًا الی الاخوة والأخوات ثم الی أولادهم ..... ثم الی الجیران ..... الخ.

زیادہ مقدم ہوں گے بشرطیکہ وہ مستحق رہتے ہوں، لہٰذا فیکٹری کے مالکان کو چاہئے کہ وہ ان کو ترجیح دیں لیکن ان کو بزورِ قانون اس کا پابند نہیں کیا جاسکتا، البتہ اس علاقے سے جو زکوٰۃ حکومت وصول کرے اس میں بہتر یہی ہے کہ وہ اسی علاقے کے لوگوں پر صرف کرے،[1] اور ان بیکار افراد کی اس مد سے مدد کرے۔

واللہ اعلم
۱۴۰۲/۳/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۵۳۱۶/۳۳ ج)

مسجد کے لئے زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- مرحوم کی نمازوں کا فدیہ اور زکوٰۃ کی رقم اگر مسجد میں دیدی جائے تو فدیہ اور زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

جواب:- مسجد میں دینے سے زکوٰۃ اور فدیہ ادا نہ ہوگا، کسی فقیر کو مالک بنا کر دینا ضروری ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۱/۲۸ ج)

زکوٰۃ کی رقم تعمیرِ مسجد اور اساتذہ کی تنخواہوں میں استعمال کرنے کا حکم

سوال ۱:- ہماری سوسائٹی نے قرآن پاک کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کھولا ہے، جس میں تقریباً ۱۵۰ طلباء وطالبات زیرِ تعلیم ہیں، مدرسہ اور سوسائٹی کی کوئی آمدنی نہیں ہے، سپارے، قرآن پاک مدرسہ کی جانب سے دیئے جاتے ہیں، کیا زکوٰۃ، فطرہ، صدقہ، قربانی کی کھال اور عقیقہ کی کھال کے پیسے کو، مدرسہ کے تعمیراتی کام پر خرچ کیا جاسکتا ہے؟ ۲:- کیا یہ پیسہ مسجد میں لگایا جاسکتا ہے؟ ۳:- کیا ان پیسوں سے اساتذہ، مؤذن اور امام کو تنخواہ دی جاسکتی ہے؟

جواب ۱:- زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور چرمِ قربانی کی قیمت کسی غیر صاحبِ نصاب کو مالک و مستحق بنا کر دینی ضروری ہے، تعمیرِ مدرسہ میں اس کا استعمال ہرگز جائز نہیں۔[3]

۲:- نہیں۔[4] ۳:- نہیں۔[5]

واللہ اعلم
۱۳۹۸/۷/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۸۳۹/۲۹ ب)

---

(۱) وفی الهندية كتاب الزكوة الباب السابع فی المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) ويكره نقل الزكوة من بلد الى بلد إلا أن ينقلها الانسان الى قرابته أو الىٰ قوم هم أحوج اليها من أهل بلده وكذا فی الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۳۵۳ (طبع سعيد).

(۲ - ۴) وفی التنوير مع شرحه ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعيد كراچی) ويشترط ان يكون الصرف (تمليكاً) لا إباحة .... لا يصرف الى بناء نحو مسجد .... الخ.

(۵) وفی الهندية كتاب الزكوة، باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع رشيديه كوئٹه) ولو نوى الزكوة بما يدفع المعلم الى الخليفة ولم يستأجره ان كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان ايضاً أجزأه وإلا فلا ... الخ. (محمد زبیر حق نواز)

مستحقِ زکوٰۃ کی تفصیل

سوال:- ایک شخص کے پاس دس بیگھے زمین مزروعہ یعنی ۵ ۱ ایکڑ زمین ہے (جس کو اجارہ پر دیتا ہے، ان سے ضروریات پوری نہیں ہوتیں)۔

۲:- رہائشی گھر، ۳:- ملازمت کی ۲۲۹ روپیہ ماہوار تنخواہ بغیر خورد و نوش کے ہے، اس کی ضروریات میں سے ایک بڑے لڑکے کی شادی کر چکا ہے، دو چھوٹے نابالغ بچوں کو دینی تعلیم دلانے کا ارادہ ہے، ابھی حفظِ قرآن کر رہے ہیں، اہلیہ فوت ہو چکی ہے، خود شادی کرنے کا بھی ارادہ رکھتا ہے، کیا ایسے شخص کو عشر یا زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، اور کیا اس کو لینا جائز ہے؟

جواب:- اس میں اُصول یہ ہے کہ اگر شخصِ مذکور کے پاس اس کی ضروریاتِ خورد و نوش ولباس و رہائش سے فاضل اتنی رقم نقد یا ضرورت سے زائد کپڑے، فرنیچر وغیرہ ہو جس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو جائے، تو اس کے لئے زکوٰۃ وعشر لینا جائز نہیں، اور اگر اتنی رقم یا ضروریات سے زائد کپڑے، فرنیچر اس قیمت کا نہیں تو اس کے لئے زکوٰۃ وعشر لینا جائز ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ

صدقۂ فطر کی مقدار اور اس کے مستحقین

سوال ا:- صدقۂ فطر کے مستحقین کون ہیں؟

جواب ا:- جو لوگ بھی صاحبِ نصاب نہ ہوں۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۲۴/۲۸ ج)

ایک شخص کو ایک سے زائد فطرہ دینے کا حکم

سوال:- انفرادی حاجت مند کو ایک سے زیادہ فطرہ دیا جاسکتا ہے؟

جواب:- دیا جاسکتا ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۲۴/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (ایچ ایم سعید) مصرف الزکوٰۃ والعشر .... (هو فقیر وهو من له أدنیٰ شیٔ) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة .... الخ.

(۲) وفی الهندية كتاب الزكوٰة باب صدقة الفطر ج:۱ ص:۱۹۴ (طبع رشيديه كوئٹه) ومصرف هذه الصدقة ما هو مصرف الزكوة.

(۳) وفی التنوير مع شرحه ج:۲ ص:۳۶۷ (طبع سعيد كراچی) وجاز دفع كل شخص فطرته الیٰ مسكين أو مساكين علی المذهب كما جاز دفع صدقة جماعة الیٰ مسكين واحد بلا خلاف.

یتیم خانے میں فطرہ دینے کا حکم

سوال:- یتیم خانے میں منتظمین کے ہاتھ یتیموں کی خاطر کئی فطرہ دیا جاسکتا ہے؟

جواب:- اگر یتیم خانے والے یتیموں کو مالک بنا کر دینے یا کھانا کھلانے کا اہتمام کرتے ہوں تو دیا جاسکتا ہے، اور اگر وہ اس کو تعمیر وغیرہ پر صرف کریں تو نہیں۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۱۰/۱۰/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۲۴/ ۲۸ ج)

گھر کی ملازمہ کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- میری ملازمہ غریب ہے اور اس کی لڑکی بالغ ہے کیا میں اس کی شادی زکوٰۃ کی رقم سے کرسکتا ہوں؟ اگر کرسکتا ہوں تو کیا کیا چیزیں دے سکتا ہوں؟ اسی طرح ایک غریب بے سہارا عورت میرے ساتھ رہتی ہے، کیا میں اس کو زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟ گھر کے کام کاج میں بھی برابر کا حصہ لیتی ہے۔

جواب:- اگر آپ کی ملازمہ کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس قیمت کی نقدی یا زائد از ضرورت سامان موجود نہیں ہے، تو وہ مستحقِ زکوٰۃ ہے، آپ اس کو زکوٰۃ کی رقم مالک وقابض بنا کر دے سکتے ہیں،[2] وہ اپنی لڑکی کی شادی پر بھی اس کو خرچ کرسکتی ہے، نیز اگر لڑکی بھی مذکورہ تفصیل کے مطابق مستحقِ زکوٰۃ ہے تو اس کو بھی زکوٰۃ کی رقم مالک بنا کر دی جاسکتی ہے،[3] یا زکوٰۃ سے اس کے کپڑے بنا کر دئے جاسکتے ہیں لیکن زکوٰۃ سے اُمراء کی دعوت وغیرہ کرنا جائز نہیں۔[4] واللہ سبحانہ اعلم

۹/۸/۱۳۹۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۱۸/ ۲۹ ب)

زکوٰۃ سے یتیم خانے کے لئے کمرہ کرایہ پر لینے کا حکم

سوال:- یتیم خانے کے سرپرست جو رقم دینا چاہتے ہیں وہ زکوٰۃ وصدقہ کی رقم ہے جو یتیم بچوں کی ضروریات میں خرچ ہونے کے لئے دے رہے ہیں، کیا ایسی رقوم سے یتیم خانہ کمرہ لے سکتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) وفی الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف (تملیکاً) لا اباحة، کما مر لا یصرف الی بناء نحو مسجد ولا الی کفن میّت، وقضاء دینه .... الخ. وفی الشامیة تحت (قوله نحو مسجد) کبناء القناطر والسقایات واصلاح الطرقات .... الخ.

(۳،۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید کراچی) مصرف الزکٰوة (هو فقیر وهو من له ادنی شئ) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر تام مستغرق فی الحاجة

(۴) وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۸۹ (طبع رشیدیه کوئٹه) ولا یجوز دفع الزکٰوة الیٰ من یملک نصابًا .... الخ.

جواب:- زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، چرمِ قربانی کی رقوم کسی مستحق کو مالک و قابض بنا کر دینا ضروری ہے، لہٰذا یہ رقوم کسی رفاہِ عامہ کے کام میں خرچ نہیں کی جاسکتیں[1]، اور ان سے یتیم خانہ کے لئے کوئی کمرہ کرائے پر لینا بھی جائز نہیں۔[2] واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۹ھ

بیوہ کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- کچھ رقم میرے داماد نے بینک سے بھیجی ہے جو کہ زکوٰۃ میں سے دی ہے۔ میری بہن بیوہ ہے، کیا میں ان پر خرچ کرسکتی ہوں؟ بطورِ امداد اور حج میں یہ رقم وہ لگاسکتی ہیں؟ کیونکہ وہ بیوہ ہے کوئی آمدنی اور کوئی جائیداد نہیں ہے۔

۲:- اور کیا یہ رقم تعمیرِ مسجد میں لگائی جاسکتی ہے (زکوٰۃ کا روپیہ ہے) یا کسی خانقاہ میں لگائی جاسکتی ہے یا اسلامی لائبریری میں لگائی جاسکتی ہے یا نہیں؟ ۳:- کسی کا بیٹا اگر جائیداد وغیرہ سب کا مالک ہوجائے یعنی ماں کے نام ہوتے ہوئے ماں کو محروم کردے اور ماں بیوہ ہے اور وہ مجبور ہے تو اس رقم کو وہ اپنے اُوپر لگاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب ۱، ۲:- زکوٰۃ کی رقم صرف ایسے شخص کو دی جاسکتی ہے جو ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کے زائد از ضرورت سامان کا مالک نہ ہو، لہٰذا اگر وہ بیوہ خاتون صاحبِ نصاب نہیں ہیں اور ان کے پاس مذکورہ قیمت کا زیور یا نقد روپیہ یا زائد از ضرورت سامان موجود نہیں ہے تو آپ یہ رقم ان کو دے سکتی ہیں، مسجد کی تعمیر یا لائبریری کے قیام میں زکوٰۃ کی رقم استعمال نہیں ہوسکتی۔[3]

۳:- اگر وہ بیوہ مذکورہ تفصیل کے مطابق صاحبِ نصاب نہ ہوں تو زکوٰۃ کی رقم لے سکتی ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۲/۱۲/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۲۲/۳۳ د)

مقروض کو زکوٰۃ دینے کی تفصیل

سوال:- ایک عورت بیوہ ہے اس کے بچے ہیں، خود محنت کرتی ہے، اور ایک بچہ نوکری کرتا ہے، اس نے کافی بڑی رقم کچھ عزیزوں سے قرض لے کر مکان خریدا ہے جس میں اب وہ رہتی ہے وہ تھوڑا زیور بھی رکھتی ہے جس کی زکوٰۃ دیتی تھی، کیا اس کو اب بھی زکوٰۃ دینی ہے اگر نہیں تو کیا اس کو بغیر

(۱، ۲، ۳) وفی تنویر الابصار مع شرحہ ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً لا اباحۃ .... لا یصرف الی بناء نحو مسجد ولا الیٰ کفن میّت وقضاء دینہ. وفی الشامیۃ تحت (قولہ نحو مسجد) کبناء القناطر والسقایات واصلاح الطرقات وکری الانہار الخ.

علم میں لائے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

جواب:- اگر اس پر واجب الاداء قرض اس زیور کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں[1] اور اس کو زکوٰۃ بھی دی جاسکتی ہے، اور اگر زیور کی مالیت قرض سے ساڑھے باون تولہ چاندی کی مقدار سے زائد ہے تو وہ صاحبِ نصاب ہے، اس کو زکوٰۃ ادا کرنی ضروری ہے[2] اور اسے زکوٰۃ بھی نہیں دی جاسکتی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۸/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۱۷/۲۹ ب)

سادات بنو ہاشم کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی

سوال:- سیّد خاندان کو زکوٰۃ دینا منع ہے اگر سیّد خاندان کی کوئی خاتون پردہ نشین اور مالی حالت سے پریشان ہے تو اس کی کفالت اور کنبہ پروری پر سیّد اگر اس کی مدد کرے یعنی دونوں سیّد ہیں تو کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- سادات بنوہاشم کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی[3] البتہ ان کو ہدیہ پیش کرنا نہایت موجبِ اجر وثواب ہے، خاص طور پر اگر وہ ضرورت مند ہوں تو ہدایا کے ذریعے ان کی اعانت سب مسلمانوں کو کرنی چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۷/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۸۷۵/۲۹ ب)

مستحق کا زکوٰۃ لے کر مسجد کو عطیہ کرنے کا حکم

سوال:- ہمارے محلہ کی مسجد کمیٹی نے پہلی دفعہ اس ماہ رمضان میں چندہ فطرہ، زکوٰۃ کی رقم مسجد کے لئے اکٹھی کی تھی تاکہ دینی مدرسہ کو ترقی ہو، مگر صدر کمیٹی نے وہ رقمِ فطرہ و زکوٰۃ مسجد فنڈ میں شامل کردی، پہلے یہ رقم ایک طالب علم کو دی اس شخص نے وہ رقم مسجد کو بطورِ عطیہ دی، کیا یہ رقم اس طرح منتقل ہوسکتی ہے؟ اور یہ طریقہ جائز ہے؟

جواب:- زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی رقم کسی مستحق کو مالک وقابض بنا کر دینا ضروری ہے، اور

---

(۱) وفی الهندية كتاب الزكوة ج:۱ ص:۱۷۲ (مكتبه رشيديه كوئته) قال اصحابنا رحمهم الله كل دين له مطالب من جهة العباد يمنع وجوب الزكوة .... الخ.

(۲) وفی الهداية كتاب الزكوة ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان) ومن كان عليه دين يحيط بماله ....وان كان ماله اكثر من دينه زكى الفاضل اذا بلغ نصابًا.

(۳) وفی الهندية كتاب الزكوة باب المصارف ج:۱ ص:۱۸۹ (طبع رشيديه كوئته) ولا يدفع الى بنى هاشم .... الخ، تفصیلی حوالہ جات صفحہ نمبر ۱۵۹ کے حاشیہ نمبر ۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

یہ رقم مسجد میں یا مدرسہ کی تعمیر میں یا تنخواہوں میں صرف کرنا جائز نہیں[1]، البتہ اگر وہ مستحق شخص اس رقم کو مالک وقابض کی حیثیت سے وصول کرلے اور یہ سمجھ لے کہ یہ رقم اس کی ہوگئی اور اس کے بعد اپنی مرضی سے بغیر کسی دباؤ یا لالچ کے وہ رقم مسجد میں اپنی طرف سے دیدے تو اب اس کا استعمال جائز ہے،[2] لہٰذا اگر مذکورہ طالبِ علم کو واقعۃً اس رقم کا مالک بنادیا گیا تھا اور اس نے اس پر قبضہ بھی کرلیا تھا اور یہ سمجھ چکا تھا کہ یہ رقم اس کی ہے اور اس کے استعمال میں وہ خودمختار ہے، پھر کسی دباؤ کے بغیر اس نے وہ رقم مسجد میں دیدی تو اب اس رقم کا استعمال مسجد میں جائز ہے ورنہ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۱/۷/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۵/ ۲۸الف)

کئی مکانات اور سامان کے مالک کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی

سوال:- الف کے پاس پانچ مکان ہیں اور ضروریاتِ زندگی کے سب سامان کے علاوہ ریڈیو، فریج، ٹی وی بھی موجود ہے پہلے وہ زکوٰۃ بھی دیتا رہا ہے، مگر اب مندرجہ بالا چیزوں کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے، اور گزرکرائے سے مشکل سے ہوتی ہے، وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے یا اس کے علم میں لائے بغیر اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر اس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا زیور یا نقد کھانے پینے کی روزمرہ ضروریات سے فاضل موجود نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، لیکن صورتِ مسئولہ میں اس کے لئے زکوٰۃ وصول کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۸/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۱۶/ ۲۹ب)

زکوٰۃ وفطرہ رفاہی کاموں اور طلباء کے تعلیمی وظائف میں خرچ کرنا

سوال:- السلام علیکم میں پہلے اپنا تعارف کراتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ میں یہ ساری

---

(۱) فی الدر المختار مع رد المحتار کتاب الزکوۃ باب المصارف ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا اباحۃ کما مر لا یصرف الی بناء نحو مسجد، ولا الیٰ کفن میّت وقضاء دینہ. وفی الشامیۃ تحت (قولہ نحو مسجد) کبناء القناطر .... وکل ما لا تملیک فیہ.

وفی الھندیۃ کتاب الزکوۃ باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) ولو نوی الزکوۃ بما یدفع المعلم الی الخلیفۃ ولم یستأجرہ ان کان الخلیفۃ بحال لو لم یدفعہ یعلم الصبیان أیضا أجزأہ والا فلا .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع سعید) وحیلۃ التکفین بھا التصدق علی فقیر، ثم ھو یکفن فیکون الثواب لھما وکذا فی تعمیر المسجد.

معلومات کس لئے چاہتا ہوں؟ میں کوئی عرصہ پانچ سال سے کینیڈا، امریکہ اور اب انگلینڈ برطانیہ سے کچھ پیسہ اکٹھا کر کے انڈیا اور پاکستان کے غریب طلبہ کو دُنیاوی تعلیمی وظائف کے لئے بھیجتا ہوں، الحمدللہ یہ کام اب بہت اچھی طرح چل رہا ہے، کیونکہ اس رقم میں فطرہ، زکوٰۃ، بینک کا سود، صدقہ، خیرات، کفارے کی رقم اور لاٹری کی رقم شامل ہے، اس لئے میں دارالعلوم سے درخواست کرتا ہوں کہ ہرایک موضوع یعنی فطرہ، زکوٰۃ، بینک کا سود، صدقہ، خیرات، کفارہ اور لاٹری پر یہ فتویٰ صادر کریں کہ مذہب کی روشنی میں یا دینی علوم اور موجودہ حالات کی روشنی میں دارالعلوم کا کیا خیال ہے؟

اُوپر ذکر کی ہوئی بات کو میں تفصیلاً بیان کرتا ہوں فطرہ اور زکوٰۃ کے بارے میں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ فطرہ اور زکوٰۃ رفاہی کاموں میں اور تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال تو ہوسکتا ہے، مگر اس کا اظہار اس پر کرنا ضروری ہے جس کو دیا جارہا ہے، اس سلسلے میں آپ لوگوں کی رائے درکار ہے۔

بینک کے سود اور لاٹری کے سلسلے میں چند لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں حرام ہیں اور قرآن میں صاف صاف بیان کردیا گیا ہے۔ بینک کا سود ایک صورت ہی میں مل سکتا ہے اور دوسری صورت میں نہیں، یعنی اگر پیسہ سیونگ اکاؤنٹ میں رکھا جائے تو سود مل سکتا ہے اور اگر یہی پیسہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھیں تو نہیں ملتا، اس کا کیا حکم ہے؟ سیونگ اکاؤنٹ میں رقم رکھ کر جو سود مل رہا ہو وہ لے لیں اور رفاہی کام میں استعمال کرلیں تو کیا یہ جائز ہوگا؟ اور ہم کسی گناہ کے مرتکب تو نہیں ہوں گے؟

صدقہ، خیرات اور کفارے کی رقم غریب طلبہ کو وظائف جاری کرنے میں استعمال کرسکتے ہیں؟ ساتھ میں یہ بھی درخواست کرتا ہوں کہ از رُوئے شرع کفارہ کا کیا حکم ہے؟ نیز یہ کفارہ کینیڈا اور امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں رہنے والا وہاں کے حساب سے کفارہ دے یا انڈیا، پاکستان بھیجنے کی صورت میں انڈیا اور پاکستان کے حساب سے دیا جاسکتا ہے؟ اخیر میں ایک اور سوال دریافت طلب ہے وہ یہ کہ یہاں پر لوگ قربانی کرتے ہیں مگر گوشت کے حصے نہیں کرتے یا وہاں ایسے غرباء نہیں جن میں غرباء کا حصہ تقسیم کیا جائے ان غرباء کے حصے کے سلسلے میں دارالعلوم کیا فتویٰ رکھتا ہے؟

جواب:- پہلے اُصولی طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور کفارہ کی رقم کسی ایسے غریب شخص کو مالک وقابض بنا کردی جانی ضروری ہے، جو صاحبِ نصاب نہ ہو، یعنی اس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کا نقد روپیہ، زیور یا گھر کا ضرورت سے زائد سامان نہ ہو، لہٰذا جو طلباء ان شرائط پر پورے اُترتے ہوں انہیں تعلیمی وظیفہ اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ رقم ان کو مالک بنا کر ان کے حوالے کردی جائے[1] اور پھر وہ اپنے تعلیمی مصارف میں اس کو خرچ کریں یا پھر وہ آپ کے لئے

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف تملیکاً لا اباحة.

وکالت نامہ تحریر کردیں کہ ہم آپ کو اپنی طرف سے زکوٰۃ کی رقم وصول کرنے اور پھر ہماری طرف سے اس کو ہماری تعلیمی ضروریات پر خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، لیکن زکوٰۃ کی مذکورہ رقم کو کسی تعمیر یا اساتذہ کی تنخواہوں یا کسی رفاہی کام پر خرچ کرنا جائز نہیں،(۱) یہ تفصیل تو زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور کفارے کی رقم کے بارے میں ہے۔

جہاں تک بینک کے سود کا تعلق ہے، اس کا لینا دینا قطعاً حرام ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ بینک سے سود وصول نہ کریں یا تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوادیں یا سیونگ اکاؤنٹ میں اس تصریح کے ساتھ رکھوائیں کہ ہماری رقم پر سود نہ لگایا جائے، تاہم اگر کسی شخص نے غلطی یا لاعلمی سے بینک سے سود کی رقم وصول کرلی تو اسے ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کرنا ضروری ہے اور اس صدقہ کے بارے میں بھی وہی شرائط ہیں جو اُوپر زکوٰۃ کے بارے میں عرض کی گئیں، یعنی وہ کسی غیر صاحبِ نصاب کو مالک بناکر دینا ضروری ہے، اسے بھی عام رفاہی کاموں میں نہیں لگایا جاسکتا،(۲) رہی لاٹری! تو وہ شرعاً قمار ہے، اس میں حصہ لینا حرام ہے۔(۳) اور اگر غلطی سے اس کی رقم وصول کرلی ہے تو اس کا بھی وہی حکم ہے جو سود کا بیان ہوا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۰/۱۱/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۱/۷/۳۱ ج)

مسجد کی تعمیر اور اساتذہ کی تنخواہ میں زکوٰۃ نہیں لگ سکتی

سوال ۱:- کیا زکوٰۃ، صدقہ اور فطرہ کا پیسہ مسجد کی تعمیر پر خرچ کیا جاسکتا ہے؟

۲:- کیا زکوٰۃ، فطرہ اور صدقہ کا پیسہ استادوں کی تنخواہ میں دیا جاسکتا ہے؟

جواب:- زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی رقم نادار افراد کو مالک وقابض بناکر دینی ضروری ہے(۴) لہٰذا

---

(۱) فی الدر المختار مع رد المحتار کتاب الزکوٰۃ باب المصارف ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا اباحۃ کما مر لا یصرف الیٰ بناء نحو مسجد، ولا الیٰ کفن میّت وقضاء دینہ. وفی الشامیۃ تحت (قولہ نحو مسجد) کبناء القناطر .... وکل ما لا تملیک فیہ.

وفی الهندیۃ کتاب الزکوٰۃ باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) ولو نوی الزکوٰۃ بما یدفع المعلم الی الخلیفۃ ولم یستأجرہ ان کان الخلیفۃ بحال لو لم یدفعہ یعلم الصبیان ایضًا أجزأہ والا فلا .... الخ.

(۲) کسبِ خبیث اور مالِ حرام کے مصرف سے متعلق بعد میں حضرت والا دامت برکاتہم نے مفصل تحقیق فرمائی جو ان شاء اللہ آگے "کتاب الحظر والاباحۃ" میں درج کی جائے گی۔

(۳) اس کی مفصل تحقیق حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب عدالتی فیصلے میں "لاٹری حرام ہے" کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

ان رقوم کو مسجد یا مدرسے کی تعمیر یا ملازمین واساتذہ کی تنخواہوں پر صرف کرنا جائز نہیں۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۵/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵۵/۲۹ ب)

زکوٰۃ کی رقوم اکٹھی کر کے تعمیرات ومواصلات میں خرچ کرنے کا حکم

سوال:- اگر زکوٰۃ کی رقم کو اکٹھا کر کے حکومت کی تحویل میں دیدیں تو اس کا استعمال کہاں کہاں ہوگا؟ مثلاً فوج، تعمیرات، مواصلات اور دیگر فلاحی کام جو کچھ بھی ترقی پذیر ممالک میں درکار ہوتے ہیں ان میں یہ پیسے خرچ ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- زکوٰۃ کا مصرف غرباء اور مساکین ہیں اور یہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ ان کو قابض و مالک بنا کر دی جائے، فوج، تعمیرات، مواصلات اور دوسرے ایسے رفاہی کاموں میں زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں جن میں کسی فردِ واحد کو زکوٰۃ کا مالک نہ بنایا جاتا ہو۔ (۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۴/۲۸ الف)

زکوٰۃ میں دوائیں دی جاسکتی ہیں

سوال:- ہم نے ہفتے میں تین چار دن کا کچھ وقت غریبوں کے علاج کے لئے وقف کیا ہے کچھ دوائیں ہم اپنی طرف سے دیدیتے ہیں باقی مہنگی دوائیں ہم بازار سے لکھ دیتے ہیں جو بازار سے خریدنی پڑتی ہیں جو غریب آدمی کے لئے مشکل ہے۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ہم وہ دوائیں بھی ان کو زکوٰۃ کے پیسوں سے دیدیں؟ کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ زکوٰۃ کے پیسوں کی دوائیں ہیں؟

جواب:- زکوٰۃ میں دوائیں بھی دی جاسکتی ہیں البتہ شرط یہ ہے کہ جس شخص کو دی جارہی ہیں وہ مستحقِ زکوٰۃ ہو اور اس کو یہ دوائیں مالک وقابض بنا کر دی جائیں (۳) لیکن اسے یہ بتانا ضروری نہیں کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے۔ (۴)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۶/۲۸ الف)

(۱، ۲) وفی الدر المختار مع رد المحتار کتاب الزکٰوۃ باب المصارف ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا اباحۃ کما مر لا یصرف الیٰ بناء نحو مسجد، ولا الیٰ کفن میّت وقضاء دینہ، وفی الشامیۃ تحت (قولہ نحو مسجد) کبناء القناطر .... وکل ما لا تملیک فیہ.

وفی الھندیۃ کتاب الزکٰوۃ باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) ولو نوی الزکوۃ بما یدفع المعلم الی الخلیفۃ ولم یستأجرہ ان کان الخلیفۃ بحال لو لم یدفعہ یعلم الصبیان أیضًا أجزاہ والا فلا .... الخ .

(۳، ۴) اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

اسکول کی عمارت کی تعمیر یا تنخواہ میں زکوٰۃ استعمال کرنا

سوال:- زکوٰۃ کی رقم اسکول کی عمارت کی تعمیر یا دیگر مصارف مثلاً عملہ کی تنخواہوں پر خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- زکوٰۃ کی رقم فقیر کو مالک بنا کر دینا ضروری ہے، اسکول کی عمارت کی تعمیر یا عملے کی تنخواہ پر صرف کرنا جائز نہیں۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۰۰/۳۳ ج)

زکوٰۃ اور قربانی کی کھالوں سے مستحق امام مسجد کو تنخواہ دینے کا حکم

سوال ۱:- امامِ مسجد کو بچوں کو درسِ قرآن دینے کے عوض قربانی کی کھالیں یا اس کی قیمت دینی جائز ہے یا نہیں؟

۲:- امام کو زکوٰۃ کا پیسہ، فطرہ اور صدقہ کی کھالیں دینا جائز ہے یا نہیں؟

۳:- ایسی صورت میں جبکہ اس کی گزر اوقات کے لئے اور کوئی ذریعہ نہیں، یا بالفرض ہے تو لیکن اتنا نہیں کہ گزارہ ہو سکے، تو ایسی صورت میں اسے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- قربانی کی کھالیں کسی کو کسی خدمت کے معاوضہ میں یا تنخواہ میں دینا جائز نہیں۔ (۲)

۲:- زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر اور صدقے کی کھالوں کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ اُجرت یا تنخواہ میں نہیں دی جاسکتیں۔ (۳)

۳:- ایسی صورت میں ان صاحب کے لئے تنخواہ الگ سے مقرر کرنی چاہئے اس کے باوجود اگر وہ صاحبِ نصاب نہ ہو تو زکوٰۃ اور قربانی کی کھالوں سے بھی ان کی امداد کی جاسکتی ہے لیکن زکوٰۃ، فطرے اور کھالوں کو تنخواہ میں نہیں لگایا جاسکتا۔ (۴)

واللہ سبحانہ اعلم
۲۲/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۶/۲۸ الف)

(حاشیہ صفحۂ گزشتہ)..... (۳) وفی الدر المختار مع رد المحتار کتاب الزکوٰۃ باب المصارف ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید) ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا اباحة کما مر لا یصرف الیٰ بناء نحو مسجد، ولا الیٰ کفن میّت وقضاء دینه، وفی الشامیة تحت (قوله نحو مسجد) کبناء القناطر ..... وکل ما لا تملیک فیه . (۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص. ۲۶۸ (طبع سعید) وشرط صحة أدائها نیة مقارنة له ای للاداء وفی الشامیة تحت قوله نیة أشار إلی انه لا اعتبار للتسمیة فلو سماها هبة أو قرضا تجزیه فی الأصح ..... الخ.

(۱-۴) وفی الهندیة کتاب الزکوٰة باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع رشیدیه کوئته) ولو نوی الزکوٰة بما یدفع المعلم الی الخلیفة ولم یستاجره ان کان الخلیفة بحال لو لم یدفعه یعلم الصبیان أیضًا أجزأه والا فلا . نیز دیکھئے گزشتہ صفحے کا حاشیہ نمبر ۱ تا ۴۔ وفی الشامیة کتاب الزکوٰة باب المصرف ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع ایچ ایم سعید) مصرف الزکوٰة والعشر ..... وهو مصرف ایضًا لصدقة الفطر.

زکوٰۃ سے معلم قرآن کو تنخواہ دینے کا حکم

سوال:- بچوں کو دینی تعلیم دینے کے لئے ایک مولوی صاحب مقرّر ہیں محلے کے بچے ایک دو گھنٹہ قرآن پڑھ کر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں، مدرسہ کی جانب سے طعام وقیام کا انتظام نہیں ہے۔ کیا عوام انہیں زکوٰۃ، فطرہ، چرمِ قربانی کی رقم سے تنخواہ دے سکتے ہیں؟ ایسی صورت میں زکوٰۃ وغیرہ ادا ہوجائیگی؟

جواب:- زکوٰۃ سے مذکورہ معلم صاحب کی تنخواہ شرعاً نہیں دی جاسکتی[۱]، ہاں اگر وہ مستحقِ زکوٰۃ ہوں یعنی ان کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا زائد از ضرورت سامان نہ ہو تو تنخواہ کے علاوہ ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، یعنی تنخواہ الگ مقرّر ہو اور زکوٰۃ اس کے علاوہ دی جائے، یا پھر معلم صاحب کی کوئی تنخواہ مقرّر نہ ہو وہ توجہ سے پڑھائیں پھر جس شخص کو جتنی زکوٰۃ دینے کا موقع ملے انہیں دیدیا کرے لیکن مقررہ نہیں ہوگی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۰۹/۳۲ ج)

زکوٰۃ سے امامِ مسجد کو تنخواہ دینا

سوال:- کیا مالِ زکوٰۃ سے امامِ مسجد کو جو بچوں کو قرآن بھی پڑھاتا ہو، تنخواہ دینا جائز ہے؟

جواب:- زکوٰۃ کے مال سے کسی مسجد کے امام یا مدرسہ کے مدرّس کو تنخواہ دینا جائز نہیں۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۳/۲۸ الف)

زکوٰۃ سے تبلیغی کتابیں چھپوانے کا حکم

سوال:- کیا مالِ زکوٰۃ سے اسلامی تبلیغی کتابیں چھپوا کر تقسیم کی جاسکتی ہیں جبکہ ان کی قیمت وصول نہ کی جائے؟

جواب:- زکوٰۃ سے تبلیغی کتابیں خریدی جاسکتی ہیں لیکن ایسی کتابیں صرف ان لوگوں کو دی جاسکتی ہیں جو مستحقِ زکوٰۃ ہوں۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۳/۲۸ الف)

(۱، ۲) دیکھئے گزشتہ صفحہ نمبر ۱۴۳ کے حواشی۔

قومی اتحاد کی تحریک میں زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- موجودہ وقت میں قومی اتحاد کی تحریک کو جہاد کہیں گے یا نہیں؟ اور اس میں زکوٰۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- دین کی سربلندی کے لئے ہر کوشش اجر وثواب کے لحاظ سے جہاد میں داخل ہے بشرطیکہ وہ خلوصِ نیت سے ہو اور شرعی قواعد کے مطابق ہو، جو لوگ اسی نیت سے شریعت کے اُحکام کی رعایت کرتے ہوئے دین کی سربلندی کے لئے کوشاں ہوں گے انشاء اللہ انہیں جہاد کا ثواب ملے گا، البتہ زکوٰۃ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی غیر صاحبِ نصاب شخص کو مالک وقابض بنا کر دی جائے،[1] محض رفاہی کاموں یا تحریکی فنڈ میں پیسے دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۶/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۳/۲۸ الف)

سال بھر میں تھوڑی تھوڑی کر کے زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے

سوال:- کیا مکمل زکوٰۃ فوری ادا کرنا ضروری ہے یا تھوڑی تھوڑی کر کے ادا کی جا سکتی ہے؟

جواب:- بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ جتنی جلدی ہو سکے ادا کر دینی چاہئے، اور تھوڑی تھوڑی کر کے سال بھر میں بھی ادا کر دینا جائز ہے۔[2]

واللہ اعلم
۲۸/۴/۱۴۰۵ھ

مستحقِ زکوٰۃ کے لئے زکوٰۃ فنڈ سے امداد لینے کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ میں نے مکان بنانے کے واسطے قرض لیا تھا، اور مکان گروی کر دیا ہے، چونکہ میری بیوی کینسر کے مرض میں مبتلا رہی اور اسی میں اس کا انتقال ہوگیا ہے، زیرِ بار ہو جانے کی وجہ سے قرضہ بمع سود اور صرف قرض بھی ادا کرنے سے قاصر ہوں، سوائے مکان کے، جو قرضہ میں گروی کر دیا ہے کوئی جائیداد یا ذریعۂ آمدنی نہیں ہے، عاجز ہو کر زکوٰۃ فنڈ سے امداد لینا چاہتا ہوں، مہربانی فرما کر فتویٰ مرحمت فرمائیں کہ میں امداد لینے کا مستحق ہوں یا نہیں؟

جواب:- سائل سے زبانی معلوم ہوا کہ اس کے پاس کوئی سونا چاندی یا بقدرِ نصاب ضرورت سے زائد سامان نہیں ہے، اس لئے وہ زکوٰۃ فنڈ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا مستحق ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۲۷/۱/۱۴۰۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵/۱۳۴ الف)

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ صفحہ:۱۴۲ کا حاشیہ نمبر۱۔
(۲) حوالہ کے لئے الدر المختار مع ردّ المحتار ج:۲ ص:۲۷۱ و ۲۷۲ (طبع سعید) اور فتح القدیر ج:۲ ص:۱۵۵ ملاحظہ فرمائیں۔

ایدھی ٹرسٹ کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- عبدالستار ایدھی ٹرسٹ وغیرہ کو زکوٰۃ کی رقم دینا درست ہے یا نہیں؟

جواب:- زکوٰۃ کے لئے ضروری ہے کہ مستحق شخص کو مالک بنا کر دی جائے،[1] وہ اس پر قبضہ کرلے، اور مالکانہ انداز میں جس طرح چاہے اسے خرچ کرنے کا اختیار اسے حاصل ہو، محض رفاہی کاموں یا شفاخانوں یا مدرسوں کی تعمیر یا عملے کی تنخواہوں وغیرہ پر خرچ نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً مستحقِ زکوٰۃ شخص کو نقد رقم یا کوئی سامان مالک بنا کر دیا جائے، تو زکوٰۃ ادا ہوگئی، اور اگر غریبوں کے لئے کوئی ایمبولینس خرید لی یا میّت گاڑی خرید لی تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی،[2] کیونکہ وہ کسی مستحق کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ اب اگر مذکورہ ادارے زکوٰۃ کو اس طرح صرف کرنے کا اہتمام کریں تو ان کو زکوٰۃ دینا دُرست ہے، لیکن اگر ان کے یہاں زکوٰۃ اور غیرِ زکوٰۃ کا حساب الگ نہ ہو یا زکوٰۃ کو مذکورہ بالا طریقے پر خرچ نہ کریں تو ان کو زکوٰۃ دینا شرعاً جائز نہیں۔　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۸/۱۱/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۱۹/۳۹ ح)

زکوٰۃ ڈسپنسری کی تعمیر، ڈاکٹر اور کمپونڈرز کی تنخواہوں پر نہیں لگ سکتی

سوال:- ہماری سوسائٹی غریبوں، ناداروں، بیواؤں، یتیموں اور محتاجوں کی مختلف قسم کی امدادی خدمات انجام دے رہی ہے، مثلاً بیماری میں امداد، نادار بچوں کی درسی کتابیں، بیواؤں کے لئے سلائی کی مشینیں وغیرہ، لاوارث میّت کے گور وکفن وغیرہ کا انتظام، ان سب اُمور میں زکوٰۃ وفطرہ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ سوسائٹی کا پروگرام ہے کہ ایک رفاہی ڈسپنسری کھولی جائے تاکہ غریبوں کو

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ مصرف الزکاۃ .... (ھو فقیر وھو من لہ ادنی شیء).
وفیہ ایضاً ج:۲ ص:۳۴۴ ویشترط ان یکون الصرف تملیکا لا اباحۃ کما مر لا یصرف الی بناء نحو مسجد ولا الی کفن میّت وقضاء دینہ .... الخ. وفی الھندیۃ ج:۱ ص:۱۸۸ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) ولا یجوز ان یبنی بالزکوٰۃ المسجد وکذا القناطر والسقایات واصلاح الطرقات وکری الانھار والحج والجھاد وکل ما لا تملیک فیہ ولا یجوز ان یکفن بھا میّت ولا یقضی بھا دین المیّت کذا فی التبیین. وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۲ ص:۲۰۲ ولا یحصل الإیتاء الا بالتملیک فکل قربۃ خلت عن التملیک لاتجزئ عن الزکوٰۃ. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۲۰۱ (مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) ھی تملیک المال من فقیر لقولہ تعالیٰ: ﴿وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ والایتاء ھو التملیک .... الخ. وفی فتح القدیر ج:۲ ص:۲۰۷ و۲۰۸ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) ولا یبنی بھا مسجد ولا یکفن بھا میّت لانعدام التملیک وھو الرکن فان اللہ تعالیٰ سماھا صدقۃ وحقیقۃ الصدقۃ تملیک المال من الفقیر. زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے مستحقِ زکوٰۃ کی تملیک ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک بھی لازم ہے فقہ حنبلی کی کتاب الفروع ج:۲ ص:۶۱۹. فقہ مالکی کی کتاب الشرح الصغیر ج:۱ ص:۶۶۴ والقوانین الفقھیۃ ص:۷۵. فقہ شافعی کی کتاب روضۃ الطالبین ج:۲ ص:۳۲۷ ملاحظہ فرمائیں۔

سستا علاج مہیا ہوسکے، اس سلسلے میں فطرہ، زکوٰۃ اور چرمِ قربانی کی رقوم استعمال کی جاسکتی ہیں؟

جواب:- زکوٰۃ اور چرمِ قربانی کی رقم ڈسپنسری کی تعمیر، کرایہ مکان یا ڈاکٹر، کمپونڈر حضرات کی تنخواہوں پر تو خرچ نہیں کی جاسکتی، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس رقم سے دوائیں خرید کر رکھ لیں، اور یہ دوائیں مستحقینِ زکوٰۃ میں تقسیم کردی جائیں[1] لیکن واضح رہے کہ زکوٰۃ سے خریدی ہوئی دوائیں صرف مستحقینِ زکوٰۃ پر خرچ کی جاسکیں گی، دوسرے لوگوں پر نہیں، لہٰذا ان کا شعبہ الگ رکھنا ہوگا اور اس شعبے میں دوا کی کوئی قیمت وصول کرنا جائز نہ ہوگا، ہاں! ڈاکٹر کے معائنے کی فیس ہوسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۹۸۹/۲۸ ج)

زکوٰۃ، عشر اور قربانی کی کھال کا مستحق

سوال:- ایک بستی میں ایک حافظِ قرآن نے مدرسہ کا کاروبار شروع کیا، اب حافظِ قرآن کی کوئی آمدنی نہیں ہے اور نہ ہی تنخواہ مقرّر ہے۔ بستی والوں سے عشر وصول کرکے اپنی زندگی پر خرچ کرتا ہے، کیا اس حافظ کو یہ عشر لینا جائز ہے یا نہیں؟

۱:- کیا حافظِ قرآن، قربانی کی کھالیں اپنے استعمال میں لاسکتا ہے؟

۲:- فطرہ کا پیسہ مدرسہ کی عمارت، مدرّس کی تنخواہ، یا کنواں بنوانے پر خرچ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- اگر اس حافظِ قرآن کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا زائد از ضرورت سامان موجود نہیں ہے تو اس کے لئے عشر وصول کرنا جائز ہے،[2] البتہ یہ واضح رہے کہ عشر اس کو بطور تنخواہ نہیں دیا جاسکتا،[3] بلکہ وہ بچوں کو پڑھانے کی خدمت بلامعاوضہ انجام دے، اور بستی والے عشر کے ذریعہ وقتاً فوقتاً اس کی اِمداد کردیا کریں تو درست ہے۔

۲:- قربانی کی کھالوں کا بھی یہی حکم ہے جو اُوپر عشر کا بیان کیا گیا ہے۔

۳:- صدقۃ الفطر کی رقم مدرسہ کی تعمیر، مرمت یا کنویں پر خرچ نہیں کی جاسکتی، بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ رقم کسی غیر صاحبِ نصاب کو مالک و قابض بنا کردی جائے۔[4]

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۶/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۲۵/۲۷ و)

---

(۱) وفی الدرالمختار ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید کراچی) مصرف الزکاۃ.. (هو فقیر وهو من له ادنی شئ) وفیه ایضًا ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع ایضًا) ویشترط ان یکون الصرف (تملیکا) لا اباحة کما مر لا یصرف الی بناء مسجد وکفن میّت ... الخ (نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ کا حاشیہ)۔

(۲) فی التنویر مع شرحه ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید کراچی) مصرف الزکاة ... (وهو فقیر و هو من له ادنی شئ) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة (ومسکین من لا شئ له) علی المذهب.

(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے صفحہ نمبر ۱۴۳ کا حاشیہ نمبر ۱ تا ۴۔

(۴) فی التنویر مع شرحه ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع أیضًا) و یشترط ان یکو ن الصرف (تملیکاً) لا اباحة کما مر (لا) یصرف (الی بناء) نحو (مسجد) ولا الیٰ (کفن میّت وقضاء دینه). وفی الشامیة تحت (قوله نحو مسجد) کبناء القناطر والسقایات واصلاح الطرقات وکری الأنهار والحج والجهاد وکل ما لا تملیک فیه.

۱:- سادات اور ملازم کو زکوٰۃ دینے کا حکم
۲:- زکوٰۃ رفاہی تعمیرات میں لگانا ممنوع ہے

سوال ۱:- محتاج سیّد خواہ رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار ہو، مستحقِ زکوٰۃ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۲:- اپنا ملازم یا ملازمہ جب ضرورت مند ہوں تو مستحقِ زکوٰۃ ہوسکتے ہیں؟

۳:- اپنے ملازم یا ملازمہ کی اولاد جس کی پرورش کے بعد شادی کردی گئی ہو، کسی طرح گزر اوقات کرلیتی ہے پسماندہ رقم کرنے کی صلاحیت نہیں، ایسی حالت میں زکوٰۃ کے پیسے ان کی نجی مالکانہ رہائش گاہ کے لئے مہیا کئے جاسکتے ہیں؟

۴:- مذکورہ بالا فیملی کو رہائش مہیا کرادینا بذریعہ زکوٰۃ، اور روزہ مرہ کی سہولت کی خاطر کپڑے، پیسے کی شکل میں زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے؟

۵:- کیا زکوٰۃ کے پیسے سے تعمیرِ مسجد کے علاوہ از قسم تعمیرات شفاء خانہ و دیگر عمارات، رفاہِ عامہ کے واسطے سب ممنوع ہیں؟

۶:- کسی شخص (صاحبِ نصاب) کے پس ماندہ یعنی جمع کئے ہوئے پیسے غیر ملک کے بینکوں میں ہوں تو ایک ہی ملک میں مروّجہ زرِمبادلہ کے مطابق کل واجب الاداء پیسے زکوٰۃ میں دیئے جاسکتے ہیں؟

جواب ۱:- سادات کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے،(۱) ہدیہ سے ان کی امداد کیجئے۔

۲:- ملازم کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں بشرطیکہ اُجرت میں نہ لگایا جائے(۲) نہ اس کا احسان جتلایا جائے۔

۳:- اگر وہ صاحبِ نصاب نہیں ہیں تو ان کو زکوٰۃ کے پیسے دے کر ان کی رہائش کا مالکانہ انتظام کرنا دُرست ہے۔

۴:- اگر وہ صاحبِ نصاب نہیں ہیں تو دے سکتے ہیں۔

۵:- ہر قسم کی تعمیر میں زکوٰۃ کی رقم لگانا ممنوع ہے۔(۳)

۶:- دے سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۰ھ

---

(۱) وفی مشکٰوۃ المصابیح باب من لا تحل له الصدقة ج:۱ ص:۱۶۱ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عبدالمطلب بن ربیعة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان هذه الصدقات انما هی اوساخ الناس وانها لا تحل لمحمد ولا لآل محمد. رواه مسلم.

وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۵۰ (طبع سعید کراچی) ولا إلی بنی هاشم الا من ابطل النص قرابته وهم بنو لهب.

وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۲۴۶ (باب المصرف) قوله (وبنی هاشم وموالیهم) أی لا یجوز الدفع لهم.

(۲) وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۹۰ (مکتبه رشیدیه کوئٹه) و لو نوی الزکٰوة بما یدفع المعلم الی الخلیفة ولم یستأجره ان کان الخلیفة بحال لو لم یدفعه یعلم الصبیان ایضًا اجزاه والا فلا.

(۳) دیکھئے صفحہ نمبر ۱۴۶ کا حاشیہ نمبر ۲،۱۔

مقروض کو زکوٰۃ دینے میں تفصیل

سوال:- ناچیز کو ایک چھوٹا سا مسئلہ درپیش ہے جس کی تصدیق وہ آپ سے کرانے کی خواہش رکھتا ہے، اُمید ہے کہ خصوصی توجہ فرمائیں گے۔

مسئلہ:- کیا فرماتے ہیں مفتی حضرات اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص جو کہ بے حد مقروض ہے، ضعیف العمر ہے، اس کا صرف ایک ہی بڑا بیٹا ہے جو کہ حافظِ قرآن ہے۔

صاحب مقروض صوبہ سرحد کی ایک چھوٹی سی مسجد کے پیشِ امام تھے۔ اچانک اور بیک وقت چار بیماریوں کے مریض ہوگئے جس میں سب سے بڑی بیماری ٹی بی کی ہے۔

صاحب مقروض امامتی کی حالت میں بھی تنگ دست تھے، اپنی بیماریوں کا علاج اور گھر کا خرچہ اِدھر اُدھر سے قرضہ لے کر کرتے رہے، یہاں تک کہ پونے دو لاکھ روپے کے مقروض ہوگئے۔

یہ گھرانہ دس افراد پر مشتمل ہے، بڑے بیٹے نے قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد درسِ نظامی کا کورس کرنے کا ارادہ کیا تھا، قرضہ معلوم ہونے کی صورت میں اس نے اپنی تعلیم موقوف کردی اور پڑھانے کا ارادہ کیا لیکن یہ ایک جان زیادہ سے زیادہ ماہانہ صرف دو ہزار روپے کما سکے گا، جس سے گھر کا خرچہ وغیرہ چل سکے گا۔ مگر قرضہ ادا کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جس کے لئے گھر کا ہر ایک فرد پریشان ہے، روز بروز قرضہ بڑھتا چلا جارہا ہے۔ کیا ان کا قرضہ ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ یا کسی بھی مد میں رقم دینا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو ازراہِ کرم ایسی تصدیق فرمائیں جس سے صاحبِ خیر حضرات بھرپور تعاون فرمائیں تاکہ یہ گھرانہ قرضے کے بوجھ سے آزاد ہوسکے۔ احقر اس گھرانے سے اچھی طرح واقف ہے اور ساتھ ساتھ ذمہ داری بھی لیتا ہے کہ آپ کی تصدیق پر کسی بھی مد سے ملنے والا ہر ایک پیسہ مقروض تک پہنچا کر رہے گا، اُمید ہے کہ ضرور تصدیق فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ جزیل سے نوازیں، فقط والسلام۔

جواب:- اگر یہ صاحب جو پونے دو لاکھ روپے کے مقروض ہیں ان کے پاس کوئی ذریعہ اور دوسری املاک اتنی نہیں ہیں جس سے یہ قرض ادا ہوسکے تو یہ زکوٰۃ کے مستحق ہیں، اور انہیں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۸/۸/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹۰۴۳۰)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۳ (ایچ ایم سعید) ومدیون لا یملک نصابًا فاضلًا عن دینه و فی الشامیة تحت (قوله مدیون) ..... فانما جاز الدفع الیه لأنه فقیر یدا

فیکٹری کے غریب چوکیدار کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- ایک صاحب ہیں جن کی اپنی کوئی جائیداد نہیں ہے، بمشکل اپنا گزر بسر کرتے ہیں بس سفید پوشی قائم ہے، انتہائی قریبی جاننے والے ان کے حال سے واقف ہیں، یہ صاحب جس فیکٹری میں چوکیدار ہیں فیکٹری والے اس کو کسی کے ساتھ اٹیچ کر کے انہیں سعودی عرب بھیج رہے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی مالی حالت بہتر ہو جانے کی اُمید ہے اور یہ صاحب نصاب نہیں ہیں، کیا کرائے کے لئے ان کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے؟

جواب:- اگر یہ صاحب واقعی صاحبِ نصاب نہیں ہیں یعنی ان کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے بقدر نقد روپیہ یا زائد از ضرورت سامان نہیں ہے تو ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۹۷۵/۲۸ ج)

تین تولہ سونے کی مالک عورت کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- ایک شخص کی دو لڑکیاں ہیں وہ ان کی شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ پوری بالغ ہو چکی ہیں، کوئی سہارا نہیں ہے، والد قرض دار ہے، مارے شرم کے کسی سے ذکر نہیں کرتی ہیں، ان میں سے ایک میرے پاس آئی تھی کہ مجھے زکوٰۃ دی جائے، میں نے معلوم کیا کہ سونا چاندی کتنی ہے؟ اور نقد کتنا ہے؟ اس نے کہا کہ والد کا دیا ہوا کچھ زیور ہے جس کا وزن تین تولہ سونا ہے اور وہ والدہ کے پاس ہے اور والد نے امداد کے طور پر بچیوں کے لئے کپڑے بنوائے ہیں۔ اب معلوم نہیں زکوٰۃ سے بنوائے ہیں یا اپنی ذات سے؟ لڑکی نے کہا کہ میں خرچ میں بہت تنگدست ہوں مجھے زکوٰۃ دی جائے، کیا اس کو یا اس کی والدہ کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

جواب:- صورت مسئولہ میں تین تولہ سونا اگر ابھی تک ماں کی ملکیت میں ہے اس نے لڑکیوں کو نہیں دیا تو ماں کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی،[2] ہاں اگر لڑکیاں صاحبِ نصاب نہ ہوں تو ان کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، البتہ اگر سونا ماں نے کسی لڑکی کو ہبہ کر کے اس کو اس کا قبضہ دیدیا ہے تو زکوٰۃ اس لڑکی کو نہیں دی جاسکتی لیکن اس صورت میں ماں کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۹۳/۲۸ ج)

---

(۱) وفي التنوير مع شرحه ج:۲ ص:۳۳۹ (ایچ ایم سعید) مصرف الزكوة .... (هو فقير وهو من له ادنى شئ) أى دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق فى الحاجة، ومسكين من لا شئ له .... الخ .

(۲) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۷ (طبع أيضًا) ولا الى غنى يملك قدر نصاب فارغ عن حاجته الاصلية من أى مال كان كمن له نصاب سائمة لا تساوى مائة درهم.

قرضہ معاف کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی

سوال:- زید نے بکر کو مال فروخت کیا جس کی رقم بکر نے بعد میں ادا کرنے کا وعدہ کیا، مگر اچانک بکر کی حالت خراب ہوگئی، نیز بکر کو عارضۂ قلب ہوگیا جس کی وجہ سے وہ گھریلو اخراجات سے بھی تنگ آگیا، بکر کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، کیا زید اس رقم کو جو بکر کے ذمہ ہے زکوٰۃ کھاتے کے نام لکھ کر وصول سمجھ لے تو جائز ہے یا نہیں؟ بکر کا کوئی کمانے والا نہیں ہے۔

جواب:- اگر واقعۃً بکر صاحبِ نصاب نہیں ہے، یعنی اس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت یا اس قیمت کا زائد از ضرورت سامان موجود نہیں ہے تو اسے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے لیکن اس پر جو رقم واجب الاداء ہے محض اس کو معاف کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کا طریقہ یہ کرنا ہوگا کہ زید، بکر کو اپنے پاس سے کچھ رقم زکوٰۃ کے طور پر مالک و قابض بنا کر دیدے پھر اس کے بعد اگر چاہے تو اس سے اپنا قرضہ وصول کرلے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۲/۲۸ ج)

کاروبار کی ترقی کے لئے زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- ہماری برادری کی ایک انجمن ہے جس میں ہم برادری سے زکوٰۃ جمع کرکے مستحق افراد میں تقسیم کر دیتے ہیں، برادری کے بعض ایسے افراد ہیں جو اپنے چھوٹے موٹے کاروبار کو بڑھانا چاہتے ہیں، اور یہ لوگ زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ برادری کی جمع شدہ زکوٰۃ کا کچھ حصہ بذریعہ شرعی حیلہ جنرل فنڈ میں تبدیل کرلیں تاکہ مستحق افراد کو قرضے دیئے جاسکیں، اس مقصد کے لئے زکوٰۃ کی رقم کا کیا حیلہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب:- زکوٰۃ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی غیر صاحبِ نصاب شخص کو مالک و قابض بنا کر دی جائے،[2] لہٰذا جن لوگوں کے پاس بقدرِ نصاب مال موجود ہو ان کو محض کاروبار کی ترقی کے لئے زکوٰۃ دینا جائز نہیں، البتہ برادری کے مستحقِ زکوٰۃ افراد کو زکوٰۃ کی رقم کا مالک اور قابض بنانے کے بعد اگر وہ اپنی خوشی سے بغیر کسی دباؤ کے اس رقم کا کچھ حصہ اس فنڈ میں دیدیں تو اسے قبول کرنا جائز ہے، لیکن ان کو یہ بات اچھی طرح باور کرادی جائے کہ زکوٰۃ کی رقم ان کی ہے اور وہ اسے اپنی مرضی سے

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص ۲۷۱ (ایچ ایم سعید) وحیلۃ الجواز ان یعطی مدیونہ الفقیر زکوٰتہ ثم یأخذھا عن دینہ، وفی الشامیۃ (قولہ وحیلۃ الجواز) ای فیما اذا کان لہ دین علی معسر واراد ان یجعلہ زکوٰۃ عن عین عندہ ... الخ۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص: ۳۳۹ (ایچ ایم سعید) مصرف الزکوٰۃ (ھو فقیر وھو من لہ ادنی شئ) وفیہ أیضا ج:۲ ص: ۳۴۴ (طبع ایضًا) ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً لا اباحۃ۔

جہاں چاہیں صرف کر سکتے ہیں[۱] محض حیلے کے طور پر انہیں نہ دی جارہی ہو، اس کے بعد وہ خوشی سے دیں تو لے لی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۳/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۳/ ۲۸ب)

داماد کی لڑکی (جو حقیقی نواسی نہ ہو) کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- سائل اپنے والدین، برادران و ہمشیرگان و دیگر عزیزان و جملہ مرحومین کے واسطے صدقہ جاریہ دینا چاہتا ہے۔

۲:- چونکہ سائل بعارضہ اختلاجِ قلب و پیشاب میں دس گیارہ سال سے مبتلا ہے، رمضان شریف کے روزے نہیں رکھ سکا اس کا کفارہ بھی دینا ہے۔

۳:- زکوٰۃ وفطرہ بھی دینا ہے۔

میری دختر کی سوتیلی جوان عمر لڑکی ہے اس کی والدہ بھی نہیں ہے، والد معمولی حیثیت کا ہے اس کی شادی میں رقومِ مذکورہ بالا دی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ اور مرحومین کو ثواب پہنچتا رہے گا اور زکوٰۃ، فطرہ اور کفارہ بھی ادا ہو جائے گا؟ جواب جلد مرحمت فرمائیں۔

جواب:- اپنی لڑکی کے شوہر کی لڑکی جو حقیقی نواسی نہ ہو، اگر مستحقِ زکوٰۃ ہو تو اس کو زکوٰۃ، فطرہ اور کفارہ وفدیہ کی رقم دی جاسکتی ہے، صدقۂ نافلہ بھی دیا جاسکتا ہے، لأنہ لیس بین السائل وبینھا ولاد ولا زوجیۃ۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۱۴/ ۲۸ج)

مقروض کو زکوٰۃ دے کر اپنے قرض میں وصول کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص کی طرف میرے پانچ سو روپیہ بقایا ہیں اور وہ اوروں کا بھی قرض دار ہے، لیکن وہ اقرار کرتا ہے کہ آپ کے میرے ذمہ پانچ سو بقایا ہیں، مگر مجبور ہوں زکوٰۃ میں وصول کر لئے جائیں تو بہتر ہیں، کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر اس مقروض شخص کے پاس واقعی ساڑھے باون تولہ چاندی کی مقدار روپیہ نہیں

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۵ (طبع سعید کراچی) وقدمنا ان الحیلۃ ان یتصدق علی الفقیر ثم یامرہ بفعل ھذہ الاشیاء و ھل لہ ان یخالف امرہ؟ لم ارہ، والظاھر نعم. و فی الشامیۃ قولہ الظاھر نعم ...... لانہ مقتضی صحۃ التملیک قال الرحمتی والظاھر انہ لاشبھۃ فیہ لانہ ملکہ ایاہ عن زکوٰۃ مالہ و شرط علیہ شرطاً فاسداً الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۶ (طبع أیضًا) ولا إلی من بینھما ولاد ولو مملوکًا لفقیر أو بینھما زوجیۃ ولو مبانۃ .... الخ.

ہے تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، لیکن اس کی صورت یہ کرنی ہوگی کہ پہلے اس کو زکوٰۃ کے طور پر روپے مالک بنا کر دیدیئے جائیں اور ان کا قبضہ بھی دیدیا جائے اور پھر اس سے اپنا قرض وصول کرلیا جائے،[1] محض زبانی طور پر قرض سے سبکدوش کردینا کافی نہ ہوگا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۹/۲۸ ج)

رفاہی کاموں پر زکوٰۃ خرچ کرنے کا حکم

سوال:- ایک رفاہی ادارہ ہے، سب سے اہم خدمت جو ادارہ انجام دے رہا ہے وہ تحصیل وتقسیمِ زکوٰۃ کا کام ہے، ادارہ کے منتظمین شرعی اعتبار سے ان شرطوں کی نشان دہی چاہتے ہیں تاکہ منتظم کمیٹی زکوٰۃ کو صحیح صرف کرسکے اور غلط روی کے عذاب سے محفوظ رہ سکے۔

جواب:- زکوٰۃ کا مستحق وہ شخص ہے جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا سامانِ تجارت یا ضرورت سے زیادہ ساز وسامان موجود نہ ہو، زکوٰۃ کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے شخص کو مالک وقابض بنا کر ادا کی جائے۔ عام رفاہی کام مثلاً تعمیرِ مسجد یا شفاخانے کی تعمیر یا ملازمین کی تنخواہ وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا جائز نہیں ہے بلکہ کسی مستحق کو مالک بنانا ضروری ہے۔

یہ تو زکوٰۃ کا ایک حکم ہے، اس کے علاوہ زکوٰۃ کے اور بھی مفصّل اَحکام بہشتی زیور میں یا رسالہ ''اَحکامِ زکوٰۃ'' مؤلفہ حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب، میں اچھی طرح مطالعہ کرلیں بلکہ بہتر یہ ہے کہ کسی مستند عالم سے باقاعدہ پڑھ لیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۲۶)

زکوٰۃ وفطرہ کی رقوم اپنے گاؤں بھیجنے کا حکم

سوال:- ایک فیڈریشن کے زیرِ اہتمام تمام جملہ سوسائٹیاں اپنے اپنے ارکان سے رمضان میں فطرہ وغیرہ جمع کرتی ہیں اور پھر جمع کر کے ہر ایک سوسائٹی اپنے اپنے طور پر بصورتِ اجتماعی، فطرہ کی تمام رقم اپنے اپنے گاؤں کے غریب، نادار، یتیموں اور بیواؤں وغیرہ کو بھیجنے کا انتظام کرتی ہے اور عید سے پہلے صدقہ کی رقم پہنچ جاتی ہے۔ کیا زکوٰۃ وفطرہ کی رقم گاؤں میں بھیجنا دُرست ہے؟

جواب:- زکوٰۃ اور فطرے کی رقوم اپنے گاؤں میں بھیجنا جائز ہے۔

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۱ (ایچ ایم سعید) وحیلة الجواز أن یعطی مدیونه الفقیر زکاته ثم یأخذها عن دینه.

فی الدر المختار وکرہ نقلها إلا إلی قرابة ..... أو أحوج أو أصلح او أورع أو أنفع للمسلمین الخ وقال الشامیؒ قوله وکرہ نقلها أی من بلد إلی بلد آخر لأن فیه رعایة حق الجوار فکان أولی (زیلعی) والمتبادر منه أن الکراهة تنزیهیة تامل، فلو نقلها جاز لأن المصرف مطلق الفقراء۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۱۷/۲۸ ج)

زکوٰۃ وفطرہ سے سیلاب زدگان اور زلزلہ کے متاثرین کی امداد کا حکم

سوال:- کیا کوئی فلاحی ادارہ جو کہ اپنے ممبران سے زکوٰۃ، فطرہ اور چرمِ قربانی وصول کر کے غریب بیوہ، محتاج اور مستحق کی اعانت کرتا ہے کیا وہ اس رقم سے سیلاب و زلزلہ زدگان کے امدادی فنڈ میں رقم دے سکتا ہے؟ جبکہ مصیبت زدگان میں ہر قوم کے لوگ شامل ہیں، نیز حکومت امدادی فنڈ سے بھی مکانات، نہریں، سڑکیں، ریلوے لائن، پل وغیرہ کی مرمت کراتی ہے۔

جواب:- زکوٰۃ، فطرہ اور چرمِ قربانی کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقوم میں یہ ضروری ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو مالک[2] بنا کر دی جائیں جو صاحبِ نصاب نہ ہو، اور سیلاب زدگان یا زلزلہ زدگان کے امدادی فنڈ میں جو رقمیں جمع ہوتی ہیں ان میں اس کا اہتمام نہیں ہوتا کہ وہ مستحقین کو مالک بنا کر دی جائیں بلکہ بسا اوقات سیلاب زدگان کے لئے رفاہی کاموں مثلاً سڑکیں بنانے، بند باندھنے وغیرہ میں بھی خرچ ہوتی ہیں لہٰذا زکوٰۃ، فطرہ اور چرمِ قربانی کی رقوم اس فنڈ میں دینا درست نہیں بلکہ اس فنڈ میں الگ سے امداد کرنی چاہئے۔ مسلمان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ زکوٰۃ کے علاوہ ایک پائی بھی خرچ نہ کرے بلکہ ایسے کاموں میں زکوٰۃ کے علاوہ دوسری مدات سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۵۴/۲۷ و)

---

(۱) فتاویٰ شامیة ج:۲ ص:۳۵۳ (ایچ ایم سعید) وفی الهندیة کتاب الزکوٰة الباب السابع فی المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) و یکرہ نقل الزکوٰة من بلد إلی بلد إلا أن ینقلها الإنسان إلی قرابته أو الی قوم هم أحوج الیها من أهل بلده .... الخ.

(۲) دیکھئے ص:۱۳۶ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۳۔

زکوٰۃ کی رقم مسجد، مدرسہ یا جنازہ گاہ کی تعمیر پر خرچ نہیں کی جاسکتی

سوال:- میرے ایک عزیز کے پاس زکوٰۃ کے کافی روپے موجود ہیں، گاؤں میں جنازہ گاہ تعمیر ہو رہی ہے، چار دیواری، فرش اور برآمدہ ہوگا تاکہ دُھوپ اور بارش سے محفوظ رہیں، کیا زکوٰۃ کی رقم اس تعمیر میں لگ سکتی ہے؟

جواب:- زکوٰۃ کی رقم کسی مسجد، مدرسے یا جنازہ گاہ کی تعمیر میں نہیں دی جاسکتی، زکوٰۃ کے لئے ضروری ہے کہ کسی غیر صاحبِ نصاب مستحقِ زکوٰۃ کو مالک وقابض بنا کر دی جائے جنازہ گاہ کی تعمیر میں زکوٰۃ کے علاوہ چندہ دینا چاہئے۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۶۷۰/۲۸ ب)

زکوٰۃ کی رقم سے تبلیغی لٹریچر شائع کرنے کا حکم

خلاصۂ سوال:- ایک تعلیمی تبلیغی ادارہ کو زکوٰۃ وخیرات دینا کیسا ہے، جس کا واحد مقصد تبلیغ کے سلسلے میں نماز، حج، روزہ، وضو، غسل، تیمم اور دیگر لٹریچر شائع کرنا ہے، اور وہ لٹریچر مفت تقسیم کرتا ہو، کیا معاونین اور غیر معاونین ادارہ اس لٹریچر سے استفادہ کرسکتے ہیں جو صرف مالِ زکوٰۃ وعطیات سے شائع ہو رہا ہے؟ یہ لٹریچر دینی مسائل سیکھنے میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ تو کیا جو لوگ اس سے استفادہ کا حق رکھتے ہیں ان پر واضح کردیا جائے اور جو لوگ استفادہ کا حق نہیں رکھتے ان پر واضح کردیا جائے تاکہ زکوٰۃ کا صحیح مصرف میں استعمال ہوسکے۔

جواب:- زکوٰۃ میں جمہور کے نزدیک کسی غریب کو مالک بنانا شرط ہے، لہٰذا زکوٰۃ کی رقم وصول کرکے اس سے تبلیغی لٹریچر شائع کرنا جائز نہیں۔ تبلیغی کاموں کے لئے زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عطیات سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔ البتہ اگر غلطی سے زکوٰۃ کی رقم سے ایسا لٹریچر شائع کرلیا گیا ہے تو پھر اس کو صرف غریب ونادار (غیر صاحبِ نصاب) افراد پر تقسیم کیا جائے، غیر مستحق افراد کے لئے اس کی کوئی قیمت مقرر کرلی جائے اور جب قیمت حاصل ہو تو اسے غریب ونادار افراد کو دیدیا جائے، اس کے

(۱) دیکھئے ص:۱۴۶ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔

بغیر زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلند شہری

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۹/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۴۱۸/۱۸ الف)

زکوٰۃ میں دیئے گئے پلاٹ پر مسجد تعمیر کرنے کا حکم

سوال:- جمعیت تعلیم القرآن (ٹرسٹ) کو ایک صاحب نے ایک پلاٹ عطیہ دیا اور فرمایا کہ میں اس پلاٹ کے عوض اپنی زکوٰۃ ادا کرنا چاہتا ہوں، اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ اس رقم سے اندرون سندھ، بلوچستان وغیرہ میں مساجد تعمیر کرائیں، جہاں ضرورت ہو اور ایک مسجد کی لاگت تقریباً پچاس ساٹھ ہزار ہونی چاہئے۔ ہم نے فتویٰ طلب کیا اور اس کی روشنی میں اسے بتایا کہ زکوٰۃ مشروط طور پر نہیں دی جاسکتی، آپ غیر مشروط دیں، لیکن آپ کی خواہشات کا احترام کیا جائے گا، انہوں نے وہ پلاٹ غیر مشروط طور پر ہماری یقین دہانی پر دیدیا، پلاٹ جمعیت نے فروخت کردیا، پھر اپنی شاخوں سے ایسی مساجد کی درخواستیں طلب کیں جس میں کافی درخواستیں آگئیں، جمعیت میں اکثر آمدنی زکوٰۃ فنڈ سے ہی ہوتی ہے، اس کو کام میں لانے کے لئے آپ سے رجوع کیا گیا تھا، آپ نے جو فیصلہ دیا تھا اس کی کاپی ہمراہ تھی، گویا ہم اس طریقہ سے زکوٰۃ کو متعدد طلباء میں وظیفہ دے کر ان سے فیس وصول کرتے ہیں اور پھر جمعیت کے جملہ کاموں پر وہ پیسہ خرچ ہوتا ہے، کیا اس طرح اس روپے کو جو انہوں نے پلاٹ کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کی ہے اور ہم نے فروخت کردیا ہے، حسبِ معمول طلباء کو وظیفہ دے کر جب ہمارے پاس فیس واپس آئے اس سے ان کی خواہش کے مطابق مساجد بناسکتے ہیں یا نہیں؟

اگر مساجد نہیں تعمیر کرسکتے اور عطیہ کنندگان خواہش کریں کہ آپ میری رقم واپس کردیں کیا ہم واپس دینے کے مجاز ہیں؟

جواب:- عطیہ دہندہ سے رقم وصول کرتے وقت جو بات بھی ہوئی تھی اس کی پابندی ضروری ہے، لہٰذا اپنے طور پر ان کی خواہش کا احترام کرنے کے لئے اگر کوئی بے غبار تملیک کی شکل ہوجائے تو مسجد کی تعمیر کریں، ورنہ ان کو بتائیں کہ تعمیرِ مسجد میں زکوٰۃ نہیں لگ سکتی،[1] لہٰذا آپ چاہیں تو رقم واپس لے لیں اور چاہیں تو مصرفِ زکوٰۃ میں ہم اپنے یہاں خرچ کرلیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۷/۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۴۷/۲۲۴)

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا إباحة کما مر لا یصرف إلی بناء نحو مسجد.... الخ. نیز دیکھئے ص:۱۴۶ کا حاشیہ نمبر ا و ۲۔

زکوٰۃ وفطرہ مدرّسین کی تنخواہ، کرایہ مکان اور بجلی کے بل پر خرچ کرنے کا حکم

سوال:- زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی رقم کو بوقت ہیچ نداری مہتمم مدرسہ مدرّسین کی تنخواہوں، مکان کے کرایہ، بجلی کے خرچ، طلبہ کے لحاف وغیرہ مدرسہ کی ضروریات میں خرچ کرسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی رقم کا کسی مستحق کو بلا معاوضہ مالک بنانا ضروری ہے، اس کے بغیر زکوٰۃ یا صدقہ ادا نہیں ہوتا، لہٰذا مدرسہ کی تعمیرات، کرایۂ مکان، بجلی کے خرچ اور مستعار دیئے جانے والے لحافوں اور کتابوں پر زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ اس میں تملیک کی شرط مفقود ہے، اسی طرح مدرّسین وملازمین کی تنخواہیں بھی مدِ زکوٰۃ سے نہیں دی جاسکتیں۔[۱]

الجواب صحیح — واللہ سبحانہ واعلم
بندہ محمد شفیع — احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۸ھ

زکوٰۃ وفطرہ امامِ مسجد ومدرّس کو بطورِ تنخواہ یا نذرانہ پیش کرنے کا حکم

سوال:- مسجد کے ایک امام صاحب ہیں، محلّہ کے مدرسہ کے مدرّس بھی ہیں، فطرہ کی رقم سے ان کی خدمت میں بطورِ نذرانہ پیش کیا جائے تو کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم امامِ مسجد یا مدرّس کو اس کی خدمت کے معاوضہ میں دینا جائز نہیں ہے،[۲] اس کو تنخواہ الگ فنڈ سے دینی چاہئے، ہاں! اگر تنخواہ الگ سے بقدرِ ضرورت مقرّر ہو اس کے باوجود وہ صاحبِ نصاب نہ ہو تو کبھی کبھی اس کی زکوٰۃ یا فطرہ سے امداد کردینے میں مضائقہ نہیں، لیکن زکوٰۃ اور فطرے کی اس رقم کو نہ تنخواہ کا جزء بنایا جائے اور نہ تنخواہ مقرّر کرتے وقت یہ بات پیشِ نظر رکھی جائے کہ اتنی رقم ان کو زکوٰۃ یا فطرے سے بھی ملتی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۴/۲۸ الف)

(۲،۱) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعيد كراچي) ويشترط أن يكون الصرف تمليكا لا إباحة كما مر لا يصرف إلى بناء نحو مسجد ..... الخ، وفي الهندية ج:۱ ص:۱۹۰ (مكتبه رشيديه كوئٹه) ولو نوى الزكوة بما يدفع المعلم الى الخليفة ولم يستأجره ان كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان ايضا أجزأه و الا فلا ..... الخ.

دینی مدارس کو علی الاطلاق زکوٰۃ دینا جائز ہے یا شرائط کے ساتھ؟

خلاصۂ سوال:- مدارسِ عربیہ میں زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو علی الاطلاق جواز ہے یا مع شرائط کے؟ سنا ہے زکوٰۃ کے مال سے مدرّسین کی تنخواہ، تعمیر وغیرہ کرانا جائز نہیں ہے، لہٰذا مطلع فرمائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم زکوٰۃ بھی ادا کرتے رہیں اور آخرت کا مؤاخذہ بھی باقی رہے؟

جواب:- وہ دینی مدارس جو غریب طلباء کے کھانے وغیرہ کا بندوبست کرتے ہیں، انہیں اس تصریح کے ساتھ زکوٰۃ دینا جائز ہے کہ یہ رقم غریب طلباء کو نقد یا کھانے، کپڑے کی صورت میں دی جائے، مدرّسین و ملازمین کی تنخواہوں، مکانات کی تعمیر وغیرہ میں اسے صرف نہ کیا جائے۔[1] جس مدرسہ کے بارے میں یہ اطمینان ہو تو اسے زکوٰۃ دینے کے بعد آپ عنداللہ بری ہیں، لیکن جس مدرسہ کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ اس میں مداتِ زکوٰۃ کو اس کے صحیح مصرف میں خرچ نہیں کیا جاتا، اس کو رقم دینے سے آپ بری نہ ہوں گے، ویسے عام طور سے وقیع دینی مدارس میں زکوٰۃ کو صحیح مصرف پر ہی صرف کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۲/۱۲/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۹/۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

اولاد کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- ایک شخص کی لڑکی ہے جو شادی شدہ ہے بچوں کی ماں بھی ہے مگر غریب ہے، اگر والدین ان کو زکوٰۃ دیں تو جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- ماں باپ اولاد کو، اور اولاد اپنے ماں باپ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے، اسی طرح شوہر بیوی کو، اور بیوی شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی،[2] اس کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳/۲/۱۳۸۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۸/۱۸ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی الھندیة ج:۱ ص:۱۹۰ (مکتبة رشیدیة کوئٹه) ولو نوی الزکوٰۃ بما یدفع المعلم الی الخلیفة، ولم یستأجره، إن کان الخلیفة بحال لو لم یدفعه یعلم الصبیان أیضا، أجزاه وإلا فلا، وکذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۶ ص:۲۱۰، ۲۱۲.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۶ (ایچ ایم سعید) ولا الیٰ من بینهما ولاد ولو مملوکًا لفقیر أو بینهما زوجیة ولو مبانة .... الخ.

۱:- بنی ہاشم پر مالِ زکوٰۃ کی حرمت کیوں؟
۲:- موجودہ زمانے میں ''تالیفِ قلب'' کا مصرف کیا ہے؟
۳:- اجتماعی نظامِ زکوٰۃ قائم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے
۴:- فقیر اور مسکین میں فرق

سوال ۱:- خاندان بنی ہاشم پر مالِ زکوٰۃ کی حرمت کیوں ہے؟

۲:- موجودہ زمانے میں تالیفِ قلب کا مصرف کیا ہوسکتا ہے؟

۳:- کیا نظامِ زکوٰۃ کے قیام کی ذمہ داری اسلامی حکومت کے علاوہ کسی اور شخص یا ادارے کے ذریعہ بھی ہوسکتی ہے؟

۴:- فقیر اور مسکین میں کیا فرق ہے؟ اور مساکین کا اطلاق سورۂ توبہ آیت نمبر ۶۰ میں کن لوگوں پر ہوتا ہے؟

جواب ۱:- ان کی شرافت اور احترام کے پیشِ نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زکوٰۃ لینے سے منع فرمادیا ہے۔[1]

۲:- اگر کسی غریب حاجت مند مسلمان کی تالیفِ قلب کی ضرورت ہو تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، کافر یا صاحبِ نصاب مسلمان کو تالیفِ قلب کے لئے زکوٰۃ دینا جائز نہیں، تفصیل کے لئے معارف القرآن ج:۴ ص:۳۶ سے ج:۴ ص:۴۴ تک ملاحظہ ہو۔

۳:- اجتماعی حیثیت سے صحیح نظامِ زکوٰۃ کے نفاذ کی حد تک تو ذمہ داری حکومت ہی کی ہے،[2] البتہ ہر شخص یا ادارہ پر اپنے وسائل کی حد تک اس سلسلے میں سعی ضروری ہے۔

---

(۱) وفي المشكاة ج:۱ ص:۱۶۱ (طبع قديمي كتب خانه) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن هذه الصدقات انما هي اوساخ الناس، وانها لا تحل لمحمد ولا لآل محمد (صلى الله عليه وسلم). وفي الطحاوي (الصدقة على بني هاشم) ج:۱ ص:۳۵۲ قال أبو جعفر .... فهذه الأثار كلها قد جاءت بتحريم الصدقة على بني هاشم، ولا نعلم شيئًا نسخها ولا عارضها.... الخ. وفي الهداية ج:۱ ص:۲۰۶ (طبع شركت علميه ملتان) ولا تدفع الى بني هاشم لقوله عليه السلام: يا بني هاشم! ان الله تعالىٰ حرم عليكم غسالة الناس وأوساخهم.

وفي الدر المختار ج:۲ ص:۳۵۰ (ايچ ايم سعيد) ولا إلى بني هاشم إلا من ابطل النص قرابته، وهم بنو لهب .... ثم ظاهر المذهب إطلاق المنع، وقال الشامي يعني سواء في ذلك كل الأزمان. وفي البحر الرائق ج:۲ ص:۲۴۷ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) اطلق الحكم في بني هاشم ولم يقيده بزمان ولا بشخص للإشارة إلى رد رواية أبي عصمة .... الخ. وكذا في مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج:۱ ص:۲۲۴.

(۲) آیت "اَلَّذِيْنَ إِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ" آیت نمبر ۴۱، سورہ حج پارہ ۱۷ میں اہل اقتدار وسلطنت کے لئے نظامِ زکوٰۃ کو مضبوط کرنے کی ہدایت مذکور ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ج:۶ ص:۲۷۱)۔ (محمد زبیر)

۴:- فقیر اور مسکین کے اصلی معنیٰ میں اگرچہ فرق ہے، ایک کے معنیٰ ہیں، جس کے پاس کچھ نہ ہو، دوسرے کے معنیٰ ہیں جس کے پاس نصاب سے کم ہو[1] لیکن حکمِ زکوٰۃ میں دونوں یکساں ہیں، جس شخص کے پاس اس کی ضرورتِ اصلیہ سے زائد بقدرِ نصاب مال نہ ہو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۸/۷/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۳۱۰/۳۹ھ)

زمین کی پیداوار ہاریوں کو بنیتِ زکوٰۃ دینے کا حکم اور اس کا جائز طریقہ

سوال:- زید نے اپنی زمین کاشت پر ہاریوں کے حوالہ کر رکھی ہے، پہلے وہ ہر سال پیداوار کا نصف حصہ دیا کرتے تھے لیکن کئی سالوں سے دینا بند کر دیا ہے، زید اپنی زمین حاصل نہیں کرسکتا اس لئے کہ مقدمہ کرنا اور ساری عدالتی کاروائی کرنے کے بعد بھی بازیابی کی صورت نظر نہیں آتی، کیا زید اس پیداوار کے بقدر ہر سال مال زکوٰۃ سے نیت کر کے منہا کرسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر مقصد یہ ہے کہ پیداوار کا جتنا حصہ زید کو ملتا، زید یہ نیت کرے کہ اتنی مقدارِ پیداوار میں کاشتکار کو اپنی زکوٰۃ میں دیدی تو یہ طریقہ دُرست نہیں، اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اس کے بجائے یہ کرسکتے ہیں کہ کاشتکار کو کچھ رقم بطور زکوٰۃ دیدیں پھر اس سے اپنا حصہ پیداوار وصول کرلیں، اس غرض کے لئے کاشتکار کو پہلے سے سمجھایا بھی جاسکتا ہے کہ اس طرح کرنے سے تم بھی گناہگار نہیں ہوگے اور ہماری زکوٰۃ بھی ادا ہوجائے گی۔

وفی رد المحتار وفی صورتین لا یجوز الأولی أداء الدین عن العین کجعله ما فی ذمة مدیونه زکوٰة لماله الحاضر..... وحیلة الجواز (أی فیما إذا کان له دین علی معسر وأراد أن یجعله زکوٰة عن عین عنده) أن یعطی مدیونه الفقیر زکاته ثم یأخذها عن دینه (شامی بتصرف ج: ۲)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۲۹/۲۷و)

---

(۱) فقیر وہ ہے جس کے پاس نصاب سے کم ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ وفی الدر المختار ج: ۲ ص: ۳۳۹ (ایچ ایم سعید) مصرف الزکاة والعشر .... (هو فقیر وهو من له أدنی شیٔ) أی دون نصاب، أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة (ومسکین: من لا شیٔ له) علی المذهب. نیز دیکھئے: فتاویٰ عالمگیریة ج: ۱ ص: ۱۸۷، ومعارف القرآن ج: ۴ ص: ۳۹۴، وفتاویٰ دار العلوم دیو بند ج: ۶ ص: ۱۹۴۔

(۲) فتاویٰ شامیة ج: ۲ ص: ۲۷۱ (ایچ ایم سعید)۔ (محمد زبیر حق نواز)

زکوٰۃ کی رقم تعمیرِ مدرسہ پر لگانے کے لئے طلبہ سے تملیک کا صحیح طریقہ

زکوٰۃ کی رقم دیتے وقت زکوٰۃ کا نام لینا ضروری نہیں

سوال ۱:- ہمارے گاؤں میں ابھی ایک مدرسہ قائم ہوا ہے جس میں بیس طلبہ پڑھتے ہیں، مدرسہ کے مہتمم غریب ہیں جو طلبہ کو پڑھاتے ہیں، چونکہ مدرسہ ابھی زیرِ تعمیر ہے اس لئے مدرسہ کے لئے جو لوگ زکوٰۃ کی رقم دیتے ہیں یہ مہتمم صاحب خود یا دارالعلوم کے طلبہ میں زکوٰۃ کی رقم ایجاب وقبول کراکر دارالعلوم کی تعمیر کی مد میں خرچ کرتے ہیں، تو اس طرح زکوٰۃ کی رقم کا ایجاب وقبول کرنا اور دارالعلوم کی تعمیر پر خرچ کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

سوال ۲:- زکوٰۃ کی رقم دیتے وقت دینے والے کو یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے یا بتانا ضروری نہیں، وضاحت فرمائیں؟

جواب ۱:- اگر زکوٰۃ کی رقم مستحقِ زکوٰۃ طلبہ کو اس طرح دیدی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس رقم کا مکمل مالک ومختار سمجھتے ہیں، اور پھر خود خوش دِلی سے کسی دباؤ کے بغیر وہ رقم یا اس کا کچھ حصہ مدرسے کو چندے کے طور پر دیدیتے ہیں تو اس رقم کو تعمیر کے کام میں خرچ کرنا جائز ہے۔[1]

لیکن اگر محض بناوٹی حیلہ کیا جاتا ہے کہ طلبہ اپنے آپ کو رقم کا مالک نہیں سمجھتے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ رقم بہرحال مدرسے میں دینی ہے، یا دباؤ کے تحت دیتے ہیں تو ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں ہے اور مہتمم صاحب کو خود تملیک نہ کرنی چاہیے، اِلَّا یہ کہ کوئی زکوٰۃ کی رقم دینے والے نے مہتمم صاحب ہی کو مستحقِ زکوٰۃ سمجھ کر دی ہو تو وہ رقم اگر چاہیں تو مدرسے میں داخل کر سکتے ہیں، مگر جو رقم مدرسے کے نام پر زکوٰۃ میں دی گئی، اس کا مالک خود کو بنا کر مدرسے میں داخل کرنا درست نہیں۔

جواب ۲:- نہیں، بتانا ضروری نہیں، ہدیہ کے نام سے بھی دے سکتے ہیں اور کچھ کہے بغیر بھی دے سکتے ہیں بشرطیکہ نیت زکوٰۃ کی ہو۔[2]

واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸/۷۵)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع سعید) وحیلة التكفین بها التصدق علیٰ فقیر ثم هو یكفن فیكون الثواب لهما، وكذا فی تعمیر المسجد .... الخ. نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: امدادالمفتین ص:۲۶۴ سوال نمبر ۳۲۵.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۸ (طبع مذكور) وشرط صحة أدائها نیة مقارنة له، (ای للأداء) وفی الشامیة (قوله نیة) اشار الیٰ أنه لا اعتبار للتسمیة، فلو سماها هبة أو قرضًا تجزیه فی الأصح. (محمد زبیر حق نواز)

مقروض کو زکوٰۃ دینے کا حکم اور کیا قرض کو زکوٰۃ میں منہا کیا جاسکتا ہے؟

سوال:- راولپنڈی کی مین مارکیٹ میں ایک صاحب سے ہم کاروبار کرتے تھے، لاکھوں کا کاروباری لین دین ہوتا تھا، یہ صاحب جو کافی مال دار اور جائیداد کے مالک تھے، ان پر زوال آگیا سب کچھ ختم ہوگیا، کاروبار تباہ ہوگیا، جائیداد کو فروخت کر کے لوگوں کے قرض ادا کئے گئے، وہ ٹھاٹھ باٹھ گئی، اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ صاحب کسی کے پاس ملازمت کرتے ہیں، بڑی مشکل سے وقت گزار رہے ہیں۔ محترم مفتی صاحب! مجھے آپ سے یہ دریافت کرنا ہے، ان ہی صاحب نے ہمارا ۶۳۰۰۰ روپیہ دینا ہے اور وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ہمارا قرض جو ان کے ذمہ برقرار ہے ادا کرسکیں۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ہم زکوٰۃ کی صورت میں یہ رقم جو ان کے ذمہ ہے منہا کرلیں، آیا ایسی صورتِ حال میں ہماری زکوٰۃ ادا ہوجائے گی اور ان صاحب کا قرض ادا ہوجائے گا، اس طرح دونوں پارٹیوں کا فائدہ دکھائی دیتا ہے، آپ کے فتویٰ کا شدّت سے انتظار رہے گا، جس کے لئے دِل سے شکرگزار رہوں گا۔

طلعت محمود (راولپنڈی)

جواب:- برادرِ عزیز و مکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اگر اُن صاحب کا قرضہ اتنا ہے کہ اگر وہ قرض ادا کریں تو ان کے پاس ½ ۵۲ تولہ چاندی کی قیمت کا روپیہ، زیور یا ضرورت سے زیادہ سامان نہ بچے گا، تو آپ انہیں زکوٰۃ دے سکتے ہیں[1]، مگر قرض کو صرف منہا کرنا ٹھیک نہیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ انہیں رقم دے دیں، پھر ان سے مطالبہ کرلیں کہ اب آپ کے پاس اتنی رقم آگئی ہے وہ قرض میں ادا کردیجئے[2]۔ اگر خود ایسا نہ کرسکیں تو رقم کسی اور سے دِلوادیں اور قرض خود وصول کرلیں۔ والسلام

واللہ اعلم

۱۴۱۵/۴/۳۰ھ[3]

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۴۹ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۵۳ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۳) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ایک جوابی خط کی صورت میں دیا۔ (محمد زبیر)

(روزے کے مسائل)

﴿فصل فی رُؤیۃ الھلال﴾
(چاند دیکھنے سے متعلق مسائل کا بیان)

حسابات کی بنیاد پر قمری مہینوں کا تعین کرنا کیسا ہے؟

سوال:- ایک ضروری علمی سوال جو آپ کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ زید کہتا ہے کہ عرب ممالک میں رؤیتِ ہلال نظری و بصری ضروری قرار نہیں دی جاتی بلکہ علم ہیئت و نجوم کی رُو سے جس دن قرانِ شمس وقمر ہوتا ہے یعنی ایک درجہ فلک پر شمس وقمر کا اجتماع ہوتا ہے اسی دن کو بشرطیکہ قران قبل دوپہر ہو، چاند کی پہلی شمار کی جاتی ہے، زید نے اس کی چھان بین کئی بار کی ہے ضروری خیال فرمائیں تو آپ بھی اس کی تحقیق فرمائیں۔

مثلاً آئندہ ماہ یعنی محرم کا چاند انگریزی تاریخ کی ۱۰/۱۱ نومبر قبل دوپہر قرانِ شمس وقمر ہے لہٰذا پہلی ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ شمار ہوگی، حالانکہ رؤیت کا قانون یہ ہے کہ اجتماعِ شمس وقمر کم از کم بیس گھنٹے کے بعد چاند بصورتِ ہلال شفق غربی پر نظر آیا کرتا ہے کیونکہ اس وقت وہ سورج سے دس بارہ درجہ دور آگے نکل جاتا ہے اور تحت الشعاع نہ ہونے کے سبب نظر آجاتا ہے قبل ازیں وہ سورج کے تحت الشعاع ہوتا ہے اور نظر آنا اس کا ممکن نہیں ہوتا، اگر گرہن شمسی کا وقت بھی اجتماعِ شمس کا ہی ہوتا ہے ایسے وقت میں زمین پر سورج کی روشنی بوجہ اس کے کہ سورج کے سامنے چاند آجاتا ہے اہلِ زمین کو نہیں ملتی اور ہم اسے گہنایا ہوا دیکھتے ہیں، علمِ ہیئت میں اس کو نیا چاند کہتے ہیں یعنی اس کے بعد چاند سورج سے آگے نکلنا اور بڑا ہونا شروع ہوجاتا ہے حتیٰ کہ وقتِ گرہن سے کم وبیش ۲۴ گھنٹے بعد ہلال نظر آتا ہے اسی کو رُؤیتِ ہلال کہتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ جب عرب ممالک میں رُؤیتِ ہلال کے بجائے نیا چاند بروئے علمِ ہیئت بنیاد قرار پایا تو کیا اس کی شرعاً گنجائش ہے؟

جواب:- سعودی عرب اور مصر کے بارے میں ہم کو تحقیق سے معلوم ہے کہ وہاں حسابات پر مدار نہیں بلکہ ہلال کی رُؤیت پر ہے اور یہی طریقہ شرعاً دُرست ہے، حسابات کی بناء پر قمری مہینوں کا تعین شرعاً دُرست نہیں، اس کی تفصیل مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ

کے رسالہ ''رُؤیتِ ہلال'' میں درج ہے، اسے ملاحظہ فرمایا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۸/۳۰ ر)

مستند علماء کی ''رُؤیتِ ہلال کمیٹی'' اگر شہادتوں کی بنیاد پر فیصلہ کرلے تو عوام کو اس پر عمل کرنا لازم ہے

سوال:- کویت میں رُؤیتِ ہلال کا اعلان حکومت کی طرف سے ہوتا ہے، اور اس کے لئے حکومت نے ایک کمیٹی تشکیل دی ہوئی ہے، دیگر ایام میں تو اس کی کارکردگی سے ہم عوام کو کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا، لیکن رمضان اور شوال کے لئے ان کے اعلان کا انتظار ہوتا ہے، بندہ کو تین رمضان کویت میں گزارنے کا موقع ملا اور بعض احباب کئی سال سے کویت میں ہیں، اپنا تین سالہ تجربہ اور دیگر احباب کا کئی سال کا مشاہدہ یہ ہے کہ کویت میں رمضان المبارک کبھی تیس ایام کا نہیں ہوا، ہر سال اُنتیس کا ہوتا ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ سال یعنی ۱۳۹۵ھ میں صبح کی نماز کے بعد انتیس رمضان المبارک کو مشرق میں چاند دیکھا گیا جو کہ مکانوں کی چھتوں کے اُوپر تھا اور محتاط اندازے کے مطابق چاند کا طلوع آفتاب کے طلوع سے ۱/۴ گھنٹہ پہلے تھا اور ہر ایک کا گمان یہی تھا کہ اس بار تیس روزے پورے ہوجائیں گے اور تقویم میں بھی تیس رمضان کے بعد شوال کے چاند کا غروب سورج سے چھ منٹ بعد تھا لیکن عشاء کی نماز سے کچھ دیر بعد حکومت کی طرف سے اعلان ہوگیا کہ شوال کا چاند ہوگیا ہے اور T.V پر کچھ احباب کی شکلیں بھی دکھائی گئیں کہ ان لوگوں نے چاند دیکھا ہے، مطلع اس دن صاف تھا اور باوجود کوشش کے نہ تو اس دن کسی کو چاند نظر آیا تھا اور نہ ہی اگلے دن نظر آسکا۔

گزشتہ سال رمضان کے آخری ایام میں اعلان ہوا کہ شوال کا چاند کویت کے اُفق پر نظر نہیں آئے گا کیونکہ اس کا غروب سورج کے غروب سے چند منٹ پہلے ہے، یکم شوال کو بھی چاند واضح نہیں ہوگا، اس کے اگلے دن چاند صاف دیکھا جاسکے گا، رمضان المبارک ۲۹ یوم کا ہی ہوا۔

اس سال تقویم میں روزے تو تیس ہی کے ہیں لیکن چاند کا غروب سورج کے غروب سے تین منٹ قبل ہے، یعنی چاند کا شہود پھر بھی نہیں ہوگا اور عین ممکن ہے کہ گزشتہ روایات کو قائم رکھتے ہوئے ۲۹ ر رمضان کو ہی شوال کے چاند کا اعلان ہو۔ مندرجہ بالا کوائف کو مدِنظر رکھتے ہوئے شرعی نقطۂ نظر سے عید کا کیا حکم ہے؟ گزشتہ سے پیوستہ سال یعنی ۱۳۹۵ھ میں کچھ لوگوں نے حکومت کے اعلان پر عید نہیں

کی، ان کا استدلال یہ تھا کہ جب مشرق میں فجر کے وقت چاند اتنا اُونچا تھا تو یہ ممکن ہی نہیں کہ شام تک سورج، چاند سے آگے نکل جائے، اور جب مطلع صاف ہو تو اس محلہ میں کسی نہ کسی کو تو نظر آنا ہی چاہئے تھا، اس کے برخلاف اکثر احباب کی رائے تھی کہ عید تو حکومت کے اعلان پر عوام کے ساتھ ہی کرنا چاہئے تھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہیں بنانی چاہئے تھی، اس اختلافِ رائے کی وجہ سے ماحول میں کافی تلخی اور کھچاؤ رہا، آپ فرمایئے کیا حکم ہے؟

تنقیح

مندرجہ ذیل سوالات کا جواب اس استفتاء کے ساتھ بھیج دیں تو اس مسئلے کا جواب دیا جاسکے گا۔

۱:- کیا رُؤیتِ ہلال کمیٹی میں علماء شامل ہیں؟ یا محض انتظامیہ کے افراد ہوتے ہیں؟

۲:- کمیٹی کا طریقۂ کار کیا ہے؟ یعنی وہ شہادتوں کی بنیاد پر فیصلہ کرتی ہے یا تقویم کے حساب پر؟

۳:- ۱۳۹۵ھ میں رمضان کا جو اعلان کیا گیا وہ کتنی شہادتوں کی بنیاد پر کیا گیا؟ یا ٹی وی پر کتنے افراد کی شہادت دکھائی گئی؟

۴:- کویت کے عام باشندوں کا فقہی مسلک کیا ہے؟

جوابِ تنقیح از مستفتی

۱:- رُؤیتِ ہلال کمیٹی پانچ افراد پر مشتمل ہے جن میں ایک عالم ہیں جو کہ مستند قاضی ہیں، کمیٹی کا سربراہ انتظامیہ سے متعلق ہے۔

۲:- کمیٹی کے فیصلہ کی بنیاد شہادتوں پر ہوتی ہے، رمضان کے چاند کے لئے ایک شہادت پر فیصلہ ہوتا ہے اور شوال کے چاند کے لئے دو شہادتوں پر، مطلع ابر آلود ہو یا صاف ہو۔

اگر سعودی عربیہ میں شوال کے چاند کا اعلان ہوجائے تو کویت میں بھی بغیر شہادتوں کے عید کا اعلان کردیا جاتا ہے۔

۳:- پہلے حصہ کا جواب نمبر۲ میں ہے دوسرے حصے کا جواب اس وقت معلوم نہیں کیا جاسکا۔

۴:- کویت کے عام باشندے مالکی اور حنبلی مسلک پر ہیں۔

جواب:- جب رُؤیتِ ہلال کمیٹی مستند علماء پر مشتمل ہے اور وہ شہادتوں کی بنیاد پر فیصلہ کرتی ہے نہ کہ حسابات کی بنیاد پر، تو پھر عوام کو اس کے فیصلے کے مطابق عمل کرنا چاہئے، اور زیادہ کنج کاؤ میں پڑکر انتشار پیدا کرنا مناسب نہیں، البتہ جب کمیٹی کے فیصلے میں کوئی شبہ پیش آئے تو مقامی علماء یا کمیٹی

کے علماء سے رُجوع کرنا چاہئے، مثلاً مطلع صاف ہونے کی صورت میں جم غفیر کی شہادت ہونی چاہئے تھی[1] اس بات کی طرف کمیٹی کو متوجہ کیا جائے۔ دُور رہنے والے علماء صحیح صورتِ حال کا اندازہ نہیں کرسکتے اس لئے مقامی علماء ہی سے رُجوع کیا جائے خواہ وہ حنفی مسلک کے نہ ہوں۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۹/۲۸ ب)

اَبر کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے تو کیا حکم

سوال:- برما ملک میں برسات اور ابر کی وجہ سے چاند نظر نہیں آتا، کیا چاروں مہینے تیس تیس دن کے شمار کئے جائیں، برمی حساب میں برمی کی تین تاریخ کو چاند ہونے کا (چاند کی ۲۹ تاریخ کو چاند کا حکم) لگایا جاسکتا ہے جبکہ مطلع صاف نہ ہو۔

جواب:- شریعت نے چاند کا دار و مدار رُؤیت پر رکھا ہے، لقولہ علیہ السلام: صوموا لرُؤیتہ وافطروا لرُؤیتہ فإن غم علیکم فأکملوا العدۃ ثلاثین۔[2] لہٰذا اگر ابر کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرنے چاہئیں،[3] حسابات کے ذریعہ یا برمی مہینوں کا اندازہ کرکے روزہ رکھنا یا افطار کرنا قطعاً جائز نہیں،[4] اس مسئلے کی مکمل تفصیل حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے رسالے ''رُؤیتِ ہلال'' میں موجود ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۶۶/۲۷ و)

دو عورتوں کی طرف سے رُؤیتِ ہلال کی شہادت کا حکم

سوال:- ہلالِ رمضان المبارک کچھ مشتبہ ہوگیا، اس کی صراحت فرمادیں کہ شبِ جمعہ کو دو نمازی عورتوں نے چاند دیکھا، اور دوسروں کو بھی دکھایا لیکن دوسرے مطمئن نہیں ہوئے سوائے دو کے،

---

(۱) کذا فی رد المحتار کتاب الصوم ج:۲ ص:۳۸۷، ۳۸۸.

(۲) وفی سنن النسائی ص:۳۰۱ (طبع قدیمی کتب خانہ) کتاب الصوم اکمال شعبان ثلاثین اذا غم، عن ابن عباسؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ، فان غم علیکم فاکملوا العدۃ ثلاثین.
نیز اسی معنیٰ کی حدیث دیکھئے۔ صحیح بخاری کتاب الصوم ج:۱ ص:۲۵۵، ۲۵۶ (طبع قدیمی کتب خانہ).

(۳،۴) وفی التاتارخانیۃ کتاب الصوم قبیل الفصل الثالث ج:۲ ص:۳۵۷ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) یجب صوم رمضان برؤیۃ الھلال أو باستکمال شعبان ثلاثین ولا یجوز تقلید المنجم فی حسابہ لا فی الصوم ولا فی الإفطار.
وفی البدائع کتاب الصوم ج:۲ ص:۸۰ فان کانت السماء مصحیۃ یعرف برؤیۃ الھلال وان کانت متغیمۃ یعرف باکمال شعبان ثلاثین یومًا لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ، فان غم علیکم فاکملوا شعبان ثلاثین یومًا ثم صوموا.

جس پر چند لوگوں نے روزہ رکھا باقی منتظر رہے پھر جمعہ کو ایک معتمد نمازی نے شہادت دی کہ میں نے گھاس کاٹتے ہوئے لبِ سڑک چاند دیکھا تھا، معتمد نمازیوں نے بستی میں آکر تراویح بھی پڑھی اور روزہ بھی رکھا پھر دن میں لوگوں نے پانی میں دیکھا سب کو نظر آیا اب اس کی قضاء ہوگی یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر مطلع بالکل صاف تھا تب تو صرف دو عورتوں کی شہادت کافی نہیں اور اس سے رمضان ثابت نہیں ہوا، اور اگلے دن میں چاند دیکھنا معتبر نہیں، لیکن اگر مطلع صاف نہیں تھا تو ان دو عورتوں کی خبر سن کر بستی والوں پر روزہ رکھنا ضروری تھا، اور اب جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا وہ اس کی قضا کریں کما فی العالمگیریہ:

إن كان بالسماء علة فشهادة الواحد على هلال رمضان مقبولة إذا كان عدلا مسلما عاقلا بالغا حرا كان أو عبدا ذكرا كان أو أنثى (وفيه أيضًا) أما في السواد إذا رأى أحدهم هلال رمضان يشهد في مسجد قريته وعلى الناس أن يصوموا..... إذا لم يكن هناك حاكم يشهد عنده (عالمگيريه)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۱/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۵/ ۲۸ الف)

پاکستان کی رُؤیتِ ہلال کمیٹی کے طریقۂ کار کے بارے میں چند سوالات کے جوابات

سوال:- پچھلے دنوں مسائلِ جدیدہ پر غور وخوض کے لئے ہمارے صوبہ گجرات (انڈیا) کے مشاہیر اہلِ علم و اربابِ فتویٰ کی ایک میٹنگ زیرِ صدارت حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی مدظلہ (صدر مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور) منعقد ہوئی تھی، جس میں منجملہ دیگر اُمور کے رُؤیتِ ہلال کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا، دورانِ بحث پاکستان کی رُؤیتِ ہلال کمیٹی کی شرعی حیثیت معلوم ہونے کے لئے ان اُمور کا معلوم ہونا ضروری ہے کہ اس کے افراد کون اور کس قسم کے افراد ہیں؟ شرعی ثبوت فراہم کرنے کا طریقِ کار کیا ہے؟

ریڈیو پر اعلان کس طرح اور کون کرتا ہے؟ وغیرہ تفصیلات کا علم ضروری ہے، اسی کے بعد پاکستان کی رُؤیتِ ہلال کمیٹی کے اعلان سے استفادہ کا مسئلہ سوچا جاسکتا ہے۔

لہٰذا جناب والا سے عرض ہے کہ پاکستان کی رُؤیتِ ہلال کمیٹی سے متعلق درج ذیل تفصیلات آپ کے علم میں تو ہوں گی، اور اگر نہ ہوں تو براہِ کرم زحمت گوارا فرما کر معلومات حاصل کر کے مطلع

---

(۱) فتاویٰ عالمگیریۃ ج:۱ ص:۱۹۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

فرمائیں، تاکہ ہندوستان میں بھی پاکستان کی رُؤیتِ ہلال کمیٹی کے اعلان سے استفادہ کا موقع شرعی نقطۂ نظر سے فراہم ہوسکے۔

۱:- پاکستان کی رُؤیتِ ہلال کمیٹی کن علماء، داعیان اور اُمت کے صالح و متدین افراد پر مشتمل ہے؟ اور کمیٹی کا صدر کون ہے؟

۲:- کیا ثبوتِ ہلال کے تمام شرعی اُصول و ضوابط کمیٹی ملحوظ رکھتی ہے؟

۳:- کیا یہ کمیٹی رُؤیت کا شرعی ثبوت فراہم کرنے کے بعد خود پوری ذمہ داری کے ساتھ ریڈیو پر اعلان کرتی ہے؟

۴:- اعلان کرنے والا کمیٹی کا صدر یا سیکریڑی ہوتا ہے؟

۵:- کیا اس بات سے لوگوں کو پہلے ہی سے مطلع کردیا جاتا ہے کہ اعلان فلاں فلاں صاحب کریں گے؟

۶:- رُؤیتِ ہلال کمیٹی کے فیصلہ میں محکمۂ موسمیات کے حساب و کتاب کو کچھ دخل ہے یا نہیں؟ کیونکہ صدر ایوب خان کے دورِ حکومت میں اعلانِ رُؤیت کا اختیار علمائے کرام سے لے کر محکمۂ موسمیات کے حوالے کردیا گیا تھا، جو شرعاً صحیح نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان کے ذمہ دار علمائے کرام نے اس پر اعتراض کیا اور وہاں دو عیدیں ہوئیں، ایک سرکاری اور ایک عوامی، اس کے بعد شاید کچھ اصلاح کی گئی، اب کیا صورتِ حال ہے؟

مصلح الدین
دارالافتاء، اصلاح المسلمین مانڈوی
گجرات، ہندوستان

جواب:-

مکرمی محترمی!　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ بسلسلۂ رُؤیتِ ہلال کمیٹی اس سے پہلے بھی احقر کو ملا تھا اور احقر نے اس وقت اس کا مفصل جواب بھی بھیج دیا تھا، افسوس ہے کہ وہ جواب آپ کو نہیں ملا۔

بہرحال! سوالات کے مختصر جوابات دوبارہ عرض کرتا ہوں۔

۱:- پاکستان کی رُؤیتِ ہلال کمیٹی یہاں کے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء پر مشتمل ہے، جس میں دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث اور شیعہ حضرات شامل ہیں، اس کے پہلے چیئرمین حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ تھے، ان کے بعد سے دو بریلوی علماء چیئرمین ہوئے، اب بھی ایک بریلوی عالم اس کے چیئرمین ہیں، اب تک کمیٹی کے تمام فیصلے ارکان کے اتفاق سے ہوتے رہے ہیں۔

۲:- مجھ سے کمیٹی کے چیئرمین نے بیان کیا کہ رُویتِ ہلال کمیٹی کا طریقِ کار بنیادی طور پر وہ ہے جو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا سیّد یوسف بنوریؒ نے منضبط فرمایا تھا، اور یہ طریقِ کار ظاہر ہے کہ شرعی اُصول وضوابط کے مطابق تھا۔

البتہ ایک معاملے میں تھوڑا سا فرق ہوگیا ہے اور وہ یہ کہ مذکورہ حضرات کے بیان کردہ طریقِ کار میں یہ درج تھا کہ اگر کوئی ذیلی رُویتِ ہلال کمیٹی اپنے شہر میں رُویت یا اس کی شرعی شہادت کی بناء پر فیصلہ کرے تو ایسی ذیلی کمیٹی کو پورے ملک کے لئے فیصلہ کرنے کی ولایت دے دی جائے اور اعلان اسی کی آواز میں نشر کیا جائے، لیکن اب عمل اس پر ہوتا ہے کہ مرکزی رُویتِ ہلال کمیٹی ذیلی کمیٹی کے فیصلے کی خبر ٹیلی فون پر حاصل کرتی ہے اور اس کے فیصلے کا ذکر کرکے خود اعلان کرتی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ کمیٹی کے چیئرمین سے کہا تھا کہ وہ ٹیلی فون پر فیصلے کی خبر لیتے وقت کم از کم یہ احتیاط ضرور کریں کہ یہ خبر استفاضہ کی حد تک پہنچ جائے، اس پر انہوں نے اتفاق کا اظہار کیا تھا۔

۳:- کمیٹی مذکورہ طریقۂ کار کے مطابق ثبوت فراہم ہوجانے پر خود ریڈیو پر اعلان کرتی ہے۔

۴:- یہ اعلان کمیٹی کے چیئرمین کی آواز میں براہِ راست کمیٹی کے مقامِ اجلاس سے نشر کیا جاتا ہے۔

۵:- جی ہاں! یہ بات سب کو معلوم ہے اور اخبارات میں بھی آجاتی ہے کہ اعلان کمیٹی کا چیئرمین کرے گا۔

۶:- کمیٹی کے فیصلے میں موسمیات کے حساب وکتاب کا کوئی دخل نہیں ہوتا، والسلام

احقر محمد تقی عثمانی
۱۴۰۳/۸/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۷۳/۳۴ د)

رُویتِ ہلال کے سلسلے میں مستند علماء کی طرف سے شرعی شہادت کے مطابق کئے گئے فیصلے پر عمل کرنا چاہئے

سوال ۱:- امسال عید الفطر میں پشاور ڈویژن میں بہت سی تحصیلوں میں یکم جنوری ۱۹۶۸ء کو عید الفطر منائی گئی تھی، جبکہ پشاور ڈویژن کے علاوہ پورے مغربی ومشرقی پاکستان میں ۲؍جنوری ۱۹۶۸ء کو عید الفطر منائی گئی تھی۔ یکم جنوری ۱۹۶۸ء کو دن کے دس بجے تک ہم بمعہ اہل وعیال روزے سے رہے، چونکہ ہمارے گاؤں میں بھی اسی دن یعنی یکم کو عید الفطر منانے کا فیصلہ ہوا تھا، اس لئے ہم نے بھی اُسی دن عید منائی، باوجودیکہ یہاں پر پشاور، نوشہرہ اور مردان شہروں میں نصف سے زیادہ لوگوں

نے یکم کو عید الفطر نہیں منائی، ہمیں اپنے گاؤں والوں کا ساتھ دینا چاہئے تھا یا شہر والوں کا، جنہوں نے ۲؍جنوری کو عید منائی؟

جواب ۱:- آپ کے گاؤں میں اگر کسی مستند عالمِ دین نے چاند کی شہادت لے کر یکم جنوری کو عید منانے کا فیصلہ کیا تھا تو آپ نے یکم جنوری کو عید منا کر صحیح کام کیا، لیکن اگر چاند دیکھنے کی کوئی شرعی شہادت آپ کے گاؤں میں پیش نہیں ہوئی تو محض عام لوگوں کے فیصلہ کر لینے سے عید نہیں ہوتی، آپ کو ایک روزے کی قضا کرنی چاہئے۔

سوال ۲:- اسی طرح عید الاضحیٰ میں بھی صرف چارسدہ تحصیل میں ۹؍مارچ کو عید الاضحیٰ منائی گئی، اس حساب سے کہ یہاں پر ۱۹۶۸/۲/۲۸ء کو چاند دیکھنے کی شہادت مل چکی تھی، اس تحصیل کے علاوہ پورے پشاور ڈویژن میں کہیں بھی عید ۱۹۶۸/۳/۹ء کو نہیں منائی گئی، اب بھی ہمارے موضع والوں نے ۱۹۶۸/۳/۹ء کو ہی عید منائی، لہٰذا ہم نے بھی اُن کا ساتھ دیا، اس بناء پر کہ گاؤں والوں کا ساتھ دینا ضروری ہے، یہ ہم نے صحیح کیا یا غلط؟

جواب ۲:- اگر واقعۃً چارسدہ میں رُؤیتِ ہلال کی شہادت کی بنیاد پر ۹؍مارچ کو عید الاضحیٰ کا اعلان کیا گیا اور آپ کو اس اعلان کی قابلِ اعتماد اطلاع پہنچ گئی، تو آپ کا ۹؍مارچ کو عید کرنا صحیح ہوا۔

آئندہ کے لئے یہ بات یاد رکھیئے کہ رُؤیتِ ہلال ایک خالص دینی معاملہ ہے، اور اس کی شہادت کا شریعت میں خاص ضابطہ ہے، چونکہ عام لوگ اس ضابطے سے واقف نہیں ہیں، اس لئے آپ کے قریب جو مستند علماء ضابطۂ شہادت سے واقف ہوں، ہمیشہ ان سے رُجوع کر کے صحیح صورتِ حال معلوم کر لیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۰/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

﴿فصل فی المسائل المتعلقة بالصوم﴾
(روزے سے متعلق مختلف مسائل کا بیان)

سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ روزہ رکھتے تھے یا نہیں؟

سوال ۱:- مولانا مودودی صاحب نے تفہیم القرآن حصہ اوّل صفحہ نمبر۱۴۲ میں لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی سفر میں روزہ رکھا اور کبھی سفر میں روزہ نہیں رکھا، کیا یہ تفسیر صحیح ہے؟

۲:- صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگوں میں رہے، کیا صحابہ کرامؓ جنگ کے درمیان روزہ رکھتے تھے؟ جیسا کہ مولانا مودودی صاحبؒ نے صفحہ نمبر۱۴۲ پر کہا ہے کہ ''ایسے صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ کوئی روزہ رکھتا تھا اور کوئی صحابی روزہ نہیں رکھتا تھا جنگ کے دوران میں'' کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- یہ دُرست ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں کبھی روزہ رکھا ہے اور کبھی افطار کیا ہے[1]، اور مسافر کے لئے دونوں طریقے جائز ہیں[2]، اور اگر غیر معمولی مشقت کا اندیشہ نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے[3] لقوله تعالیٰ "وأن تصوموا خير لكم"۔[4]

صحابہ کرامؓ کے بارے میں بھی یہ درست ہے کہ سفر کی حالت میں بعض صحابہؓ روزے سے ہوتے اور بعض افطار فرماتے تھے۔[5]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۳۹/۲۷و)

---

(۱) وفي الصحيح للامام مسلمؒ باب جواز الصوم والفطر في شهر رمضان للمسافر ج:۱ ص:۳۵۶ (طبع قديمي كتب خانه) عن ابن عباسؓ قال: سافر رسول الله صلى الله عليه وسلم في رمضان فصام حتى بلغ عسفان ثم دعا باناء فيه شراب فشربه نهارًا ليراه الناس ثم افطر حتى دخل مكة. قال ابن عباسؓ: فصام رسول الله صلى الله عليه وسلم وافطر من شاء صام ومن شاء افطر. وفي مجمع الزوائد للهيثميؒ ج:۳ ص:۱۵۸، ۱۵۹ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصوم في السفر ويفطر .... الخ (قال الهيثمي) رواه احمد وابويعلى والبزار بنحوه ورجال احمد رجال الصحيح.

(۲، ۳) مذکورہ حدیث کے علاوہ مزید حوالہ جات اگلے فتویٰ کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (۴) سورة البقرة: ۱۸۴.

(۵) وفي جامع الترمذي ج:۱ ص ۸۹ (طبع فاروقي كتب خانه) عن ابي سعيدؓ قال: كنا نسافر مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في شهر رمضان فما يعاب على الصائم صومه، ولا على المفطر فطره .... الخ. وجاء في حديث باب ما جاء في كراهية الصوم في السفر ج:۱ ص:۸۹ (قبل الحديث السابق) فأفطر بعضهم وصام بعضهم.

سفر میں روزہ رکھنے کا حکم

سوال:- اگر کوئی سفر میں ہے یا بیمار ہے کیا وہ شخص روزہ چھوڑ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- سفر میں روزہ چھوڑنا جائز ہے لیکن اگر غیر معمولی مشقت کا اندیشہ نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے۔ (۱)

بیماری میں روزہ چھوڑنے کے لئے شرط یہ ہے کہ کوئی ماہر اور دیانت دار معالج یہ کہے کہ اس حالت میں روزہ رکھنے سے تکلیف کے بڑھ جانے یا دراز ہونے کا اندیشہ ہے تو روزہ چھوڑ سکتے ہیں۔ (۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۰۱/۳۰ ج)

عمداً کئی سال تک روزے نہ رکھنے کی صورت میں تمام عرصے کی قضاء لازم ہے

سوال:- میری خالہ جن کی عمر اس وقت ساٹھ سال کے لگ بھگ ہوگی پہلے خرابی صحت کی وجہ سے رمضان کے روزے نہیں رکھ سکتی تھی، یہاں تک کہ انہیں روزوں کی پابندی سے بچنے کی عادت سی ہوگئی اب تقریباً ۴۰ سال سے انہوں نے یہ فرض ادا نہیں کیا اور نہ ہی اس کا کوئی کفارہ ادا کیا کیونکہ توفیق نہیں تھی پھر جب توفیق ہوئی تو اس کا خیال نہیں آیا۔ اب انہیں اس بات کا احساس ہو رہا ہے اور کفارہ ادا کرنا چاہتی ہیں، تو کس حساب سے ادا کریں تاکہ خدا کے عذاب سے بچ سکیں۔

جواب:- آپ کی خالہ صاحبہ کو چاہئے کہ وہ اوّل تو چھوڑے ہوئے روزوں کو ٹھیک ٹھیک حساب لگا کر اپنے وصیت نامے میں لکھ دیں کہ میرے اتنے روزے چھوٹے ہوئے ہیں اگر میں ان کو ادا

---

(۱) وفی مشکوۃ المصابیح ج:۱ ص:۱۷۷ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عائشۃؓ قالت: إن حمزۃ بن عمرو الاسلمی قال للنبی صلی اللہ علیہ وسلم أصوم فی السفر؟ وکان کثیر الصیام فقال: إن شئت فصم وإن شئت فافطر. متفق علیہ. وکذا فی جامع الترمذی ج:۱ ص:۱۵۲۔ نیز تفصیل کیلئے دیکھئے عمدۃ القاری باب الصوم فی السفر والإفطار ج:۱۱ ص:۴۳. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۲۱-۴۲۳ لمسافر سفرا شرعیًا ولو بمعصیۃ .... الفطر .... ویندب لمسافر الصوم لآیۃ: "وأن تصوموا خیر لکم" و الخیر بمعنی البر، لا أفعل تفضیل إن لم یضرہ فإن شق علیہ .... فالفطر أفضل. وفی الشامیۃ قولہ: إن لم یضرہ، أی بما لیس فیہ خوف ھلاک وإلا وجب الفطر .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۲۲ .... فصل فی العوارض المبیحۃ لعدم الصوم .... أو مریض خاف الزیادۃ لمرضہ وصحیح خاف المرض .... الخ. وفی الھندیۃ ج:۱ ص:۲۰۷ وإن خاف زیادۃ العلۃ وامتدادہ فکذلک عندنا .... الخ.

کئے بغیر مرجاؤں تو ان کا فدیہ ادا کردیا جائے[۱]، اس کے بعد ان پر فرض ہے کہ وہ چھوٹے ہوئے روزوں کی قضاء کرنا شروع کریں اور جتنے روزوں کی قضاء کرسکتی ہوں کرلیں[۲]، اور جتنے روزے رکھتی رہیں ان کا حساب بھی وصیت نامے میں درج کرتی رہیں، اور جب عمر کی زیادتی اور ضعف و بیماری کی وجہ سے روزہ رکھنا ان کے لئے ممکن نہ رہے تو جتنے روزے اس وقت باقی ہوں ان کا فدیہ خود اپنی زندگی میں ادا کردیں[۳]، اور فدیہ اس حساب سے ادا کریں کہ ہر ایک روزے کے بدلے ایک سیر ساڑھے بارہ چھٹانک گندم کسی فقیر کو دیدیں یا اس کی قیمت ادا کردیں[۴]، پھر اگر قوت آجائے تو دوبارہ قضاء روزے رکھنے شروع کردیں۔

واضح رہے کہ فدیہ کی ادائیگی صرف اس وقت کافی ہوگی جبکہ روزہ رکھنے کی طاقت بالکل نہ رہے، ورنہ خود روزہ رکھنا ضروری ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۹۴/۲۸ ج)

روزہ اور ظہار کے کفارہ کی تفصیل

سوال ۱:- قرآن مجید کے مطابق کفارہ کی ادائیگی بہ شکل کھانا کھلانا ۶۰ مساکین کو، کیا کھانے کا معیار صاحبِ کفارہ کے نجی اوسط معیار کا ہونا ہے؟

۲:- دارالعلوم کورنگی کے طلباء میں ۶۰ طلباء کو ایک وقت اس قسم کے کھانے کے اگر وہ مستحق ہیں ان کو کھلا دیا جائے تو کفارہ ادا ہوگا یا نہیں؟

۳:- کفارہ کے کھانے کے سلسلے میں ۶۰ مسکین کی جو تعیین قرآن مجید سے ہے ان کے علاوہ پندرہ بیس اشخاص تعداد میں (دوسری نیت سے مثلاً ایصالِ ثواب والدین) اضافہ کئے جاسکتے ہیں؟

جواب ۱:- روزے یا ظہار کے کفارے میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اس وقت جائز ہے جبکہ ساٹھ روزے پے در پے رکھنے کی قدرت نہ ہو، یعنی متواتر بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکتا ہو، اگر روزے رکھ سکتا ہو تو متواتر ساٹھ روزے رکھنا ہی ضروری ہے، کھانا کھلانا کافی نہیں، اور

(۱، ۲) فی جامع الفصولین کتاب الصوم ج:۲ ص:۲۳۱ (ناشر اسلامی کتب خانہ بنوری ٹاؤن) ولو أفطر المریض یقضی بلا فدیة ولو مات قبل البرء لا شئ علیه اذ لم یدرک عدة من أیام اخر، وعلیه ان یوصی بفدیة مکان لکل یوم نصف صاع من بر یجوز فیها ما یجوز فی صدقة الفطر. وفی الهندیة الباب الخامس فی الأعذار التی تبیح الإفطار ج:۱ ص:۲۰۷ فان برئ المریض أو قدم المسافر وأدرک من الوقت بقدر ما فاته فیلزمه قضاء جمیع ما أدرک فان لم یصم حتی أدرکه الموت فعلیه أن یوصی بالفدیة، وکذا فی الدر المختار ج.۲ ص:۴۲۴ والبحر الرائق ج:۲ ص:۲۸۳ (فصل فی العوارض) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

(۳، ۴) وفی الهندیة الباب الخامس ج:۱ ص:۲۰۷ فالشیخ الفانی الذی لا یقدر علی الصیام یفطر ویطعم لکل یوم مسکینا کما یطعم فی الکفارة وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۲۷ (طبع سعید) وللشیخ الفانی العاجز عن الصوم الفطر ویفدی وجوبا .... الخ.

روزے نہ رکھ سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے،[۱] اس صورت میں ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کم از کم روٹی سالن کھلائے اور بہتر یہی ہے کہ کھانے کا معیار صاحبِ کفارہ کے نجی اوسط معیار کا ہو، کسی دینی مدرسے کے مستحقِ زکوٰۃ طلباء میں ساٹھ کا انتخاب کر کے دو وقت کھلانے سے بھی کفارہ ادا ہوجائے گا۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ کھانا کھلانے کے بجائے اس کی قیمت صدقہ کرے، اس صورت میں ہر مسکین کو پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی،[۲] اور کفارہ کا کھانا کھلاتے وقت ساٹھ سے زائد افراد کو کسی اور نیت سے شریک کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۱۲/۲۸ ج)

سفر کی وجہ سے رمضان اکتیس کا ہونے کی صورت میں اکتیسواں روزہ بھی فرض ہے

سوال:- ایک آدمی نے سعودیہ میں قضائے قاضی سے روزہ رکھا پھر پاکستان آگیا، اس نے وہاں سعودیہ میں تیس روزے پورے کر لئے جبکہ پاکستان میں عید کا حکم نہیں ہے۔ مفتی رشید احمد صاحب نے احسن الفتاویٰ جدید ج:۴ ص:۴۲۳ میں بہ عنوان ”سفر کی وجہ سے رمضان اکتیس یا اٹھائیس ہوگیا“ لکھا ہے یہ آدمی اکتیسواں روزہ بھی رکھے گا۔ نیز اگر یہ آدمی اکتیسواں روزہ نہ رکھے تو اس پر اس کی قضاء ہے یا نہیں؟ برائے کرم تشفی فرمائیں۔

جواب:- احسن الفتاویٰ تو اس وقت سامنے نہیں ہے، لیکن حضرت والد صاحب (حضرت مفتیٔ اعظم قدس سرہٗ) کا فتویٰ بھی یہی تھا کہ پاکستان پہنچنے کے بعد یہاں کا اعتبار کرتے ہوئے اکتیس روزے پورے کرے گا، اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ شھود الشھر موجب فرضیتِ صوم ہے، اور شھود الشھر ہر علاقے میں وہاں کا معتبر ہے، پاکستان میں چونکہ شھر ابھی موجود ہے اس لئے فرضیتِ صوم اس کے حق میں متحقق ہے، رہی وہ حدیث جس میں شہر کے تیس دن ہونے کا ذکر ہے، سو وہ اس بارے

(۱، ۲) وفی خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۶۱ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) ثم لا بد من کفارة فنقول کفارة الفطر وکفارة الظهار واحدة وهی عتق رقبة مؤمنة أو کافرة وإن لم یقدر علی العتق فعلیه صیام شهرین متتابعین، وإن لم یستطیع فعلیه إطعام ستین مسکینًا کل مسکین صاعًا من تمرة أو شعیر أو نصف صاع من حنطة علی ما یأتی فی صدقة الفطر. وفی الدر المختار مع ردالمحتار باب الکفارة ج:۳ ص:۴۷۸ فإن عجز عن الصوم أطعم ستین مسکینًا کالفطرة (قوله کالفطرة قدرًا) أی نصف صاع من بُر أو صاع من تمر أو شعیر.

میں قطعی الثبوت والدلالۃ نہیں بلکہ اس میں احتمال موجود ہے اور "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ ..... الخ"[1] کا حکم قرآنی قطعی الثبوت والدلالۃ ہے، مزید یہ کہ احتیاط بھی اسی میں ہے، اور جب روزہ فرض ہوا تو نہ رکھنے سے قضاء بھی لازم ہوگی۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۸/۱۱/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۱۱/۳۹ ح)

۱:- پاکستان سے سعودی عرب اور سعودیہ سے پاکستان آنے والے شخص کے روزے اور عید میں تفصیل

۲:- روزے کی حالت میں حیض کا شروع ہونا

سوال:- ایک شخص سعودی عرب سے روزے رکھتے ہوئے آیا اور یہاں پر بھی روزے رکھ رہا ہے، پاکستان کے لحاظ سے اس کے دو روزے زائد ہو رہے ہیں ایسی حالت میں کیا حکم ہے؟

۲:- اس کے برعکس ایک شخص پاکستان سے روزے رکھتے ہوئے سعودی عرب جائے اس کے دو روزے سعودی عرب کے لحاظ سے کم ہو جائیں گے ایسی صورت میں کیا شکل اختیار کرے؟

۳:- اگر ایک عورت روزے سے ہو اور دن کے کسی حصہ میں وہ ناپاک (حیض یا نفاس سے) ہو جائے تو وہ کیا کرے؟

۴:- اگر ایک عورت حیض و نفاس سے ناپاک ہوئی کچھ دنوں کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ وہ دن کے کسی حصے میں پاک ہو جائے گی تو وہ اس دن کا روزہ رکھے اور دن میں غسل کرے یا یہ کہ غسل کرنے کے بعد دوسرے دن سے روزہ شروع کرے۔

جواب:- پاکستان پہنچ کر جب تک رمضان باقی ہے اس وقت تک روزہ رکھنا اس پر فرض ہے۔[2]

۲:- صورت مسئولہ میں جبکہ اس نے پاکستان میں صرف اٹھائیس روزے رکھے تھے اور سعودی عرب پہنچا تو رمضان ختم ہو چکا تھا تو اس کو دو روزے قضا کرنے ہوں گے۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ:۱۸۵ . وفی جامع الترمذی ج:۱ ص:۸۸ (طبع فاروقی کتب خانہ) الصوم یوم تصومون والفطر یوم تفطرون ..... الخ . وفی رد المحتار ج:۲ ص:۳۸۴ تنبیہ :- لو صام رائی هلال رمضان واکمل العدة لم یفطر الا مع الإمام لقوله علیه السلام: صومکم یوم تصومون وفطرکم یوم تفطرون. رواه الترمذی.

وفی بدائع الصنائع کتاب الصوم ج:۲ ص:۸۰ واما صوم رمضان فوقته شهر رمضان لا یجوز فی غیره فیقع الکلام فیه فی موضعین احدهما فی بیان وقت صوم رمضان، والثانی فی بیان ما یعرف به وقته، اما الأول فوقت صوم رمضان شهر رمضان لقوله تعالیٰ: "فمن شهد منکم الشهر فلیصمه" ای فلیصم فی الشهر، و قول النبی صلی الله علیه وسلم: وصوموا شهرکم، أی فی شهرکم لأن الشهر لا یصام وانما یصام فیه ..... الخ .

(۲) دیکھئے حاشیہ نمبر۱۔ (محمد زبیر)

۳:- اس کا اس دن کا روزہ نہیں ہوا بعد میں اس کی قضاء کرے۔[۱]

۴:- جب تک پاک نہ ہو دن میں کھا پی سکتی ہے، اور پاک ہونے سے پہلے روزے کی نیت بھی درست نہیں، پاک ہونے پر بھی روزے کی نیت درست نہیں، البتہ جس وقت پاک ہوئی اس کے بعد سارے دن کھانا پینا اس کے لئے جائز نہیں،[۲] اور اس دن کی قضا بھی واجب ہے،[۳] اور اگر غلطی سے کھا پی لیا تب بھی کفارہ نہیں آئے گا،[۴] قضاء کافی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۰۵/ ۲۸ ج)

تندرست کے لئے روزہ رکھنا لازم ہے کفارہ کافی نہیں

سوال:- رمضان المبارک کا مہینہ ہے مگر بہت سے لوگ اس سعادت کو جان بوجھ کر چھوڑ دیتے ہیں (بیماروں کے علاوہ) اور کہتے ہیں کہ بعد میں کفارہ دیدیں گے۔ اگر کفارہ ادا کیا جائے تو کتنا ادا کیا جائے؟

جواب:- قوی اور تندرست آدمیوں کے لئے کوئی کفارہ یا فدیہ نہیں ہے، ان پر روزے رکھنا ہی فرض ہے، کفارہ ایسے بوڑھوں کے لئے ہے جو کمزوری کے سبب روزے نہ رکھ سکتے ہوں[۵] اور ان میں قوت دوبارہ آنے کی اُمید نہ ہو، ایسے بوڑھے ایک روزے کے عوض پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت صدقہ کریں۔[۶]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۰۴/ ۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۲۹۰، ۲۹۱ (یمنع صلاة) مطلقا ولو سجدة شکر (وصوما) وجماعا (وتقضیه) لزوما دونها للحرج. وفی الشامیة تحته قوله وتقضیه أی الصوم علی التراخی فی الاصح. وفی الهدایة ج: ۱ ص: ۲۲۴ (مکتبه شرکت علمیه ملتان) واذا حاضت المرأة أو نفست افطرت وقضت. وفی الجوهرة النیرة ج: ۱ ص: ۱۷۷ کتاب الصوم واذا حاضت المرأة أفطرت وقضت وکذا اذا نفست .... الخ. وکذا فی الهندیة کتاب الصوم الباب الخامس ج: ۱ ص: ۲۰۷.

(۲،۳) وفی الهدایة ج: ۱ ص: ۲۲۵ (طبع مکتبه شرکت علمیه ملتان) واذا قدم المسافر أو طهرت الحائض فی بعض النهار أمسکا بقیة یومهما .... الخ.

(۴) وفی الهدایة ج: ۱ ص: ۲۲۳ (مطبع مذکور) و اذا بلغ الصبی أو أسلم الکافر فی رمضان امسکا بقیة یومهما قضاءً لحق الوقت بالتشبه ولو أفطرا فیه لا قضاء علیهما لأن الصوم غیر واجب فیه.

(۵) وفی کشف الاسرار للبزدویؒ ح: ۱ ص: ۱۵۱ تحت قوله تعالیٰ: "وعلی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین.. ." قرأ ابن عباس یطوقونه ویطیقونه، أی یکفلونه علی جهد منهم وعسر وهم الشیوخ والعجائز وحکم هؤلاء الافطار والفدیة .... وفی قراءة ابن عباسؓ: وعلی الذین یطوقونه أی یکلفونه فلا یطیقونه وفی قراءة حفصةؓ: وعلی الذین لا یطیقونه وقیل هو الشیخ الفانی .... الخ. وفی الدر المختار ج: ۲ ص: ۴۲۷ وللشیخ الفانی العاجز عن الصوم الفطر ویفدی وجوبا .... الخ.

(۶) وفی الدر المختار باب الکفارة ج: ۳ ص: ۴۷۸، ۴۷۹ فان عجز عن الصوم اطعم ستین مسکینًا کالفطرة. وفی الشامیة (قوله کالفطرة قدرًا) أی نصف صاع من بر أو صاع من تمر أو شعیر .... الخ.

کمزوری کی بناء پر روزے کا فدیہ دینا
روزے میں زیرِ ناف بال صاف کرنا

سوال:- ایک زچہ رمضان میں روزے نہیں رکھ سکی ہے اور اس کے لئے سارے سال میں روزے رکھنا مشکل ہے، کیا وہ روزے کا فدیہ دے سکتی ہے یا روزہ رکھنا ہی ضروری ہے؟

۲:- کیا روزے کے اندر ناف کے نیچے کے بال صاف کر سکتے ہیں؟

جواب ۱:- تندرستی کے بعد روزے رکھ کر قضاء کرنا ضروری ہے،[1] فدیہ ادا کرنا کافی نہیں، فدیہ ان بوڑھوں کے لئے ہے جن کی صحت وقوت واپس آنے کی اُمید نہ ہو۔[2]

۲:- کر سکتے ہیں۔　　واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۹۵۱/ ۲۸ ج)

۱:- طبّی ہدایات کی بناء پر پائلٹوں کے لئے روزہ نہ رکھنے کی شرعی حیثیت
۲:- آکسیجن ماسک سے روزہ فاسد ہوتا ہے یا نہیں؟

سوال:- پائلٹوں کو بعض طبّی وجوہات کی بناء پر روزے کی حالت میں پرواز کرنے کی ممانعت ہے، ڈاکٹروں کی ہدایات یہ ہوتی ہیں کہ جہاز اُڑانے سے قبل بھی پائلٹ ضرور کچھ کھا پی کر جائیں اور پرواز سے واپس آکر بھی خورد ونوش کریں، ورنہ طبّی نقطۂ نگاہ سے ان کی صحت پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے، کیا اس صورت میں پائلٹ کے لئے روزہ نہ رکھنے کی اجازت از رُوئے شرع ہو سکتی ہے؟

نیز اس صورت میں جبکہ پائلٹ جنگی جہاز اُڑاتے ہوں اور ان کی تربیت پروگرام کے تحت لازمی ہو تو کیا ایامِ رمضان میں ان کی اُڑان اور مسافت اپنی اصلی جگہ سے اتنی دُور ہوتی ہے کہ وہ پرواز کرتے ہی مسافر کے حکم میں آجاتے ہیں؟ تو آیا اس صورت میں وہ روزہ نہ رکھیں اور بعد میں قضاء کرلیں تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

۲:- نیز پائلٹوں کے لئے آکسیجن ماسک لگانا لازمی ہوتا ہے، آکسیجن ماسک لگانے سے روزہ باقی رہ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- ڈاکٹروں کی بعض ہدایات تو محض بربنائے احتیاط ہوتی ہیں جن کی خلاف ورزی سے کوئی واقعی نقصان عموماً نہیں ہوتا، ایسی ہدایات کی بناء پر تو روزہ چھوڑنا درست نہیں، لیکن اگر یہ

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۷۵ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔
(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۷۵ کا حاشیہ نمبر ۳ و ۴، اور ص:۱۷۸ کا حاشیہ نمبر ۵، وامداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۱۵۰، ۱۵۱۔

ہدایات واقعتاً ایسی ہیں کہ ان کی خلاف ورزی سے نقصان کا گمان غالب ہے، تو ایسی صورت میں پائلٹ کے لئے روزہ چھوڑ کر دوسرے دنوں میں قضاء کرنا جائز ہوگا، سفر کی وجہ سے بلاشبہ روزہ قضا کرنے کی اجازت ہے،[1] لیکن سفر سے پہلے وطن ہی میں کھانا شروع کر دینا ضرورت کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔

۲:- آکسیجن ماسک لگانے سے اگر سوائے ہوا یا اس کے کسی جزء کے کوئی اور چیز حلق میں نہ جاتی ہو تو اس کے لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح　　　احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع　　　۱۳۹۶/۹/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱۳۳/۲۷ھ)

فدیہ کی رقم کتنی ہے؟

سوال:- روزے کے فدیہ کی رقم آج کل کے حساب سے کتنی ہے؟

جواب:- آج کے حساب سے فی روزہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ادا کریں۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

روزہ کے فدیہ کی تفصیل

سوال:- زید اسّی سالہ بوڑھا آدمی ہے جس نے اپنی زندگی میں آج تک روزہ نہیں چھوڑا، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے مگر اتفاق سے گرنے کی وجہ سے اس کی ایک پسلی ٹوٹ گئی اور اس میں شگاف آگیا ہے صرف پہلے پانچ روزے رکھ سکا، روزوں کا فدیہ دینے کی طاقت رکھتا ہے، روزے کا فدیہ کیا ہے؟

جواب:- اگر عمر کی زیادتی اور بیماری کی بناء پر آئندہ کبھی روزے رکھنے کی طاقت واپس آنے کی اُمید نہ ہو تو روزوں کا فدیہ دیا جاسکتا ہے، لیکن اگر طاقت واپس آنے کی اُمید ہو تو قضاء ہی واجب ہے، فدیہ دینے کے باوجود اگر طاقت آگئی تو پھر قضاء رکھنا واجب ہوگا، اور ایک روزے کا فدیہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ہے[3] (جو آج کل تقریباً پونے تین روپے ہے اور پورے تین روپے احتیاطاً سمجھنے چاہئیں)۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۶۰/۲۸ ج)

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۷۴ کا حاشیہ نمبر۱۔　(۲و۳) دیکھئے ص:۱۷۸ کا حاشیہ نمبر۶، وامداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۱۵۰، ۱۵۱۔

انجکشن سے روزہ نہ ٹوٹنے کا حکم

سوال:- سیّدنا المحترم زادت معالیکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض خدمت عالیہ میں یہ ہے کہ ۱۹۹۲ء میں ہمارے ایک استاد صاحب نے ٹیکہ لگوانے سے روزہ نہ ٹوٹنے کے سلسلے میں آپ کی خدمتِ عالیہ میں ایک مراسلہ ارسال فرمایا تھا جس کا جواب موصول نہیں ہوا۔ چنانچہ اب جبکہ موقر جریدہ البلاغ کے جنوری/ شعبان کے شمارے میں پھر روزہ کے مسائل کے ضمن میں یہ بات شائع ہوئی تو انہوں نے ایک سابق تحریر کا فوٹو اسٹیٹ عکس بندہ کے حوالے کیا ہے کہ آپ کی توجہ پر ان کی تحقیق پیش ہو، اگرچہ مجھے آپ کے شعبۂ افتاء میں بھیجنا مناسب تھا لیکن آپ سے شرفِ ملاقات کی غرض سے حضورِ والا کے نام بھیج رہا ہوں، ایک جوابی لفافہ ساتھ ہے حضورِ والا سے استدعا ہے کہ اپنے لیٹر پیڈ پر اس کا جواب بندہ کو ارسال فرما کر ممنونِ احسان فرمائیں، جملہ ادارہ کے لئے دُعا کرتا ہوں اور آپ سے خصوصی اوقات میں دُعا کی دست بستہ استدعا کرتا ہوں۔

فقط والسلام نصیر احمد طاہر

وہ مضمون یہ ہے:-

روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین،

وعلی الہ وصحبہ الطیبین الطاهرین، اما بعد.

روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانا مفسدِ صوم ہے دلائلِ شرعیہ سے اس بات کو سمجھنا چند مقدمات پر موقوف ہے۔

۱:- اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ، اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ."

جس قدر قوت اور پلے ہوئے گھوڑے تم سے ہوسکیں ان کافروں کی لڑائی کے لئے مہیا رکھو، کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کے دُشمنوں کو اور اپنے دُشمنوں کو مرعوب کرو، اس کے علاوہ ان کو بھی مرعوب کرو جن کو تم نہیں جانتے، ان کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرو گے تم کو اس کا پورا اجر ملے گا اور تم پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا۔

اخرج احمد ومسلم وابوداؤد وابن جریر وابن منذر وابن ابی حاتم وابو الشیخ

وابن مردویه وابو یعقوب اسحاق بن ابراهیم القراب فی کتاب فضل الرمی والبیهقی فی شعب الایمان. عن عقبة بن عامر الجهنی رضی الله تعالیٰ عنه قال سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول وهو علی المنبر "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" اَلا ان القوة الرمی، اَلا ان القوة الرمی قالها ثلاثا، الدر المنثور.

عقبہ بن عامر جہنیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ منبر پر فرمارہے تھے: "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" خبردار قوت تیر چلانا ہے تین بار فرمایا، اس آیت میں جو لفظ قوت ہے، اس کی تفسیر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر چلانے سے فرمائی۔ بایں ہمہ تفسیر بیان القرآن میں مرقوم ہے اب بندوق اور توپ قائم مقام تیر کے ہیں۔ یعنی تیر چلانا ترک کردیں گے، اور اس کی بجائے بندوق وغیرہ چلانے کی مشق کریں گے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تفسیر کو بدلنا کیونکر جائز ہے؟

اس کا جواب فقط یہی ممکن ہے کہ تیر چلانا مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ مقصود حاصل کرنے کا اس زمانے میں واحد ذریعہ تھا۔ مقصود بالذات اس آیت میں یہ امر تھا کہ دُور سے دُشمنانِ اسلام کو قتل کرنے کی مشق کرو۔ دُور سے دُشمنوں کو قتل کرنے کا اس زمانے میں ذریعہ تیر چلانا تھا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا، جب دوسرے ذرائع اس سے کہیں بہتر پیدا ہوگئے تو تیر چلانے کو ترک کرنا اور دوسرے موجود ذرائع وغیرہ کو اختیار کرنا فرض ہوگیا، کیونکہ تیر چلانا مقصود بالذات نہیں تھا درحقیقت حکم یہ تھا کہ دُشمنوں کو دُور سے قتل کرنے کی مشق کرو۔

۲:- جب شارع علیہ السلام کی زبان درفشاں سے ایسا لفظ صادر ہو جو محتمل معانی کثیرہ ہو اور شارع علیہ السلام سے کسی ایک معنیٰ کی تعیین ثابت نہ ہو تو یہ مجتہد اپنے اجتہاد سے کسی ایک معنیٰ کی تعیین کرلے اور اس تعیین میں مُصیب نہ ہو تو وہ مجتہد قابلِ ملامت نہیں بلکہ ایک اجر کا مستحق ہے۔

جس طرح ایک صحابی نے آیت "حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود" سن کر دو دھاگے سفید اور سیاہ رات کو تکیہ کے نیچے رکھ دیئے تھے اور اُمہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن نے "اطولکن یدا" سن کر ایک دُوسرے کے ہاتھ ناپ کر حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس کا مصداق قرار دیا تھا۔

۳:- جو چیز ہم کھاتے ہیں وہ معدہ میں پک کر آشجو کے مشابہ ہوجاتی ہے جس کو کیموس کہا جاتا ہے، پھر اس میں سے لطیف مادّہ ماساریقا کے ذریعہ جگر کی طرف آتا ہے، اس لطیف مادّہ کو کیلوس کہا جاتا ہے، پھر یہ کیلوس جگر میں پکتا ہے، پکتے وقت اس سے جھاگ پیدا ہوتا ہے اور کچھ مادّہ تہہ

نشین ہوجاتا ہے، یہ جھاگ صفرائی ہوتا ہے اور تہہ نشین مادّہ سوداء، جو چیز پورے طور پر پک جاتی ہے وہ خون ہوتا ہے اور جو کچھ کچا رہ جاتا ہے وہ بلغم ہوتا ہے، پھر جگر ان چاروں خلطوں کو رگوں کے ذریعے سے ان کے مقاموں پر پہنچاتا ہے، صفراء کا مقام پتہ ہے، اور سودا کا مقام تلی، اور بلغم کا مقام پھیپھڑا، پھر جگر اس خون کو دل کی طرف پہنچا دیتا ہے، دل اس خون میں رُوحِ حیوانی پیدا کر کے شریانوں کو یعنی پھڑکنے والی رگوں میں تقسیم کر دیتا ہے، وہ رگیں پورے جسم میں خون کو پھیلا دیتی ہیں، یہی خون جسم کی غذا ہے، یہ خون جب پورے طور پر جسم میں پہنچتا ہے تو اس کے بعض اجزاء تحلیل ہوکر فنا ہوجاتے ہیں اور باقی ماندہ اجزاء کو عروق شعریہ جذب کر کے وریدوں یعنی ساکن رگوں میں لاتی ہیں، پھر ان ساکن رگوں سے منجذب ہوکر جگر کو پہنچتا ہے، جگر پھر اس پرانے اور نئے خون کو دل کی طرف منتقل کر دیتا ہے، خون کا یہ چکر جسمِ انسانی میں تادمِ زیست جاری رہتا ہے، ہمارے کھانے پینے کی غایت یہی خون ہے جو پورے جسم کی غذا ہے۔

الشروع فی المقصد

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ ..... الخ.“

اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا اس طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ اور دوسری جگہ فرمایا: ”کُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ......“ یعنی صبح صادق تک کھاؤ پیو، پہلی آیت میں روزہ کی حقیقت بیان نہیں فرمائی، دُوسری میں بطریقِ مفہومِ مخالف ترکِ اکل وشرب کی طرف اشارہ فرمایا۔ لغت میں صوم کا معنی امساک ہے اور شرعی معنیٰ ہے صبحِ صادق سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور جماع سے امساک مع النیۃ، روزہ کے اس شرعی معنی کا قرآن مجید میں ذکر نہیں بلکہ یہ معنیٰ سنتِ نبویہ سے مأخوذ ہے، باجماعِ مسلمین اکل وشرب اور جماع مفسدِ صوم قرار پائے۔

بالفاظِ دیگر صائم کے لئے ضروری ٹھہرا کہ روزہ کی حالت میں شہوتِ بطن اور شہوتِ فرج کو پورا کرنے سے پرہیز کرے، فقہائے کرام نے تفصیلِ اَحکام الصیام میں معدہ اور دماغ کی حفاظت ضروری قرار دی ہے کیونکہ بدن کو غذا پہنچانے کا واحد ذریعہ معدہ ہے، اور فرج کو قوتِ شہوانیہ عطا کرنے والا فقط دماغ ہے۔ حفظِ معدہ اور حفظِ دماغ کو بقائے صوم قرار دینا اور ان دونوں میں کسی ایک تک ایسی چیز کا پہنچانا جس میں صلاحِ بدن ہے فسادِ صوم شمار کرنا طبّی نظریہ پر مبنی ہے، اس پر کوئی دلیلِ شرعی موجود نہیں، اسی طرح معدہ اور دماغ تک پہنچنے والی چیز کی راہ منافذِ فطریہ میں محصور کرنا بھی کسی دلیلِ شرعی سے مأخوذ نہیں۔

فقہائے کرام نے اُمورِ معتادہ پر ان مسائل کی بنیاد رکھی ہے، سنتِ نبویہ سے ہمیں بقائے صوم

اور فسادِ صوم کا جو معیار ملا ہے، وہ بالکل سادہ اور عام فہم ہے، طبّی باریکی میں اُلجھنے کی حاجت نہیں رہتی، وہ یہ ہے کہ جسم کے اندر داخل ہونے والی چیز سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے، اگرچہ اس حدیث کے رفع پر محدثینِ کرام نے کلام فرمایا ہے اور اس کو حدیثِ موقوف قرار دیا ہے، لیکن اس کے حکماً مرفوع ہونے کا کوئی عالم انکار نہیں کرسکتا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول جو عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں پوری سند سے لکھا ہے وہ یہ ہے: **قال انما الوضوء مما خرج وليس مما دخل والفطر فی الصوم مما دخل وليس مما خرج**، حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا وضو باہر نکلنے والی چیز سے فاسد ہوتا ہے اور اندر جانے والی چیز سے نہیں ٹوٹتا، اور روزہ اندر جانے والی چیز سے فاسد ہوتا ہے اور باہر نکلنے والی چیز سے نہیں ٹوٹتا، اس اثر میں روزہ اور وضو کا بقا اور فساد ایک دوسرے کے برعکس بتایا۔

اس تقابل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اندر جانے والی چیز مفسدِ صوم ہے، اس دخول کے لئے منافذِ فطریہ کی کوئی قید نہیں، خواہ دخول منافذ سے ہو یا غیر منافذ سے کیونکہ اس اثر سے بالتقابل وضو کا فساد خروج سے بتایا ہے خواہ وہ خروج منافذ سے ہو یا غیر منافذ سے جیسے بدن کے کسی حصہ میں کانٹا وغیرہ چبھے اور خون جاری ہوجائے تو وضو ٹوٹ جائے گا، حالانکہ خون غیر منفذ سے نکل رہا ہے، اسی طرح کسی چیز کا دخول خواہ وہ دخول منفذ سے ہو یا غیر منفذ سے مفسدِ صوم قرار دیا ہے، یہ بھی اس امر کی تائید ہے کہ دخول کے لئے منفذِ فطری شرط نہیں، اسی طرح فقہائے کرام کے بیان کردہ بیشتر مسائل میں تضاد پایا جاتا ہے۔

آمدم برسرِ مطلب:- مقدمہ نمبر۳ میں بتایا جاچکا ہے کہ ہر غذا یا دوا جو معدہ میں جاتی ہے تین ہضموں کے بعد مستحیل الی الدم ہوجاتی ہے اور یہی خون درحقیقت پورے جسم کی غذا ہے، معدہ اور جگر درمیان میں اعضاء خادمہ ہیں، اب طبِ جدید نے ٹیکہ ایجاد کیا ہے، ایک سوئی کے ذریعہ سے براہِ راست دوا یا غذا خون میں ملائی جاتی ہے، خون میں یہ دوا، غذا مل کر معدہ والی دوا یا غذا سے بہت جلد فائدہ ظاہر کرتی ہے، ظاہر ہے کہ حدیث شریف کے بیان کردہ معیار کے مطابق ٹیکہ لگانے سے دوا یا غذا اندر داخل ہوتی ہے لہٰذا اس سے روزہ فاسد ہوجائے گا، روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگانے کے مجوّزین غور فرمائیں کہ روزہ کی علت تو کسرِ شہوات ہے، ٹیکہ لگا کر روزہ کی حالت میں شہوات میں قوت پیدا کردی جائے تو روزہ عبادت نہیں رہے گا۔

مجوّزین سے ہم دریافت کرتے ہیں کہ روزہ کے بغیر عام حالت میں نشہ کا ٹیکہ لگوانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر کہہ دیں کہ جائز ہے تو تمہارا یہ فتویٰ **کل مسکر حرام** کے خلاف ہے لہٰذا باطل ہے، اگر وہ جواب دیں کہ جائز نہیں ہے تو ہم ان سے دلیل دریافت کریں گے، دلیل بیان کرتے ہوئے انہیں لامحالہ

کہنا پڑے گا کہ نشہ آور دوا کا ٹیکہ لگوانا، نشہ آور دوا کے کھانے یا پینے کا حکم رکھتا ہے، هذا هو المطلوب۔

ہم بھی یہی بات کہتے ہیں کہ ٹیکہ لگوانے کا حکم کھانے پینے کا سا ہے، الحاصل حق بات یہ ہے کہ جس طرح قوت کی تفسیر کچھ زمانے کے بعد رمی کی بجائے بندوق اور توپ چلانے سے کی گئی، بعینہٖ اسی طرح تغذیة اور مداواة کا معدہ اور دماغ میں حصر باقی نہیں رہا، بلکہ طبِ جدید نے ثابت کردیا کہ تغذیه اور مداواة معدہ اور دماغ کے ذریعے بھی ہوتے ہیں اور براہِ راست سوئی کے ذریعے دوا یا غذا کو خون میں پہنچادینے سے بھی ہوتے ہیں، اب امساک عن الأکل والشرب کے معنیٰ امساک عن التغذية والمداواة کے ہوں گے جس طرح قوت کی تفسیر اس کی علتِ غائیہ سے کی گئی یعنی قتل الأعداء من بعيد اسی طرح اکل وشرب کی تفسیر اس کی علتِ غائیہ سے کی جائے گی یعنی تغذية ومداواة مطلقًا۔

علامہ آلوسیؒ روح المعانی میں آیت: ”وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ“ کے تحت صوفیائے کرام پر کئے ہوئے اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں: ”فيجوز ان يعطى الله تعالى لبعض خواص عباده فهما يدرك به من الكتب والسنة ما لم يقف عليه احد من المفسرين والفقهاء المجتهدين في الدين.“ یہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں کو ایسا فہم عطا کرے جس کے ذریعے وہ کتاب اور سنت کے ایسے معنیٰ معلوم کرلیں جن پر مفسرین وفقہاء ومجتہدین میں سے کوئی ایک مطلع نہ ہوا ہو، لہٰذا یہ اعتراض مندفع ہوگیا کہ کسی مفسر نے اکل وشرب کا معنیٰ مطلقاً تغذیہ و مداواة نہیں لکھا، فقہائے کرام نے اکل وشرب معتاد کو دیکھ کر معدہ اور دماغ تک منافذِ فطریہ کے ذریعے کسی دوا یا غذا کے پہنچنے کو فسادِ صوم کی شرط بایں وجہ قرار دیا کہ اکل وشرب کا متبادر مفہوم یہی ہے اگرچہ ”كـــلـــوا واشربوا حتى يتبين“ میں یہ متبادر مفہوم مراد نہیں بلکہ مراد مطلقاً تغذیہ و مداواة ہے خواہ وہ معدہ ودماغ کے ذریعے براہ منافذِ فطریہ ہو یا منفذِ مصنوع کے ذریعہ براہِ راست خون میں مل جانے سے ہو۔

فقہائے کرام کی یہ عدمِ اصابت ان کی رفعتِ علمیہ کے لئے قادح نہیں، جس طرح اُمہات المؤمنینؓ کا طول کے لفظ سے طولِ حسی سمجھنا اور صحابیؓ کا خیطِ ابیض اور اسود کو متبادر دھاگے پر حمل کرنا ان کی رفعتِ علمیہ کے لئے قادح نہیں، اگرچہ اُمہات المؤمنینؓ اور صحابیؓ معانی مرادہ کو نہیں سمجھے، اتمامِ حجت کے لئے یہ سطور کافی ہیں۔

ان سطور سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ٹیکہ لگوانے سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے، اس سے فقط روزہ کی قضاء لازم ہے کفارہ نہیں، کیونکہ یہ فساد میں لذاتِ نفسانیہ نہیں ہے، علمائے کرام کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اس بات کو ضرور سوچیں کہ جہاں دلائلِ اباحت اور دلائلِ تحریم متعارض ہوں وہاں جانبِ تحریم کی ترجیح لازم ہے، اس تفکر کے بعد اعلان کردیں کہ روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانا مفسدِ صوم

ہے تاکہ کل قیامت کے دن احکم الحاکمین کی بارگاہ میں یوں نہ کہنا پڑے: "رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيْلَا" والسلام وما علینا الا البلاغ۔

جواب:- محترمی ومکرمی!　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ اور اس کے ساتھ مولانا عبدالرزاق ہاشمی صاحب کا مضمون بسلسلۂ ''روزہ'' موصول ہوا، اس سے پہلے یہ مضمون پڑھنا یاد نہیں، اب احقر نے دیکھا، لیکن اس طرزِ استدلال سے اتفاق نہ ہوا، تفصیل کا تو موقع نہیں، لیکن مختصراً عرض یہ ہے کہ منسلک تحریر میں استدلال، حکمت کو علت سے خلط ملط کرنے کا نتیجہ ہے، کسرِ شہوت جیسا کہ صاحبِ تحریر نے لکھا ہے، روزے کی علت نہیں، حکمت ہے، اور حکمت کا ہر جزیئے میں پایا جانا ضروری نہیں، اگر منافذِ اصلیہ اور غیر اصلیہ کا فرق نہ کیا جائے تو کہنا چاہئے کہ جو شخص روزے میں غسل کرے، اور اس سے اس کی پیاس میں تسکین ہو تو اس سے اس کا روزہ ٹوٹ گیا، کیونکہ شربِ ماء میں جو تسکینِ عطش مقصود ہے وہ اس طرح بھی حاصل ہوگئی، اگر غیر اکل وشرب سے حاصل ہونے والا تغذیہ مفطرِ صوم ہو تو نصِ صریح ہے کہ: "ربی یطعمنی ویسقینی"[1] یہ سقی واطعام کیوں مفطر نہ ہوا؟ صوم کا اصل مقصود اتباع ہے، اور وہ امساک عن الأکل والشرب والجماع سے حاصل ہوجاتا ہے، اگر کسی اور ذریعہ سے تغذیہ ہو تو وہ اس کے منافی نہیں، اور اگر اکل وشرب پایا جائے، اور تغذیہ نہ ہو، جیسے پتھر نگلنے کی صورت میں، تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا روزے کا مدار تغذیہ پر نہیں، اکل وشرب پر ہے۔[2]　　والسلام

(حضرت مولانا مفتی)
محمد تقی عثمانی (مدظلہم)
بقلم: محمد عبداللہ میمن
۱۴۱۵/۹/۱۱ھ

روزہ کی حالت میں دِل کا دورہ پڑنے کی بناء پر پانی پلایا تو کیا حکم ہے؟

سوال:- میری چچی صاحبہ کو سحری کے بعد دِل کا شدید دورہ پڑا، بہت کوشش کے بعد بھی

---

(۱) وفی صحیح البخاری کتاب الصوم باب الوصال .... الخ ج:۱ ص:۲۶۳ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عائشۃ قالت: نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن الوصال رحمة لهم، فقالوا: انک تواصل! قال: انی لست کهیئتکم، انی یطعمنی ربی ویسقینی .... الخ. نیز یطعمنی ربی ویسقینی اور اس مفہوم کے مختلف الفاظ صحیح بخاری شریف کے اس باب اور ج:۱ ص:۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۳ (طبع قدیمی کتب خانہ) کی مختلف احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔

(۲) اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی کتاب "ضابط المفطرات" اور ''البلاغ'' شمارہ رمضان ۱۴۲۲ھ ملاحظہ فرمائیں۔ (از مرتب عفی عنہ)

ہوش نہیں آیا، مجبوراً پانی کے چند چمچے دینے پڑے جس کی وجہ سے پندرہ منٹ کے بعد ہوش آگیا، چچی روزہ چھوڑنا گوارا نہیں کرتی ہیں، بغیر سحری کے بھی روزہ رکھ لیتی ہیں، ہم نے ان کو بے ہوشی کے عالم میں چند چمچے پانی دے کر روزہ توڑ ڈالا اور وہ ہوش میں نہیں تھیں، اس کا کفارہ کیا ادا کرنا ہوگا؟

جواب:- صورت مسئلہ میں آپ کی چچی صاحبہ کو چاہئے کہ اس روزے کی قضا کرلیں، مذکورہ صورت میں کفارہ واجب نہیں۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۳۱/۲۸ ج)

غروبِ آفتاب سے قبل افطار کرنے کا حکم

سوال:- کل مؤرخہ ۲۹/اگست ۱۹۷۷ء کو مغرب سے قبل ریڈیو پر اذان، غلطی سے نشر ہوگئی اور میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ افطار کا وقت ہوگیا افطار کرلیا، ابھی حلق سے تھوڑی سی غذا اُتری تھی تو پتہ چلا کہ اذان وقت سے قبل نشر ہوگئی، گزارش یہ ہے کہ فقہِ حنفی کی رُو سے اس روزے کا کیا حکم ہے قضاء کرنی ہوگی یا بری الذمہ ہوں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر آپ نے غروبِ آفتاب سے پہلے کچھ کھا لیا تھا تو آپ کا روزہ ٹوٹ گیا، آپ کے ذمے اس کی قضاء واجب ہے البتہ کفارہ واجب نہیں۔

لما فی المتون أو تسحر أو افطر یظن الیوم لیلا والفجر طالع والشمس لم تغرب قضٰی فقط (شامی ج:۲ ص:۱۰۵)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۶۰/۲۸ ج)

صبحِ صادق کے بعد تک سحری کرتے رہنے کا حکم
ریڈیو کے غلط اعلان کی بناء پر غروبِ آفتاب سے قبل افطار کا حکم

سوال:- سحری کا انتہائی وقت ۴:۴۵ ہے، اذان پانچ بجے ہوتی ہے کیا ہم پانچ بجے تک

---

(۱) وفی الهندیة ج:۱ ص:۲۰۷، المریض اذا خاف علی نفسه التلف أو ذهاب عضو یفطر بالاجماع وان خاف زیادة العلة و امتداده فکذلک عندنا وعلیه القضاء اذا افطر وکذا فی البحر الرائق فصل فی العوارض ج:۲ ص:۲۸۱، ۲۸۲ والشامیة ج:۲ ص:۴۲۲۔

(۲) فتاویٰ شامیة ج:۲ ص:۴۰۵ وفی الهدایة باب ما یوجب القضاء ج:۱ ص:۲۲۵ (طبع شرکت علمیه) واذا تسحر وهو یظن ان الفجر لم یطلع فاذا هو قد طلع .... علیه القضاء .... ولا کفارة علیه لأن الجنایة قاصرة لعدم القصد وفی تبیین الحقائق شرح الکنز کتاب الصوم ج:۱ ص:۳۴۱، ۳۴۲ (طبع مکتبه امدادیه ملتان) ولو .... تسحر ظنه لیلا والفجر طالع أو أفطر کذلک والشمس حیة امسک یومه و قضٰی ولم یکفر .... الخ۔ نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۱۲۸۔

سحری کھا سکتے ہیں؟ اور کیا پانچ بجے کے بعد تک کھا سکتے ہیں؟ اور انتہائی وقت کیا ہے؟ اور پانچ بجے تک کھانے سے روزے پر کیا اثر پڑے گا؟

نمبر۲:- پیر کے دن کا روزہ جو پانچ منٹ پہلے ریڈیو والوں کی غلطی سے کھل گیا ہے کیا یہ دوبارہ رکھنا پڑے گا؟

جواب۱:- صبحِ صادق کے بعد اگر ایک منٹ بھی مزید کھا لیا تو روزہ فاسد ہے، لہٰذا اگر ۴ بج کر پینتالیس منٹ پر صبحِ صادق ہو رہی ہے تو پانچ بجے تک کیسے کھا سکتے ہیں؟[1] ہاں! بعض اوقات بعض نقشوں میں انتہائے سحر کا وقت صبحِ صادق سے چند منٹ پہلے لکھا ہوتا ہے، اتنے منٹ دیر تک کھانے سے روزہ فاسد نہ ہوگا، لہٰذا اصل چیز صبحِ صادق کا وقت ہے اس کی صحیح معلومات رکھنی چاہئیں، دار العلوم کے نقشے میں صبحِ صادق کا وقت ہوتا ہے۔

۲:- جی ہاں! جن لوگوں نے اس اعلان پر غروب سے پہلے افطار کیا ان پر قضاء لازم ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۹۵۵/۲۸ ج)

کینیڈا میں روزہ رکھنے کے لئے بیماری سرٹیفکیٹ لینے کا حکم

سوال:- یہاں کینیڈا میں روزہ ساڑھے سترہ گھنٹہ کا ہوتا ہے، بعض فیکٹریوں میں مشقت زیادہ ہونے کی وجہ سے کمزور آدمی کو روزہ نبھانا مشکل ہو جاتا ہے بلکہ بعض تو روزہ ہی چھوڑ دیتے ہیں، اگر کوئی شخص روزہ رکھنے کے لئے ڈاکٹر سے بیماری کا سرٹیفکیٹ لیتا ہے جبکہ وہ بیمار نہیں اور چھٹی کر لیتا ہے، کیا اس کو ان چھٹیوں میں بیماری الاؤنس لینا جائز ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں روزے کے لئے بیماری سرٹیفکیٹ لینا اس تأویل کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے کہ روزہ کی حالت میں انسان کی صحت عموماً بالکلیہ اعتدال پر نہیں رہتی، کم از کم نقاہت تو ہو جاتی ہے، اس تأویل سے الاؤنس بھی لے سکتے ہیں، لیکن یہ اسی وقت کیا جائے جب چھٹی لئے بغیر روزہ رکھنا بالکل ممکن نہ ہو۔[3]

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۵۰/۳۰ و)

(۱، ۲) تفصیل کے لئے دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۸۷ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۳) یستأنس ویزید فیها بهذه العبارة: وفي رد المحتار ج:۲ ص:۴۲۰ (طبع سعید) وقال الرملي وفي جامع الفتاوىٰ ولو ضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعیشة فله أن یفطر ویطعم لکل یوم نصف صاع أی اذا لم یدرک عدة من أیام أخر یمکنه الصوم فیها والا وجب علیه القضاء وعلی هذا الحصاد اذا لم یقدر علیه مع الصوم ویهلک الزرع بالتأخیر لا شک في جواز الفطر والقضاء وکذا الخباز....الخ.

وقت سے قبل عمداً افطار کی صورت میں قضاء و کفارہ دونوں لازم ہیں

سوال:- مسمّٰی حبیب الرحمٰن امامِ مسجد نے ماہ رمضان میں دو دن بوجہ ضد کے، وقت سے قبل لوگوں کو روزہ افطار کرایا، اس کے اس جرم پر شریعت میں دعویٰ پیش کیا گیا اور شریعت میں اسے طلب کیا گیا، جس کے جواب میں اس نے تحریری خط بھیجا جس کا مضمون ذیل ہے:

نمبر۱:- سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے غلطی کی ہے اور مسلسل باقی پیغمبر بھی غلطی کرتے آئے ہیں، تو میں نے کون سی بڑی غلطی کی کہ روزہ قبل از وقت افطار کرادیا۔

نمبر۲:- اور مجھ ایک عالم پر جھوٹا اور بے بنیاد الزام اور بہتان لگایا گیا۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جرائم کے مرتکب کے خلاف کیا حکم ہے؟ روزہ قبل از وقت افطار کو پیغمبروں کے ساتھ غلطی منسوب کرنے والے آدمی کے لئے قرآنِ حکیم اور مجتہدین کے نزدیک کیا حکم ہے؟

اور جو مسلمان ایسے امام کی پیروی کریں، ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب:- وقت سے قبل روزہ افطار کرنا یا کسی دوسرے شخص کو افطار پر مجبور کرنا بہت بڑا گناہ ہے، اور جن لوگوں نے جان بوجھ کر کہ ابھی افطار کا وقت یعنی غروبِ آفتاب نہیں ہوا، روزہ افطار کرلیا ان پر قضاء بھی واجب ہے اور کفارہ بھی، جس شخص نے محض ضد کی وجہ سے ایسی غلطی کی ہے اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے گناہ سے توبہ کرے، اس عمل کی تاویلات کرنا اور پیغمبروں کی غلطی کی صف میں اسے کھڑا کرنا، بدترین گستاخی ہے، ایسے شخص کو فوراً اپنے گناہ سے توبہ کرنی چاہئے اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۱۹۵ ج)

سحری کھانے کے اوقات میں امداد الفتاویٰ اور شامی کی عبارت میں کوئی تعارض نہیں

سوال:- فتاویٰ امدادیہ کتاب الصوم ج:۱ ص:۱۶۷ میں ہے کہ فقہاء نے احتیاط کی ہے کہ غروب سے طلوع تک کل وقت جتنا ہے اُس کو سات پر تقسیم کریں، چھ حصے میں سحری کھا سکتے ہیں، تفسیر تنویر الایمان پ۲ ع۷ میں بھی اسی طرح ہے بحوالہ درمختار، مگر میں نے درمختار میں نہیں دیکھا، مگر ہندیہ

اور شامی میں ہے کہ سحری کھانے کا مستحب وقت شب کا آخری حصہ ہے، یعنی آخری چھٹا حصہ ہے۔

اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غروب سے طلوعِ شمس تک کل وقت جتنا ہے، اس کو چھ پر تقسیم کریں، چھ حصے میں سحری کھاسکتے ہیں، سات پر تقسیم کرنا معلوم نہیں ہوتا، بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے، اس کو رفع فرماویں۔

جواب:- امداد الفتاویٰ اور شامی میں کوئی تعارض نہیں، امداد الفتاویٰ میں لکھا ہے کہ غروبِ شمس سے طلوعِ شمس تک کے وقت کو سات حصوں پر تقسیم کریں، ان میں سے چھ حصوں میں سحری کھاسکتے ہیں اور ساتواں حصہ شروع ہونے پر احتیاطاً سحری کھانا بند کردیں، اور شامی میں لکھا ہے کہ غروبِ شمس سے طلوعِ صبح تک کا جو وقت ہے، اسے چھ حصوں پر تقسیم کریں تو چھٹے حصے میں سحری کھانا مستحب ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

کیونکہ اوّل الذکر میں طلوعِ شمس تک کے وقت کو تقسیم کیا جارہا ہے، اور ثانی الذکر میں صرف صبحِ صادق تک کے وقت کو (دیکھئے: شامی ج:۲ ص:۱۱۴، اواخر باب ما یفسد الصوم،[1] امداد الفتاویٰ کتاب الصوم ج:۲ ص:۷۵[2])۔

واللہ اعلم

۲۵/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۳/ ۲۸-الف)

روزے میں مسواک چبانے کا حکم

سوال:- کیا روزے میں مسواک چبانا جائز ہے؟

جواب:- مسواک کرنا تو جائز ہے، لیکن چبانے سے حتی الوسع پرہیز کرنا چاہئے۔

بہتر یہ ہے کہ مسواک پہلے سے بنالی جائے، تاہم روزہ چبانے سے بھی نہیں ٹوٹتا تاوقتیکہ عرق حلق تک نہ پہنچے، فی الدر المختار: وکرہ مضغ علک، وقال الشامیؒ تحتہ: ولأن العادة مضغہ خصوصًا للنساء لأنہ سواکھن کما یأتی. ج:۲ ص:۱۱۲،[3] وقد صرح الشامیؒ أن الکراھة تنزیھیة۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۲/۱۰/۱۳۹۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۵۱/ ۲۸ج)

---

(۱) وفی الشامیة ج:۲ ص:۴۱۹ (طبع سعید) (سحر) .... وھو اسم للماکول فی السحر وھو السدس الأخیر من اللیل .... الخ.

(۲) امداد الفتاویٰ کتاب الصوم والاعتکاف ج:۲ ص:۹۵،۹۶ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

(۳) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۴۱۶ (طبع سعید)، نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۱۴۰،۱۴۱۔ (محمد زبیر)

روزے کی نیت کب تک کی جاسکتی ہے؟

سوال:- اگر رمضان میں آدھے دن سے پہلے نیت کرنا بھول جائے، آدھا دن گزرنے کے کچھ دیر بعد یاد آئے اور نیت کرلے، تو کیا یہ جائز ہے؟ اور روزہ ہوجائے گا یا نہیں؟

جواب:- روزے کی صحت کے لئے آدھا دن گزرنے سے پہلے پہلے نیت کرنا ضروری ہے،[1] اس کے بغیر روزہ نہیں ہوتا، لیکن یہ واضح ہونا چاہئے کہ نیت کا مطلب دِل کا ارادہ ہے، زبان سے کچھ کہنا ضروری نہیں ہے، لہٰذا اگر ارادہ روزے کا تھا، لیکن زبان سے کچھ الفاظ نہیں کہے تھے تو روزہ ہوگیا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۱ھ

روزے کے فدیے کی مقدار اور اس کی ادائیگی کے مختلف اَحکام

سوال:- بوجہ بیماریٔ قلب و کمزوریٔ جسم و جان و بدن، نیز ایمائے ڈاکٹر، رمضان کے روزے نہ رکھ سکا، چنانچہ اب روزوں کا فدیہ فرض ہے یا واجب ہے؟ لہٰذا پورے ماہ کا فدیہ کتنی رقم ہوگی؟ یک مشت دی جائے یا تھوڑی تھوڑی ادا کی جاسکتی ہے؟ ماہِ رمضان میں ادا کی جائے یا کتنے عرصے کے اندر ادا کرسکتے ہیں؟

جواب:- اگر مرض ایسا ہے کہ قابل ڈاکٹر کی رائے میں دوبارہ اتنی قوت آنے کی اُمید ہے کہ جس میں روزے رکھے جاسکیں تو فدیہ کافی نہیں، اور ان روزوں کی قضاء ضروری ہے، لیکن اگر ایسی قوت آنے کی اُمید نہیں تو فدیہ دیا جاسکتا ہے۔[2] ایک روزے کا فدیہ ایک سیر ساڑھے بارہ چھٹانک گندم یا اس کی قیمت ہے۔[3] تیس دن کا فدیہ اس طرح ترپن سیر نو چھٹانک گندم بنتا ہے، اس کی قیمت بازار سے معلوم کرکے وہ بھی ادا کرسکتے ہیں (لیکن قیمت گندم کی معتبر ہے، آٹے کی نہیں)، ہر روز پونے دو سیر گندم کی قیمت دیا کریں۔[4] اور فدیہ کا مستحق وہی ہے جو زکوٰۃ کا مستحق ہے، یعنی وہ شخص جس کے پاس

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۱۳۲ (سوال نمبر۱۹۱) اور ج:۲ ص:۱۲۳۔

(۲) وفی الرد المحتار ج:۲ ص:۴۲۷: المریض اذا تحقق الیاس من الصحة فعلیه الفدیة لکل یوم من المرض.

(۳) وفی تنویر الأبصار ج:۲ ص:۷۲: واوصی بالکفارة یعطی لکل صلوٰة نصف صاع من برّ کالفطرة.
نیز دیکھئے: کفایت المفتی (جدید ایڈیشن، دارالاشاعت) ج:۴ ص:۱۷۸۔

(۴) وفی الهندیة ج:۱ ص:۵۱۳: ولو أعطی مسکینًا واحدًا کله فی یوم واحد لا یجزیه الا عن یومه ذلک، وهٰذا فی الاعطاء بدفعة واحدة واباحة واحدة من غیر خلاف، واما اذا ملکه بدفعات فقد قیل تجزیه وقیل لا یجزیه الا عن یومه ذلک وهو الصحیح کذا فی التبیین. وفی الشامیة ج:۳ ص:۷۲۵: لو اعطی مسکینًا واحدًا فی عشرة أیام نصف صاع یجوز ولو اعطاه فی یوم واحد بدفعات فی عشر ساعات قیل یجوز، وقیل لا، وهو الصحیح. وکذا فی فتاویٰ قاضی خان علی هامش الهندیة ج:۲ ص:۱۸، ۱۹، والتاتارخانیة ج:۵ ص:۲۰.

ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی ہم قیمت کوئی چیز زائد از ضرورت نہ ہو، فدیہ کے لئے ضروری نہیں کہ رمضان ہی میں ادا کیا جائے، بعد میں بھی کر سکتے ہیں، لیکن جتنی جلدی کریں اتنا بہتر ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۱۱/۲۹ ج)

نسوار کے استعمال سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے

سوال: - نسوار جس میں چونہ وغیرہ ڈال کر منہ میں رکھا جاتا ہے، کا شرعی حکم کیا ہے؟ بعض لوگ اس کو حرام، بعض مباح کہتے ہیں، کیا اس سے روزہ ٹوٹتا ہے؟

جواب: - تمباکو، نسوار وغیرہ کا استعمال مباح ہے، اور اس سے روزہ بھی فاسد ہوجاتا ہے، اس لئے کہ نسوار کا منہ میں رکھنا عملاً کھانے کے حکم میں ہے۔　　واللہ اعلم

الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی
بندہ محمد شفیع	۱۳۸۸/۶/۱ھ
۱۳۸۸/۶/۱ھ	(فتویٰ نمبر ۶۳۲/۱۹-الف)

یوم الشک کے روزے کا حکم

سوال: - بعض لوگ یوم شک کے روزے کو مکروہ کہتے ہیں، عن عمار بن یاسر قال: من صام الیوم الذی یشک فیه فقد عصی أبا القاسم صلی الله علیه وسلم۔[1] اور بعض کہتے ہیں کہ یوم شک کا روزہ جائز ہے، اور اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں، لہٰذا آپ فرمائیے کیسے کرنا چاہئے؟

جواب: - یہ حدیث اگرچہ مرفوع نہیں، لیکن موقوف ہے، اور موقوف مرفوع کے حکم میں ہے، لأن الصحابی لا یقول ذٰلک من قبل رأیه، فیکون من قبیل المرفوع (بذل المجهود ج:۴ ص:۱۳۴)[2] اسی وجہ سے حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ عوام اس دن روزہ نہ رکھیں۔ البتہ دُوسرے دلائل کی روشنی میں خواص اہلِ فتویٰ کے لئے اجازت دی گئی ہے۔ قال فی رد المحتار: استحب صومه للخواص، قال فی الفتح وقیده فی التحفة بکونه علی وجه لا یعلم العوام ذٰلک، کی لا یعتادوا صومه، فیظنه الجهال زیادة علیٰ رمضان، ویدل علیه قصة أبی یوسف المذکورة فی الإمداد (شامی ج:۲ ص:۳۸۲)[3] اور اگر خواص بھی اس حدیث کی بناء پر روزہ نہ رکھیں تو کچھ حرج نہیں۔

ہاں! اگر کسی کی عادت ہے کہ وہ کسی خاص دن روزہ رکھا کرتا ہے اور وہ دن یوم الشک میں

---

(۱) مشکوٰة المصابیح کتاب الصوم، باب رؤیة الهلال ج:۱ ص:۱۷۴ (طبع قدیمی کتب خانه).
(۲) بذل المجهود ج:۴ ص:۱۳۴ (طبع مکتبه قاسمیه ملتان).
(۳) ردّ المحتار ج:۲ ص:۳۸۲ (طبع ایچ ایم سعید).

آ گیا تو وہ رکھ سکتا ہے۔ قال علیہ الصلوٰۃ والسلام: لا تقدموا رمضان بصوم یوم ولا یومین الا رجل کان یصوم صومًا فیصومه، رواه الستة (فتح القدیر ج:۲ ص:۵۴)۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۸۷/۱۱/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۳۴/۱۸-الف)

ریڈیو کے غلط اعلان پر غروبِ آفتاب سے قبل اِفطار کرلیا تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک روز ریڈیو پاکستان کراچی نے مغرب کی اذان وقت سے ۵ منٹ قبل دے دی، جس سے اکثر لوگوں کے روزے خراب ہوگئے اور انہوں نے افطار کرلیا، پھر اذان بند ہوگئی، لوگوں نے کھانا چھوڑ دیا، پھر اذان ہوئی بہت سے لوگوں نے روزہ نہیں کھولا، ان دونوں کا کیا حکم ہے؟

جواب:- جن لوگوں نے غروب سے قبل اِفطار کیا، خواہ ریڈیو کے غلط اعلان کی بناء پر کیا ہو، اُن پر اُس روزے کی قضاء واجب ہے، خواہ صحیح وقت معلوم ہونے کے بعد رُک گئے ہوں یا کھاتے پیتے رہے ہوں، قضاء دونوں صورتوں میں واجب ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷/۲۸-ج)

---

(۱) فتح القدیر ج:۲ ص:۲۴۵ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۸۷ کا حاشیہ نمبر۲ و امداد الفتاوی سوال ۱۸۵، ج:۲ ص:۱۲۸۔

﴿باب الإعتكاف﴾
(اِعتکاف کے مسائل)

رمضان کے آخری عشرے کا اِعتکاف بغیر روزے کے نہیں ہوسکتا

سوال ۱:- چند اشخاص ایک جامع مسجد میں رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرنے بیٹھے تھے، ان میں سے ایک شخص حالتِ اِعتکاف میں بخار میں مبتلا ہوگیا، صحت یاب نہ ہونے پر علاج معالجے کی ضرورت پڑی، مجبوراً تارک الصوم ہونا پڑا اور اِعتکاف ترک کرکے علاج کے لئے اہل وعیال کے پاس چلے گئے، اب دریافت یہ کرنا ہے کہ رمضان کے آخری عشرے میں بغیر روزے کے اِعتکاف ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۲:- اگر بغیر روزے کے اِعتکاف نہ ہوتا ہو، تو اس کا اِعتکاف ٹوٹ گیا یا نہیں؟

جواب ۱:- رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اِعتکاف جو مسنون ہے، اس کے لئے روزہ شرط ہے، لہٰذا جس روز روزہ اِفطار کیا، اس دن سے اِعتکاف ٹوٹ گیا۔ لما فی ردا لمحتار ومقتضٰی ذلک أن الصوم شرط ایضًا فی الاعتکاف المسنون، لأنه مقدر بالعشر الأخیر، حتی لو اعتکفه بلا صوم لمرض أو سفر ینبغی أن لا یصح عنه ..... وسکتوا عن بیان حکم المسنون لظهور انّهٗ لا یکون الا بالصوم عادة (شامی ج:۲ ص:۱۳۰)۔[۱]

۲:- جس روز روزہ اِفطار کیا، اس روز سے اِعتکاف ٹوٹ گیا، ایک دن کے اِعتکاف کی قضا واجب ہے، کما مرّ۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۷/۲۷و)

---

(۱) ردّ المحتار باب الاعتکاف ج:۲ ص:۴۴۲ (طبع سعید)، وفی الهدایة باب الاعتکاف ج:۱ ص:۲۱۱ والصحیح أنّهٗ سنّة مؤكّدة لأنّ النبی صلی الله علیه وسلم واظب علیه فی العشر الأواخر من رمضان والمواظبة دلیل السنّة وهو اللّبث فی المسجد مع الصّوم .... والصّوم من شرطه .... الخ.
وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۲۹۹، ۳۰۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) .... الاعتکاف المسنون سنّة مؤكّدة وهو العشر الأخیر من رمضان فانّ الصّوم من شرطه حتّٰی لو اعتکفه من غیر صوم لمرض أو سفر ینبغی أن لا یصحّ .... الخ. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۲۱۱ (طبع رشیدیه کوئٹه) (محمد زبیر حق نواز).

مرض کی وجہ سے اِعتکاف توڑنے کا حکم

سوال:- ایک شخص حالتِ اِعتکاف میں بخار میں مبتلا ہوگیا، صحت یاب نہ ہونے پر علاج معالجے کی ضرورت پڑی، مجبوراً تارک الصوم ہونا پڑا، تو آیا اس صورت میں علاج کے لئے اور خدمت کے واسطے اِعتکاف توڑ کر اہل وعیال کے پاس گھر جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- مرض اور اس کا علاج ایسا عذر ہے جس کی وجہ سے اِعتکاف توڑنا جائز ہے۔ ولا فرق (أی فی القضاء) بین فساده بصنعه بلا عذر کالجماع مثلاً الا الردة أو لعذر کخروجه لمرض (شامی ج:۲ ص:۱۳۳)، البتہ ایک دن کے اِعتکاف کی قضا واجب ہوگی۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۷/۲۷ و)

اِعتکافِ مسنون میں غسلِ جمعہ یا ٹھنڈک کے لئے غسل کی خاطر مسجد سے باہر نکلنا

سوال:- بخدمت حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب۔

رسالہ ''اَحکامِ اِعتکاف'' کے صفحہ نمبر ۳۹ میں آپ نے معتکف کے غسل کے ذیل میں لکھا ہے کہ: ''معتکف کو غسلِ جمعہ یا برائے ٹھنڈک مسجد سے باہر جانے کی اجازت نہیں، لیکن مسجد کے اندر ٹب میں یا مسجد کے کنارے پر غسل کرسکتا ہے۔'' اس میں ایک بات وضاحت طلب رہ گئی ہے کہ مساجد کے غسل خانے جو کہ حدودِ مسجد سے باہر ہوتے ہیں، کیونکہ وہ تعینِ حدودِ مسجد کے وقت نماز کے لئے نہیں بلکہ غسل، استنجاء کے لئے بنائے جاتے ہیں، اور حدودِ مسجد وہی ہے جو تعینِ حدود کے وقت نماز کے لئے متعین کی جائے، جیسا کہ آپ نے ''حدودِ مسجد کا مطلب'' کے ذیل میں بحث کی ہے۔ اب مسئلہ باعثِ نزاع یہ ہے کہ مسجد کے غسل خانے جو اگرچہ حدودِ مسجد سے باہر ہوتے ہیں لیکن ملکیتِ مسجد اور احاطۂ مسجد میں شامل ہوتے ہیں، ان میں غسل برائے ٹھنڈک یا غسلِ جمعہ کی اجازت ہے یا نہیں؟ براہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں۔

---

(۱) ردّ المحتار باب الاعتکاف ج:۲ ص:۴۴۷ (طبع سعید).

جواب :- مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ ملا، ''اَحکامِ اِعتکاف'' میں جو مسئلہ لکھا ہے، اس کا حاصل یہی ہے کہ مسجد کے ملحق غسل خانے جو مسجد میں نہیں ہوتے، لیکن مسجد کی ملکیت ہوتے ہیں، ان میں بھی غسلِ جمعہ یا ٹھنڈک کے لئے غسل کی خاطر جانا، اِعتکافِ مسنون میں جائز نہیں،[1] لہٰذا جائز طریقے پر غسل کی صورت وہی ہے کہ مسجد میں ٹب رکھ کر اس میں غسل کریں یا مسجد کے کنارے پر اس طرح بیٹھیں کہ مستعمل پانی مسجد میں نہ گرے۔[2]

جہاں تک اس مسئلے کی دلیل کا تعلق ہے، وہ ''اَحکامِ اِعتکاف'' کے ضمیمے میں لکھ دی گئی ہے،[3] اس کا مطالعہ فرمالیں۔

واضح رہے کہ آج کل بعض علماء نے غسلِ جمعہ کے لئے مسجد سے نکلنے کو جائز قرار دیا ہے، لیکن اس کی کوئی اطمینان بخش دلیل احقر کو اب تک نہیں ملی۔ اور جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان سے اطمینان نہیں ہوتا، اور فقہائے کرامؒ کے درمیان مشہور اور مُسلّم مسئلہ وہی ہے جو احقر نے ''اَحکام اعتکاف'' میں لکھا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۵/۸/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۷/۶ ۳۵د)

اِعتکافِ مسنون توڑنے کی صورت میں قضاء کا حکم

سوال :- اگر بغیر روزے کے اِعتکاف نہ ہوتا ہو اور اِعتکاف باطل ہوگیا ہو تو مذکورہ بالا حالت میں اپنا خیمہ مسجد میں چھوڑ کر گھر چلے جانے کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟ اور جتنے دن تندرستی کی حالت میں اِعتکاف کے دن گزرے، کیا وہ اِعتکافِ مسنونہ یا نافلہ میں شمار ہوں گے یا نہیں؟

جواب :- جتنا اِعتکاف اس نے روزے کی حالت میں کیا وہ اِعتکاف شمار ہوگا، اور اُس ایک دن کی قضاء کرنی ہوگی، قضاء کرنے کے لئے رمضان ضروری نہیں، لیکن روزہ ضروری ہے۔ قال

(۱، ۲) وفی الدر المحتار ج:۲ ص ۴۴۴، ۴۴۵ وحرم علیه الخروج الّا لحاجة الانسان طبیعیة کبول وغائط وغسل لو احتلم ولا یمکنه الاغتسال فی المسجد. وفی الشامیة (قوله ولا یمکنه ....الخ) فلو أمکنه من غیر أن یتلوث المسجد فلا بأس به. بدائع أی بأن کان فیه برکة ماء أو موضع معدّ للطّهارة أو اغتسل فی اناء بحیث لا یصیب المسجد الماء المستعمل قال فی البدائع: فان کان بحیث یتلوّث بالماء المستعمل یمنع منه لأنّ تنظیف المسجد واجب ....الخ. وفی الهندیة کتاب الصّوم، الباب السابع فی الاعتکاف ج:۱ ص:۲۱۳ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) ثم ان أمکنه الاغتسال فی المسجد من غیر أن یتلوّث المسجد فلا بأس والا فیخرج ویغتسل ویعود الی المسجد.

(۳) ص:۶۱ تا ۶۵ (طبع دارالعلوم کراچی) ''اعتکاف میں غسلِ جمعہ کا مسئلہ'' کے تحت حضرت والا دامت برکاتہم نے تفصیلی دلائل اور غسلِ جمعہ کی خاطر خروج کے جواز کے قائلین کے جوابات ذکر فرمائے ہیں، تفصیل کے لئے اُسے ملاحظہ فرمائیں۔

فی الشامیة: اذا فات عن وقته المعین، فان فات بعضه قضاه لا غیر ولا یجب الاستقبال (شامی ج:۲ ص:۱۳۳)۔ [۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۷/۲۷ د)

مشرک کے لئے اِعتکاف میں بیٹھنے کا حکم

سوال:- مشرک کو اِعتکاف میں بیٹھنا جائز ہے؟

جواب:- اِعتکاف عبادت ہے جو بغیر اسلام کے ادا نہیں ہوتی، لہٰذا غیر مسلم اِعتکاف میں نہیں بیٹھ سکتا۔ [۲]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

❊❊❊

---

(۱) ردّ المحتار باب الاعتکاف ج:۲ ص:۴۴۷ (طبع سعید) وفی ردّ المحتار ج:۲ ص:۴۴۴، ۴۴۵ (طبع سعید) فیظهر من بحث ابن الهمام لزوم الاعتکاف المسنون بالشروع وان لزوم قضاء جمعیه أو باقیه محرج علیٰ قول أبی یوسف امّا علی قول غیره فیقضی الیوم الّذی أفسدهٗ لاستقلال کل یوم بنفسه وانّما قلنا أی باقیه بناء علیٰ أن الشروع ملزم کالنّذر وهو لو نذر العشر یلزمه کله متتابعا ولو أفسد بعضه قضی باقیه علیٰ ما مرّ فی نذر صوم شهر معین والحاصل أن الوجه یقتضی لزوم کل یوم شرع فیه عندهما بناء علی لزوم صومه بخلاف الباقی لأنّ کل یوم بمنزلة شفع من النافلة الرباعیة وان کان المسنون هو اعتکاف العشر بتمامه تأمّل. وفی التتارخانیة الفصل الثانی عشر فی الاعتکاف ج:۲ ص:۴۱۴ ولو شرع فیه ثم قطع لا یلزمه القضاء فی روایة الأصل، وفی روایة الحسن یلزمه، وفی الظّهیریة عن أبی حنیفة انّه یلزمه یومًا ... الخ.

(۲) فی الدرّ المختار ج:۲ ص:۴۴۱ (طبع سعید) والنیة من مسلم عاقل طاهر .... الخ. وفی الشامیة تحته: لأن النیة لا تصح بدون الاسلام .... الخ.

کتاب الحج

(حج کے مسائل)

﴿فصل فی من یفرض علیه الحج﴾

(حج کس پر فرض ہے؟)

غیرمحرَم کے ساتھ سفرِ حج کا حکم

سوال:- میری والدہ جن کی عمر پچاس سال ہے اور وہ بیوہ ہیں، وہ اپنے ایک پڑوسی کے ساتھ حج کے لئے جانا چاہتی ہیں، موصوف اپنی زوجہ کے ساتھ جارہے ہیں، کیا میں ان کے ساتھ اپنی والدہ اور والدہ کی چچی کو بھیج سکتا ہوں یا نہیں؟ شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- حنفی مسلک میں عورت خواہ جوان ہو یا بوڑھی، اس کے لئے حج پر جانے کے لئے محرَم کی رفاقت شرط ہے،[1] لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر پڑوسی اس بیوہ کا محرَم نہیں ہے تو اس کے ساتھ نہیں جاسکتی۔

شرائطِ حج میں ہے: ومنها المحرَم للمرأة شابة کانت أو عجوزًا اذا کانت بینها وبین مکّة مسیرة ثلاثة أیام. (عالمگیریہ ج:۱ ص:۲۱۸)۔[2]

لہٰذا حنفی مسلک میں حکم یہ ہے کہ جب تک محرَم نہ ملے، حج پر نہ جائے، اور آخر عمر تک محرَم نہ ملے تو وصیت کرجائے کہ میری طرف سے حجِ بدل کرادیا جائے۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸۶/۲۸ ب)

---

(۱) وفی صحیح البخاری ج:۱ ص:۱۴۷ (طبع قدیمی کتب خانه) عن ابن عمرؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: لا تسافر المرأة ثلثا إلّا معها ذو محرم. وفی الدّر المختار ج:۲ ص:۴۶۴ و ۴۶۵ (طبع سعید) .... ومع زوج أو محرم بالغ .... ولو حجّت بلا محرم جاز مع الکراهة. وفی الشامیة (قوله مع الکراهة) ای التحریمیة للنّهی فی حدیث الصحیحین: "لا تسافر امرأة ثلثاً الّا ومعها محرم" زاد مسلم فی روایة: "أو زوج".

وفی بدائع الصنائع ج:۲ ص:۱۲۳ (طبع سعید) (وأمّا) الّذی یخصّ النّساء فشرطان، أحدهما أن یکون معها زوجها أو محرم لها، فان لم یوجد أحدهما لا یجب علیها الحج، وهذا عندنا وعند الشافعی هذا لیس بشرط ..... ولنا ما روی عن ابن عباسؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم أنه قال: الا لا تحجّن امرأة الّا ومعها محرم. وعن النبی صلی الله علیه وسلم أنّه قال: لا تسافر امرأة ثلاثة أیام الّا ومعها محرم أو زوج ولأنّها اذا لم یکن معها زوج ولا محرم لا یؤمن علیها .... الخ.
وکذا فی البحر الرائق ج:۲ ص:۳۱۵ (طبع سعید).

(۲) ج:۱ ص:۲۱۸، ۲۱۹ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

(۳) وفی ردّ المحتار ج:۲ ص:۴۶۵ (طبع سعید) والّذی اختارهٗ فی الفتح أنّه مع الصّحة وأمن الطّریق شرط وجوب الأداء فیجب الایصاء ان منع المرض، وخوف الطّریق أو لم یوجد زوج ولا محرم .... الخ. وفی الفتاویٰ الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج:۱ ص:۳۰۸ (طبع رشیدیه کوئٹه) المرأة اذا لم تجد محرمًا لا تخرج الی الحج الّا أن تبلغ الوقت الّذی تعجز عن الحجّ فحینئذٍ تبعث من یحجّ عنها أمّا قبل ذٰلک لا یجوز الحج لتوهّم وجود المحرم .... الخ. (محمد زبیر حق نواز).

شوہر کی اجازت کے بغیر حج پر جانے کا حکم

سوال:- جناب والا! میں اپنی ایک دینی بہن کے حالات تحریر کر رہا ہوں، پڑھ کر اس کے سوالات کے جوابات شریعت کی رُو سے تحریر فرمائیں۔

اپنی دینی بہن کے حالات اس کی اپنی زبان میں لکھ رہا ہوں۔ میری بہن فرماتی ہیں: میرا خاوند بہت ہی بُری عادتوں میں مبتلا ہے، جس کا ذکر میرے لئے بھی اذیت ناک ہے، بُری عورتوں اور شراب میں مبتلا رہتا ہے۔ میں خود نماز، روزوں کی پابند ہوں، میں نے اور میرے بچوں نے بہت کوشش کی کہ وہ پیار سے سمجھ جائیں، مگر وہ کسی صورت میں بھی بُری عادتوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ میرا خاوند آنکھوں کا ڈاکٹر ہے، اور میرے دو بیٹے بھی ڈاکٹر ہیں۔ میرا خاوند حج اور عمرہ کی طرف دھیان بھی نہیں دیتا اور نہ ہی مجھے اپنے بیٹوں کے ساتھ حج اور عمرہ پر جانے کی اجازت دیتا ہے۔ گھر میں سب چیزیں موجود ہیں، مثلاً کوٹھی اپنی ہے، کار بھی ہے اور ہر چیز گھر میں موجود ہے، مگر میں ان سب چیزوں کے باوجود بہت پریشان ہوں۔ میں نے اپنے خاوند کو یہ بھی کہا کہ وہ غلط کام چھوڑ دیں اور ایک اور شادی کرلیں، مگر وہ میری بات پر دھیان نہیں دیتے۔

۱:- میں نے اپنے خاوند کے لئے بہت سارے وظیفے اور تسبیحات کی ہیں کہ میرا خاوند دُرست ہوجائے، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا، کیا میرے لئے یہ وظیفے کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۲:- کیا میں اپنے بیٹے کے ساتھ خاوند کی اجازت کے بغیر حج اور عمرہ پر جاسکتی ہوں یا نہیں؟ کیونکہ میرا خاوند اجازت نہیں دیتا۔

۳:- مہربانی فرماکر مجھے ایسا وظیفہ بتادیں کہ اس پر عمل کرنے سے میرا خاوند راہِ راست پر آجائے، اور میری پریشانی بھی دُور ہوجائے۔ اور یہ بھی جواب طلب ہے کہ میں نے ابھی تک فرض حج بھی ادا نہیں کیا، تو اس حالت میں کیا میرے لئے اپنے شوہر سے اجازت لے کر جانا ضروری ہے یا پھر اس حالت میں اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر بھی حجِ فرض ادا کرنے کے لئے اپنے بیٹے کے ساتھ جاسکتی ہوں؟

جواب:- آپ کی پریشانی دُور ہونے کے لئے دِل سے دُعا کرتا ہوں، آپ ہر نماز کے بعد یہ دُعا کم از کم تین مرتبہ پڑھا کریں:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا. (۱)

(۱) سورۃ الفرقان: ۷۴۔

اگر آپ فرض حج کرچکی ہیں تو نفلی حج یا عمرے کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں ہے۔ آپ کو ان شاء اللہ گھر بیٹھے نیت کے ذریعے حج اور عمرے کا ثواب ملے گا۔ اور اگر آپ پر حج فرض ہو چکا ہو اور آپ اپنے بیٹے کے ساتھ حج پر جارہی ہوں تو شوہر حجِ فرض سے نہیں روک سکتا، اگر شوہر روکے تو عورت اس کی اجازت کے بغیر بھی جاسکتی ہے۔ **في الدر: وليس لزوجها منعها عن حجة الاسلام. في الشامية: أي اذا كان معها محرم والّا فله منعها كما يمنعها عن غير حجة الاسلام.** (ج:۲ ص:۴۶۵)۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۰/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۴۹/۴۰۱)

منہ بولے بھائی کے ساتھ سفرِ حج پر جانے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے اپنے لئے منہ بولی بہن بنائی ہے، کیا ایسی بہن کے ساتھ سفرِ حج کرسکتا ہے؟

جواب:- کسی غیر محرَم عورت کو زبان سے بہن کہہ دیا جائے تو وہ شرعاً بہن کے حکم میں نہیں ہوتی، اس لئے اس کا صرف اپنے منہ بولے بھائی کے ساتھ حج کے سفر میں جانا جائز نہیں۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۷/ ۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

لڑکیوں کی شادی کئے بغیر حج فرض ہوگا یا نہیں؟

سوال:- میری عمر ۶۱ سال ہے، حج کی تمنا رکھتا ہوں، میں نے تقریباً پانچ ہزار روپے جمع کئے، حکومت نے دس ہزار کر دیئے۔ میری چار لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں، دو لڑکیوں کی شادی کردی، دو گھر میں ہیں، جن کی عمر ۲۲ سال ہے، بڑا لڑکا ۲۲ سال، چھوٹا لڑکا ۱۶ سال کا ہے، دونوں گھر سے بھاگے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ دو لڑکیوں کی شادی کئے بغیر حج کرسکتا ہوں یا نہیں؟

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید). وفي غنية الناسك ص:۱۲ (طبع قدیم ادارة القرآن کراچی) وليس للزوج منعها عن حجة الاسلام اذا كان معها محرم والّا فله منعها كما يمنعها عن غير حجة الاسلام .... الخ.
(۲) غیر محرَم کے ساتھ سفر کی ممانعت کے دلائل سابقہ صفحہ ۲۰۱ کے حاشیہ نمبر ۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

جواب:- اگر آپ کے پاس اتنی رقم ہے جس سے حج ہوسکتا ہو تو آپ پر حج فرض ہے۔[1] حج کی فرضیت کا لڑکیوں کی شادی سے کوئی تعلق نہیں، حج کی ادائیگی کے لئے ان کی شادی کا انتظار کرنا دُرست نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۱۰/۲۷ ج)

جہاز کی اکانومی کلاس میں ٹکٹ نہ ملنے کی بنا پر کیا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر حج پر جانا فرض ہے

سوال:- میں آپ کو زحمت اس لئے دے رہا ہوں کہ میری عمر ۶۳ سال ہوچکی ہے، اور میرے اُوپر حج فرض ہے، چنانچہ میں مشہد سے حج پر جانے کے لئے تین مرتبہ درخواستیں دے چکا ہوں، مگر قرعہ اندازی میں میرا نام نہیں نکلتا، معاملہ قسمت پر چھوڑ دوں یا پانی کے جہاز سے فرسٹ کلاس سے جانے کے لئے درخواست دوں؟ ایسا کرنے میں پہلے سال تو بہت اِمکان تھا، مگر اس میں دو باتیں ہیں:-

۱:- یہ کہ حکومتِ پاکستان علاوہ عرشہ کے اور تمام درجوں کے مسافروں سے بڑی بھاری رقم بونس واؤچر کے نام سے لیتی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ رقم لینا اور دینا مذہباً کہاں تک دُرست ہے؟ حج میں تو کوئی نقصان نہ ہوگا؟

۲:- دُوسری بات یہ ہے کہ میرے چار بچے بھی ہیں، جن میں سے ایک لڑکی جوان بھی ہے، اور باقی تمام کے تمام شادی کی عمر میں ہیں۔ اگر میں عرشہ کے بجائے فرسٹ کلاس میں جاؤں تو اخراجات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ اولاد کی شادی میں دیر اور دِقت ہوگی، ان باتوں کو مدِنظر رکھ کر یہ فرمایئے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟

جواب۱:- اگر آپ کے پاس اپنی ضروریاتِ اصلیہ سے زائد اتنا روپیہ ہے کہ اس کے ذریعے آپ بونس واؤچر پر حج کرسکیں تو آپ پر اس کے ذریعے حج کرنا واجب ہے۔ اور اولاد کی شادی ضروریاتِ اصلیہ میں داخل نہیں۔ اور اگر اتنا روپیہ نہیں تو عرشہ کے ذریعے جانے کی درخواست دیتے رہئے، جب نام نکل آئے تو چلے جائیں، آخر عمر تک نہ ہوسکے تو حجِ بدل کی وصیت کرنا ضروری نہ ہوگا۔ فقہائے کرام کی مندرجہ ذیل تصریحات اس مسئلے سے متعلق ہیں:-

---

(۱) وفي تنوير الأبصار ج.۲ ص.۴۵۹ (طبع ایچ ایم سعید) .... ذي زاد وراحلة فضلا عما لا بد منه ونفقة عياله الى عوده.

۱:- وهل ما يؤخذ من المكس والخفارة عذر قولان، والمعتمد لا كما فى القنية والمجتبى، وعليه فيحتسب فى الفاضل عما لا بد منه القدرة على المكس ونحوه كما فى مناسك الطرابلسى، وكذا فى الدر المختار، وقال الشامى: المكس ما يأخذه العشار والخفارة ما يأخذه الخفير وهو المجير ومثله ما يأخذه الأعراب فى زماننا من الصر المعين. (شامی ج:۲ ص:۱۹۸)۔[1]

۲:- وعلى تقدير أخذهم الرشوة فالاثم فى مثله على الأخذ لا المعطى على ما عرف من تقسيم الرشوة فى كتاب القضاء ولا يترك الفرض لمعصية عاص. (البحر الرائق ج:۲ ص:۳۳۸)۔[2]

۳:- اذا وجد ما يحج به وقد قصد التزوج يحج به ولا يتزوج لان الحج فريضة أوجبها الله تعالىٰ على عبده كذا فى التبيين. (عالمگیریہ ج:۱ ص:۲۳۱)۔[3] فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۸/۷ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

کیا عمرہ کرنے سے حج فرض ہوجائے گا؟

سوال:- ایک غیر مستطیع شخص ایامِ حج کے علاوہ کے دنوں میں عمرے کے واسطے چلا جائے، کیا اس پر حج فرض ہوجائے گا؟ یہ جو مشہور ہے کہ جس نے خود حج نہ کیا ہو، وہ حجِ بدل کے لئے نہ جائے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- غیر ایامِ حج میں عمرہ کرنے سے حج فرض نہیں ہوتا، جب تک کہ اَشہرِ حج میں اسے حج کرنے کی استطاعت پیدا نہ ہو،[4] اور یہ صحیح ہے کہ جس شخص نے اپنا حج نہ کیا ہو، اسے دُوسرے کی

---

(۱) ج:۲ ص:۴۶۳، ۴۶۴ (طبع سعید). (۲) ج:۲ ص:۳۱۴ (ایضًا).
(۳) ج:۱ ص:۲۱۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).
(۴) وفى الغنية ص:۸ (طبع ادارة القرآن) السابع الوقت أى وجود القدرة فيه، وهو أشهر الحج، أو وقت خروج أهل بلده ان كانوا يخرجون قبلها، فلا يجب الّا على القادر فيها أو فى وقت خروج أهل بلده فان ملك المال قبل الوقت فله صرفه حيث شاء ... الخ.
وفى ارشاد السارى ص:۳۳ (طبع مصطفى محمد مصر) السابع من شرائط الوجوب، الوقت وهو أشهر الحج أو وقت خروج أهل بلده .... فان ملكهٗ أى المال قبل الوقت أى قبل الأشهر أو قبل أن يتأهب أهل بلده فله صرفه حيث شاء ولا حج عليه.
وفى الغنية ص:۴ (طبع ادارة القرآن كراچى) (السادس) الاستطاعة، وهى القدرة علىٰ زاد يليق بحاله .... الخ. وفيها أيضًا (ص:۶۰) والرّاحلة شرط فى حقّ الأفاقى فقط قدر على المشى أو لا، امّا المكى ومن حولها وهو من كان داخل المواقيت الى الحرم فلا يشترط فى حقّه الرّاحلة اذا كان قادرًا على المشى بلا مشقة زائدة والا فكالأفاقى واما الزّاد فشرط لا بدّ منه قدر ما يكفيه وعياله فى أيام اشتغاله بنسك الحج .... الخ. (باقی اگلے صفحے پر)

طرف سے حجِ بدل کرنا دُرست نہیں، البتہ ایسا شخص اگر حجِ بدل کی نیت سے حج کرلے تو اس سے حجِ بدل ہی ادا ہوگا، اس کا اپنا حج نہیں ہوگا۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۹/۲۸ الف)

ضرورت سے زائد مزروعہ زمین کو فروخت کرکے حج پر جانا فرض ہے

سوال:- فتاویٰ ہندیہ اُردو جلد دوم صفحہ: ۴۵ میں لکھا ہے ''اگر کوئی شخص مزروع زمین کا مالک ہے، اور اس کے پاس اس قدر زمین ہے کہ اگر اس میں سے تھوڑی سی زمین بیچ ڈالے تو حج کے اخراجات کے لئے اور بچوں کی ضرورت کے لئے کافی ہے، پھر بھی اتنی زمین بچی رہے گی جس کی آمدنی سے گزر کرسکتا ہے، تو اس پر حج فرض ہوگا'' فرمائیے کیا اس صورت میں حج فرض ہوگا؟

جواب:- فرضیتِ حج کے لئے زکوٰۃ کی طرح مالِ نامی کا مالک ہونا شرط نہیں،[۲] لہٰذا صورتِ مسئولہ میں یعنی کسی شخص کے پاس نقد روپیہ نہ ہو، لیکن گزارے کی ضرورت سے زیادہ زمین یا مکان ہو جسے فروخت کرکے حج کرسکتا ہو تو اس پر حج فرض ہے۔ فتاویٰ ہندیہ کی عبارت یہ ہے: **وان کان صاحب ضیعة ان کان لهٗ من الضیاع ما لو باع مقدار ما یکفی الزاد والراحلة ذاهبا وجائیا**

........(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وفی ردّ المحتار ج:۲ ص:۴۶۰ (طبع سعید) والحاصل أن الزّاد لا بدّ منه ولو لمکّی کما صرّح به غیر واحد کصاحب الینابیع والسراج وما فی الخانیة والنّهایة من أن المکی یلزمه الحج ولو فقیرًا لا زاد له، نظر فیه ابن الهمام الّا أن یراد ما اذا کان یمکنه الاکتساب فی الطّریق .... وبعد أسطر .... (تنبیه) فی اللّباب - الفقیر الأفاقی اذا وصل الی میقات فهو کالمکی قال شارحه أی حیث لا یشترط فی حقّه الّا الزّاد والرّاحلة .... الخ. (وراجع للتفصیل الیها).

اور زبدۃ المناسک ص.۲۱ میں ''ضروری فائدہ'' کے تحت ہے: ... جب مکہ مکرّمہ میں آکر داخل ہوا اور کعبۃ اللہ شریف میں آپہنچا تو اب اس پر فرضیتِ حج متعین ہوجائے گی بالاتفاق.... لیکن اس فقیر پر یہ فرضیتِ حج بالاتفاق تب ہوگی جب اَشہرِ حج میں آکر کعبۃ اللہ شریف میں پہنچا ہو، اور ایامِ حج کا خرچہ کھانے کا بھی رکھتا ہو اور عرفات پر پیادہ جانے کی قدرت بھی رکھتا ہو....الخ۔ نیز دیکھئے: حیات القلوب ص۲۶، ۲۷۔

(۱) وفی التاتارخانیة ج:۲ ص:۵۴۶ (طبع ادارة القرآن) والأفضل للانسان اذا أراد أن یحجّ رجلًا عن نفسه أن یحجّ رجلًا قد حجّ عن نفسه فانّ الذی لم یحجّ عن حجّة الاسلام عن نفسه لم یجز حجّته عن غیره عند بعض النّاس، ومع هذا لو أحجّ رجلًا لم یحجّ عن نفسه حجّة الاسلام یجوز عندنا .... الخ. نیز ''حج صرورۃ'' سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے صفحہ: ۲۱۵ تا ۲۲۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی ارشاد الساری ص:۳۸ (طبع مصطفی محمد مصر) (ونصاب الوجوب) أی مقدار ما یتعلق به وجوب الحج من الغنی، ولیس له حد من نصاب شرعی علٰی ما فی الزکاة بل هو (ملک مال یبلغه الی مکّة) بل الٰی عرفة (ذاهبا) أی الیها (وجائیا) أی راجعًا الی وطنه۔ (محمد زبیر حق نواز)

ونفقة عياله وأولاده ويبقى له من الضَيعة قدر ما يعيش بغلة الباقي يفترض عليه الحج وإلّا فلا.
(فتاویٰ عالمگیریہ)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۲۰/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۶/۲۸ الف)

۱:- کیا عمرہ کرنے کے بعد حج فرض ہوجاتا ہے؟
۲:- اگر کوئی شخص بڑھاپے میں غنی ہوجائے تو کیا اس پر حج فرض ہوگا؟

سوال ۱:- کیا عمرہ کرنے کے بعد حج کرنا فرض ہوجاتا ہے، جبکہ اس پر حج فرض نہ ہوا ہو؟

۲:- اگر کوئی شخص زیادہ عمر یا ضعیفی کے زمانے میں تونگر ہوجائے تو کیا اس پر حج فرض ہوجاتا ہے، جبکہ اس کی لاغری مانع ہو؟

جواب ۱:- عمرہ اگر ایامِ حج کے علاوہ دُوسرے ایام میں کیا جائے تو اس سے حج فرض نہیں ہوتا، البتہ ایامِ حج میں مکہ مکرّمہ پہنچنے سے حج فرض ہوجاتا ہے، كذا في عمدة المناسك مع زبدة المناسك: ۱۳۱۔[2]

۲:- اگر صحت وقوت کی حالت میں حج فرض نہیں تھا اور جب اتنا بوڑھا ہوگیا کہ سواری پر بغیر شدید مشقت کے سوار نہیں ہوسکتا، اور اس وقت حج کرنے کے لائق رقم حاصل ہوئی، تو اس کے بارے میں فقہاءِ حنفیہ کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایسے شخص پر حج بالکل فرض نہیں، نہ خود کرنا فرض ہے اور نہ کسی دُوسرے سے کرانا، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک ایسے شخص پر خود تو حج کرنا فرض نہیں لیکن کسی دُوسرے سے کرانا فرض ہے۔ مشائخِ حنفیہ میں سے بعض حضرات نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے، اور بعض نے دُوسرے کو۔ احتیاط اسی میں ہے کہ ایسا شخص صاحبینؒ کے قول پر عمل کرے اور کسی دُوسرے شخص سے اپنی طرف سے حج کروائے یا کم از کم اس کی وصیت کردے کہ میری طرف سے حج کیا جائے۔

في رد المحتار: فلا يجب على مقعد ومفلوج وشيخ كبير لا يثبت على الراحلة بنفسه .... لا بأنفسهم ولا بالنيابة في ظاهر المذهب عن الامام وهو رواية عنهما، وظاهر الرواية عنهما وجوب الاحجاج عليهم .... وظاهر التحفة اختيار قولهما، وكذا الاسبيجابي

---

(۱) ج:۱ ص:۲۱۸. وفي غنية النّاسك ص:۷ (طبع ادارة القرآن كراچي) وان كان لهُ من الضّياع ما لو باع مقدار ما يكفي الزّاد والرّاحلة يبقى بعد رجوعه من ضيعته قدر ما يعيش بغلّته الباقي يفترض عليه الحج والّا فلا كذا في الخانية. (محمد زبیر حق نواز)

(۲) ص:۱۳۱.

وقواه في الفتح .... وحكى في اللّباب اختلاف التصحيح. (شامی ج:۲ ص:۱۴۲)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۲/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۶۱و)

نکاح ہونے کی صورت میں شوہر اور بیوی کا حج پر جانا جائز ہے

سوال:- عارفہ نے ۱۹۵۰ء میں اپنے شوہر سے تنگ آکر سندھ سے ملتان چلی گئی، اور ابراہیم شاہ سے پناہ طلب کی، ابراہیم شاہ نے عارفہ کو پناہ میں رکھا، اس دوران عارفہ کے شوہر نے کوئی خرچ نہیں دیا، اور عارفہ کا نان نفقہ ابراہیم شاہ برداشت کرتا رہا، ۱۹۵۱ء میں عارفہ کے شوہر کا انتقال ہوگیا، بعد عدّت عارفہ نے ابراہیم شاہ سے نکاح کرلیا، ۱۹۵۲ء ۱۷؍اپریل کو ملتان چھاؤنی میں عبدالمنان امامِ مسجد نے نکاح پڑھایا، احمد علی، خدابخش ولد خان جانگلہ گواہ تھے، ان کے رُوبرو نکاح ہوا، اُس وقت فارم اور رجسٹر ی کا عام رواج نہیں تھا، یہ حلفیہ بیان ہے، اب ابراہیم شاہ اور عارفہ دونوں حج کو جانا چاہ رہے ہیں، یہ اپنے عزیزوں کو اس سلسلے میں مدعو کرنا چاہتے ہیں، ان کی اس دعوت میں عزیزوں کا جانا اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جب عارفہ اور ابراہیم شاہ کے درمیان شرعی طور پر نکاح ہوچکا ہے، تو اب یہ دونوں ساتھ حج کو جاسکتے ہیں، اور ان کی دعوت قبول کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں بشرطیکہ کوئی اور مانعِ شرعی موجود نہ ہو۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۵۹۱و)

---

(۱) ج:۲ ص:۴۵۹ (ایچ ایم سعید). وفي غنية الناسك ص:۹ (مطبع ادارة القرآن كراچی) وأما شرائط وجوب الأداء فخمسة على الأصح الأوّل: الصحة .... فلا يجب الحج على المقعد والزمن والمفلوج، ومقطوع الرجلين أو اليدين، أو الرجل الواحدة، والأعمى والمريض والمعضوب وهو الشيخ الكبير الذى لا يثبت على الراحلة بنفسه وان ملكوا ما به الاستطاعة، فليس عليهم الاحجاج أو الايصاء، وعندهما يجب الحج عليهم اذا ملكوا الزاد والراحلة، ومؤنة من يرفعهم ويضعهم .... ولكن ليس عليهم الأداء بأنفسهم فعليهم الاحجاج أو الايصاء به عند الموت، وصححه قاضى خان واختاره كثير من المشايخ، منهم ابن الهمام، وأما ظاهر المذهب فصححه فى النهاية، وقال فى البحر العميق: هو المذهب الصحيح فقد اختلف التصحيح، وان ملكوا الزاد والراحلة، ولم يجدوا مؤنة من يقودهم لا يجب عليهم الحج فى قولهم .... الخ. وكذا فى الهندية ج:۱ ص:۲۱۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه). (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی المواقیت﴾
(میقات سے متعلق مسائل کا بیان)

جدہ تک بغیر اِحرام کے جانے والا مسافر اگر کسی دُوسری میقات سے اِحرام باندھ لے تو اس پر دَم نہیں
(''جواہر الفقہ'' کی ایک عبارت کی تحقیق)

سوال:- ''جواہر الفقہ'' کے ذیل کی عبارت: ''اس لئے اہلِ پاکستان اور ہندوستان کے لئے تو احتیاط اسی میں ہے کہ ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہی اِحرام باندھ لیں، اگر بغیر اِحرام باندھے ہوئے ہوائی جہاز کے ذریعے جدہ پہنچ گئے تو ان کے ذمہ دَم یعنی قربانی ایک بکرے کی واجب ہوجائے گی'' میں یہ اِشکال ہے کہ میقات سے بغیر اِحرام گزرنے پر جو دَم لازم ہوتا ہے، وہ عود الی المیقات سے ساقط ہوجاتا ہے، تو ہوائی جہاز میں مسافر پر اگر دَم واجب ہوا لیکن جب وہ جدہ پہنچ گیا اور اِحرام وہاں سے باندھا تو چاہئے کہ وہ دَم ساقط ہوجائے، کیونکہ درمختار میں ہے: **وحرم تاخیر الاحرام عنها.** (در مختار) **وقال علیه المحشی فعلیه العود الی میقات منها وان لم یکن میقاته لیحرم منه والا فعلیه دَم کما سیأتی بیانه فی الجنایات** (تحت مطلب فی المواقیت ج:۲) **فان عاد الی میقات ما ثم احرم الٰی قوله .... سقط دمه.** (درمختار باب الجنایات)۔

لیکن اس میں اب یہ بات ذہن میں آئی کہ دَم جو بغیر اِحرام کے میقات سے گزرنے پر لازم ہوتا ہے، وہ تب ساقط ہوتا ہے جب یہ شخص کسی ایک میقات کو رُجوع کرے اور جدہ میقات نہیں، لہٰذا اس سے اِحرام باندھنے پر وہ دَمِ واجب ساقط نہیں ہوتا ہے، لہٰذا ''جواہر الفقہ'' کی عبارت بظاہر صحیح ہے، اگرچہ جدہ سے اِحرام باندھنا اس وجہ سے صحیح ہے کہ وہ میقات کا محاذی ہے۔ سو حاصل یہ نکلا کہ میقات اور محاذی میقات ان دونوں سے اِحرام باندھنا صحیح ہے، لیکن اگر میقات پر بغیر اِحرام کے گزرنے سے دَم واجب ہوا تو وہ عود الی المیقات سے ساقط ہوجائے گا، لیکن عود الی محاذی المیقات سے ساقط نہیں ہوگا۔ مؤدّبانہ گزارش ہے کہ میری اس رائے کی تصحیح یا تردید سے مطلع فرمائیں۔

جواب:- عزیز گرامی قدر مولانا محمد سردار صاحب سلمہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بہت عرصہ قبل آپ نے ایک سوال بھیجا تھا، جو اِحرام کے بغیر جدہ تک پہنچنے سے متعلق تھا،

چونکہ معاملہ قدرے غور وفکر اور مراجعت کا محتاج تھا، اس لئے فوراً جواب نہ دے سکا، اب کچھ غور کرنے کا موقع ملا تو جواب عرض ہے۔

جواہر الفقہ[1] میں ہوائی جہاز کے مسافروں کے لئے جدہ تک بغیر احرام چلے جانے پر جو دَم کا وجوب لکھا ہے، غور وفکر اور علماء سے مشورے کے بعد ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تسامح ہوا ہے، شاید اس وقت ذہن اس طرف گیا ہو کہ مجاوزت قرن المنازل کے میقات کی بغیر احرام ہوئی، لہٰذا پھر عود اس کی طرف نہیں ہوا، بلکہ دُوسرے میقات کی محاذات کی طرف عود ہوا ہے، اس لئے دَم ساقط نہیں ہوا، لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ اگر عود کسی اور میقات کی طرف ہو تب بھی دَم ساقط ہوجاتا ہے۔ چنانچہ بدائع میں ہے: **"ولو عاد الی میقات اٰخر غیر الذی جاوزہ قبل أن یفعل شیئًا من افعال الحج سقط عنہ الدم، وعودہ الٰی ھذا المیقات والٰی میقات اٰخر سواء."** (بدائع الصنائع ج:۲ ص:۱۶۵، مطبع رشیدیہ کوئٹہ)۔

اور آپ نے جو احتمال تحریر فرمایا ہے کہ سقوطِ دَم میقات پر عود کرنے سے ہوتا ہے، محض محاذات کی طرف عود کرنے سے نہیں، سو یہ احتمال احقر کی نظر میں نیز دُوسرے علماء جن سے مشورہ ہوا، ان کی نظر میں بھی صحیح نہیں، کیونکہ محاذات جمیع اَحکام میں میقات کے قائم مقام ہے، اگر کوئی فرق ہوتا تو فقہائے کرام ضرور تصریح فرماتے۔[2]

لہٰذا اب مسئلہ صحیح یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز سے جانے والا اگر قرن المنازل کی محاذات سے بغیر اِحرام گزر گیا اور پھر جدہ پہنچ کر اِحرام باندھا تو مجاوزتِ میقات بغیر اِحرام کا گناہ اسے ضرور ہوگا، لیکن دَم واجب نہیں ہوگا، کیونکہ وہ دُوسرے میقات کی طرف نکل گیا ہے اور وہاں سے اِحرام باندھ رہا ہے، **ھٰذا ما ظھر لی**، واللہ اعلم۔

اگر کوئی اور بات آپ کے ذہن میں آئے تو احقر کو مطلع فرمایئے گا۔ والسلام

محمد تقی عثمانی
۱۴۰۳/۸/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۴/۸۲۰ و)

---

(۱) **جواھر الفقہ ج:۱ ص:۴۷۵ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی).**

(۲) بلکہ حضراتِ فقہائے کرام رحمہم اللہ نے محاذاتِ میقات پر عود کرنے پر بھی سقوطِ دَم کی تصریح فرمائی ہے، چنانچہ **غنیۃ النّاسک باب مجاوزۃ المیقات بغیر احرام، فصل فی مجاوزۃ الافاقی وقتہ** ص:۷۰ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) میں ہے: **وعن ابی یوسف رحمہ اللہ تعالٰی أن کان الّذی یرجع الیہ محاذیًا لمیقاتہ الّذی جاوزہٗ أو ابعد منہ سقط الدّم والّا فلا، فان لم یعد ولا عذر لہٗ أثم اٰخری لترکہ العود الواجب .... الخ.** اسی طرح **مناسک مُلّا علی القاریؒ باب المواقیت** ص.۸۴ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) کے حاشیہ پر فتح القدیر کے حوالے سے ہے: **قال فی فتح القدیر وعن ابی یوسف رحمہ اللہ ان کان الّذی رجع الیہ محاذیًا لمیقاتہ أو أبعد منہ، فکمیقاتہ .... الخ.** (محمد زبیر)

﴿فصل فی الإحرام وما هو محذور فیه أو مباح﴾

(اِحرام اور اس کے مباحات وممنوعات کا بیان)

اِحرام کے لئے سلا ہوا کپڑا اور ٹیڑون استعمال کرنے کا حکم

سوال:- اِحرام کے لئے سلا ہوا کپڑا پہننا دُرست ہے یا نہیں؟ دُوسری بات یہ کہ اِحرام کے لئے ٹیڑون استعمال کرسکتا ہوں یا نہیں؟ (عبدالوحید، ریاض سعودی عرب)

جواب:- آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ ۱۰ اور ۱۱ رشوال کی درمیانی شب میں واصل بحق ہوچکے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کے لئے دُعائے مغفرت اور ہمارے لئے صبر وسکون اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی دُعا فرمائیں۔ اِحرام کے لئے سلے ہوئے کپڑے کا استعمال دُرست نہیں ہے۔[1] ٹیڑون کے اِحرام میں کچھ حرج نہیں بشرطیکہ سلا ہوا نہ ہو، والسلام۔

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
ابن حضرت مفتی صاحبؒ
۱۳۹۶/۱۱/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۷۷/۲۷و)

---

(۱) وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۳۲۳ (طبع سعید) قوله فاتّق الرفث .... قولهٗ ولبس القمیص والسراویل .... وفیه ص:۳۲۴ وذکر الحلبی فی مناسکه أن ضابطه لبس کل شیٔ معمول علٰی قدر البدن أو بعضه بحیث یخیط به بخیاطة أو تلزیق بعضه ببعض .... الخ.

﴿فصل فی القران والتّمتع﴾

(حجِ قران اور تمتع سے متعلق مسائل کا بیان)

سعودی عرب میں مقیم شخص کے لئے حجِ قران کا حکم

سوال:- میرا لڑکا سعودی عرب میں مقیم ہے، اس نے آخری عمرہ گزشتہ رمضان المبارک میں جمعۃ المبارک پر کیا تھا، کیا اب وہ حجِ قران کرسکتا ہے یا تمتع کرنا پڑے گا؟ اس کے شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کے صاحبزادے حدودِ میقات میں مقیم نہیں ہیں تو وہ قران کرسکتے ہیں،[1] رمضان المبارک میں عمرہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۲۷ و)

حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے والے جدہ میں مقیم شخص کے لئے حجِ قران کا حکم

سوال:- زید جدہ میں مقیم ہے، اَشہرِ حج میں عمرہ بھی کیا ہے، قران کا اِحرام بھی باندھ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- جو شخص اَشہرِ حج میں عمرہ کے افعال بجالاکر وقوفِ عرفہ سے پہلے پہلے حلال ہوچکا ہو اس کے لئے قران جائز نہیں، (کذا فی زبدۃ المناسک ص:۲۸۴)[2] اور جدہ کا مقیم حِلّی میقاتی کے حکم

---

(۱) (وھو) أی القِران (أن یجمع الأفاقی) أی لا المکّی والمیقاتی لیکون قرانه مسنونا بین الحج والعمرۃ. (مناسک مُلّا علی القاریؒ ص:۲۵۶ طبع ادارۃ القرآن). وکذا فی غنیۃ النّاسک ص. ۱۰۹ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)

(۲) زبدۃ المناسک مع عمدۃ المناسک قران کا بیان مسئلہ نمبر۲ ص:۲۹۳. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۵۳۹ (طبع سعید): والمکی ومن فی حکمه یفرد فقط، ولو قرن أو تمتع جاز وأساء، وعلیه دَم جبر. وفی ردالمحتار: ومن فی حکمه ای من أهل داخل المواقیت. (قوله یفرد فقط) هذا ما دام مقیمًا .... قال المحبوبی هذا اذا خرج الی الکوفة قبل أشهر الحج وأما اذا خرج بعدها فقد منع من القران فلا یتغیر بخروجه من المیقات کذا فی العنایة وقول المحبوبی هو الصّحیح. ....

(باقی اگلے صفحے پر)

میں ہے، اس لئے بھی اس کے لئے قران اور تمتع جائز نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جدہ کے اس مقیم کے لئے قران کا اِحرام باندھنا جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۶/ ۲۸ الف)

﴿فصل فی العمرة﴾
(عمرہ سے متعلق مسائل کا بیان)

ابتداءً حج کے لئے رقم جمع کرنی چاہئے یا عمرہ کو ترجیح دے؟

سوال:- کیا کوئی شخص عمرہ پر اکتفاء کرسکتا ہے یا حج ہی کے لئے روپیہ جمع کرے؟ کیا وہ عمرہ کو ترجیح دے سکتا ہے؟

جواب:- جس شخص نے حج نہیں کیا، اسے حج ہی کے لئے رقم جمع کرنی چاہئے، لیکن اگر حجِ فرض کرچکا ہے تو اب عمرہ پر اکتفاء کرنا دُرست ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۱۷/ ۲۷ و)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)...... .... وفی الھدایة ج:۱ ص:۲۶۳ لیس لأهل مكة تمتع ولا قران وانّما لهم الافراد خاصّة خلافًا للشافعيّ والحجّة عليه قوله تعالٰى: "ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" ولأنّ شرعهما للترفّه باسقاط احدى السفرتين وهٰذا فى حقّ الآفاقى، ومن كان داخل المواقيت فهو بمنزلة المكّى حتّى لا يكون له متعه ولا قران، وفى فتح القدير نقلًا عن البدائع: ....انّ العمرة دخلت فيها رخصة للآفاقى ضرورة تعذر انشاء سفر للعمرة نظرًا له وهٰذا المعنٰى لا يوجد فى حق أهل مكة ومن بمعناهم فلم تكن العمرة مشروعة فى اشهر الحج فى حقّهم.
وفى غنية الناسك ص:۲۱۹ لا تمتع ولا قران، ولا جمع بينهما فى غير أشهر الحج لأهل مكّة وأهل المواقيت الخمسة، ومن دونها الٰى مكّة سواء كان بينه وبين مكّة مسيرة سفر أو لا .... الخ.
اور زبدۃ المناسک ص.۳۰۵ (طبع سعید) میں ہے: مکہ مکرمہ کے رہنے والوں اور میقات پر یا میقات کے اندر حل میں رہنے والوں کو قران اور تمتع کرنا جائز نہیں۔ (محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہما)

﴿فصل فی الحجّ عن الغیر والبدل والوصیّة﴾

(حجِ بدل اور نفلی حج سے متعلق مسائل کا بیان)

۱:- جس نے اپنا حجِ فرض نہ کیا ہو اس سے حجِ بدل کرانے کا حکم
۲:- حجِ بدل کے لئے مکہ مکرّمہ جانے سے کیا اپنے اُوپر حج فرض ہوجاتا ہے؟

سوال ۱:- میرے والد مرحوم پر حج فرض نہ تھا، میں بغرضِ ایصالِ ثواب ان کے لئے حج بدل کرانا چاہتا ہوں۔ ایک عالم اس کام پر آمادہ ہیں، لیکن انہوں نے اپنا حج نہیں کیا ہے، اور نہ ان پر حج فرض ہے۔ کیا ایسا شخص جس نے اپنا حجِ فرض نہ کیا ہو کسی کی طرف سے حجِ بدل کرسکتا ہے؟

۲:- اور جس شخص پر حج فرض نہ ہو اور زمانۂ حج میں مکہ معظمہ پہنچ جائے تو کیا اس پر حج فرض ہوجاتا ہے؟

جواب ۱:- افضل اور بہتر تو تمام فقہاء کے نزدیک یہی ہے کہ حجِ بدل اس شخص سے کرایا جائے جو اپنا حجِ فرض ادا کرچکا ہو، اور جس شخص نے اپنا حجِ فرض ادا نہ کیا ہو اس کے ذریعے حجِ بدل کرانا مکروہِ تنزیہی ہے، اور جس شخص کو حجِ بدل پر بھیجا جارہا ہے، اگر اس کے ذمے خود حج فرض ہے اور وہ ابھی ادا نہیں کیا تو اس کے لئے حجِ بدل پر جانا مکروہِ تحریمی اور ناجائز ہے،[1] البتہ بھیجنے والے کا حج بہرصورت ادا ہوجائے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ کسی ایسے شخص کا حجِ بدل کے لئے انتخاب کریں جو پہلے

(۱) وفی الشامیة ج:۲ ص:۶۰۳ (طبع سعید) قال فی البحر: والحق أنها تنزیهیة علی الأمر لقولهم والأفضل الخ تحریمیة علی الصّرورة المأمور الذی اجتمعت فیه شروط الحج ولم یحج عن نفسه لانه أثم بالتأخیر الخ۔
وکذا فی فتاوی دار العلوم دیوبند ج:۶ ص:۵۷۳۔
وفی حاشیة البحر الرائق ج:۳ ص:۶۹ أن حج الصرورة عن غیره ان کان بعد تحقق الوجوب علیه بملک الزاد والراحلة والصحة فهو مکروه کراهة تحریم علیه لأنه یتضیق علیه۔
وفی البحر الرائق ج:۳ ص:۷۰ والحق أنها تنزیهیة علی الأمر تحریمیة علی الصرورة المامور الذی اجتمعت فیه شروط الحج ولم یحج عن نفسه لأنه آثم بالتأخیر

اپنا حج کر چکا ہو،[۱] حج فرض کے معاملے کو خواہ مخواہ خطرے میں ڈالنا مناسب نہیں۔

۲:- جس شخص نے اپنا حج نہیں کیا اور اس پر حج فرض نہیں تھا، تو بعض علماء کے نزدیک محض حجِ بدل کے لئے مکہ معظمہ پہنچ جانے سے اس پر حج فرض ہوجاتا ہے، لیکن راجح قول یہی ہے کہ اس طرح حج فرض نہیں ہوتا، کذا فی جواهر الفقه. (ج:۱ ص:۵۰۷)۔[۲]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۵/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۴۷۶/ ۲۸ ب)

مسئلۂ حجِ صرورہ

(''حجِ صرورہ'' کی مفصّل اور مدلل تحقیق)

سوال:- صرورہ کسے کہتے ہیں؟ اور کیا جس شخص نے اپنا حج نہ کیا ہو اُسے دُوسرے کی طرف سے حج پر بھیجنا جائز ہے؟ اگر بھیجا جائے تو حج ادا ہوجائے گا یا نہیں؟ اور ایسا شخص دُوسرے کی طرف سے حج کرے تو کیا اس سے خود اس پر حج فرض ہوجائے گا؟ براہِ کرم یہ مسئلہ مفصّل و مدلل بیان فرمادیں۔

جواب:- جس شخص نے اپنا حج ادا نہ کیا ہو، اس کو ''صرورہ'' کہتے ہیں، وہ اگر دُوسرے کی طرف سے حج کرے تو وہ حنفیہ کے یہاں ادا ہوجاتا ہے، علامہ علاء الدین حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں: **فجاز حجّ الصّرورة بمهملة من لم يحجّ۔** (درمختار مجتبائی ص:۱۸۲)[۳] بشرطیکہ حج کرنے والے کو کوئی ایسا عذر لاحق نہ ہو کہ جو موت تک مستمر رہے، مگر زائل ہونا ممکن ہو، کیونکہ حج ایک ایسی عبادت ہے جو مالی بھی ہے اور بدنی بھی، اور ایسی عبادت کے بارے میں فقہاءؒ نے یہی حکم دیا ہے، درِّ مختار میں ہے: **والمركبة منهما كحجّ الفرض تقبل النيابة عند العجز فقط لكن بشرط دوام العجز الى الموت.** (ص:۱۸۱ مجتبائی)[۴] اور ''بذل المجهود'' میں ہے: **ومركبة من البدنية والماليّة كالحج لا تجرى فيها النّيابة فى غير عذر. (بذل المجهود ج:۳ ص:۱۱۲)[۵] ومثله فى كتاب الفقه على المذاهب الأربعة.** (ج:۱ ص:۷۰۷)،[۶] لیکن چونکہ ایک چیز کا ادا ہوجانا اور چیز ہے اور فی نفسہٖ مکروہ ہونا

---

(۱) وفى الفتاوى التاتارخانية ج:۲ ص:۵۴۶ (طبع ادارة القرآن كراچى) والأفضل للانسان اذا أراد أن يحج رجلا عن نفسه (أن يحج رجلا قد حج عن نفسه) فان الذى لم يحج عن حجة الاسلام عن نفسه لم يجز حجته عن غيره عند بعض الناس، ومع هذا لو احج رجلا لم يحج عن نفسه حجة الاسلام يجوز عندنا ..... الخ.

وفى البحر الرائق ج:۳ ص:۶۹ والأفضل احجاج الحرّ العالم بالمناسك الّذى حجّ عن نفسه

(۲) نیز ''حج صرورة'' سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کے اگلے تفصیلی فتویٰ میں فریقین کے دلائل اور راجح قول ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) الدرّ المختار ج:۲ ص:۶۰۳ (طبع سعيد).

(۴) ج:۲ ص:۵۹۸ (ایضاً)

(۵) طبع مكتبه قاسميه ملتان.

(۶) طبع شركة فن الطباعة، مصر. (محمد زبیر)

اور چیز، اس لئے یہاں بھی حجِ صرورہ فی نفسہٖ تو مکروہ ہے، لیکن اگر کوئی کرلے تو ادا ہوجائے گا۔

اب اس کراہت کی نوعیت میں تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ اگر حجِ بدل کرنے والا ایسا شخص ہے کہ جس پر حج فرض تھا مگر اس نے نہیں کیا، تب تو اس کے لئے حجِ بدل کرنا مکروہِ تحریمی ہے، اور حج کروانے والے کے لئے مکروہِ تنزیہی ہے۔ (شامی ج:۲ ص:۲۳۱)[۱] اور اگر حجِ بدل کرنے والے پر حج فرض نہیں ہے تو دونوں کے لئے مکروہِ تنزیہی یعنی خلافِ اَولیٰ ہے۔ بہرحال! افضل یہی ہے کہ حجِ بدل اس شخص سے کرایا جائے جس نے اپنا حج کرلیا ہو، جیسا کہ عالمگیریہ میں ہے: والأفضل للانسان اذا أراد أن یحج رجلا عن نفسہٖ أن یحجّ رجلًا قد حجّ عن نفسہٖ ومع ھذا لو أحجّ رجلًا لم یحجّ عن نفسہٖ حجّۃ الاسلام یجوز عندنا. (عالمگیریہ ج:۱ ص:۲۷۴)[۲] اور فتاویٰ قاضی خان میں ہے: قالوا وینبغی أن یکون الحاجّ رجلًا حجّ مرّۃً. (فتاویٰ خانیہ ج:۱ ص:۲۶۰)۔[۳]

اور تنقیح حامدیہ میں ہے: یجوز لمن لم یکن حجّ عن نفسہٖ أن یحجّ عن غیرہٖ لٰکنّہ خلاف الأفضل. (العقود الدّرّیۃ ج:۱ ص:۱۳)۔[۴]

الغرض! ان اور ان جیسی دُوسری نصوص سے یہ بات تو پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ حجِ صرورہ عن الغیر خلافِ اَولیٰ ہے، لیکن ادا ہوجاتا ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اگر کوئی صرورہ حجِ بدل کرے تو اس پر اپنا حج فرض ہوجاتا ہے یا نہیں؟ سو اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف نظر آتا ہے، حتیٰ کہ کئی علماء نے اس پر مستقل رسالے لکھے ہیں، جن میں سے سیّد عبدالغنی نابلسی اور سیّد احمد بادشاہ رحمہما اللہ کے رسالوں کا ذکر علامہ شامی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ (العقود الدریۃ ج:۱ ص:۱۳،[۵] وشامی ج:۲ ص:۲۳۲)۔[۶]

اور یہ اختلاف بھی متقدمین میں نہیں ہے، بلکہ مشائخِ متأخرینؒ میں ہے، جیسے کہ علامہ حامد آفندی عمادیؒ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے: وھل یجب علیہ ان یمکث بمکّۃ حتّٰی یحجّ عن نفسہٖ لم أرہٗ الّا فی فتاویٰ أبی السّعودؒ. (تنقیح الحامدیۃ ج:۱ ص:۱۳)۔[۷]

---

(۱) ردّ المحتار ج:۲ ص:۲۰۳ (طبع سعید).
(۲) ج:۱ ص:۲۵۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).
(۳) الفتاویٰ الخانیۃ علی ھامش الھندیۃ ج:۱ ص:۳۰۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).
(۴) کتاب الحج ج:۱ ص:۱۳ (طبع دار المعرفۃ، بیروت).
(۵) کتاب الحج ج:۱ ص:۱۳ (طبع دار المعرفۃ، بیروت).
(۶) ج:۲ ص:۲۰۴ (طبع سعید).
(۷) ج:۱ ص:۱۳.

تنقیح خلاف

مجمع الأنهر کے مصنف تحریر فرماتے ہیں: ویجوز احجاج الضرورة ..... ولکن یجب علیہ عند رؤیة الکعبة الحجُّ لنفسہٖ وعلیہ أن یتوقف الٰی عامٍ قابلٍ ویحجّ لنفسہٖ أو أن یحجّ بعد عودہ أھلہٖ بمالہٖ وان فقیرًا فلیحفظ والنّاس عنھا غافلون. (مجمع الأنھر ج:۱ ص:۳۰۸)[۱]۔

ملّا علی قاریؒ نے بھی شرح منسک کبیر میں اس کی تائید فرماتے ہوئے لکھا ہے: انہ بوصولہٖ لمکّة وجب علیہ الحجّ. (بحوالہ العقود الدریة ج:۱ ص:۱۳)[۲] سیّد احمد بادشاہ رحمہ اللہ نے بھی ایک مستقل رسالہ لکھ کر اس کی تائید کی ہے، جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے، (بحوالۂ مذکورہ)[۳]۔

علامہ ابن حمزہ نقیبؒ نے بھی نھج النجاة میں اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ (شامی ج:۲ ص:۲۳۲)[۴] علامہ ابوالسعودؒ[۵] اور صاحب سکبُ الأنہر نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ (ردّ المحتار ج:۲ ص:۲۳۲)[۶]۔

اس کے برخلاف مندرجہ ذیل علماء وفقہاء رحمہم اللہ نے عدمِ وجوب کا قول اختیار کیا ہے:-

۱:- علامہ سیّد عبدالغنی نابلسی رحمہ اللہ نے اس مسئلے پر مستقل رسالہ لکھ کر ثابت کیا ہے کہ حج واجب نہ ہوگا، (العقود الدریة ج:۱ ص:۱۳[۷] وشامی ج:۲ ص:۲۳۲)[۸]۔

۲:- علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ نے ردّ المحتار میں اسی قول کو دلالۃً اختیار کیا ہے، (ملاحظہ ہو شامی ج:۲ ص:۲۳۲)[۹]۔

واجب کہنے والوں کے دلائل

جہاں تک احقر نے جستجو کی ہے، واجب کہنے والوں کے دلائل مجموعی اعتبار سے یہ نظر آئے:-

۱:- حج بدل کرنے والا ایک مرتبہ کعبۂ مشرفہ تک پہنچنے پر قادر ہو چکا، لہٰذا "مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا"[۱۰] میں داخل ہونے کے سبب اس پر آئندہ سال حج فرض ہو جائے گا۔

۲:- جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے،[۱۱] علامہ ابنِ حمزہ نقیبؒ نے نہج النجاة میں یہ

---

(۱) ج:۱ ص:۴۵۶ (طبع دار الکتب العلمیة، بیروت). (۲) ج:۱ ص:۱۴ (طبع دار المعرفة، بیروت).
(۳) ردّ المحتار ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید).
(۴) ردّ المحتار ج:۲ ص:۶۰۳ و ۶۰۴ (ایضًا)
(۵) یہ فتویٰ علامہ حامد آفندیؒ نے اپنے فتاویٰ میں بجنسہٖ نقل کیا ہے، لیکن غالبًا وہ ترکی زبان میں ہے، اس لئے سمجھ میں نہیں آسکا۔
(حاشیہ از حضرتِ والا دامت برکاتہم)
(۶) ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید).
(۷) کتاب الحج ج:۲ ص:۱۳ (طبع دار المعرفة، بیروت).
(۸) ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید).
(۹) ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید).
(۱۰) سورة اٰل عمران:۹۷.
(۱۱) ردّ المحتار ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید).

دلیل پیش کی ہے کہ بدائع الصنائع میں ہے کہ: **یکرہ احجاج الصرورۃ لأنّہٗ تارک فرض الحجّ**[1]۔ اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ وہ شخص دُخولِ مکہ سے حج عن نفسہٖ پر قادر ہوچکا ہے، اگرچہ اس وقت دُوسرے کا حج کرنے میں مشغول ہے۔

۳:- علامہ شامی رحمہ اللہ نے لباب سے نقل کیا ہے: **الفقیر الأفاقیّ اذا وصل الٰی میقات فھو کالمکّی قال شارحہٗ أی حیث لا یشترط فی حقہ الّا الزّاد والرّاحلۃ ان لم یکن عاجزًا عن المشی. (ردّ المحتار ج:۲ ص:۱۹۵)**[2]۔

ایک آفاقی فقیر اگر میقات تک پہنچ جائے تو اس کے اَحکام مکی جیسے ہوتے ہیں، اس لئے صرورہ فقیر کا حکم بھی یہی ہوگا۔

قائلینِ وجوب کے جوابات

لیکن یہ تمام دلائل حیزِ قبول میں نہیں ہیں، بلکہ ان کے خلاف دُوسرے دلائل قویّہ موجود ہیں۔

چنانچہ پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ استطاعت معتبر نہیں ہے، کیونکہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی امیر شخص کسی غریب کو اداءِ زکوٰۃ کے لئے وکیل بنائے، اور وہ وکیل زکوٰۃ ادا کرے تو کوئی بھی اس کو یہ نہیں کہتا کہ یہ قادر ہوگیا، لہٰذا اس پر اپنی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، بعینہٖ اسی طرح ایک صرورہ فقیر اگر حج بدل کے لئے مکہ پہنچ گیا تو اگر وہ آمر بالحج کے بجائے اپنا حج کرنا شروع کردے تو یہ تصرّف فی مال الغیر بغیر اذنہٖ ہے، اور اگر اپنا حج بھی کرے اور اس کا بھی تو یہ تداخل لازم آنے کے سبب محال ہے، اور اگر ایک سال تک وہیں ٹھہرا رہے تو حرجِ عظیم ہے، کیونکہ وہ فقیر ہے، اور عادۃً سفر میں انسان ایک سال تک کے مصارف ساتھ نہیں رکھتا، اور پھر اس کے اہل و عیال وغیرہ وطن میں بے سہارا رہیں گے، خصوصیت سے اس زمانے میں کہ ایک ملک کی حکومت کسی غیرملکی کو اپنے ملک میں زیادہ عرصہ قیام کی اجازت نہیں دیتی، اور اگر اس وقت لوٹ آئے اور اگلے سال پھر جائے تو یہ دو حال سے خالی نہیں، ایک یہ کہ اس عرصہ میں وہ غنی ہوجائے، سو اس صورت میں ہم بھی وجوبِ حج کے قائل ہیں، نہ اس وجہ سے کہ وہ پہلے حج کو جاچکا ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ غنی ہوگیا۔ دُوسرے یہ کہ اگر وہ غنی نہ ہو تو حج بغیر غنیٰ کیسے کرسکتا ہے؟

غرض یہ آیت وجوبِ حج پر دلیل بنا کر پیش کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا، بلکہ یہ تو عدمِ وجوب پر دال ہے جیسا کہ ہم ان شاء اللہ عنقریب بیان کریں گے۔

---

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید) (۲) ج:۲ ص:۴۶۰ (ایضاً)۔

رہی دُوسری دلیل سو دراصل وہ صرورہ غنی کے بارے میں ہے، جیسے کہ ابنِ ہمامؒ کا صنیع اس پر دال ہے کہ انہوں نے صاحبِ بدائع کا یہ جملہ نقل کرنے کے بعد حج صرورہ کی صحت پر استدلالات پیش کئے اور پھر لکھا ہے کہ: والذی یقتضیه النّظر أنّ حجّ الصّرورة عن غیرہ ان کان بعد تحقیق الوجوب علیه بملک الزّاد والرّاحلة والصحة فهو مکروہ کراهة تحریم لأنّهٗ یتضیق علیه .... الخ. (فتح القدیر ج:۲ ص:۳۲۱)۔[1] علامہ شامیؒ نے بھی اس عبارت کو صرورہ غنی پر محمول قرار دیا ہے، (ملاحظہ ہو ردّ المحتار ج:۲ ص:۳۳۱،۳۳۲)۔[2]

باقی رہی تیسری دلیل تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ صرورہ فقیر قادر بقدرة غیرہ ہے، اور قدرت بقدرة غیرہ معتبر نہیں، کما قرّرنا۔ بخلاف آفاقی فقیر کے کہ وہ قادر بقدرة نفسه ہے، اس لئے ایک کو دُوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ شامیؒ نے جہاں آفاقی فقیر کا مسئلہ بیان فرمایا ہے، وہاں تو اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ: ان المأمور بالحج اذا وصل الی مکة لزمهٗ ان یمکث لیحجّ حجّ الفرض عن نفسه لکونه صار قادرًا علٰی ما فیه. (شامی ج:۲ ص:۱۹۵)۔[3] لیکن باب الحج عن الغیر کے اندر اس دلیل کو ردّ کیا ہے، (شامی ج:۲ ص:۳۳۲)۔[4]

عدمِ وجوب پر دلائل

۱:- وہ آیت جو قائلینِ وجوب کے استدلال میں تحریر کی گئی تھی، دراصل عدمِ وجوب پر دال ہے، کیونکہ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حج لوگوں پر اس وقت فرض ہوتا ہے جبکہ قطعِ سبیل کی استطاعت ہو، اور صرورہ فقیر اس میں داخل نہیں ہوتا، جیسے کہ ہم نے اُوپر عرض کیا کہ اگر وہ وہاں رہتا ہے تو تکلیف ہے، اور اگر واپس آتا ہے تو اس کی سابقہ اور موجودہ کیفیت میں کوئی فرق نہیں، اگر وہ فقیر ہی ہے تو "مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا"[5] میں داخل نہیں، لہٰذا آئندہ سال بھی اس پر حج فرض نہ ہونا چاہئے۔ اور اگر شبہ کیا جائے کہ وہ قرض لے کر جاسکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں بھی قدرت بقدرة غیرہ ہوگی، جو معتبر نہیں۔

۲:- "لَا یُکَلِّفُ اللهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا"[6] مجمع الأنهر وغیرہ میں صرورہ فقیر کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ یا مکہ میں ٹھہر کر آئندہ سال کا انتظار کرے یا وطن واپس جاکر دوبارہ آئے، تو اس

---

(۱) ج:۳ ص:۹۷ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۲) ردّ المحتار ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید)
(۳) ج:۲ ص:۴۶۰ (طبع سعید)
(۴) ج:۲ ص:۶۰۴ (ایضاً)
(۵) سورة اٰل عمران:۹۷
(۶) سورة البقرة: ۲۸۶

کا حاصل یہ ہے کہ وہ اگر دونوں میں سے کسی ایک شق کو اختیار کرلے تو جائز ہے، اب اگر وہ قصداً یا خطأً وہاں سے چلا آئے اور ہم اس پر حج فرض ہونے کا حکم لگادیں تو یہ تکلیف ما لا یطاق ہے، کیونکہ صرورہ اس کی وسعت نہیں رکھتا، اور وہ مذکورۃ الصدر آیت کی رُو سے صحیح نہیں۔

اس آیت میں "اِلَّا وُسْعَهَا" کے الفاظ بطورِ خاص قابلِ غور ہیں، کیونکہ یہاں وسعت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، امکان کا نہیں، اس لئے وہ شبہ بھی اس دلیل سے دُور ہوگیا جو پہلی دلیل میں ہوسکتا تھا کہ وہ قرض لے کر جاسکتا ہے۔

۳:- اور اگر علیٰ سبیل التنزل یہ مان لیا جائے کہ امکان یا وسعت ہے، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مشقت اور حرجِ عظیم ہے، جو: "اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ"[1] وغیرہ کے خلاف ہونے کے سبب اَحکامِ شرعیہ میں تخفیف کا باعث بنتا ہے۔

اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ حرج اور مشقت ہر جگہ معتبر نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ ابنِ نجیمؒ نے لکھا ہے: المشقة والحرج انّما یعتبر فی موضع لا نصّ فیه. (الأشباه والنظائر ج:۱ ص:۱۱۷)۔[2]

مسئلۂ زیرِ بحث میں بھی کوئی نص موجود نہیں، حتیٰ کہ ائمہ حنفیہ بلکہ مشائخ تک سے کوئی قول منقول نہیں ہے، جیسا کہ علامہ حامد آفندیؒ نے اپنے فتاویٰ میں اس کی تصریح فرمائی ہے: لم اره الّا فی فتاویٰ أبی السّعود. (عقود دریہ ج:۱ ص:۱۳)۔[3] اس لئے یہاں پر باعثِ تخفیف بننے میں کوئی مانع نظر نہیں آتا۔

خلاصہ

غرض پوری بحث سے خلاصہ کے طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حجِ صرورہ ادا ہوجاتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے کسی فقیر پر حج واجب نہیں ہوتا۔ هٰذا ما ظهر لی بعد بحثٍ وتفتیش ونظر وتفحص كثیر، والعلم الصحیح عند الله اللطیف الخبیر، اذ هو أعلم بما هو صواب والیه مصیرنا والمآب. وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العٰلمین وسلّم علی المرسلین والعاقبة للمتقین.

الجواب صحیح	احقر العباد محمد تقی العثمانی
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ	عفر الله لهٗ وهداهُ الی الصواب
	۱۳۷۹/۱۱/۲۷ھ[4]

---

(۱) فی صحیح البخاری، باب الدین یسرٌ الخ ج ۱ ص:۱۰ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أبی هریرةؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: انّ الدین یُسْرٌ ولن یشآدّ الدین أحد الّا غلبهٗ فسدّدوا وقاربوا وابشروا واستعینوا بالغدوة والرّوحة وشیء من الدّلجة.

(۲) ص:۴۲ (طبع سعید). (۳) ج:۱ ص:۱۳ (طبع دار المعرفة، بیروت).

(۴) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کے درجۂ تخصص (تمرینِ افتاء) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

۱:- بیماری کی وجہ سے کسی دُوسرے کو حجِ بدل پر بھیجنے کا حکم
۲:- جس شخص نے اپنا حج نہ کیا ہوا سے حجِ بدل پر نہیں بھیجنا چاہئے

سوال ۱:- پچھلے ماہ سے عرق النساء کی تکلیف میں مبتلا ہوں، تکالیف برداشت سے باہر ہیں، زیادہ چل پھر نہیں سکتا ہوں، اس حالت میں اپنی اہلیہ کو حجِ بدل میں بھیج سکتا ہوں یا نہیں؟ جبکہ ان کا کوئی محرم نہیں؟ ۲:- دونوں کا حج اُوپر کی شکل میں ہوگا یا نہیں؟ یا میرا حج ہوگا اور اہلیہ کو صرف ثواب ملے گا؟

جواب ۱:- اگر آپ اتنے بیمار ہیں کہ حج خود ادا نہیں کر سکتے تو کسی کو حجِ بدل پر بھیج سکتے ہیں،[۱] لیکن کسی ایسے شخص کے ذریعے حجِ بدل کروائیں جو خود اپنا حج کر چکا ہو۔[۲] جس شخص نے اپنا حج نہ کیا ہو، اسے حجِ بدل پر بھیجنا مکروہ ہے، البتہ اگر بھیج دیا تو حج ادا ہو جائے گا۔[۳]

۲:- آپ کی اہلیہ نے اگر اپنا حج نہیں کیا تو ان سے اپنا حجِ بدل نہ کرائیں، ہاں اگر وہ اپنا حج کر چکی ہیں تو انہیں محرم کے ساتھ حجِ بدل پر بھیج سکتے ہیں۔[۴]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۱۰/۲۷ھ)

والدہ مرحومہ کے لئے نفلی حج کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص اپنا حج پہلے کر چکا ہو تو دُوسرے حج کے موقع پر اپنی والدہ مرحومہ کے لئے حج کر سکتا ہے؟

جواب:- جی ہاں کر سکتا ہے۔[۵]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۹/۲۱ھ

۱:- حجِ بدل میں تمتع کا اِحرام باندھنے کا حکم
۲:- کیا حجِ بدل کرنے سے حج فرض ہو جاتا ہے؟

سوال ۱:- زید نے حجِ بدل میں تمتع کا اِحرام باندھا تھا، اور سنا ہے کہ حجِ بدل میں افراد کا اِحرام میقات سے باندھنا چاہئے۔

---

(۱) وفی الشامیة ج:۲ ص:۵۹۸ (طبع سعید) حج الفرض تقبل النّیابة عند العجز فقط لکن بشرط دوام العجز الی الموت .. الخ

(۲، ۳، ۴) ان مسائل کی مکمل تفصیل اور دلائل کے لئے پچھلا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

(۵) وفی الغنیة ص.۱۷۲ تبرع الولد بالاحجاج أو الحج بنفسه عن أحد أبویه اذا مات وعلیه حج الفرض ولم یوص به مندوب الیه جدا وفی التاتارخانیة ج:۲ ص:۲۶۴ من مات وعلیه فرض الحج ولم یوص به لم یلزم الوارث أن یحج عنه وان أحب یحج عنه حج، وأرجو أن یجزیه ان شاء الله تعالی ... الخ (محمد زبیر حق نواز)

۲:- اور کیا حجِ بدل کرنے پر حج فرض ہوجاتا ہے، جبکہ پہلے اس پر فرض نہیں تھا؟ حج بدل کے لئے کیا شرائط ہیں؟ صورتِ مذکورہ میں اِحرام تمتع سے کوئی خرابی آتی ہو تو اس کا کوئی تدارک ہوسکتا ہے؟

جواب ا:- حجِ بدل میں تمتع کا اِحرام باندھنا اگر بھیجنے والے (آمر) کی مرضی اور اجازت سے ہو تو جائز ہے، لیکن اس صورت میں قربانی کی رقم خود حج کرنے والے کے ذمہ ہے، بھیجنے والے پر اس کا دینا ضروری نہیں۔ اگر بھیجنے والے نے تمتع کی اجازت نہیں دی تھی اور حاجی نے تمتع کرلیا تو یہ بھیجنے والے کے حکم کی مخالفت سمجھی جائے گی، اور اس کا حج ادا نہ ہوگا، اور جانے والے کے ذمہ ہوگا کہ خرچہ واپس کردے اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ بھیجنے والے کو چاہئے کہ وہ ہر طرح کے اِحرام کی مأمور کو اجازت دیدے۔ ودم القِران و التمتع و الجناية على الحاج ان أذن له الأمر بالقِران و التمتع و إلا فيصير مخالفاً فيضمن. (درمختار مع الشامی ج:۲ ص:۳۳۹)[1] فلو أمره بالافراد أو العمرة فقرن أو تمتع ولو للميّت لم يقع حجه عن الأمر ويضمن النفقة. (حاشیۃ البحر ج:۳ ص:۶۸)[2]۔

۲:- جس شخص نے اپنا حج نہ کیا ہو، اسے حجِ بدل پر نہ بھیجنا چاہئے، لیکن اگر بھیج دیا تو بھیجنے والے کی طرف سے حج ہوجائے گا، اور اگر جانے والے کے ذمہ پہلے سے حج فرض نہیں تھا تو تحقیق یہی ہے کہ صرف حجِ بدل کرلینے سے حج فرض نہیں ہوگا، تاوقتیکہ خود اس کو استطاعت پیدا نہ ہو۔ (دیکھئے العقود الدرية ج:۱ ص:۱۳[3] وشامی ج:۲ ص:۲۳۲[4])۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۵/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

کیا ضعیف شخص کسی دُوسرے کو اپنی جگہ حج کے لئے بھیج سکتا ہے؟

سوال:- کیا ضعیف آدمی اپنے بجائے کسی اور کو حج کے لئے بھیج سکتا ہے؟

جواب:- اگر ضعیف آدمی خود حج کرنے پر قادر نہیں تو وہ کسی ایسے شخص کو اپنی طرف سے حج کرنے کے لئے بھیج سکتا ہے جس نے اپنا حج کرلیا ہو۔[5]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۱/۲۷ و)

---

(۱) ج:۲ ص:۶۱۱ (طبع سعید).

(۲) ج:۳ ص:۶۳ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) نیز اس مسئلہ کی مزید تفصیل وتحقیق کے لئے امداد الاحکام ج:۲ ص:۱۸۲ تا ۱۸۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) كتاب الحج ج:۲ ص:۱۴ (طبع دار المعرفة، بيروت)۔ (۴) ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید).

(۵) في الدر المختار ج:۲ ص:۵۹۸ (طبع سعيد) حجّ الفرض تقبل النّيابة عند العجز فقط .... الخ.

وفي الهندية ج:۱ ص:۲۵۷ (طبع رشيديه كوئته) والأفضل للانسان اذا أراد أن يحجّ رجلاً عن نفسه أن يحجّ رجلاً قد حجّ عن نفسه.

﴿فصل فی المسائل المتفرقة المتعلّقة بالحجّ﴾
(حج سے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

اگر ایامِ حج میں عورت کو حیض آجائے تو وہ کیا کرے؟

سوال:- اگر کوئی عورت حج کرنے چلی جائے اور ایامِ حج میں حیض آنا شروع ہوجائے تو وہ کیا کرے؟

جواب:- طواف کے ماسوا حج کے تمام کام حالتِ حیض میں کرسکتی ہے، طوافِ زیارت پاک ہونے کے بعد کرے۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۵/۲۵ھ

مسجدِ نبوی میں چالیس نمازیں نہ پڑھنے سے حج میں کوئی فرق نہ ہوگا

سوال:- زید سعودی عرب میں ملازم ہے، اُسے حج کرنے کا موقع مل جاتا ہے، لیکن حج ادا کرنے کے بعد فوراً یا کچھ عرصے کے بعد واپس وطن آنا ہے، جس کی وجہ سے مدینہ منورہ میں چالیس وقت کی نمازیں ادا نہیں کرسکتا، کیا اسے اگر چھوڑ دیا جائے تو حج ادا ہوجائے گا؟

جواب:- کوشش تو حتی الامکان یہی کریں کہ چالیس نمازیں کم از کم ہوجائیں، کیونکہ یہ سعادتِ عظمیٰ[2] بار بار نہیں ملتی، لیکن اگر کسی مجبوری کی بنا پر جلد واپس آنا ہو تب بھی حج میں کوئی کراہت وغیرہ پیدا نہیں ہوتی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۹/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۷۴/۲۹ ب)

---

(۱) وفی الهداية ج:۱ ص:۲۶۵ (طبع شركت علميه ملتان) (باب التمتع ....) واذا حاضت المرأة عند الاحرام اغتسلت واحرمت وصنعت كما يصنعه الحاج غير أنها لا تطوف بالبيت حتى تطهر لحديث عائشة. وكذا في فتاوى دار العلوم ديوبند ج:۲ ص:۵۴۶.

(۲) وفي الترغيب والترهيب ج:۲ ص:۱۳۹ (طبع دار الكتب العلمية، بيروت) عن انس بن مالكؓ عن النبى صلى الله عليه وسلم قال. من صلّى في مسجدى أربعين صلوة لا تفوته صلوة كتبت له براءة من النّار وبراءة من العذاب وبرئ من النفاق وكذا في مسند احمد ج:۳ ص:۱۵۵ رقم الحديث. ۱۲۶۰۵ (طبع مؤسسة قرطبة، مصر).

جس کو حج کے لئے رقم دی ہو، اگر اس کا نام قرعہ میں نہ نکلے تو اس رقم کا کیا حکم ہے؟

سوال:- کسی شخص نے کسی کو رقم دی کہ حج کرو۔ دینے والا شخص حاجی ہے، اس نے کئی سال تک متواتر کوشش کی، مگر اس کا نام حج کی فہرست میں نہ آسکا، پھر زرِ مبادلہ زیادہ ہوگیا، ایسی صورت میں اب یہ رقم کس کی ہے؟

جواب:- اگر یہ رقم دینے والے نے اپنی طرف سے یا کسی اور کی طرف سے حجِ بدل کے لئے دی تھی تو یہ واپس کرنا واجب ہے، اور اگر بطورِ امداد دی تھی اور ہبہ کردیا تھا، تو واپس واجب نہیں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ

کتاب النکاح
(نکاح کے مسائل)

﴿فصل فی وعدِ النکاح﴾
(منگنی کے مسائل کا بیان)

منگنی کی شرعی حیثیت اور منگنی کے بعد لڑکی کا نکاح سے انکار کرنا

سوال:- ایک مسلمان عورت یا مرد تین دفعہ قرآن شریف کو ہاتھوں میں لے کر اللہ اور رسول کو گواہ بنا کر عہد کرے کہ زندگی میں اگر شادی کروں گی یا کروں گا تو تم سے، ورنہ نہیں، اگر دُوسرے مرد سے شادی کروں تو قرآن میرے خلاف گواہی دے گا، اس عورت نے یا مرد نے تین دفعہ ہاتھ میں ہاتھ لے کر عہد کیا۔ آج سے دو سال پہلے میں نابالغ تھی، میرے والدین سے یٰسین نے ان کی جھولی میں قرآن مجید رکھ کر اپنے لئے رشتہ مانگا، اور صاف کہہ دیا کہ میری دُوسری بیوی زندہ ہے، مگر اس سے سلوک اچھا نہیں ہے، میرا اس سے قطع تعلق کرنے کا ارادہ ہے۔ بعد میں وہ عید کے موقع پر ہمارے لئے اور تقریباً سب گھر والوں کے لئے کپڑے اور میرے لئے منگنی کی انگوٹھی لے کر آیا، میری والدہ نے والد سے کہا کہ: یہ چیزیں قبول کرنا ہو تو سوچ سمجھ کر قبول کرو، کیونکہ یہ شخص غرض مند ہے۔ میری موجودگی میں میرے والد نے کہا: کوئی بات نہیں ہے، اللہ مالک ہے۔ میں نابالغ ضرور تھی مگر مجھے تمام باتوں کی سمجھ تھی، چار پانچ روز کے بعد میری والدہ نے میرے بڑے بھائی کو کہا کہ: یہ سامان یٰسین لے کر آیا ہے، تیرے والد نے قبول کرلیا ہے، میرے بھائی نے کہا: اماں! یہ سامان تیرے مشورے سے آیا ہے، کیونکہ یہ تو منگنی کا سامان ہے۔ اور ماں کی شان میں بہت گستاخی کی اور کہا کہ: اماں! تم بے غیرت ہو۔ اگلے روز یٰسین کو پتہ لگا، اس نے میری والدہ سے حقیقت معلوم کی، میری والدہ نے رو کر کہا کہ: میرے لڑکے نے آج مجھے بے غیرت کہہ کر بالکل ننگا کر دیا ہے۔ یہ بات سن کر یٰسین نے کہا کہ: جب میں نے ماں کہا ہے تو سگی ماں سے زیادہ آپ کی عزّت کروں گا۔ رات میں یٰسین نے میرے بھائی کی جھولی میں اپنی لڑکی ڈال دی (جس کی عمر نو سال ہے) کہ اس سے تم اپنے بھائی کی شادی کر لینا، بدلے کے طور پر دیتا ہوں اور اس رشتے کے بدلے تم سے میں کچھ نہیں مانگوں گا، تحریر لکھ کر دستخط کر کے دے دیئے، والد اور والدہ نے پھر مشورہ کیا کہ یٰسین کی لڑکی کو یونہی نہیں لیں گے، بلکہ اس کے بدلے میں

رشتہ دے دو، یٰسین کو بلا کر کہا گیا کہ: تم میری چھوٹی لڑکی اپنے لڑکے کے لئے لے لو، اس پر یٰسین نے کہا کہ: اگر رشتہ دینا ہے تو بڑی لڑکی کا میرے لئے دو، ورنہ میں اپنی لڑکی تو آپ کو دے چکا ہوں۔ تین چار دن کے صلاح مشورے کے بعد میرے والدین میرا رشتہ دینے پر رضامند ہوگئے اور میری والدہ نے میرے بڑے بھائی کو صاف لفظوں میں کہا کہ: سوچ لو اپنے لئے بڑی لڑکی کا رشتہ مانگ رہا ہے، کبھی کل مجھ پر الزام نہ دینا کہ ماں نے ہمیں دھوکا دیا، اور یہ طعنہ دینا کہ لڑکی سوکن پر دی ہے۔

عید پر میرے والدین منگنی کے کپڑے لے کر یٰسین کے گھر گئے جو کہ یٰسین نے قبول کر لئے، عید کے بعد یٰسین نے اپنی لڑکی کی منگنی کا اعلان میرے حقیقی ماموں، بڑے بھائی اور میری والدہ اور دیگر عزیزوں کے سامنے کر دیا، دُعائے خیر بھی کی گئی، بعد میں یٰسین کی حالت خراب ہوگئی، اس کے رشتہ دار طاقت ور ہیں، اس کی لڑکی کو بے اجازت اپنے گھر لے گئے، بعد میں یٰسین کی ساس فوت ہوگئی تو یٰسین اپنی لڑکی اور اپنے لڑکے کو بھی وہاں چھوڑ آیا، تین چار دفعہ لینے گیا تو انہوں نے کہا کہ: جب تک منگنی نہیں توڑو گے، بچے واپس نہیں ملیں گے۔ یٰسین نے کہا کہ: میں قرآن اُٹھا کر لڑکی دے چکا ہوں، میرا قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتا، میری زندگی میں میری لڑکی کا دُوسرا خاوند نہیں ہوسکتا۔ میرے گھر والوں نے یٰسین کا کچھ ساتھ دیا، لیکن یٰسین نے یہاں تک کہا کہ: لڑکا ساتھ بھیج دو میں وہیں جاکر شرعی نکاح پڑھوادوں گا، لیکن میرے باپ اور بھائی نے انکار کر دیا، سرگودھا سے مفتی سیّد احمد صاحب سے فتویٰ منگوایا، انہوں نے لکھ دیا کہ نابالغ لڑکی کا باپ جس جگہ اور جس وقت چاہے نکاح کر سکتا ہے، میرے بھائی اور باپ نے اس پر بھی ٹھکرا دیا، میں اب بالغ ہوں اور میں اپنی مرضی کی خودمختار ہوں، اس کے علاوہ میں نے خود تین دفعہ قرآن اُٹھا کر عہد کیا ہے اور عہد مجھے عزیز ہے، اور مجھے قرآن و ایمان عزیز ہے، کیا عہد پورا کرنا چاہئے یا نہیں؟ یہ بیان فرمادیں تاکہ سیدھے راستے پر چلنے میں کامیاب ہوجاؤں۔

جواب:- شرعاً منگنی کی حیثیت ایک وعدے کی ہے،[1] جس کا پورا کرنا واجب ہے، اور بغیر کسی عذر کے اس کی خلاف ورزی جائز نہیں، لہٰذا آپ اب بالغ ہونے کے بعد مختار ہیں کہ اگر یٰسین سے نکاح کرنے میں آپ کو کوئی خرابی محسوس ہوتی ہو تو انکار کر سکتی ہیں، لیکن اگر اس میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی تو اس کے ساتھ کئے وعدے کو پورا کرنا[2] اور اس کے ساتھ نکاح کر لینا چاہئے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۹۴۰/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۱۲ وان للوعد فوعد، وفی الشامیة ص:۱۱ لو قال هل أعطیتنیها فقال أعطیت ان کان المجلس للوعد فوعد وان کان للعقد فنکاح. نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۵ ص:۴۸ تا ۵۱۔

(۲) وفی صحیح البخاری کتاب الإیمان باب علامة المنافق ج:۱ ص:۱۰ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أبی هریرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: آیة المنافق ثلاث، اذا حدث کذب واذا وعد أخلف واذا اؤتمن خان.

منگنی کی شرعی حیثیت اور کیا منگنی توڑنا جائز ہے؟

سوال:- عرض یہ ہے کہ میرے والدین نے پانچ سال قبل میری منگنی اپنے بہت قریب ترین رشتہ داروں میں کی، اور تین سال سے میں ملک سے باہر سعودی عرب میں تھا، اور اب میں ملک واپس آیا ہوں، اور شادی بھی تیار ہے، لیکن میرے والدین اب عین وقت پر شادی کے حق میں نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر تم نے اس جگہ شادی کی تو، تو ہمارا بیٹا نہیں رہے گا، جبکہ میں نے منانے کی بہت کوشش کی، معززین نے بھی بہت سمجھایا ہے، لیکن وہ نہیں مانتے، آخر میں مجبور ہوگیا، اب شریعتِ مطہرہ کی طرف رُجوع کرتا ہوں، اس رشتہ ٹوٹنے پر دو بھائیوں سے قطع تعلق ہوجائے گا، یعنی میرے والدین اور سسرال میں، میرا خیال ہے کہ میں شادی کرلوں اور والدین کے حقوق بھی ادا کرتا رہوں، اور باقی بھائیوں کی زیادہ خدمت کی ہے اور کرتا رہوں گا، جبکہ والدین اس رشتے کے توڑنے پر زیادتی کر رہے ہیں، کوئی خاص شرعی وجہ بھی نہیں ہے کہ جس پر رشتہ چھوڑ دوں، اب آپ مجھے یہ بتایئے کہ میں کیا کروں؟

جواب:- منگنی نکاح کا وعدہ ہے،[1] اور جب تک کوئی معقول عذر پیش نہ آئے، اس وعدے کو پورا کرنا دیانۃً ضروری ہے،[2] البتہ اگر کوئی معقول عذر پیش آجائے تو منگنی توڑی بھی جاسکتی ہے، اب اگر آپ کے والدین کسی معقول عذر کی بناء پر منگنی ختم کرنا چاہتے ہیں، تو آپ اس پر ٹھنڈے دِل سے غور کریں، اگر والدین کی بات معقول معلوم ہو اور کوئی عذر سامنے آجائے، تو آپ ان کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے منگنی ختم کرسکتے ہیں، لیکن اگر والدین کسی معقول عذر کے بغیر منگنی ختم کرنے پر اصرار کر رہے ہیں، تو آپ کے لئے اس معاملے میں ان کی اطاعت واجب نہیں ہے، ان کو حتی الامکان راضی کرنے کی کوشش کرتے رہیں، اور نکاح کرلیں، لیکن یہ فیصلہ کرنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ عموماً والدین اپنی اولاد کی بھلائی ہی کی بات سوچتے ہیں، لہٰذا ان کی بات کو سرسری طور پر نظرانداز نہ کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۸/۴/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۶۹۵/۳۹ ج)

منگنی کے بعد انکار کرنے کا حکم

سوال:- زید نے اپنی دختر کے بارے میں ایک مجلس میں بکر سے کہا کہ میں اپنی بیٹی آپ کے

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۱۲ (طبع سعید) وان للوعد فوعد، وفی الشامیۃ ص:۱۱ لو قال هل أعطیتنیها فقال أعطیت ان کان المجلس للوعد فوعد وان کان للعقد فنکاح.

(۲) وفی صحیح البخاری کتاب الإیمان باب علامۃ المنافق ج:۱ ص:۱۰ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن أبی هریرۃ رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: ایۃ المنافق ثلاث، اذا حدث کذب واذا وعد أخلف واذا اؤتمن خان.

بیٹے کو دیتا ہوں، لیکن نکاح بعد میں ہوگا، صرف بات ہوئی تھی نکاح نہیں ہوا تھا، اب گھریلو اختلافات کی وجہ سے بکر انکار کر رہا ہے، کیا اب انکار کرنا اس کا دُرست ہے اور کیا نکاح ہوگیا تھا یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بکر کے لڑکے کا زید کی دختر سے نکاح منعقد نہیں ہوا تھا، صرف وعدۂ نکاح ہوا تھا،(۱) اب اگر زید نے اپنی لڑکی کی شادی بکر یا اس کے لڑکے کو اطلاع دیئے بغیر دُوسری جگہ کر دی تو اسے وعدہ کی خلاف ورزی کا گناہ ہوا،(۲) لیکن یہ نکاح دُرست ہوگیا۔ واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم

الجواب صحیح　　احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ　　۱۳۸۷/۱۰/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۹/ ۱۸ الف)

منگنی کے بعد انکار کرنے کا حکم

سوال:- دو فریق آپس میں رُوبرو امام، رُوبرو مجلس یہ فیصلہ کریں یا بیان دیں کہ میں نے فلاں نام کی لڑکی کا رشتہ فلاں نام کے لڑکے کو دے دیا ہے، مجلس میں پھر دُعا مانگی گئی اور مٹھائی تقسیم کر دی گئی، اس کے بعد کچھ ناراضگی کی وجہ سے لڑکی کا رشتہ دُوسری جگہ دے دیا، ایسا کرنے والوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:- نکاح کا رشتہ دے دینا، نکاح کا وعدہ ہے، اور وعدے کی خلاف ورزی بغیر شدید عذر کے ناجائز ہے، البتہ شدید عذر کی صورت میں گنجائش ہے۔(۳)　　واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۰/ ۲۸ الف)

معقول عذر کی بناء پر منگنی توڑی جاسکتی ہے

سوال:- ایک صاحب نے اپنے لڑکے کی منگنی کی، اور لڑکے کے والد نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر یہ عہد کیا کہ یہ لڑکی تمہاری ہے اور لڑکا میرا ہے، یہ منگنی کی رسم اس طرح ادا ہوئی تھی، اب کچھ عرصہ بعد دونوں فریقوں میں کشیدگی ہوگئی، اب لڑکی والا رشتہ دینے سے انکار کر رہا ہے، اب ہمارے اُوپر شریعت کی رُو سے کوئی کفارہ لازم تو نہیں ہوتا؟

---

(۱) وفی الدرّ المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۱۲ (طبع سعید) وان للوعد فوعد. وفی الشامیة ص:۱۱ لو قال هل أعطیتنیها فقال أعطیت ان کان المجلس للوعد فوعد وان کان للعقد فنکاح.

(۲،۳) دیکھئے امداد المفتین ص:۵۸۲ تا ۵۸۳، سوال نمبر ۴۴۶ تا ۴۴۸۔

جواب:- شرعاً منگنی کی حیثیت ایک وعدے کی ہے،[1] اور حتی الامکان وعدے کی پابندی ضروری ہے،[2] لیکن اگر کوئی معقول عذر پیش آجائے، مثلاً لڑکی اس لڑکے سے نکاح پر رضامند نہ ہو یا لڑکے کے اخلاق و عادات سے متعلق کچھ ایسی باتیں سامنے آئی ہوں جو پہلے معلوم نہ تھیں، تو منگنی کو توڑنا بھی جائز ہے، اور منگنی کے وقت اگر زبان سے کوئی قسم نہیں کھائی تھی تو اس پر کوئی کفارہ بھی واجب نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۸۶۸/۲۸ ج)

لڑکے کے طور طریق کا دُرست نہ ہونا، منگنی توڑنے کے لئے معقول عذر ہے

سوال:- علاقہ راجستھان میں سائل کے اجداد کے دور سے ایک قدیم رسم چلی آرہی ہے کہ ہم لوگ اپنے بچوں کی عالم شیرخوارگی وخوردسالی میں ہی منگنی اس طرح کردیتے ہیں کہ بچوں کو رسماً چینی چٹادی جاتی ہے، اس رسم کو ''چینی چٹائی رسم'' کہا جاتا ہے، اس طرح دو بچوں کی نسبت طے کردی جاتی ہے اور بلوغت پر ان کا عقدِ شرعی کردیا جاتا ہے۔

چنانچہ اسی کہنہ علاقائی رسم کے مطابق سائل نے کراچی میں اپنی شیرخوار دختر جمیلہ (جبکہ اس کی عمر ڈیڑھ سال تھی) کی بشیر پسر بھورے شاہ ساکن نزد بارودخانہ ولایت آباد نمبر۲ منگھوپیر روڈ کراچی سے (جبکہ اُس کی عمر پانچ سال تھی) منگنی طے کردی تھی، اور رسم چینی چٹائی عمل میں لائی گئی تھی۔ اب دونوں بالغ ہیں، لڑکے کے طور وطریق کو دیکھ کر سائل لڑکی کی منگنی کو ناقابلِ قیام اور رشتۂ مناکحت کے قابل نہیں سمجھتا ہے، اور شرعاً اُس سے عقد کرنا نہیں چاہتا ہے، کیا سائل اس نسبت کو منقطع کرنے کا حق دار ہے؟ یا کیا وہ دختر کو سائل کی مرضی کے خلاف اس سے عقد کرنے یا اُس کو زوجہ بنانے کا شرعاً مستحق ہے یا نہیں؟

جواب:- منگنی خواہ زبانی ہو یا عملی ہو (مثلاً صورتِ مسئولہ میں چینی چٹا کر) وہ نکاح نہیں بلکہ محض نکاح کا وعدہ ہے، جس سے کوئی عقد منعقد نہیں ہوتا،[3] البتہ وعدے کی خلاف ورزی بلاعذر ناجائز ہے،[4] اور کوئی عذرِ معقول ہو تو جائز ہے، اور لڑکے کے طور طریق کا دُرست نہ رہنا یا لڑکی کا اس رشتے پر راضی نہ ہونا عذرِ معقول ہے، اور اُس کی بنا پر اگر آپ منگنی ختم کردیں تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں، لڑکے والوں کو اس پر شرعاً اعتراض کا حق نہیں پہنچتا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵۹/۲۸ ب)

(۱ تا ۴) دیکھئے حوالہ سابقہ صفحہ نمبر ۲۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ تا ۳۔

خِطبہ کسے کہتے ہیں؟ اور منگنی یا سلامتی کے عنوان سے اجتماع کی شرعی حیثیت

سوال:- شریعتِ اسلامیہ میں منگنی (یا سلامتی) کا کیا حکم ہے؟ اس کی صورت یہ ہے کہ لڑکے والا کسی لڑکی والے کے ہاں بذاتِ خود یا کسی نمائندہ کے ذریعے نکاح کا پیغام دیتا ہے، اگر لڑکی والا اس پیغام کو قبول کر لیتا ہے تو لڑکے کے ماں باپ یا ذمہ دار حضرات لڑکی کے ماں باپ یا ذمہ دار حضرات سے اوّلاً نکاح کے سلسلے میں مہر کی مقدار اور نکاح کی تاریخ وغیرہ کی تعیین کرتے ہیں، گویا نکاح کی بات چیت پکی ہوگئی۔ اس کے بعد مزید تشہیر کے لئے نکاح کے دن سے قبل لڑکی والوں کے گھر پر منگنی (یا سلامتی) کے نام سے ایک دن مقرّر کر کے ایک مجلس قائم کرتے ہیں جس میں اپنی اپنی حیثیت کے موافق پچاس، سو یا ہزار دو ہزار آدمی دونوں طرف کے متعلقین اور رشتہ داروں کو دعوت دی جاتی ہے، مقرّرہ تاریخ میں یعنی سلامتی کے دن جب سب لوگ جمع ہوجاتے ہیں تو ایک شخص کھڑے ہوکر اعلان کرتا ہے کہ یہ فلاں اور فلانہ کی سلامتی ہے، فلاں کا لڑکا فلاں سے اور فلاں کی لڑکی فلانہ سے اتنے اتنے مہر پر سلامتی ہوگئی ہے، اور لڑکی کے لئے مہر متعینہ زیورات یا روپیہ وغیرہ لڑکی والوں کو برسرِ مجلس سپرد کردیا جاتا ہے، اور لڑکی والے ان اسباب کو اپنی تحویل میں لیتے ہیں، اور جو سامان لڑکی کے لئے دیا جاتا ہے زیورات وغیرہ برسرِ مجلس لڑکی والے اس تمام سامان کی باضابطہ جانچ پڑتال کرتے ہیں اور اہلِ شرکاء میں سے بعض حضرات کو دِکھایا جاتا ہے، اس کے بعد امام صاحب دُعا کرتے ہیں اور لڑکی والوں کی طرف سے تمام شرکائے مجلس کو حسبِ حیثیت ضیافت کرتے ہیں۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ نکاح کا پیغام قبول کرنے کے بعد اور جانبین کی رضامندی سے نکاح کے سلسلے میں مہر کی مقدار اور نکاح کی تاریخ وغیرہ متعین کرنے کے بعد اس طرح سلامتی کے نام سے لوگوں کو جمع کر کے مجلس قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ہمارے یہاں کے ایک مستند عالم جو دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جانبین کی رضامندی کے بعد اس طرح سلامتی کے نام سے مجلس قائم کرنا شرعاً جائز ہے، بلکہ موجب ثواب ہے۔ حدیث شریف میں جسے خِطبہ کہتے ہیں، وہ اسی کو کہتے ہیں۔ اس عالم صاحب کا کہنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ صورتِ مسئولہ میں جو دو صورتیں پیش کی گئی ہیں، پہلی صورت کو خِطبہ کہتے ہیں یا دُوسری صورت کو؟

جواب:- شرعاً خطبہ کا حاصل صرف اتنا ہے کہ مرد یا اس کے اقارب، عورت یا اس کے اقارب کو نکاح کا پیغام دیں، اس غرض کے لئے کوئی اجتماع یا تحائف کا تبادلہ خِطبہ کے لئے ہرگز

ضروری نہیں، لہٰذا منگنی یا سلامتی کے نام سے جس اجتماع کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے، اس کو سنت قرار دینا بالکل غلط ہے، بلکہ سنت سمجھ کر ایسا کرنا بدعت اور واجب الترک ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۴/۱۲/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۰۷۸/۳۵ ہ)

منگنی خُطبۂ نکاح کے قائم مقام نہیں ہوسکتی

سوال:- میری عمر ۷۲ سال کی ہوچکی ہے، اللہ نے تین فرزند اور بیٹیاں عطا کر رکھی ہیں، تین لڑکوں اور تین بیٹیوں کی شادیوں سے میرے مالک نے سبکدوش کردیا ہے، اب صرف ایک چھوٹی بچی کا فریضہ ادا کرنا میرے ذمہ باقی ہے، اس لڑکی کی عمر ۲۹ سال ہے، صوم وصلوٰۃ کی پابند ہے، اور اُمورِ خانہ داری میں معقول مہارت رکھتی ہے، والدہ کی وفات کے بعد خاموش رہتی ہے، اور اس کی خاموشی مجھے شاق گزرتی ہے۔

میری رفیقۂ حیات کا ڈیڑھ سال ہوا کہ وہ انتقال کرگئی اور مناسب رشتہ کی تلاش کرتی رہی اور یہ حسرت دِل میں لئے چلی گئی، بیٹی کی افسردگی نے مجھے مجبور کردیا ہے کہ اس کی شادی جلد کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوجاؤں، چنانچہ ۱۹۷۶ء میں ایک قریبی رشتہ دار کی وساطت سے اس بچی کی منگنی کردی گئی، جب لڑکے کو اُس کے رشتہ دار کے ذریعے پیغام شادی کا بھیجا تو اُس نے جواب دیا کم از کم دو سال تک انتظار کریں ورنہ بصورتِ دیگر آپ جہاں چاہیں اپنی لڑکی کی شادی کرسکتے ہیں۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ میں اُس لڑکے کی منّت سماجت کروں، کیا رسمِ منگنی کو خطبۂ نکاح کا مقام دیا جاسکتا ہے؟ اگر کوئی دُوسرا موزوں لڑکا مل جائے تو کیا ہم اُس سے نکاح کرسکتے ہیں منگنی رُکاوٹ تو نہیں بنے گی؟

جواب:- منگنی خُطبۂ نکاح کے قائم مقام نہیں ہوسکتی، اور نہ شرعاً اس سے نکاح منعقد ہوتا ہے، وہ تو محض نکاح کا ایک وعدہ ہے،[1] اور وعدے کی خلاف ورزی کسی عذر کے بغیر جائز نہیں،[2] ہاں! اگر کوئی عذر ہو مثلاً لڑکے میں کوئی عیب جو پہلے معلوم نہیں تھا اب معلوم ہوجائے، یا لڑکی اس رشتے کو

---

(۱) وفی الدّر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۱۲ (طبع سعید) وان للوعد فوعد. وفی الشامیة ص:۱۱ لو قال هل أعطيتنيها فقال أعطيت ان كان المجلس للوعد فوعد وان كان للعقد فنكاح.

(۲) وفی صحیح البخاری باب علامة المنافق ج:۱ ص:۱۰ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أبی هريرةؓ عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: اٰية المنافق ثلاث، اذا حدث كذب واذا وعد أخلف واذا اؤتمن خان (الحديث)

ناپسند کرے تو ایسی صورت میں منگنی توڑ دینا جائز ہے، لیکن اس کی اطلاع فریقِ ثانی کو کر دینی ضروری ہے۔[1]

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶۴۱/ ۲۸ ب)

منگنی کے عوض لڑکی والوں کا رقم وصول کرنا

سوال:- ایک شخص مسمّٰی سلمان ایک جگہ اپنے بیٹے مسمّٰی عبدالستار کی منگنی کر چکا تھا، اور لڑکی والوں کو حسبِ دستور دو ہزار ایک سو روپیہ بھی دے چکا تھا، لیکن اُس کے بعد مسمّٰی عبدالستار کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے فوراً مجمع میں اعلان کر کے شادی کرنے سے انکار کر دیا، پھر تقریباً دو ماہ بعد وہ لڑکی وفات پا چکی جس کے ساتھ شادی ہونے والی تھی، اب ہم جب لڑکی والوں سے اپنے دیئے ہوئے اکیس سو روپے کا مطالبہ کرتے ہیں، وہ یہ کہہ کر کہ ہماری بیٹی مرگئی ہے لہٰذا تمہارے پیسے بھی واپس نہیں دیں گے، رقم واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں، کیا یہ رقم ہمیں واپس مل سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- بعض مقامات پر لڑکی کی منگنی کے معاوضے میں جو رقم لڑکی والے وصول کرتے ہیں، وہ شرعاً رشوت کے حکم میں ہے، جس کا لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں، لہٰذا لڑکی کا انتقال ہوتا یا نہ ہوتا، ہر حالت میں لڑکی والوں پر واجب تھا کہ یہ رقم واپس کریں۔[2] ہاں! اگر یہ رقم مہر کا جزء بنا کر دی جائے تو یہ لڑکی کو دینی چاہئے تھی،[3] لیکن چونکہ نکاح منعقد ہونے سے پہلے ہی لڑکی کا انتقال ہوگیا اس لئے اب مہر کا بھی کوئی سوال نہیں رہا، لہٰذا لڑکی والوں پر بہرصورت واجب ہے کہ وہ رقم واپس کریں۔

والله سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۲۹/ ۲۷ و)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد المفتین ص.۵۸۲ تا ۵۸۴، سوال نمبر ۴۴۶ تا ۴۴۸۔

(۲) وفی الدّر المختار کتاب النکاح باب المهر ج ۳ ص:۱۵۶ (طبع سعید) أخذ اهل المرأة شيئًا عند التسليم فللزّوج أن يستردّه لأنّه رشوة .. . الخ. وفی الهندية ج:۱ ص:۳۲۷ (طبع ماجديه) ولو أخذ أهل امرأة شيئا عند التسليم فللزّوج أن يستردّه لأنّه رشوة .. الخ

(۳) وفی الدّر المختار ج.۳ ص.۱۵۱، ولو بعث الى امرأته شيئًا ولم يذكر جهة عند الدّفع غير جهة المهر .... فقالت هو أی المبعوث هدية وقال هو من المهر أو من الكسوة أو عارية فالقول له بيمينه

﴿فصل فی المحرّمات﴾

(کس سے نکاح جائز ہے اور کس سے حرام؟)

(قرابت و رضاعت کے رشتوں کا بیان)

رضاعی بھتیجی اور رضاعی بھانجی سے نکاح جائز نہیں

سوال:- ایک دودھ پیتا بچہ جو بھوک یا کسی اور وجہ سے رو رہا ہے اور اس کی ماں کسی اور کام میں مصروف ہے، اس دوران بچے کی دادی آجاتی ہے اور وہ بچے کو اپنا دودھ پلادیتی ہے، کیا اس کی وجہ سے بچے کی ماں اور باپ کے رشتے میں فرق آئے گا؟ اور بچہ کا باپ کیا اس کا رضاعی بھائی بن گیا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اس بچے کی دادی اس کی رضاعی ماں بھی بن گئی، لہٰذا فرق یہ پڑے گا کہ پہلے اس دادی کی پوتیاں یا نواسیاں اس بچے کی چچازاد یا پھوپھی زاد بہن ہوتیں اور ان سے نکاح جائز ہوتا، لیکن اب اس کی رضاعی بھتیجیاں اور بھانجیاں بن گئیں اور ان سے نکاح جائز نہیں رہا۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۸/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۹۷۷/۲۷/۲۷ و)

بیوی کا دودھ پینے سے بیوی حرام نہیں ہوتی

سوال:- زید نے اپنی بیوی کا دودھ غلطی سے پی لیا، یا جان بوجھ کر پی لیا، دونوں صورتوں میں یہ فعل حرام ہے یا مکروہ؟ اور اس سے نکاح تو نہیں ٹوٹتا؟

---

(۱) وفی سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب یحرم من الرضاعة ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع سعید) عن عائشة زوج النبی صلی الله علیه وسلم ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة.

وفی جامع الترمذی، باب ما جاء یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب ج:۱ ص:۲۱۷ (طبع سعید) عن علی قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الله حرم من الرضاع ما حرم من النسب وفی المشکوة، کتاب النکاح، باب المحرمات ص:۲۷۳ عن علی أنه قال: یا رسول الله! هل لک فی بنت عمک حمزة فانها أجمل فتاة فی قریش، فقال له: اما علمت ان حمزة أخی من الرضاعة، وان الله حرم من الرضاعة ما حرم من النسب، رواه مسلم

جواب:- اپنی بیوی کا دُودھ پینا جائز نہیں،[۱] لیکن کوئی شخص ایسا کرے تو اس سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔[۲]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۸/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۷۷۹/۲۷و)

رضاعی بہن سے نکاح جائز نہیں

سوال:- مسماۃ حلیمہ کا دُودھ محمد عمر اور محمد ہارون نے اکٹھے پیا، مسماۃ حلیمہ، محمد عمر کی پھوپھی ہے، اور محمد ہارون کی حقیقی ماں ہے، اس کے بعد مسماۃ حلیمہ کے ہاں ایک لڑکی رشیدہ پیدا ہوئی، کیا رشیدہ کا نکاح محمد عمر کے ساتھ ہوسکتا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مسماۃ رشیدہ، محمد عمر کی رضاعی بہن ہے، لہٰذا اس کے ساتھ اس کا نکاح نہیں ہوسکتا۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۴/۲۸ الف)

رضاعی بہن سے نکاح جائز نہیں

سوال:- زبیر احمد نے شیرخواری کے عالم میں اپنی پھوپھی کا دُودھ پیا تھا، یہ دُودھ صرف دو دن کے لئے پلایا گیا تھا، اب زبیر احمد جوان ہوگیا ہے، اور اس کی منگنی پھوپھی کی لڑکی (ہمشیرہ حمید) سے ہوگئی ہے، اب یہ شادی شرعاً جائز ہوگی یا نہیں؟ اس کے علاوہ حمید کی منگنی زبیر کی بہن سے ہوئی ہے، کیا حمید کی شادی زبیر کی بہن سے جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زبیر احمد ہمشیرۂ حمید کا رضاعی بھائی ہے، لہٰذا ہمشیرۂ حمید کا نکاح اس سے نہیں ہوسکتا،[۴] البتہ زبیر کی بہن نے اگر والدہ حمید کا دُودھ نہیں پیا تو اس کا نکاح حمید سے ہوسکتا ہے۔[۵]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۷/۲۸ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۱ (طبع سعید) ولم یبح الارضاع بعد مدته، لأنه جزء آدمی والانتفاع به لغیر ضرورة حرام علی الصحیح.

(۲) وفی الخانیة علی هامش الهندیة ج:۱ ص:۴۱۷ (طبع ماجدیه کتب خانه) اذا مص الرجل ثدی امرأته وشرب لبنها لم تحرم علیه امرأته لما قلنا انه لا رضاع بعد الفصال.

(۳، ۴) "حرمت علیکم أمهاتکم ... وأخواتکم من الرضاعة" (الأیة) سورة النساء:۲۳.

(۵) "واحل لکم ما وراء ذٰلکم" (الایة) سورة النساء:۲۵.

اغواء کنندہ کی پوتی سے، مغویہ کے لڑکے کا نکاح دُرست ہے

سوال:- ایک مرد، زید کی منکوحہ بیوی کو اغواء کر کے لے آیا، اور اپنے پاس دو ماہ تک رکھا، اس سے صحبت بھی کی، جس کا وہ زبانی بھی اقرار کرتا ہے، عورت بھی اقرار کر رہی ہے، اب عورت اپنے خاوند کے پاس ہے، اور وہاں جا کر لڑکا پیدا ہوا تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد، اب اسی اغواء کنندہ مرد کی پوتی سے مغویہ کے لڑکے کا نکاح ہوا ہے، کیا یہ شرعاً جائز ہوا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر حرمت کی کوئی اور شرعی وجہ نہ ہو، تو محض مذکورہ اغواء کی بناء پر نکاح میں کوئی رُکاوٹ نہیں ہے، اغواء کنندہ کی پوتی سے مغویہ کے لڑکے کا نکاح دُرست ہوگیا۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۵۹/۲۷ د)

مرضعہ کی کسی بیٹی سے دُودھ پینے والے کا نکاح نہیں ہوسکتا

سوال:- زید نے بنتِ عدی کا دُودھ پیا، بنتِ عدی کے بطن سے بہت سی بیٹیاں ہیں، کیا زید شرعاً بنتِ عدی کی بیٹیوں میں سے کسی بیٹی سے شادی کرسکتا ہے؟

جواب:- اگر زید نے ڈھائی سال سے کم عمر کے اندر بنتِ عدی کا دُودھ پیا ہے تو بنتِ عدی کی کسی بیٹی سے زید کا نکاح جائز نہیں، لقولہ علیہ السلام: یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۶/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۷ ۲۹ ب)

دُوسرے کی منکوحہ سے نکاح کا حکم

سوال:- زید نے ایک عورت اغواء کی، دُوسری کسی جگہ بکر سے دو ہزار روپے لے کر نکاح کردیا، عورت کے اغواء ہونے کا علم نہ بکر کو اور نہ ہی گاؤں کے معززین اور نکاح خواں و گواہان کو تھا، عورت کی فروختگی میں ہاشم اور سرور شریک تھے، جو بکر کے گاؤں کے تھے، انہوں نے جان پہچان کا ثبوت دیا کہ ہم زید کو جانتے ہیں، چنانچہ وہ لڑکی بکر کے گاؤں پہنچی، گاؤں کے معزّزین اور نکاح خواں کو

---

(۱) ویحل لأصول الزانی وفروعه، أصول المزنی بها وفروعها. (رد المحتار باب المحرمات ج:۳ ص:۳۲).

(۲) سنن ترمذی ج:۱ ص:۲۱۷ (طبع سعید) وکذا فی سنن أبی داوٗد، کتاب النکاح، باب یحرم من الرضاعة ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع سعید). وفی الهدیة کتاب الرضاع ج:۱ ص:۳۲۳ (طبع ماجدیه) یحرم علی الرضیع أبواه من الرضاع وأصولهما وفروعهما من النسب والرضاع جمیعًا .... الخ.

بکر اور اس کے گھر والوں نے نکاح کے لئے مدعو کیا، عورت سے بیان لیا گیا کہ کسی جبر کی وجہ سے تو نکاح نہیں کر رہی ہو؟ عورت نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے نکاح کی اجازت دی، زید عورت کو اپنے فوت شدہ بھائی کی بیوی بتاتا تھا، اور عورت نے بھی اس کو دیور تسلیم کیا، اس واقعے کے تیسرے روز اس کے شوہر منشی محمد نے بمعہ پولیس چھاپہ مار کر عورت کو برآمد کیا اور بتایا کہ یہ میری بیوی ہے جو بال بچے دار ہے۔ ۱:- اب فرمایئے کہ زید جس نے عورت کو اغواء کیا وہ وکیل تھا اس کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ ۲:- گواہوں کے لئے شرعی تعزیر کیا ہے؟ ۳:- نکاح خواں جبکہ غیر شادی شدہ ہے اس کے لئے کیا حکم ہے؟ ۴:- گواہان اور نمبردار جس نے بیانات لئے اور نکاح کی اجازت دی، ان کا کیا حکم ہے؟ ۵:- اور جنہوں نے اس فروختگی میں حصہ لیا اور انہیں علم بھی تھا، ان کے لئے کیا سزا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بکر سے اس مغویہ عورت کا جو نکاح کیا گیا، وہ شرعاً بالکل باطل ہے،[1] اور زید جس نے عورت کو اغواء کر کے بکر سے اس کا نکاح کیا وہ سخت گناہگار ہوا، اور جن جن لوگوں نے جان بوجھ کر اس نکاح میں حصہ لیا وہ بھی سخت گناہگار ہوئے، البتہ جن لوگوں نے بے خبری کی بنا پر نکاح میں شرکت کی وہ معذور ہیں،[2] اور مذکورہ گناہ کے لئے شریعت میں کوئی حد مقرر نہیں، قاضی اپنی صوابدید کے مطابق اس پر سزا جاری کر سکتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۳۸/۲۷ و)

کسی غیر کی بیوی سے نکاح کرنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے اپنی چھوٹی لڑکی دُوسرے آدمی کے چھوٹے لڑکے کے ساتھ نکاح کر کے دے دی، اب ایک تیسرے مولوی صاحب نے خفیہ طور پر اپنے لئے نکاح پڑھوایا، اور اب وہ لڑکا لڑکی تیرہ اٹھارہ سال کے ہیں، اور مولوی صاحب نے اس لڑکی کو اپنے گھر میں رکھا ہے، اور لڑکا اپنی منکوحہ کو طلاق نہیں دیتا، اب سوال یہ ہے کہ مولوی صاحب کا نکاحِ ثانی صحیح ہوا یا غلط؟ اور نکاحِ اوّل صغرسنی کی وجہ سے لیکن دونوں کے ولیوں نے کروایا، صحیح ہوا یا نہیں؟

جواب:- پہلا نکاح صحیح ہوا، اور ثانی نکاح مولوی صاحب کا بالکل کالعدم ہے،[3] اُسے چاہئے

---

(۱) وفی التفسیر المظهری ج:۲ ص:۶۴ تحت قوله تعالٰی: "والمحصنٰت من النساء" عطف علٰی أمهاتکم یعنی حرمت علیکم المحصنٰت من النساء أی ذوات الأزواج لا یحل للغیر نکاحهن ما لم یمت زوجها أو یطلقها وتنقضی عدتها من الوفاة أو الطلاق. وفی الدر المختار ج:۳ ص:۲۸ أسباب التحریم أنواع، قرابة، مصاهرة، رضاع .... وتعلق حق الغیر بنکاح. وفی الهندیة کتاب النکاح الباب الثالث القسم السادس المحرّمات الّتی یتعلّق بها حقّ الغیر ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع ماجدیه) لا یجوز للرجل أن یتزوج زوجة غیره وکذٰلک المعتدة.
(۲) دیکھئے: کفایت المفتی جواب نمبر۱۰ ج:۵ ص:۳۵ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت).
(۳) دیکھئے: حاشیہ نمبر۱۔

کہ لڑکی فوراً شوہر کے پاس پہنچادے، اور جو شخص جان بوجھ کر دُوسرے کی بیوی کو اپنے پاس رکھے وہ فاسق ہے، لہٰذا مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے جب تک علانیہ توبہ کا اعلان نہ کرے تب تک اس کو اِمام بنانا جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۳۱/۱۸ الف)

باپ کی منگیتر سے اس کے انتقال کے بعد خود نکاح کرنے کا حکم

سوال:- زید کی بیوی وفات پاگئی، اسی بیوی سے زید کا ایک لڑکا خالد ہے، زید نے دُوسری جگہ منگنی کی، ایجاب وقبول ہوچکا ہے، اب زید انتقال کرگیا، کیا زید کا لڑکا اس عورت سے نکاح کرسکتا ہے جس سے زید نے منگنی کی تھی؟

جواب:- اگر زید نے اس لڑکی سے صرف منگنی کی تھی باقاعدہ نکاح نہیں ہوا تھا، تو زید کے لڑکے کے لئے اس سے نکاح کرنا جائز ہے،[1] لیکن اگر نکاح ہوگیا تھا تو جائز نہیں،[2] خواہ رُخصتی نہ ہوئی ہو، اور نکاح کا مطلب یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں مرد وعورت میں سے کوئی، یا ان کا وکیل یہ کہے کہ: ''میں نے فلاں سے نکاح کیا، یا کرایا'' اور دُوسرا جواب میں کہے: ''میں نے قبول کیا''۔ اور منگنی صرف وعدۂ نکاح کو کہتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۹/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۳/۱۹ الف)

منکوحہ غیر مدخول بہا کی لڑکی سے شوہر کے نکاح کا حکم

سوال:- مسماۃ ہندہ کا شوہر وفات پاگیا اور اسی شوہر سے ایک لڑکی مسماۃ رابعہ ہے، ہندہ نے دُوسری جگہ شادی کی، مگر قبل دُخول کے ہندہ وفات پاگئی یا قبل دُخول کے شوہر نے ہندہ کو طلاق دے دی، آیا اسی شوہر کا نکاح مسماۃ رابعہ سے جو اس منکوحہ غیر مدخول بہا کی لڑکی ہے، دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں رابعہ کے ساتھ ہندہ کے شوہر کا نکاح دُرست ہے، کیونکہ ہندہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۱۲ وان للوعد فوعد. وفی الشامیة ص:۱۱ لو قال هل أعطیتنیها فقال أعطیت، ان کان المجلس للوعد فوعد، وان کان للعقد فنکاح.

(۲) "ولا تنکحوا ما نکح اٰباؤکم من النّساء" (الأیة) سورة النساء:۲۲. وفی الهندیة ج:۱ ص:۲۷۴ نساء الاٰباء والأجداد من جهة الأب أو الأم وان علوا فهٰؤلاء محرّمات علی التأبید نکاحًا ووطأ. وفی الدر المختار کتاب النکاح فصل فی المحرّمات: وتحرم موطؤات اٰبائه وأجداده وان علم ولو برنا والمعقودات لهم علیهن بعقد صحیح.

کے ساتھ اس کا دُخول نہیں ہوا، قرآنِ کریم میں ہے: ''وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ، فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ....''[1]۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۹/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۳/ ۱۹ الف)

منکوحہ غیر مطلقہ سے کسی غیر کے نکاح کا حکم

سوال:- میاں بیوی کے درمیان کسی جھگڑے کی وجہ سے لڑکی کے والدین نے لڑکی کو قوم کے اختیار میں دے دیا ہے، اور قوم کو پورے اختیارات دے دیئے کہ قوم جو چاہے سو کرے، قوم مالک ہے، اس کے بعد قوم نے ایک شخص کو جو کہ قوم کا صدر بھی ہے، اسے قوم نے اپنا امین سمجھتے ہوئے بطورِ امانت رکھ دی، لیکن اس امین نے بغیر قوم سے دریافت کئے ہوئے لڑکی کا نکاح اپنے بھتیجے سالے کے لڑکے سے کردیا کیونکہ اس میں امین کا ذاتی فائدہ تھا، آیا شرع میں اس شخص کو اپنا امین سمجھا جائے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب لڑکی کا نکاح اپنے شوہر سے قائم تھا، تو صدر نے بھتیجے سے اس کا نکاح کرکے سخت گناہ کا کام کیا،[2] یہ نکاح باطل اور حرام ہے،[3] لڑکی کا نکاح بدستور اپنے شوہر سے قائم ہے، جس شخص نے یہ حرکت کی اسے توبہ و استغفار کرنا چاہئے اور جب تک وہ اپنی اصلاح نہ کرے مسلمانوں کو اپنا کوئی ذمہ داری کا عہدہ اسے سونپنا نہیں چاہئے، بشرطیکہ وہ واقعات دُرست ہوں جو سوال میں تحریر کئے گئے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۲/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۸۲۳/ ۲۱ الف)

صرف پستان منہ میں لینے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی

سوال:- ہم سات بہن بھائی تھے، تین برادر ایک بہن ہماری ماں مادرزاد تھی اور ہم تین بھائی مسمّٰی سلطان محمد خان، شیرباز، محمد نواز ان سے چھوٹے تھے، جب میری والدہ نے میرے باپ سے

---

(۱) سورۃ النساء: ۲۳.

(۲،۳) وفی الھندیۃ کتاب النکاح الباب الثالث ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع ماجدیہ) لا یجوز للرجل أن یتزوج زوجۃ غیرہ وکذلک المعتدۃ .... الخ. وکذا فی کفایت المفتی ج:۵ ص:۲۸۵ (دارالاشاعت جدید ایڈیشن).

وفی الدر المختار ج:۳ ص.۲۸ أسباب التحریم أنواع، قرابۃ، مصاھرۃ، رضاع .... وتعلق حق الغیر بنکاح.

نیز دیکھئے: تفسیر مظھری ج:۲ ص:۲۶۳ تحت قولہ تعالٰی: ''والمحصنٰت من النساء'' (الآیۃ). وفی ردّ المحتار ج:۳ ص:۱۳۲ اما نکاح منکوحۃ الغیر ومعتدتہ فالدخول فیہ لا یوجب العدۃ أن علم أنھا للغیر لأنہ لم یقل أحد بجوازہ فلم ینعقد أصلًا.

شادی کی لازم تین چار ماہ بعد اسلامی والد فوت ہوئے، ان کی پرورش دادی کے ذمہ تھی، دُودھ بکری کا نپل کے ذریعہ پیتا تھا، اس وقت میری والدہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی، بدن پر خون گوشت کا تنکا بھی نہ تھا، کبھی کبھی دادی والدہ کی حرمت پوری کرنے کے لئے بچہ کو لیتی کیونکہ وہ چیختا چلاتا تھا چپ کرواتی لیکن قسم سے پستانوں سے دُودھ کہاں پانی بھی نہیں نکلتا تھا، میرے بھائی محمد نواز کی لڑکی جوان ہے، میرا لڑکا جس کی عمر دو سال مادرزاد چچا کے گھر بیس سال کا شادی شدہ ہے، اولاد سے محروم ہے، میرے بھائی کی لڑکی میرے لڑکے کے ساتھ نکاح میں کوئی خلل تو نہیں جائز ہے؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ آپ کے لڑکے نے آپ کی والدہ کے صرف پستان منہ میں لئے تھے اور دُودھ نہیں نکلا تھا تو آپ کے لڑکے کی شادی آپ کے بھائی کی لڑکی سے ہوسکتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۰۱/۱/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳ ۱۷/۳۲ ج)

رضاعی بھانجے سے نکاح کا حکم

سوال:- ہندہ کا دُودھ اس کی حقیقی پوتی نے پیا، تو کیا ہندہ کے حقیقی نواسے یعنی ہندہ کی سگی بیٹی کے لڑکے سے اس دُودھ پینے والی لڑکی کا نکاح جائز ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ہندہ کی پوتی کا نکاح ہندہ کے نواسے سے نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ نواسہ لڑکی کا رضاعی بھانجا ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۹/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۸/ ۲۷ و)

رضاعی چچا سے نکاح کا حکم

سوال:- جمال خان کے دو فرزند ہیں، غلام علی اور نور الدین۔ غلام علی کی زوجہ زینت کا دُودھ نور الدین نے پیا ہے جنت کے ساتھ، جنت غلام علی کی بیٹی ہے، اب غلام علی کا بیٹا عبدالکریم جو جنت بہن کے بعد غلام علی کے ہاں پیدا ہوا ہے، یہ عبدالکریم اب نور الدین کی بیٹی فاطمہ سے نکاح کرنا

---

(۱) وفی الشامیة، کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۲ (طبع سعید) لو أدخلت الحلمة فی الصبی وشکت فی الأرتضاع لا تثبت الحرمة بالشک. وفی الدر المختار، کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۲ فلو التقم الحلمة ولم یدر أدخل اللبن فی حلقه أم لا؟ لم یحرم.

(۲) "حرمت علیکم أمهاتکم وبناتکم .... وبنات الأخ وبنات الأخت" الأیة سورة النساء. ۲۳. وفی الحدیث: عن علی رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الله حرم من الرضاعة ما حرم من النسب. (جامع الترمذی، ابواب الرضاع، باب ما جاء یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب ج:۱ ص:۲۱۷). نیز دیکھئے کفایت المفتی (جدید ایڈیشن دارالاشاعت) ج:۵ ص:۱۷۲، و فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۷ ص:۴۰۱.

چاہتا ہے، کیا یہ نکاح ہوجائے گا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر عبدالکریم زینت کے بطن سے ہے تو وہ فاطمہ کا رضاعی چچا ہونے کے سبب فاطمہ کے لئے حرام ہے، اور دونوں میں نکاح نہیں ہوسکتا،[1] اور اگر عبدالکریم زینت کے علاوہ غلام علی کی کسی اور بیوی کے بطن سے ہے اور اس نے زینت کا دُودھ بھی نہیں پیا تو فاطمہ اور عبدالکریم کے درمیان کوئی رضاعی رشتہ نہیں ہے، اور حقیقی رشتے سے وہ اس کے چچا کا لڑکا ہے، اس لئے دونوں کے درمیان نکاح ہوسکتا ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۱۵ھ

بیوی کو طلاق دینے کے بعد دورانِ عدّت اس کی بہن سے نکاح کرنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی کا نکاح ایک عورت سے ہے، اس کو طلاق دے دی، طلاق دے کر اسی جگہ اس وقت اس کی حقیقی بہن سے نکاح کرلیا، کیا یہ نکاحِ ثانی جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ نکاح جائز نہیں، جب تک پہلی بیوی کی عدّت ختم نہ ہوجائے (یعنی اسے تین مرتبہ حیض نہ آجائے، یا اگر اسے حیض نہیں آتا تو تین مہینے پورے نہ ہوجائیں) اس وقت تک اس کی بہن سے نکاح جائز نہیں ہے، اور ایسا نکاح کالعدم ہوگا، لما فی البدائع: وکما لا یجوز للرجل أن یتزوج المرأة فی نکاح أختھا لا یجوز له أن یتزوجھا فی عدة أختھا. (بدائع الصنائع ج:۲ ص:۲۶۳)۔[2]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۷/۲ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۰۳ الف)

---

(۱) عن علی رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ حرم من الرضاع ما حرم من النسب. (جامع الترمذی، باب ما جاء یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب ج:۱ ص:۲۱۷ طبع سعید). وفی سنن أبی داوٗد کتاب النکاح باب یحرم من الرّضاعة ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع سعید) عن عائشة زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۳۱۴ (رضاعی چچا و خالو سے نکاح حرام ہے)۔

(۲) (طبع سعید) وفی المبسوط للسرخسی، کتاب النکاح ج:۴ ص:۲۰۴ (طبع دار المعرفة بیروت) وعدة الأخت تمنع نکاح الأخت. وفی الھدایة، کتاب النکاح ج:۲ ص:۳۰۹ و ۳۱۰ (طبع شرکت علمیه) واذا طلّق الرجل امرأته بائنًا أو رجعیًا لم یجز له أن یتزوج بأختھا حتی تنقضی عدتھا.

رضاعی بہن سے نکاح جائز نہیں

سوال:- زید کی ایک حقیقی پھوپھی ہے، زید اس پھوپھی کی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہے، جبکہ زید نے پھوپھی کا چھ مہینے دُودھ بھی پیا ہے، کیا یہ نکاح ہوسکتا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی پھوپھی کی لڑکی اس کی رضاعی بہن ہے، اس لئے اس سے نکاح جائز نہیں۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

بھائی کے لڑکے سے اپنی پوتی کا نکاح کرانے کا حکم

سوال:- ایک عورت ہے، اس کا ایک سگا بھائی ہے، اور اس کا ایک لڑکا بھائی کے لڑکے سے اپنے لڑکے کی لڑکی کا نکاح کرنا چاہتی ہے، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- بھائی کے لڑکے سے اپنی پوتی کا نکاح کرنا جائز ہے،[2] بشرطیکہ کوئی دُودھ پینے کا رشتہ نہ ہو۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۱۱/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۳/۲۱ الف)

بیوی کے پستان منہ میں لینے سے نکاح پر اثر نہیں پڑتا

سوال:- میری شادی ہوئی ہے، میں نے کسی کی غلط باتوں میں آکر اپنی بیوی کی چھاتیاں چوسنا شروع کردیا، لیکن کچھ لوگوں نے بتایا ہے کہ اس فعل سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کا نکاح نہیں ٹوٹا،[3] اور بیوی کے پستان منہ میں لینا شرعاً ممنوع بھی نہیں، بشرطیکہ اس سے دُودھ منہ میں چلے جانے کا اندیشہ نہ ہو، اگر دُودھ منہ میں چلا گیا تو

---

(۱) ولا حل بین رضیعی امرأة لکونهما أخوین وان اختلف الزمن، (الدر المختار کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۷)۔ وفی الهندیة ج:۱ ص:۳۴۳ (طبع ماجدیه) یحرم علی الرضیع أبواه من الرضاع وأصولهما وفروعهما من النسب والرضاع جمیعا .... الخ.

(۲) یہ "وأحل لکم ما وراء ذٰلکم" الأیة (سورة النساء:۲۴) میں داخل ہے، دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۷ ص:۱۹۴، سوال نمبر ۲۷۰۔

(۳) وفی الدّر المختار، کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۲۵ (طبع سعید) مص رجل ثدی زوجته لم تحرم.

ایک ناجائز چیز پینے کا گناہ ہوگا،[1] لیکن نکاح پھر بھی نہیں ٹوٹے گا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۲/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۳/۲۸ الف)

سوتیلی بہن کی پوتی سے نکاح کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ میرے والد نے میری سوتیلی بہن کی شادی اپنے چچازاد بھائی سے کی اور اس چچازاد بھائی کا اس عورت سے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، اب اس لڑکے کی ایک لڑکی ہے جو کہ میری اس سوتیلی بہن کی پوتی لگتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ میرا نکاح اس لڑکی کے ساتھ جو میری سوتیلی بہن کی پوتی ہے جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- آپ کے لئے اپنی سوتیلی بہن (یعنی باپ شریک) کی پوتی سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے، قال فی العالمگیریة ج:۲ ص:۵ فی بیان المحرمات النسبیة: وکذا بنات الأخ والأخت وان سفلن۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۰/۱۲/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۶۴۵/۲۱ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

سوتیلے والد کی سابقہ بیوی کی بیٹی سے نکاح جائز ہے

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، جس وقت طلاق دی تھی، اس وقت اس عورت کی لڑکی پیدا ہوئی جو بعد میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی، اور اس شخص نے ایک اور عورت سے نکاح کیا، اور جس عورت سے نکاح کیا تھا، اس کا ایک لڑکا سابق شوہر سے تھا، اب وہ لڑکی اور یہ لڑکا دونوں جوان ہوگئے ہیں، کیا ان کا آپس میں نکاح دُرست ہے؟

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۱ ولم یبح الارضاع بعد مدته لأنه جزء ادمی والانتفاع به لغیر ضرورة حرام علی الصحیح. وکذا فی کفایت المفتی ج:۵ ص:۱۲۲.

(۲) الفتاویٰ الهندیة، کتاب النکاح الباب الثالث فی بیان المحرمات ج:۱ ص:۲۷۳ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) وفیها أیضًا الباب الثالث القسم الأوّل ج:۱ ص:۲۷۳ (طبع ماجدیه) وبنات الأخت فهن محرمات نکاحا ووطأ ودواعیه علی التأبید .... الخ. وفی التفسیر المظهری ج:۲ ص:۵۶ تحت قوله تعالٰی: "وبنت الأخ وبنت الأخت" یعنی فروع الأخت والأخت بناتهما وبنات أبنائهما، وبنات بناتهما، وان سفلن سواء کان الأخ والأخت لأبوین أو لأحدهما.
وکذا فی معارف القران ج:۲ ص:۳۵۸.

جواب:- صورتِ مسئولہ میں دونوں کا نکاح ہوسکتا ہے۔[1]

فقط واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲۹/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

رضاعی بہن سے نکاح کا حکم

سوال:- دو سگے بھائی ہیں، بڑے بھائی کے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، چھوٹے بھائی کا ایک لڑکا اور چار لڑکیاں ہیں، بچپن میں چھوٹے بھائی کی بیوی نے اپنی لڑکی کو بڑے بھائی کی بیوی کا دُودھ پلایا تھا، اب وہ جوان ہیں، بڑے بھائی کے گھر والے چاہتے ہیں کہ جس لڑکی کو ان کی بیوی نے دُودھ پلایا تھا اس کی شادی اپنے لڑکے سے کریں۔ اس لڑکے سے شادی نہیں کر رہے ہیں جو لڑکی کو دُودھ پلاتے وقت گود میں تھا، بلکہ اس کے بڑے بھائی سے شادی کرنا چاہتے ہیں، اس لڑکی کی شادی دُودھ پلانے والی عورت کی کسی لڑکی سے ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں لڑکی نے جس عورت کا دُودھ پیا ہے اس کے تمام لڑکے اس کے رضاعی بھائی ہیں، اور ان سے اس لڑکی کا نکاح نہیں ہوسکتا،[2] خواہ لڑکی کے دُودھ پینے کے وقت وہ شیر خوار ہوں یا نہ ہوں، لہٰذا مجوزہ نکاح شرعاً جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۵/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۰/۲۸ الف)

دو رضاعی بہنوں سے بیک وقت نکاح کرنا حرام ہے

سوال:- نبی الدین نامی ایک شخص کے گھر میں لڑکا نہیں جنتا تھا، تو بہت برس کے بعد اس نے ایک لڑکی کی پرورش کی، اللہ کے حکم سے پندرہ دن کے بعد شخصِ مذکور کی بیوی کو جو حاملہ تھی ایک لڑکی پیدا ہوگئی، اب دونوں ہمشیر ہوگئے، رفتہ رفتہ ان میں سے ایک بالغ ہوگئی تو اس کی نذیر احمد نامی شخص سے شادی کرادی اور ساتھ دُوسری لڑکی بھی بالغہ ہوئی اور بہنوئی کے گھر میں آگئی، لوگوں کو جب زنا کا اندیشہ ہوا تو ان کے زجر وتوبیخ پر باپ اُسے اپنے گھر لے گئے، پھر چند دنوں بعد معلوم ہوا کہ موصوفہ پھر بہنوئی کے گھر گئی ہے، لوگوں نے اس سے پوچھ پاچھ کیا، اس نے اقرار کیا کہ میں حاملہ ہوں، بعد میں بہنوئی

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح فصل فی المحرمات ج:۳ ص:۳۱ (طبع ایچ ایم سعید) أما بنت زوجة أبیه أو ابنه فحلال.

(۲) وفی الدر المختار کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۱ ص:۲۱۷ ولا حلّ بین رضیعی امرأة لکونهما أخوین وان اختلف الزمن. وفی الهندیة کتاب الرضاع ج:۱ ص:۳۴۳ (طبع ماجدیه) یحرم علی الرضیع أبواه من الرضاع وأصولهما وفروعهما من النسب والرضاع جمیعًا .... الخ.

سے پوچھا گیا تو اس نے بھی زنا کا اقرار کیا، بعد میں داماد نے سسر کو ایک سو روپے جھوٹی بات کہنے کے لئے دیئے تو باپ نے روپے کے حرص میں کہا کہ یہ لڑکی رضیعہ نہیں، ایک مجلس طلب کی گئی، اس میں گواہ پیش ہوئے کہ یہ رضیعہ نہیں ہے، مگر اس کی خالہ اس لڑکی کو موصوفہ دایہ کے پاس لے گئی، اس نے لڑکی کے والد کو کہا کہ تم چھوٹے روپے کے خوف سے جھوٹ بات منہ سے نکالتے ہو، اس پر وہ خاموش رہا، اب شرعاً و سیاسۃً کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جبکہ دو معتبر گواہ اس بات کے موجود ہیں کہ ان دونوں لڑکیوں نے ایک ہی عورت کا دُودھ پیا ہے تو ان دونوں سے بیک وقت نکاح کرنا نذیر احمد کے لئے حرام ہے،[1] اور جو گواہیاں رضیعہ نہ ہونے پر لائی گئی ہیں، وہ قابلِ قبول نہیں ہیں، کیونکہ المثبت مقدم علی النافی، نذیر احمد کو چاہئے کہ فوراً دُوسری لڑکی کو چھوڑ دے اور اس گناہ سے توبہ و اِستغفار کرے، اور وہ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو تو عدالت کے ذریعے بھی دونوں میں تفریق کرائی جاسکتی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۲/۱۲/۱۳۹۰ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۴/۲۱ الف)

باپ شریک بہن سے نکاح کا حکم

سوال:- زید کے پاس دو عورتیں ہیں، زید نے ان دونوں عورتوں کو چھوڑ دیا، پھر ان دونوں عورتوں نے الگ الگ مرد سے اپنا نکاح کرلیا، ایک عورت کے یہاں کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی، البتہ اس کے مرد کی پہلی عورت سے ایک لڑکا ہے، دُوسری عورت کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی، اب اس لڑکی کا نکاح اُس لڑکے سے ہوسکتا ہے جو اُوپر ذکر کیا گیا ہے؟

جواب:- سوال پوری طرح واضح نہیں ہے، اگر مذکورہ لڑکا اور لڑکی آپس میں باپ شریک بھائی بہن ہیں، تب تو ان کے درمیان نکاح نہیں ہوسکتا،[2] اور اگر دونوں کے ماں باپ بالکل الگ ہیں تو صورتِ مسئولہ میں نکاح جائز ہے، بشرطیکہ کوئی اور سببِ حرمت موجود نہ ہو۔

لیکن بہتر یہ ہے کہ یہی سوال ہر مرد و عورت اور لڑکے لڑکی کا نام لکھ کر وضاحت سے دوبارہ پوچھ کر پھر عمل کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۶/۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۰۹/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الشامیة، کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۲۴ وهی شهادة عدلین ای من الرجال وأفاد انه لا یثبت بخبر الواحد امرأة کان أو رجلًا. وفی الهندیة کتاب الرضاع ج:۱ ص:۳۴۷ (طبع ماجدیه) ولا یقبل فی الرضاع الّا شهادة رجلین أو رجل وامرأتین عدول.

(۲) وفی التفسیر المظهری ج:۲ ص:۵۶ (طبع دهلی) تحت قوله تعالٰی: "حرّمت علیکم امهاتکم وبنٰتکم واخواتکم" تعمّ ما کانت منها لأب أو لأم أو لهما .... الخ.

رضاعی پھوپھی سے نکاح جائز نہیں

سوال:- زید کی ماں محمودہ کا دودھ خالد نے پیا، پھر تقریباً سولہ سال بعد خالد کی بیوی کا دودھ ظفر نے پیا، اب ظفر کا نکاح زید کی حقیقی بہن صاعقہ سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں صاعقہ ظفر کے رضاعی باپ کی رضاعی بہن ہوئی، اس لئے ان دونوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ رضاعی رشتے سے ظفر کی پھوپھی ہے، ویحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۶/ ۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

مزنیہ سے نکاح کرنے کا حکم

سوال:- ایک لڑکا اور لڑکی جو باہم رشتہ میں بھائی بہن ہیں، یعنی ماموں کی لڑکی اور پھوپھی کا لڑکا، ان دونوں میں ناجائز تعلق ہوگیا، جس کے نتیجے میں لڑکی حاملہ ہوگئی، بزرگوں کو معلوم ہونے پر دونوں کی شادی طے کردی ہے، جس کا انعقاد کل ۱۵؍جون کو ہے، آپ سے دریافت کرنا ہے کہ آیا یہ شادی جائز ہے؟ اور پیدا ہونے والا بچہ جائز ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں لڑکے اور لڑکی نے زنا کرکے سخت گناہ کا ارتکاب کیا ہے، دونوں پر واجب ہے کہ صدقِ دل سے توبہ و استغفار کریں، اور صورتِ مسئولہ میں دونوں کا باہم نکاح صحیح ہوجائے گا،[2] اور اگر بچہ نکاح کے چھ مہینے بعد پیدا ہوا تو بچے کو بھی ثابت النسب سمجھا جائے گا۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۶۰/ ۲۸ ب)

---

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب یحرم من الرّضاعة ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع سعید) و جامع الترمذی ج:۱ ص:۲۱۷ (طبع سعید).

(۲) وفی الدر المختار، کتاب النکاح، فصل فی المحرمات ج:۳ ص:۴۸ وصحّ نکاح حبلٰی من زنی. وفی الشامیة تحته (وصحّ نکاح حبلٰی من زنی) أی عندهما، وقال أبویوسف: لا یصحّ، والفتویٰ علٰی قولهما .... الخ.

(۳) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۴۹ لو نکحها الزّانی حلّ له وطؤها اتفاقا والولد له ولزمه النفقة وفی الشامیة تحته قوله والولد له أی ان جاءت بعد النکاح لستة أشهر مختارات النوازل فلو لأقل من ستّة أشهر من وقت النکاح لا یثبت النسب ولا یرث منه.

مزنیہ سے نکاح کا حکم

سوال:- اگر کسی لڑکے نے زنا کرلیا اور لڑکی حاملہ ہوگئی، لڑکا چاہتا ہے کہ وہ اُس لڑکی سے نکاح کرلے تو کیا حمل کے دوران نکاح ہوسکتا ہے؟

جواب:- جی ہاں! نکاح کرسکتا ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۷/۱۱/۱۴۰۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲/۱۶۷۲/۳۲ ج)

مزنیہ سے نکاح کے بعد وطی کا حکم

سوال:- ہندہ منکوحہ نے رُخصتی سے قبل زنا کرلیا اور حمل ٹھہر گیا، اب ہندہ کے والد نے ہندہ کی رُخصتی کردی تو اب ہندہ کے شوہر کو اس سے وطی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ہندہ کا شوہر اس سے وطی کرے تو کسی قسم کا گناہ تو نہ ہوگا؟

جواب:- اگر شوہر اس حمل کو اپنی طرف منسوب کرنے سے انکار کرتا ہے تو جب تک وضعِ حمل نہ ہوجائے اس کے لئے وطی جائز نہیں۔[2]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۴/۱۱/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۵۷/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

رضاعت کا ایک مسئلہ

سوال:- زید اور بکر گو کہ دونوں حقیقی بھائی باپ کی طرف سے نہیں، ماں کی طرف سے ہیں، یعنی ماں ایک ہے، اور باپ دو، زید پہلے باپ سے ہے، جبکہ بکر دُوسرے باپ سے ہے، زید کا انتقال ہوچکا ہے، جس نے عمرو کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کا دُودھ پیا تھا، اب مسئلہ درپیش یہ ہے کہ بکر جو کہ دُوسرے باپ کی اولاد ہے، یعنی زید کی ماں نے جس دُوسرے خاوند سے نکاح کیا، آیا شریعت کی رُو سے بکر، عمرو کو اپنی بیٹی عقدِ نکاح میں دے سکتا ہے یا نہیں؟ براہِ کرم مندرجہ دونوں صورتوں میں الگ الگ وضاحت فرمائیں۔

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب النکاح، باب المحرّمات ج:۳ ص:۴۸ (طبع ایچ ایم سعید) (وصح نکاح حبلیٰ من زنی لا) (حبلیٰ) (من غیرہ) ای الزّنی لثبوت نسبہ .... الخ. وفی الشامیة تحتہ ای عندھما، وقال أبویوسف: لا یصحّ، والفتویٰ علی قولھما .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۴۸، ۴۹ (و) صحّ نکاح (حبلی من زنی) لا حبلی (من غیرہ) أی الزّنی .... (وان حرم وطؤھا) ودواعیہ (حتّی تضع) متصل بالمسئلة الأولی لئلّا یسقی ماءہ زرع غیرہ.

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بکر اور عمرو کے درمیان کوئی رضاعی رشتہ قائم نہیں ہوا، کیونکہ رشتہ رضاعت زید اور عمرو کے مابین ہے، بکر اور عمرو کے مابین نہیں ہے، لہٰذا عمرو کی ماں بکر کی رضاعی ماں نہیں ہے، لقولہ فی الدر المختار فیحرم منه ما یحرم من النسب .... الا ام اخیه واخته ..... فان حرمة أم أخته وأخیه نسبا لکونها أمّه أو موطؤة أبیه وهذا المعنی مفقود فی الرضاع. (شامی ج:۲ ص:۴۰۷)[1] اور جب عمرو کی ماں کا بکر کے ساتھ کوئی نسبی یا رضاعی تعلق نہیں تو وہ بکر کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے۔

بالفاظِ دیگر بکر کی بیٹی عمرو کے رضاعی بھائی زید کی بھتیجی ہے اور رضاعی بھائی کی نسبی بہن سے بھی نکاح جائز ہے، کما قالوا وتحلّ أخت أخیه رضاعا. (شامی ج:۲ ص:۴۰۸)[2] تو رضاعی بھائی کی بھتیجی سے بطریقِ اَولیٰ جائز ہوگا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں عمرو، بکر کی بیٹی سے شرعاً نکاح کرسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۱/۸/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۹۹۱ ب)

غیر ثابت النسب لڑکی سے نکاح کا حکم

سوال:- ایک صاحب اپنے لڑکے کی شادی ایسی لڑکی سے کرنا چاہتے ہیں جس کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ لڑکی اپنے والدین کی ناجائز یعنی حرامی اولاد ہے، اُس کی ماں کا نکاح اُس کے باپ کے ساتھ نہیں ہوا تھا، از رُوئے شریعتِ اسلامی ایک حرامی لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہوگا کہ نہیں؟

جواب:- اگر حرمت کی کوئی اور وجہ نہ ہو تو محض لڑکی کے غیر ثابت النسب ہونے کی بنیاد پر اس سے نکاح حرام نہیں، نکاح ہوسکتا ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۴۲/۲۷/۲۷ و)

تایازاد بہن کے ساتھ نکاح کا حکم

سوال:- کیا تایازاد بہن کے ساتھ مذہبِ اسلام میں نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

---

(۱) الدر المختار باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۳ الی ۲۱۵ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) الدر المختار باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۷.
(۳) کیونکہ یہ محرمات میں داخل نہیں: "واحل لکم ما وراء ذلکم" سورۃ النساء:۲۵۔

جواب:- تایازاد بہن کے ساتھ نکاح جائز ہے، بشرطیکہ کوئی اور سببِ حرمت، رضاعت یا مصاہرت کا نہ پایا جاتا ہو۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۸۳/۲۷و)

رضاعی بہن سے نکاح کا حکم

سوال:- میری خالہ کی لڑکی نے اُس وقت میری والدہ کا دُودھ پی لیا جبکہ پانچ سال چھوٹا ایک میرا بھائی، میری والدہ کا دُودھ پیتا تھا، خالہ کو دُودھ کم تھا، میری والدہ نے دُودھ پلایا، جس لڑکی نے میری والدہ کا دُودھ پیا ہے کیا اُس لڑکی سے میرا نکاح ہوسکتا ہے، جبکہ میں نے اُس کے ساتھ دُودھ نہیں پیا ہے؟

جواب:- اگر آپ کی خالہ کی لڑکی نے آپ کی والدہ کا دُودھ مدتِ رضاعت میں یعنی دو سال سے کم عمر میں پیا ہے،[1] تو وہ آپ کی رضاعی بہن ہوگئی اور اُس کے ساتھ آپ کا نکاح نہیں ہوسکتا،[2] دُودھ خواہ آپ کے ساتھ پیا ہو یا آپ کے چھوٹے بھائی کے ساتھ، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۸۶۲/۲۸ج)

غیر مطلقہ منکوحہ سے کسی دُوسرے شخص کے نکاح کا حکم

سوال:- قاضی بشیر احمد کی بیوی بسااوقات اپنے خاوند سے محض بیوقوفی اور سخت مزاجی سے پیش آیا کرتی تھی، لہٰذا خاوند مذکورہ نے علالت کے باعث منکوحہ سے تنگ آکر اس کی والدہ کو بلاکر منکوحہ کو گھر بھیج دیا کہ میں فی الحال اس ہٹ دھرمی کو ناقابلِ برداشت سمجھتے ہوئے آپ کے حوالے کرتا ہوں اور جس طرح آپ صحت یاب ہونے پر حکم فرمائیں گی میں تعمیل کروں گا، لہٰذا ان کی منکوحہ سے ایک دو ماہ بعد فوری طور پر بغیر کسی طلاق کے مولوی عبداللہ نے نکاح کرلیا، کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں اور قاضی بشیر احمد نے اپنی بیوی زلیخا بی بی کو کوئی طلاق نہیں دی تو وہ بدستور قاضی بشیر احمد کی بیوی ہے، اور مولوی عبداللہ کے ساتھ اس کا

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۱ (طبع سعید) ویثبت التحریم فی المدة فقط.
وفی الشامیة تحته اما بعدها فانه لا یوجب التحریم.
(۲) "حرّمت علیکم امهاتکم .... وأخواتکم من الرضاعة" (الأیة) سورة النساء:۲۳.
(۳) وفی الدر المختار کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۱ ص:۲۱۷ (طبع سعید) ولا حلّ بین رضیعی امرأة لکونهما أخوین وان اختلف الزّمن.

نکاح شرعاً باطل اور کالعدم ہے،[1] جتنے عرصے زلیخا بی بی، محمد عبداللہ کے پاس رہی، ناجائز طور پر رہی، اب ان کا فوراً الگ ہونا ضروری ہے، دونوں توبہ و استغفار کریں اور زلیخا بی بی اپنے اصلی شوہر قاضی بشیر احمد کے پاس واپس آجائے، اور چونکہ محمد عبداللہ سے زلیخا کا نکاح ہی دُرست نہیں ہوا، اس لئے طلاق کی تحریریں بے کار ہیں، قاضی بشیر احمد عدالت کے ذریعے بیوی کو دوبارہ واپس آنے پر مجبور کرسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۶/۲۲ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۲۸ اسباب التحریم أنواع، قرابة، مصاهرة، رضاع .... وتعلق حق الغیر بنکاح .... الخ. وفی الشامیة ج:۳ ص:۳۲ اما نکاح منکوحة الغیر ومعتدته فالدخول فیه لا یوجب العدّة ان علم أنها للغیر، لأنه لم یقل أحد بجوازه فلم ینعقد اصلاً.

وفی الهندیة کتاب النکاح الباب الثالث ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع ماجدیه) لا یجوز للرّجل أن یتزوّج زوجة غیره وکذلک المعتدّة ... الخ. نیز دیکھئے کفایت المفتی ج:۵ ص:۲۸۵. (جدید ایڈیشن دارالاشاعت)۔

فصل فی أحکام الحرمة المصاهرة

(حرمتِ مصاہرت کے اَحکام)

بہو سے زنا کرنے سے بیٹے پر اس کی بیوی حرام ہو جائے گی

سوال:- اگر کسی شخص کے اپنی بہو یعنی لڑکے کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا ہو جائیں اور سسر نے بہو سے صحبت کر لی ہو تو کیا حکم ہے؟ اگر صحبت نہ کی ہو تو کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کی بیوی سے زنا کرے تو وہ اس کے بیٹے پر حرام ہو جاتی ہے[1]، ایسی صورت میں شوہر پر واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی سے یہ کہہ کر فوراً الگ ہو جائے کہ میں نے تمہیں چھوڑ دیا[2]۔ اور اگر پوری صحبت نہیں ہوئی تو واقعے کی صحیح صحیح تفصیل لکھ کر بھیجئے اُسے دیکھ کر ہی حکم بتایا جا سکے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۳۶/۲۸ ب)

سالی سے زنا کرنے پر حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوتی

سوال:- ایک شخص اپنی سالی (بیوی کی بہن) سے زنا کا مرتکب ہوا ہے، کیا اس کا نکاح ٹوٹ گیا یا نہیں؟ یا نکاح میں کچھ خلل واقع ہوا ہے یا نہیں؟

(محمد ریاض، حفر الباطن، سعودی عرب)

جواب:- اس شخص نے سخت گناہ کا ارتکاب کیا ہے، جس پر اُسے توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے، اور آئندہ اُس سالی سے پردہ کا اہتمام کرنا چاہئے، لیکن اس عمل سے اس کی بیوی کے ساتھ نکاح پر کوئی

---

(۱) وفی الشامیة ج:۳ ص:۳۲ (طبع سعید) قال فی البحر: أراد بحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة علی أصول الزّانی وفروعه نسبًا ورضاعًا. وکذا فی البحر الرائق ج:۳ ص:۱۰۱، والهندیة ج:۱ ص:۲۷۵ الباب الثالث فی المحرمات.

(۲) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۳۷ وبحرمة المصاهرة لا یرتفع النکاح حتّٰی لا یحلّ لها التزوج بآخر الّا بعد المتارکة. وفی الشامیة تحته: .... وقد علمت ان النکاح لا یرتفع بل یفسد وقد صرّحوا فی النکاح الفاسد بأنّ المتارکة لا تتحقق الّا بالقول ان کانت مدخولا بها کترکتک أو خلیت سبیلک. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۳۲۳ (محمد زبیر عفی عنہ).

اثر نہیں پڑا، وہ بدستور اس کی منکوحہ ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۲/۴/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۴/۴۹۴ الف)

---

(۱) تاہم سالی کے استبراء یعنی اُس کے ایک حیض گزرنے تک یا اُس کے حاملہ ہونے کی صورت میں اُس کے وضعِ حمل تک اپنی بیوی سے جماع کرنا جائز نہیں، بلکہ علیحدہ رہنا واجب ہے۔ دراصل اس مسئلے میں کہ مذکورہ صورت میں مزنیہ کا استبراء واجب ہے یا مستحب؟ حضراتِ فقہائے کرامؒ کے مختلف اقوال ہیں، جن کی روشنی میں محتاط یہی ہے کہ مزنیہ کا استبراء واجب ہے، تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کا مصدقہ راقم کا درج ذیل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:-

مذکورہ مسئلے سے متعلق عبارات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں حضراتِ متقدمین کے مختلف اقوال ہیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے دو قول مروی ہیں:-

۱:- سالی سے زنا کی صورت میں سالی کے تین حیض گزرنے تک بیوی سے علیحدہ رہنا واجب ہے، یعنی مذکورہ صورت میں زنا سے عدت، نکاح میں عدت ہی کی طرح ہے۔

۲:- ایک حیض گزرنا واجب ہے۔

۳:- فقہائے حنابلہ نے ایک تیسرے قول کو بطورِ احتمال کے ذکر کیا ہے، جو اس کے ضعف کی طرف اشارہ ہے، وہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں کچھ واجب نہیں، بلکہ بعض فقہائے حنابلہ نے یہ تیسرا قول ذکر ہی نہیں کیا۔

في المغني لابن قدامه تحت رقم المسئلة: ۱۱۳۹ ج: ۹ ص: ۴۷۹ و ۴۸۰ (طبع دار عالم الكتب رياض) وان زنى بامرأة فليس له أن يتزوج أختها حتى تنقضي عدتها وحكم العدة من الزنا والعدة من وطء الشبهة كحكم العدة من النكاح. فان زنى باخت امرأته فقال أحمد يمسك عن وطء امرأته حتى تحيض ثلاث حيض وقد ذكر عنه في المزني بها انها تستبرأ بحيضة لأنه وطء في غير نكاح ولا احكامه احكام النكاح ويحتمل ان لا تحرم بذلك أختها ولا اربع سواها لأنها ليست منكوحة ومجرد الوطء لا يمنع بدليل الوطء في ملك اليمين لا يمنع أربع سواها.

تنبيه:- اذا وطيء بشبهة او زنى لم يجز في العدة أن ينكح أختها ولو كانت زوجته نص عليه وفيه احتمال. (المبدع في شرح المقنع ج: ۷ ص: ۶۲ طبع المكتب الاسلامي بيروت). (وكذا في الفقه الاسلامي وادلته ج: ۷ ص: ۱۶۵ طبع دار الفكر دمشق).

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے استبراء مستحب ہونا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ان کے ہاں ملکِ یمین میں بھی استبراء مستحب ہے۔ (مغني المحتاج ج: ۳ ص: ۱۸۰ طبع دار احياء التراث العربي)۔ (وكذا في التهذيب ج: ۵ ص ۳۶۱ طبع دار الكتب العلمية بيروت)۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اس مسئلے میں نہیں مل سکا، جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے تو ان کے ہاں اس مسئلے میں دو قول ملتے ہیں، ایک قول شامی میں نقل کیا گیا ہے کہ استبراء مستحب ہے، يعني اذا زنى باخت امرأته أو بعمّتها أو بخالتها أو بنت أخيها أو أختها بلا شبهة فان الأفضل أن لا يطأ امرأته حتى تستبرأ المزنية .... الخ. شامی ج: ۶ ص: ۳۸۰ باب الاستبراء (طبع سعيد). اور یہی قول جامع الرموز للقهستاني كتاب الكراهية ج: ۲ ص: ۳۱۴ (طبع سعيد) میں بھی مذکور ہے۔ (وكذا في شرح الملتقى ص: ۲۱۱ على مجمع الأنهر) مگر ایک دوسرا قول استبراء کے واجب ہونے کا بھی ہے جو دراية عن الكامل کی عبارت: لو زنى باحدى الأختين لا يقرب الأخرى حتى تحيض الأخرى حيضة .... الخ. کے علاوہ النتف في الفتاویٰ كتاب النكاح ص: ۱۸۹ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) میں یوں مذکور ہے:-

الموانع في النكاح .... والخامس عشر:- اذا وطأ ذات محرم من امرأته ممن لا يحرم عليه بزنا فانه لا يطأ امرأته حتى يستبرئ الموطوءة بحيضة لانه لا يحلّ له رحمان محرمان فيهما ماؤه. .... (باقی اگلے صفحے پر)

سالی سے زنا کرنے سے بیوی حرام نہیں ہوتی

سوال:- آیا سالی سے ناجائز تعلقات ہونے کی بناء پر نکاح برقرار رہتا ہے یا نہیں؟

جواب:- سالی سے زنا کرنا یا ناجائز مقاربت کرنا سخت گناہ کا موجب ہے، لیکن اس سے بیوی حرام نہیں ہوتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۷/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۸۶۷/۲۸ ج)

مزنیہ کی بیٹی سے نکاح جائز نہیں

سوال:- جس عورت سے ناجائز تعلقات رہے ہوں، اس عورت کی لڑکی سے شادی جائز ہے یا نہیں؟ (لڑکی کا نطفہ شخصِ مذکور سے نہیں ہے)۔

جواب:- جس عورت سے زنا کیا ہو یا ناجائز طور پر بوس و کنار کیا ہو، اس کی لڑکی سے نکاح حرام اور باطل ہے،[2] خواہ وہ لڑکی زانی کے نطفے سے نہ ہو۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۸۶۷/۲۸ ج)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)........(نیز علامہ عبدالرحمن شیخی زادہ آفندی نے مجمع الأنهر ج:۱ ص:۴۷۹ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) میں صرف درایہ عن الکامل کی عبارت ذکر کی ہے، اُس پر کوئی اِشکال وغیرہ ذکر نہیں فرمایا) اس سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کے ہاں ایک قول استبراء کے واجب ہونے کا بھی ہے، لہٰذا حنابلہ کے ہاں مطلقاً استبراء کے واجب ہونے اور حنفیہ کے ایک قول کے مطابق استبراء واجب ہونے کی بناء پر محتاط بات وہی معلوم ہوتی ہے جو حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان رحمۃ اللہ علیہ ونور اللہ مرقدہٗ نے امداد المفتین ص:۵۵۳ میں تحریر فرمائی ہے کہ کم از کم ایک حیض گزرنے تک بیوی سے علیحدہ رہنے کو واجب قرار دیا جائے، خاص طور پر جبکہ معاملہ فروج سے متعلق ہے جس میں احتیاط والے پہلو کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یُعمل بالاحتیاط خصوصًا فی باب الفروج. (شامی ج:۳ ص:۲۸۳ طبع سعید)۔

فی الفقه الاسلامی وأدلّته ج:۷ ص:۱۶۵ (طبع دار الفکر دمشق): وان زنی الرجل بامرأة فلیس لهٗ أن یتزوج باختها حتی تنقضی عدتها وحکم العدة من الزنا والعدة من وطء الشبهة کحکم العدة من النکاح.

الجواب صحیح
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

واللہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم وعلمهٗ أتم وأحکم
محمد زبیر عفی عنہ
۱۴۲۲/۱/۱۲ھ

الجواب صحیح
احقر محمود اشرف غفر اللہ لہٗ

الجواب صحیح
محمد عبداللہ عفی عنہ

الجواب صحیح
محمد عبدالمنان

الجواب صحیح
اصغر علی ربانی

---

(۱) تفصیل کے لئے پچھلا فتویٰ اور اُس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب عفی عنہ)۔

(۲) وفی الدر المختار کتاب النکاح فصل فی المحرمات ج:۳ ص:۳۲ (طبع سعید): (و) حرم أیضًا بالصهریة (اصل مزنیته) .... الخ. وفی الشامیة، قال فی البحر: أراد بحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة علٰی أصول الزانی وفروعه نسبًا ورضاعًا وحرمة أصولها وفروعها علی الزّانی نسبًا ورضاعًا کما فی الوطءِ الحلال .... الخ.
وکذا فی البحر الرائق فصل فی المحرمات ج:۳ ص:۱۰۱، و الفتاویٰ الهندیة الباب الثالث فی المحرمات ج:۱ ص:۲۷۵ (محمد زبیر عفی عنہ).

شہوت کے صرف شبہ سے حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوتی

سوال:- اکثر مجھے شبہ ہوتا ہے کہ فلاں بات سے کیا کوئی طلاق واقع ہوئی ہے یا فلاں بات سے حرمتِ مصاہرت ہوئی ہے، براہِ کرم ذیل کے مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

۱:- ساس کے ساتھ شہوت سے ہاتھ لگے، یا ساس کی ماں کے ساتھ شہوت سے ہاتھ لگے، دونوں صورتوں میں حرمتِ مصاہرت ہوجاتی ہے یا نہیں؟ البتہ شہوت میں مرد کا معیار یہ ہے کہ اس کے آلۂ تناسل میں حرکت آجائے۔

ایک مرتبہ میری ساس نے مجھے چائے کی پیالی دی تو میرا ہاتھ ان کے ہاتھ سے لگا تو فوراً بوجۂ شبہ دھیان آلۂ تناسل کی طرف چلا گیا، آلۂ تناسل میں حرکت نہ ہوئی، جیسا کہ حرکت بیوی کو ہاتھ لگانے سے شہوت کے خیال کے ساتھ آنا شروع ہوجاتی ہے، البتہ بطور میری عادت، آلۂ تناسل کی طرف دِل کی دھڑکن سے بھی خفیف دھڑکن غالباً دو مرتبہ خیال شہوت ہوا، چونکہ آلۂ تناسل میں حرکت نہ ہوئی تو غالباً اس سے حرمتِ مصاہرت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دو، تین ایام قبل میری ساس کی بوڑھی والدہ محترمہ نے میرا ہاتھ چوما پھر مذکورہ صورت حال پیدا ہوئی، مارے خوف کے آلۂ تناسل کی طرف دھیان رکھا، اُس میں حرکتِ جسمانی محسوس نہ ہوئی، صرف خفیف دھڑکن، بہت خفیف دھڑکن ہوئی، لیکن آلۂ تناسل میں جسمانی حرکت شہوت والی نہ آئی، میری کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو آلۂ تناسل کی طرف دِل کی طرف سے ہوتی ہوئی دھڑکن (خفیف) سی دو، تین، چار مرتبہ اندرونی طور پر معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شہوت مجھے کافی آتی ہے اور مذکورہ صورت میں وہ حرکت آلۂ تناسل میں نہ آئی سوائے وہ آلۂ تناسل کے سرے تک کی دھڑکن جیسا کہ دھیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے تک دھڑکن جاتی ہے، ساس کے ساتھ ہاتھ سے ہاتھ لگنے اور ان کی والدہ محترمہ کے بوسہ لیتے وقت خوف سا بھی ہوگیا کہ حرمتِ مصاہرت نہ ہوجائے اور خوف کی وجہ سے آلۂ تناسل میں حرکت نہیں آیا کرتی، کیا دھڑکن شہوت سمجھی جائے گی؟

۲:- ایک شخص بیمارِ جنسیات ہو اور کسی سے ہاتھ وغیرہ لگ جانے سے فوراً آلۂ تناسل میں حرکت آجاتی ہو تو اس شخص کا اگر ہاتھ ساس کے ہاتھ سے لگ جائے اور حرکت تناسل ہوجائے جبکہ ارادہ اُس شخص کا شہوت کا اور بُرائی کا نہ ہو، تو اس بیماری کی وجہ سے کیا حرمتِ مصاہرت لازم نہ ہوگی کہ ہوگی؟

جواب:- آپ وساوس کو دُور کرنے کے لئے "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" آخر سورت تک کثرت سے پڑھا کریں، اور جو صورت آپ نے سوال میں لکھی ہے اس سے حرمتِ مصاہرت ثابت

نہیں ہوئی، مس بلا کسی حائل کے شہوت کے ساتھ ہو تو اس سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوتی ہے، اور شہوت کے لئے آلۂ تناسل میں جسمانی طور پر انتشار پیدا ہونا شرط ہے، محض انتشار کے شبہ سے حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوتی۔ وحد الشهوة في الرجل أن تنتشر آلته أو تزداد انتشارًا ان كانت منتشرة كذا في التبيين وهو الصحيح، كذا في جواهر الأخلاطي وبه يفتى، كذا في الخلاصة .... هذا الحد اذا كان شابًا قادرًا على الجماع. (عالمگیریہ ج:۱ ص:۲۷۵)۔[1]

۲:- اگر یہ واقعہ کسی کے ساتھ پیش آیا ہے تو پہلے یہ بتائیں کہ جنسی بیماری کیا اس قسم کی ہے کہ کسی مرد یا کسی اور چیز کو ہاتھ لگانے سے بھی آلۂ تناسل میں حرکت آجاتی ہے یا عورت کو ہاتھ لگانے سے ہی حرکت آتی ہے؟ اس کے بعد جواب دیا جاسکے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۵۹۱ ب)

---

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) وفي الدر المختار ج:۳ ص:۳۳ (طبع سعید) وحدها فيهما تحرّك آلته أو زيادته به يفتى. وفي الشامية قال في الفتح ثم هذا الحد في حق الشّاب .... الخ.

﴿فصل فی المناكحة بالكفّار وأهل الكتاب والفِرَق الضّالة﴾

(کفار، اہلِ کتاب اور گمراہ فرقوں سے نکاح کا بیان)

عیسائی عورت سے نکاح کا حکم

سوال:- میرے ایک عزیز کی شادی ایک عیسائی لڑکی سے ہوئی ہے، لڑکی کا باپ مسلمان ہے اور ماں عیسائی، باپ چونکہ ہندوستانی فوج میں میجر تھا اور مذہب کی بیگانگی، اور شرافت سے بیگانگی کی وجہ سے لڑکی سے محبت ہوگئی، انہوں نے بزرگوں کی مرضی سے سول میرج کرلی، لڑکی کی ماں کہتی تھی کہ میں نکاح نہیں کرنے دوں گی، لڑکے کا باپ نکاح کرنے پر مُصر تھا، لڑکی کے باپ نے کہا کہ: ابھی تو لڑکی کی ماں کا کہا مان لیں، کیونکہ وہ بہت ضدی ہے، آپ اپنے گھر لے جا کر نکاح پڑھوالیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، سب نے یہی سمجھا کہ لڑکا مسلمان ہے، لہٰذا لڑکی بھی مسلمان ہوگی، جب دو بچے پیدا ہوگئے تو معلوم ہوا کہ لڑکی اپنی ماں کے مذہب پر ہے، یعنی عیسائی ہے، اور لڑکی نے بھی اقرار کیا کہ عیسائی ہوں، اب شرعاً کیا یہ شادی جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- عیسائی عورت سے مسلمان کا نکاح شرعاً منعقد ہوجاتا ہے، شرط یہ ہے کہ عورت واقعۃً عیسائی مذہب پر ہو،[1] آج کل کے عیسائیوں کی طرح نہ ہو جو نام کے تو عیسائی ہوتے ہیں، اور اُن کے عقائد دہریوں کے عقائد ہوتے ہیں کہ خدا، رسول کسی کو نہیں مانتے۔ نیز دُوسری شرط یہ ہے کہ نکاح شرعی طریقے پر دو گواہوں کے سامنے ہوا ہو،[2] اگر یہ دونوں شرطیں موجود ہیں تو وہ نکاح دُرست ہوچکا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۳/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱۱/۲۸ ب)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۴۵ (طبع ایج ایم سعید) (وصحّ نكاح كتابية) وان كره تنزيها (مؤمنة بنبی) مرسل (مقرّة بكتاب) منزل وان اعتقدوا المسيح الٰها. وفی الشامية (قوله مقرّة بكتاب) فی النهر عن الزّيلعی، واعلم أن من اعتقد دينا سماويًا وله كتاب منزل كصحف ابراهيم وشيث وزبور داوٗد فهو من أهل الكتاب، فتجوز مناكحتهم.

(۲) وينعقد بايجاب من أحدهما وقبول من الأخر . . . وشرط حضور شاهدين حرّين او حرّ وحرّتين مكلّفين سامعين قولهما معًا. (الدر المختار كتاب النكاح ج:۳ ص: ۹ و ۲۱ طبع سعيد).

لا مذہب اور شیعہ سے نکاح کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ ایک ایسی لڑکی جس کے والدین کا تعلق دیوبندی مسلک سے ہے، اس کی شادی ایک ایسے لڑکے سے جس کے والدین شیعہ ہیں، اور لڑکا ان کے ساتھ کسی مذہبی تقریب میں شرکت نہیں کرتا۔ نیز نکاح پڑھانے کے لئے قاضی بھی مسلک دیوبندی کا ہی بلایا جائے گا، کیا یہ نکاح جائز ہے؟ نیز یہ لڑکا اور لڑکی دونوں بالغ ہیں، اور لڑکی نیک پارسا، قرآن پاک اور نماز پڑھتی ہے، اور دیوبندی مسلک کی ہے، جبکہ لڑکے کا قول یہ ہے کہ میں نہ شیعہ ہوں، نہ سنی، میں کسی مذہبی تقریب میں نہیں جاتا۔ جب ہم نے لڑکے کے گھر کہا کہ لڑکا اگر اخبار میں اور پوری طرح سنی ہونے کا اعلان کرے تو کوئی بات شاید بن جائے، لیکن اسی وقت اس کی والدہ نے کہا کہ: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ لڑکے کا باپ شیعہ اور میں خود شیعہ ہوں، یہ اعلان کیسے کرسکتا ہے؟ اس وقت لڑکے نے بھی اس کی تردید نہیں کی، بلکہ والدہ کی بات سے اتفاق کرلیا۔ ہمارے سامنے اس کے حالات مشکوک ہیں، اس وقت چونکہ رشتے کی بات سامنے ہے، اس لئے جو کچھ بھی ہم لکھوائیں گے وہ لکھ کر دیدے گا، اور ہمارے ہر سوال کا جواب ہاں سے دے گا، لیکن ہمیں اس کی باتوں پر اطمینان نہیں، کیا یہ رشتہ ہوسکتا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب لڑکا صراحۃً سنی ہونے کا انکار کر رہا ہے اور اس کے والدین واضح طور پر شیعہ ہیں، تو اب شیعہ ہونے سے انکار کا مطلب یا تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ تقیۃً ایسا کر رہا ہے، اور حقیقت میں وہ شیعہ ہے۔ یا پھر وہ کوئی مذہب ہی نہیں رکھتا، لا مذہب ہے۔ اور دونوں صورتوں میں اس کا نکاح سنی صحیح العقیدہ لڑکی سے کرنا جائز نہیں۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۸/۱۰/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۲۱۵۹ ز)

---

(۱) اگر لا مذہب ہے یا کفریہ عقیدہ رکھنے والا شیعہ ہے تو ان دونوں صورتوں میں اس کے کافر ہونے کی وجہ سے یہ نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ اور اگر کفریہ عقیدہ رکھنے والا شیعہ نہیں تو پھر بھی اس کے ساتھ سنی لڑکی کا نکاح کرنا جائز نہیں، کیونکہ وہ سنی لڑکی کا کفو نہیں ہے۔

وفی الشامیة کتاب النکاح فصل فی المحرمات ج:۳ ص:۴۶ وبھٰذا ظهر أن الرّافضی ان کان ممّن یعتقد الألوهیة فی علی أو انّ جبریل غلط فی الوحی أو کان ینکر صحبة الصدیق أو یقذف السیّدة الصدیقة فهو کافر لمخالفته القواطع المعلومة من الدّین بالضرورة. وفی البحر الرّائق کتاب السیر باب احکام المرتدین ج:۳ ص:۱۲۱ (طبع سعید) ویکفّر من أراد بغض النبی صلی الله علیه وسلم .... وبعد أسطر بقذفه عائشة رضی الله عنها من نسائه صلی الله علیه وسلم فقط وبانکاره صحبة ابی بکر رضی الله عنه. وفی الهندیة کتاب النکاح الباب الثالث (طبع ماجدیه) ج:۱ ص:۲۸۲ ولا یجوز تزوّج المسلمة من مشرک ولا کتابی. وفی البدائع ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع سعید) ومنها اسلام الرّجل اذا کانت المرأة مسلمة فلا یجوز انکاح المؤمنة الکافر، لقوله تعالیٰ: "ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا" ولأنّ فی انکاح المؤمنة الکافر خوف وقوع المؤمنة فی الکفر .... الخ.

قادیانی سے نکاح کا حکم اور کیا مسلمان ہونے کے لئے سرٹیفکیٹ ضروری ہے؟

سوال:- عرض یہ ہے کہ ایک شخص جو قادیانی جماعت سے تعلق رکھتا ہے، کوئٹہ میں جعل سازی اور خورد بُرد کے مقدمات میں ملوّث تھا، فرار ہوکر کراچی آ گیا اور یہاں جعلی ڈاکٹر بن کر ڈاکٹر کیپٹن ایم اے خالد کے نام سے ملیرسٹی کراچی میں اپنا کلینک چلانے لگا، حالانکہ یہ شخص نہ ڈاکٹر تھا اور نہ کیپٹن، بلکہ کوئٹہ میں ایک کلرک کی حیثیت سے کام کرتا تھا، جہاں اس نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے کافی رقم خورد بُرد کرلی، جس کی وجہ سے اس کے خلاف جعل سازی، دھوکا دہی، فراڈ اور خورد بُرد کے متعدّد مقدمات قائم ہوئے، جن سے فرار ہوکر کراچی آ گیا، اور وہاں اشتہاری مجرم قرار دے دیا گیا، اپنی مجرمانہ ضرورت کے تحت اپنا نام اور مذہب تبدیل کرتا رہتا ہے، کچھ عرصہ قبل ہمارے مکان سے متصل میری پھوپھی کے مکان میں ظفر ہسپتال کے نام سے اپنا کلینک چلا رہا تھا، کرایہ وغیرہ کے سلسلے میں جھگڑا شروع ہوا، اور بات عدالت تک جا پہنچی، اس نے کرایہ داری کا مقدمہ دائر کردیا، عدالتی معاملات کو سنبھالنے کے لئے میرے والد صاحب نے اپنی بہن یعنی میری پھوپھی کی مدد کی، تو یہ شخص میرے والد کا دُشمن بن گیا، اور مختلف حیلے بہانے سے دونوں خاندانوں کو تنگ کرتا رہا، میرے والد سے بدلہ لینے کی خاطر اس نے روزانہ کالج آتے جاتے، میرا پیچھا کرنا شروع کردیا، کئی بار راستے میں مل کر مجھے اپنی محبت کا یقین دلاتا رہا، وقتی جذبات میں آ کر میں اس کی باتوں میں آ گئی، اور ایک دن اس نے مجھے ایک ہوٹل پر لے جاکر نکاح نامہ کے سادے فارم پر دستخط کروالئے، ساتھ ہی دو اسٹامپ پیپروں پر بھی دستخط کروالئے، نکاح نامہ کے فارم اور اسٹامپ پیپروں کی خانہ پُری بعد میں کی گئی، اس نکاح کا میرے والدین اور کسی دُوسرے رشتہ دار کو کوئی علم نہ تھا، نہ ہی ان کی مرضی شامل تھی، نکاح کی اس کاروائی کے وقت کوئی نکاح خواں یا قاضی موجود نہیں تھا، اور نہ ہی کوئی گواہ موجود تھا، بلکہ اس وقت ہم دو افراد کے علاوہ کوئی تیسرا شخص بھی موجود نہیں تھا، نہ ہی میں نے زبان سے اقرار کیا اور نہ اس نے اپنی زبان سے کچھ الفاظ ادا کئے، بس اس کے کہنے پر میں نے فارم پر دستخط کردیئے اور اپنے گھر واپس آ گئی، اس کے بعد کی کاروائی کا مجھے علم نہیں تھا، شادی کے تمام گواہوں کے نام اور مہر کی رقم وغیرہ کا تعین بعد میں اس نے اپنی مرضی سے کیا، یہاں تک کہ دُلہن کے گواہوں کے نام کے خانے میں جن افراد کے نام لکھے گئے ہیں، میں ان سے قطعی طور پر ناواقف ہوں، اس کے بعد ان کاغذات کے بل بوتے پر وہ مجھے بلیک

میل کرتا رہا، میرے گھر والوں کو مجھے زبردستی لے جانے کی دھمکیاں دیتا رہا، اور دو مرتبہ چند افراد کے ہمراہ گھر کے اندر داخل ہوکر زبردستی لے جانے کی کوشش کی، میں اس کے ساتھ جانے پر رضامند نہیں تھی، اس لئے عدالت میں خلع کا مقدمہ دائر کردیا، جو ابھی زیرِ سماعت ہے۔

یہ شخص قادیانی جماعت سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کا پورا خاندان کٹر قادیانی ہے، خود کو مسلمان ظاہر کرنے کے لئے اس نے کسی مولوی سے قادیانی مذہب ترک کرنے اور مسلمان ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا، یہ سرٹیفکیٹ اس نے مجھ سے نکاح کرنے سے صرف بیس دن پہلے حاصل کیا اور مجھے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ مسلمان ہوگیا ہے، حالانکہ وہ اس سے پہلے ایک مسلمان لڑکی سے شادی کرچکا ہے اور اس کے چار بچے بھی ہیں، اس کا اصل نام خالد سیف اللہ ولد عطاء الرحمٰن ہے، جبکہ میرے نکاح نامہ میں اس نے اپنا نام منوّر احمد لکھا ہے، اور اپنے والد کا نام محمد عظیم لکھا ہے، اور مسلمان ہونے کے سرٹیفکیٹ میں اس نے اپنا نام نور احمد ولد عطاء الرحمٰن ایم اے لکھا ہے۔

میرے خاندان کے دُوسرے لوگوں کو بھی تنگ کرنے کے لئے ان پر جھوٹے مقدمات کردیئے اور خلع کا ایک مقدمہ میرے جعلی دستخط سے میری طرف سے خود ہی عدالت میں دائر کردیا، اور اس کے جواب میں مجھ پر اور میرے گھر والوں پر بے بنیاد جھوٹے الزامات عائد کردیئے، اپنی کاغذی کاروائی کو مزید مضبوط کرنے کے لئے میرا ایک شناختی کارڈ میرے جعلی دستخط سے بنوالیا، جس میں میرا نام نفیس فاطمہ زوجہ منوّر احمد درج کروایا، اس کے علاوہ اپنے ایک دوست مسمّٰی عبدالرشید کے حق میں ایک فرضی اور جھوٹا امانت نامہ مالیتی چالیس ہزار روپے میرے جعلی دستخط سے تیار کردیا، اور یہ تمام جعلی دستاویزات عدالت میں پیش کردیئے تاکہ کسی بھی طرح میری جان اس جھوٹے دھوکے باز قادیانی سے نہ چھوٹ سکے، کوئٹہ کے ادارہ تحفظِ ختمِ نبوّت کی اطلاع کے مطابق یہ شخص وہاں پر بھی ایک لڑکی کو اغواء کرکے اس کا جعلی نکاح نامہ تیار کرچکا ہے، اب سوال یہ ہے کہ:-

۱:- نکاح کی بیان کردہ صورتِ حال میں کیا میرا نکاح اس شخص سے ہوگیا؟ جبکہ نکاح نامہ میں اس نے غلط نام اور ولدیت استعمال کیا ہے، اور نکاح کی کاروائی تنہائی میں ہم دو افراد کے درمیان انجام پائی۔ ۲:- اور کیا یہ شخص قادیانی سے مسلمان ہوگیا ہے جبکہ اس نے مسلمان ہونے کے سرٹیفکیٹ میں بھی اپنا غلط نام اور ولدیت استعمال کی ہے، اور مسلمان ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے پہلے کے تمام کاغذات میں خود کو مسلمان ظاہر کرتا رہا ہے، شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں؟

جواب ۱:- اگر سوال میں ذکر کردہ واقعات دُرست ہیں تو مسماۃ نفیس فاطمہ کا نکاح مذکورہ

شخص خالد سیف اللہ سے نہیں ہوا، نکاح نامہ کے سادہ فارم پر صرف دستخط کردینے سے شرعاً نکاح منعقد نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے کم از کم دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول ضروری ہے۔[1] اس کے علاوہ اگر مذکورہ شخص اب بھی قادیانی ہے اور مسلمان ہونے کا سرٹیفکیٹ جھوٹا ہے، تو قادیانی مرد سے کسی مسلمان عورت کا نکاح شرعاً ہو ہی نہیں سکتا،[2] خواہ دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کیا ہو، لہٰذا اگر سوال میں ذکر کردہ واقعات دُرست ہیں تو نفیس فاطمہ کو اس کے خلاف خلع کا نہیں، بلکہ انخلاء زناشوئی کا مقدمہ کرنا چاہئے تھا۔

۲:- قادیانی سے مسلمان ہونا، درحقیقت قلبی عقائد کی تبدیلی اور ان کے اعلان پر موقوف ہے، اگر کوئی شخص قادیانی عقائد سے واقعۃً تائب ہوجائے، اور زبان سے اس کا اعلان کردے تو وہ مسلمان ہوسکتا ہے، خواہ اس کے پاس سرٹیفکیٹ نہ ہو، اور اگر دِل سے تائب نہ ہوا ہو تو محض جھوٹا سرٹیفکیٹ بنوالینے سے مسلمان نہیں ہوسکتا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۰۸/۸/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۹/۱۶۵۷ د)

شیعہ سے نکاح کا حکم

سوال:- رافضی شیعہ اور اثناعشری میں کوئی فرق ہے تو تحریر کیجئے، نیز ایسے عقائد رکھنے والوں سے کسی سنی العقیدہ عورت کا یا مرد کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ خلفائے ثلاثہؓ پر تبرّا پڑھتے ہیں، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ جس نے میرے صحابی کو تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی، جس نے مجھے تکلیف دی اس نے گویا خدا کو ناراض کیا، ان ارشادات کی روشنی میں نکاح کا کیا حکم ہے؟

جواب:- شیعوں کے بہت سے فرقے ہیں، وہ سب اپنے آپ کو شیعہ اور اثناعشری کہتے ہیں اور اہلِ سنت ان سب کو رافضی کہتے ہیں، یہ تمام فرقے علی الاطلاق کافر نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے جو لوگ حضرت علیؓ کی خدائی کے قائل ہوں یا قرآنِ کریم کو تحریف شدہ مانتے ہوں یا اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ پر تہمت لگاتے ہوں، یا اس قسم کے کسی اور کافرانہ عقیدے کے معتقد ہوں وہ تو کافر ہیں اور ان

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص: ۹ و ۲۱ وینعقد بایجاب من أحدھما وقبول من الأخر وشرط حضور شاھدین حرین أو حر وحرتین مکلّفین سامعین قولھما معًا. وفی الھدایۃ ج:۲ ص:۳۰۶ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ) ولا ینعقد نکاح المسلمین الّا بحضور شاھدین حرین عاقلین بالغین مسلمین.

(۲) وفی الھندیۃ کتاب النکاح الباب الثالث (طبع ماجدیہ) ج:۱ ص:۲۸۲ ولا یجوز تزوّج المسلمۃ من مشرک ولا کتابی. وفی البدائع ج:۲ ص:۲۵۳ (طبع سعید) ومنھا الاسلام فی نکاح المسلم والمسلمۃ. نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۵ ص:۱۹۶ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت).

سے نکاح نہیں ہوتا،[۱] لیکن جو لوگ اس قسم کے کفریہ عقائد نہ رکھتے ہوں وہ کافر نہیں ہیں، ان سے نکاح تو ہو جاتا ہے مگر مناسب نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۳۰/۲۸ الف)

حاجی عثمان کے پیروکار سے نکاح کا حکم

سوال:- ایک شخص حاجی عثمان صاحب کا معتقد ہے، اس کی خانقاہ میں جاتا ہے، اس کے بارے میں دریافت کرنا ہے:

۱:- اس سے رشتہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟
۲:- اگر رشتہ کرلیا جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا یا نہیں؟

جواب از مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب مدظلہم دارالافتاء والارشاد

حضراتِ اکابر مفتیانِ کرام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حاجی عثمان گمراہ ہے، ۵/شوال ۱۴۰۸ھ کو اکابر مفتیانِ کرام نے حاجی عثمان کو، دارالافتاء والارشاد ناظم آباد میں بلاکر اس سے مفصل گفتگو کی، اس کے نتیجے میں حاجی عثمان کے جو نظریات سامنے آئے ان کے بارے میں سب حضرات نے حاجی عثمان کے نام ایک نصیحت نامہ اپنے دستخطوں سے روانہ فرمایا، جس کے چند اقتباسات یہ ہیں:

۱:- آپ میں بیعت وارشاد کی اہلیت نہیں۔
۲:- آپ نے بیعت وارشاد کا سلسلہ جاری رکھا تو اس سے شدید گمراہی پھیلنے کا سخت خطرہ ہے۔
۳:- آپ کے بعض معتقدات اہلِ حق کے معتقدات کے خلاف ہیں:
۱:- اپنی تحقیق یا استخارہ کو بالکل قطعی اور یقینی سمجھنا۔
۲:- ایک خلیفہ کے مشاہدے کی بناء پر ایک صحیح حدیث کا انکار کرنا۔
۴:- یہ سب انتہائی خطرناک اور گمراہانہ خیالات ہیں، جس سے زندقہ کی راہ کھلتی ہے۔
۵:- مکاشفہ، مشاہدہ یا اِلہام کی بناء پر شریعت کے کسی بھی حکم یا دلیل کا انکار کھلی ہوئی گمراہی ہے۔
۶:- آپ کے خلیفہ کا مشاہدہ ایک صحیح حدیث کے خلاف ہوا تو آپ کو کوئی تردّد پیدا نہیں ہوا،

---

(۱) وفی الشامیة کتاب النکاح فصل فی المحرمات ج:۳ ص:۴۶ وبهذا ظهر أن الرّافضی ان کان ممّن یعتقد الألوهیة فی علی أو أنّ جبریل غلط فی الوحی او کان ینکر صحبة الصدیق أو یقذف السیّدة الصدیقة فهو کافر لمخالفته القواطع المعلومة من الدِّین بالضّرورة. وفی البحر الرائق، کتاب الجهاد، باب أحکام المرتدین ج:۳ ص:۱۲۱ (طبع سعید) ویکفر من أراد بغض النبی صلی الله علیه وسلم .... وبعد أسطر وبقذفه عائشة رضی الله عنها من نسائه صلی الله علیه وسلم فقط وبانکاره صحبة أبی بکر رضی الله عنه. نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۵ ص:۱۹۵.

لیکن جب آپ کے ایک مریدزادہ ''چاند میاں'' کی شادی کے بارے میں اس خلیفہ کا مشاہدہ آپ کے استخارہ کے خلاف ہوا تو تردّد پیدا ہوگیا، آپ نے اپنے استخارہ کے نتیجے کو ایک صحیح حدیث سے بھی زیادہ فوقیت دی۔

۷:- جو خلیفہ خود آپ کے بقول سالہا سال تک حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان باندھتا رہا اس کو اپنی طرف سے نہ صرف ''کامل'' ہونے بلکہ ''اکمل'' کے قریب ہونے کی گواہی دی، بلکہ اسے یہ سند بھی عطا کی کہ وہ ''غوث'' اور فرد کی منزلیں طے کرچکا ہے اور ''قطب وحدت'' کے منصب پر پہنچ گیا ہے۔

۸:- مریدین کی اصلاح وتربیت اور نگرانی کی، آپ میں ہرگز صلاحیت نہیں۔

۹:- حضرت مولانا فقیر محمد صاحب مدظلہم العالی نے خلافت سلب فرمائی تو پھر آپ نے حضرت مولانا کی طرف رُجوع کر کے ان اسباب کے ازالے کی کوشش نہ کی جن کی بناء پر خلافت سلب ہوئی تھی، بلکہ آپ نے بیعت لینے کا سلسلہ بدستور جاری رکھا، آپ کا یہ طرزِ عمل طریقت وسلوک کے بنیادی اُصولوں کے بھی خلاف تھا، شیخ کی ناراضگی کے اسباب دُور کرنے کے بجائے اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بیعت کا سلسلہ جاری رکھنا طریقت وسلوک کے ابجد کے بھی خلاف ہے، جو شخص اپنے شیخ کے حکم کی اطاعت نہ کرے وہ اپنے مریدوں سے اطاعت کرانے کا اہل کیسے ہوسکتا ہے؟

۱۰:- آپ کا طرزِ عمل طریقت وسلوک کے مُسلَّم بنیادی اُصولوں کے خلاف ہے۔

۱۱:- آپ کے پاس اتنا علم نہیں جو ایک شیخِ طریقت کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

۱۲:- طریقت وسلوک میں پیش آنے والے مراحل کے بارے میں آپ کے خیالات و تصوّرات ومعتقدات دُرست نہیں۔

۱۳:- نہ مریدین کی اصلاح وتربیت کے بنیادی تقاضوں سے واقفیت ہے۔

۱۴:- نہ کسی شیخ محقق کے ساتھ آپ نے کوئی رابطہ رکھا ہے۔

۱۵:- آپ کے لئے اصلاح اور ارشاد کا سلسلہ جاری رکھنا شرعاً ہرگز جائز نہیں۔

۱۶:- نہ کسی مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ آپ کے ساتھ مریدی کا تعلق قائم کرے۔

۱۷:- آپ اپنے غلط خیالات اور غلط طرزِ عمل سے تائب ہوں۔

۱۸:- خانقاہ کا یہ سلسلہ اور بیعت لینا موقوف کردیں اور اس کا اعلان کریں۔

۱۹:- دُوسروں کی اصلاح کی فکر میں پڑنے کی بجائے اپنی اصلاح کی فکر کریں۔

۲۰:- اصلاحِ خلق کا خیال دِل سے نکال کر خالص اپنی اصلاح کے لئے اپنے آپ کو شیخ کے

حوالے کریں، اور صرف رسمی تعلق کی بجائے اپنے معاملے کو ان کے سامنے پیش کریں، ان سے ہدایات لیں اور ان کا مکمل اتباع کریں، خواہ وہ ہدایات آپ کی اپنی رائے، تحقیق، مکاشفات وغیرہ کے کتنی خلاف ہوں، یہی آپ کے لئے راہِ نجات ہے، ورنہ آپ بہت خطرناک راستے پر پڑ چکے ہیں۔

۲۱:- آپ کے لئے عزت کا راستہ یہی ہے کہ از خود اس مشورہ پر عمل کرلیں۔

حاجی عثمان نے اس نصیحت نامے کی طرف کوئی توجہ نہ دی، تو آپ کے شیخ نے دوبارہ خلافت سلب کرنے کا اعلان فرمایا، اور حاجی عثمان کو توبہ کی تلقین فرمائی ہے، وہ اس پر بھی تائب نہ ہوا تو شیخ نے تحریر فرمایا:-

اگر حاجی عثمان تکبر کرے اور فساد کرے تو فساد کو روکنے کے لئے حکومت کے ذریعے انتظام کرنا۔

اس تفصیل کے بعد سوالات کے جوابات لکھے جاتے ہیں:-

۱:- ایسے گمراہ شخص کے مرید یا معتقد سے رشتہ کرنا جائز نہیں۔

۲:- کسی ناجائز اور حرام کام کے بارے میں یہ دریافت کرنا کہ کرلیا جائے تو کیا ہو جائے گا یا نہیں؟ سخت گناہ ہے، بلکہ اس پر کفر کا خطرہ ہے، اس لئے کہ نفس پرستی کے لئے ارتکابِ حرام میں اَحکامِ شریعت کی تخفیف و توہین ہے۔

علاوہ ازیں حاجی عثمان جس ڈگر پر چل رہا ہے، پھر اتنے بڑے اکابر علماء و مفتیانِ کرام کے علاوہ خود اپنے شیخ کے سمجھانے پر بھی باز نہیں آرہا، اس کے اور اس کے مریدین و معتقدین کا کسی بھی وقت کفر تک پہنچ جانا کوئی بعید نہیں، العیاذ باللہ ایسی حالت میں اس نکاح کا انجام کیا ہوگا؟ عمر بھر حرام کاری اور اولاد ولد الزنا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	عبدالرحیم
رشید احمد	ولی حسن	نائب مفتی دارالافتاء والارشاد
دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی	جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی	۴ ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ

جواب:- از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

۱:- ہمیں اس بات سے اتفاق ہے کہ حاجی عثمان صاحب کے عقائد سے متعلق جو اُمور جواب میں بیان کئے گئے ہیں، وہ گمراہانہ عقائد ہیں، ایسے گمراہانہ عقائد کے حامل کسی شخص سے یا اس کے کسی پیروکار سے نکاح کرنا ناجائز ہے۔

۲:- اگر نکاح کر ہی لیا تو، خواہ وہ منعقد ہو جائے، مگر سخت گناہ کا کام ہوگا۔

الجواب صحیح	واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
دارالافتاء دارالعلوم کراچی	۱۴۰۹/۴/۶ھ
۱۴۰۹/۴/۶ھ	(فتویٰ نمبر ۶۱۱/۴۰ ب)

کافر شوہر پر اسلام پیش کرنے کے بعد اگر وہ مسلمان ہو جائے تو یہ نکاح برقرار رہے گا

سوال:- غیر مذہب کی ایک عورت ہے (یعنی ذکری) اس عورت کا خاوند بھی غیر مسلم ہے، اب وہ عورت مسلمان ہونا چاہتی ہے اور وہ عورت کہتی ہے کہ میرا خاوند مجھے ناجائز تنگ کرتا ہے، میرا لڑکا ہر وقت شراب نوشی کر کے تنگ کرتا ہے، لڑکا کوئی کام نہیں کرتا، صبح و شام مجھ سے پیسے مانگتا ہے، اگر پیسے نہ ملیں تو مجھے مارتا پیٹتا ہے، جس کی وجہ سے میں تنگ آگئی ہوں، اس نے ایک مسلمان شخص سے کہا کہ مجھے تم کورٹ لے جاؤ، وہاں جاکر میں بیان دوں گی کہ میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں، اس شخص نے کہا کہ تمہارے شوہر نے طلاق نہیں دی تو میں کیسے نکاح کرلوں، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں پہلے عورت مسلمان ہو جائے اس کے بعد عدالت میں دعویٰ دائر کرے، عدالت اس کے شوہر پر اسلام کی پیشکش کرے، اگر شوہر بھی مسلمان ہوگیا تو ان کا نکاح برقرار رہے گا، اور اگر اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا تو عدالت دونوں کا نکاح فسخ کردے، اس فسخِ نکاح کے بعد عورت عدتِ طلاق گزار کر کسی مسلمان سے نکاح کر سکے گی۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۶/۲۸ الف)

کافر شوہر کے نکاح سے نکلنے کا طریقہ

سوال:- ایک غیر مسلم عورت مسلمان ہونا چاہتی ہے، اس عورت کا شوہر بھی زندہ ہے، وہ بھی غیر مسلم ہے، اس کا ایک لڑکا ہے جو شراب نوشی کر کے ماں کو مارتا ہے، عورت شوہر کو کہتی ہے کہ لڑکے کو سمجھاؤ تو شوہر کہتا ہے میں نہیں کہوں گا، آپ جدھر جانا چاہیں چلی جائیں، اس عورت نے

---

(۱) اس فتویٰ کے تفصیلی حوالہ جات اسی جواب پر دوبارہ آئے ہوئے سوال کے جواب میں لکھے گئے اگلے فتویٰ کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

مسلمان ہوکر کسی مسلمان سے شادی کرنے کا اقرار کرلیا ہے، اس کے جواب میں آپ نے لکھا ہے کہ عورت مسلمان ہوجائے اور عدالت میں دعویٰ دائر کرے، پھر عدالت شوہر کو مسلمان ہونے کی پیشکش کرے اور شوہر مسلمان ہوجائے تو دونوں کا نکاح برقرار رہے گا، اور عدتِ طلاق گزار کر کسی بھی مسلمان سے نکاح کرسکتی ہے، لوگوں کو بھی اس کے مسلمان ہونے کا علم ہوگیا ہے، اب اس کو جان سے ماردیں گے، لہٰذا عدت گزارنا اور عدالت میں مقدمہ پیش کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے، کیا یہ عورت مسلمان ہوکر کسی مسلمان سے نکاح کرے، یہ صورت جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- کافر شوہر کے نکاح سے نکلنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عدالت میں دعویٰ کرکے شوہر پر اسلام پیش کیا جائے، وہ انکار کرے تو قاضی تفریق کردے[1]، اس کے بغیر عورت کا دُوسری جگہ نکاح نہیں ہوسکتا، اور عورت کو شوہر سے جان کا خطرہ ہو تو مسلمانوں کی پناہ حاصل کرلے، **وما لم یفرق القاضی فھی زوجته.** (شامی ج:۲ ص:۳۸۹)[2] ہاں! اگر شوہر نے خود طلاق دے دی ہو تو اسلام لاتے ہی نکاح کرسکتی ہے، لیکن محض گھر سے نکال دینے سے طلاق نہ ہوگی، تاوقتیکہ شوہر کے مذہب میں اس کو طلاق نہ سمجھا جاتا ہو۔ اور اگر ملکی قوانین کی رُو سے کوئی ایسا طریق کار موجود نہ ہو جس کے ذریعے عدالت شوہر کو بلاکر اس پر اسلام پیش کرے، تو اُس صورت میں عدت گزار کر دُوسری جگہ نکاح کی گنجائش ہوگی۔ **إما لأنه فی حکم دار الکفر فی ھذہ الجزئیة بخصوصھا، واما عملا بمذھب الأئمة الأخریٰ عند الضرورة۔**[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۳/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۷/۲۸ ب)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: تفسیر معارف القرآن ج:۸ ص:۴۱۳ اور حیلۂ ناجزہ ص:۱۰۵۔ وفی الدر المختار ج:۳ ص:۱۸۸ واذا اسلم أحد الزوجین المجوسیین او امرأة الکتابی عرض الاسلام علی الأخر، فان أسلم فبھا والّا بان أبی أو سکت فرق بینھما، وکذا فی الھدایة علی فتح القدیر ج:۳ ص:۲۸۸، والتاتارخانیة ج:۳ ص:۱۸۱، والھندیة ج:۱ ص:۳۳۸، وفی اعلاء السنن ج:۱۱ ص:۹۸ .... اذا أسلمت المرأة فی دار الاسلام وفیھما دلالة علی أنھا فی نکاح زوجھا حتی یعرض علیه الاسلام فیأبی فیفرّق القاضی أو الامام بینھما. وراجع أیضًا للتفصیل فتح القدیر ج:۳ ص۱۸۸، والبحر الرائق ج:۳ ص۲۱۱ والنتف فی الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۰۹.

(۲) ج:۳ ص:۱۸۹ (طبع سعید).

(۳) اِمام مالک، اِمام شافعی اور اِمام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک جب کسی غیرمسلم کی بیوی مسلمان ہوجائے تو اس کی عدت گزرتے ہی اس کا نکاح اس کے سابق شوہر سے خودبخود فسخ ہوجائے گا۔ فسخ کے لئے عدالت میں جانے کی ضرورت نہیں۔ فی المغنی لابن قدامة مع الشرح الکبیر ج:۷ ص:۵۳۶ (طبع دار الفکر بیروت) میں ہے:- اذا اسلم أحد الزّوجین وتخلف الأخر حتّی انقضت عدة المرأة انفسخ النکاح فی قول عامّة العلماء .... الخ. اس مسئلہ کی تحقیق اور ائمہ اربعہؒ کے مذاہب کی تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کا اس موضوع پر عدالتی فیصلہ ملاحظہ فرمائیں جو P.L.D ۱۹۸۸ء، ص:۱۷۰ تا ۲۱۷ میں موجود ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی الأنکحة الفاسدة والصحیحة﴾
(صحیح اور فاسد نکاح کے بیان میں)

چھ ماہ کی حاملہ عورت سے نکاح کا حکم

سوال:- کیا چھ ماہ کی حاملہ عورت سے نکاح جائز ہے؟

جواب:- اگر حمل کسی سابق شوہر سے ہے تو جب تک ولادت نہ ہوجائے، نکاح دُرست نہیں،[۱] اور اگر حمل زنا کا ہے تو نکاح ہوجائے گا،[۲] لیکن اگر نکاح کرنے والا وہ نہ ہو جس سے زنا کیا تھا تو نکاح کے بعد صحبت کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک بچے کی ولادت نہ ہوجائے۔[۳]

واللہ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۱۳/۳۲ ج)

ایامِ حیض میں نکاح جائز ہے

سوال:- کیا زمانۂ ایامِ حیض میں عقدِ شرعی ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- زمانۂ حیض میں نکاح تو منعقد ہوجاتا ہے، لیکن چونکہ ایسی حالت میں شوہر کے لئے جماع جائز نہیں ہے، اس لئے ایامِ حیض میں رُخصتی کرنا احتیاط کے خلاف ہے، اور اگر کسی مجبوری سے رُخصتی بھی ہوجائے تو شوہر کو جماع سے پرہیز لازم ہے۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۱۵/۲۱ الف)

---

(۱) کیونکہ ایسی صورت میں وہ عدّت میں ہوگی اور حاملہ کی عدّت وضعِ حمل ہے، لہٰذا وضعِ حمل سے پہلے کسی اور سے اس کا نکاح جائز نہیں، "وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ أَجَلَهٗ" (البقرة:۲۳۵)۔
وفی الهندیة کتاب النکاح، الباب الثالث ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع ماجدیه) لا یجوز للرّجل ان یتزوّج زوجة غیره وكذا المعتدة .... الخ۔
(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے سابقہ ص:۲۴۷ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے سابقہ ص:۲۴۸ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۴) "فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ" (الآیة) البقرة: ۲۲۲۔

نکاح خواں کے جواب میں ”لڑکی دی“ کے لفظ سے نکاح منعقد ہو جائے گا

سوال:- عرض اینکہ ایک لڑکی نے اپنے نکاح کا وکیل ایک شخص کو مقرّر کیا جو کہ اس کا محرَم نہ تھا، نکاح خواں نے ایجاب وقبول کراتے وقت لڑکی کے وکیل کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہے کہ: فلاں لڑکی فلاں کی بیٹی، فلاں لڑکا فلاں کا بیٹا تم نے بعوض اتنے روپے مہر کے قبول کی؟ اس کے جواب میں وکیل نے کہا: ”میں نے قبول کیا“ ایک دُوسرے آدمی نے صحیح کہنے کی غرض سے کہا کہ: اس طرح کہو کہ تم نے فلاں لڑکی فلاں کی بیٹی فلاں لڑکے کے لئے دی، وکیل نے کہا ”دی“، اس کے بعد لڑکے سے قبول کرایا گیا، آیا اس صورت میں نکاح کا انعقاد کس سے ہوا؟ وکیل سے یا لڑکے سے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں نکاح خواں نے دُوسری مرتبہ جو جملہ وکیل سے مخاطب ہوکر کہا، اور وکیل نے اس کے جواب میں کہا: ”دی“ اس سے نکاح منعقد ہوگیا،[1] اور لڑکے ہی سے نکاح ہوا، وکیل سے نہیں، یہ اس صورت میں ہے جبکہ لڑکی نے نکاح خواں کو وکیل بنادیا ہو،[2] ورنہ مذکورہ جملے کے بعد لڑکے سے جو ایجاب وقبول کرایا گیا، اس سے نکاح منعقد ہوگیا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۸/۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۱/۳۹ الف)

نکاح منعقد ہونے کے لئے گواہوں کا ایجاب وقبول کو سننا لازم ہے

سوال:- (عقد کے سلسلے میں موصولہ تحریر) میں مسمّٰی عبدالرحمٰن خان بن عبدالرحیم خان جو کہ مسماۃ صوفیہ افضال بنت افضال اللہ خان کی جانب سے اس کے نکاح خوانی کی تکمیل کے لئے وکیل مقرّر کیا گیا ہوں، شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ایجاب کی تکمیل کراچکا ہوں، اور پاکستان دستور مسلم فیملی لاء کے مطابق اس تحریر کو جناب ارشاد علی خان ولد جناب جواد علی خان کو ارسال کرتا ہوں کہ وہ میرا فریضہ انجام دہی کے لئے نکاح خوانی کے متعلق وکیل کی نیابت قبول کریں اور نکاح خوانی کی مجلس

---

(۱) وفی رد المحتار کتاب النکاح ج:۳ ص:۱۱، لو قال هل أعطیتنیها فقال أعطیت ان کان المجلس للوعد فوعد وان کان للعقد فنکاح. وفی ردالمحتار أیضًا ج:۳ ص:۱۲ (قوله ان المجلس للنکاح) أی لانشاء عقده لأنه یفهم منه التحقیق فی الحال فاذا قال الأخر أعطیتکها أو فعلت لزم .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۹ (طبع سعید) وینعقد متلبسًا بایجاب من أحدهما وقبول من الأخر کزوّجت نفسی او بنتی او مؤکلتی منک. وفی الشامیة (قوله کزوّجت نفسی) أشار الٰی عدم الفرق بین أن یکون الموجب أصیلا أو ولیًا أو وکیلًا.

منعقدہ لطیف آباد (حیدرآباد) پاکستان میں مسمّی معید الظفر خان عرف ممو خان بن جناب عبدالرشید خان صاحب کو قبولیت کرائیں۔

۱:- یہ کہ میں مہر مؤجل ۹ ہزار روپیہ سکۂ پاکستانی کے بالعوض اپنی مؤکلہ مسماۃ صوفیہ افضال دختر افضال اللہ خان صاحب کو بحق مسمّیٰ معید الظفر خان عرف ممو خان بن عبدالرشید خان صاحب کے نکاح و زوجیت میں دیتا ہوں۔

۲:- کہ میں مہرِ مؤجل ۹ ہزار روپیہ سکہ پاکستانی کے بالعوض اپنی مؤکلہ مسماۃ صوفیہ افضال دختر افضال اللہ خان صاحب کو بحق مسمّیٰ معید الظفر خان عرف ممو خان بن عبدالرشید خان صاحب کے نکاح و زوجیت میں دیتا ہوں۔

۳:- میں مہرِ مؤجل ۹ ہزار روپیہ سکہ پاکستانی کے بالعوض اپنی مؤکلہ مسماۃ صوفیہ افضال دختر افضال اللہ خان صاحب کو مسمّیٰ معید الظفر خان عرف ممو خان بن عبدالرشید خان صاحب کے نکاح و زوجیت میں دیتا ہوں۔

عبدالرحمٰن خان، وکیل

تحریرِ بالا لڑکی کے والد کی لکھی ہوئی ہے، اور دستخط عبدالرحمٰن خان صاحب کے ہیں، لہٰذا معلوم کرنا ہے کہ اس تحریر کے مطابق نکاح خوانی انجام پاسکتی ہے؟

جواب:- نکاح میں یہ ضروری ہے کہ نکاح کے گواہ ایجاب وقبول دونوں کو سنیں[1]، لہٰذا یہ تحریر انعقادِ نکاح کے لئے کافی نہیں ہے، البتہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ لڑکی کا کوئی وکیل بذاتِ خود حیدرآباد جاکر لڑکی کی طرف سے ایجاب کرے اور لڑکا اُسی مجلس میں قبول کرے، اور گواہ ایجاب وقبول کو سن لیں۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

گواہوں کا فسق انعقادِ نکاح میں مانع نہیں، مگر ثبوتِ نکاح میں مانع ہے

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں ایک شخص نے اپنی لڑکی کی منگنی اپنے ایک رشتہ دار کے لڑکے سے کردی، منگنی کے وقت لڑکی اور لڑکا دونوں نابالغ تھے، کچھ عرصہ کے بعد نااتفاقی ہونے کے سبب لڑکی والوں نے جواب دے دیا کہ ہم تم سے رشتہ کرنا ہی نہیں

(۱، ۲) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۹ (طبع سعید) وینعقد متلبسا بایجاب من احدهما وقبول من الأخر. وفیه أیضًا ج:۳ ص:۲۱ وشرط حضور شاهدین حرّین أو حرّ و حرّتین مکلّفین سامعین قولهما معًا.

چاہتے اور جو کچھ منگنی کے وقت لڑکے والوں نے دیا تھا وہ ان کو واپس کر دیا، اور انہوں نے اپنی چیزیں واپس لے لیں اور اب تک نکاح کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، کچھ عرصے کے بعد لڑکی والوں نے اس لڑکی کا دُوسری جگہ رشتہ کرنا چاہا تو لڑکے والوں نے یہ کہا کہ اس لڑکی سے ہمارا نکاح ہے، جس کے ایسے دو شخصوں کو گواہ مقرّر کر دیا جن کی سیرت حرام کاری میں بہت زیادہ داغدار ہے، یعنی پرلے درجے کے فاسق و فاجر ہیں، نیز وہ دونوں گواہ جس شخص کا لڑکا ہے اس کا ایک بھتیجا اور دُوسرا بہنوئی ہے، جو ایک وہاں سے چودہ میل اور دُوسرا سات، آٹھ میل پر رہتا ہے، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم رات کے وقت گئے اور انہوں نے اپنی لڑکی کا نکاح کر کے دیا۔ لڑکی والے حلفاً بیان کرتے ہیں کہ ہم نے کوئی نکاح کر کے نہیں دیا، یہ لوگ فقط ہمیں بدنام کرنے اور ہمارے کام میں روڑے اٹکانے کے لئے پروپیگنڈا کر رہے ہیں، نیز لڑکی والوں کے آس پاس والے خواہ ان کے رشتہ دار ہوں یا دُوسری قوم کے آدمی ہوں، سب یہ کہتے ہیں کہ اس نکاح کا ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ نیز جس نکاح خواں کا لڑکے والے نام لیتے ہیں کہ فلاں شخص نے نکاح پڑھایا ہے وہ شخص بھی آج سے عرصہ چار پانچ سال پہلے انتقال کر چکا ہے، حاصل یہ ہے کہ ان کے پاس سوا ان دو گواہوں کے اور کوئی ثبوت، نکاح کا نہیں ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس لڑکی کا نکاح لڑکے والوں کے دعوے کے مطابق شرعاً ثابت ہوگا یا نہیں؟

۲:- جس قسم کے یہ گواہ ہیں، اس قسم کے فاسق و فاجر گواہان کی گواہی شرعاً قبول ہے یا نہیں، جبکہ وہ خود حرام کاری میں مبتلا ہیں اور بے نکاحی عورتوں کو گھر میں بٹھانے کے عادی ہیں، اگر یہ نکاح شرعاً ثابت نہیں تو اس لڑکی کا نکاح دُوسری جگہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۳:- لڑکے والوں کا بھتیجا اور بہنوئی شرعاً ان کی گواہی معتبر ہے یا نہیں؟ نیز اگر شرعاً اس لڑکی کا نکاح ان گواہوں سے ثابت ہوجائے تو لڑکی والوں کے لئے کیا حکم ہوگا؟ یعنی کیا ان کی قسم پر اعتبار کیا جائے گا یا ان کو لڑکی بیاہ کر دینی ہوگی، اس کا جواب فقہِ حنفی کے مطابق مفصل تحریر فرما کر بحوالہ کتبِ فقہ مشکور فرمادیں۔

جواب:- مفتی عالم الغیب نہیں ہوتا، بلکہ اس سے جو سوال کیا جائے اس کے حکم کے مطابق جواب دے سکتا ہے، معاملہ حلال و حرام کا ہے، اس لئے دونوں فریق خوب سمجھ لیں کہ اگر واقعۃً نکاح ہوچکا تو لڑکی کو بھیجنا لازم ہے، محض جھوٹی قسمیں کھانے سے آخرت کا عذاب نہیں ٹل سکتا۔ اور اگر نکاح نہیں ہوا تھا تو محض دو جھوٹے گواہ پیش کرنے سے آخرت کا عذاب نہیں ٹل سکتا، اس لئے دونوں فریقوں کو اپنی قبر اور آخرت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے۔ یہ حکم تو دیانت کا ہے، اور اگر معاملہ شرعی عدالت میں جائے تو صورتِ مسئولہ میں چونکہ دونوں گواہ فاسق و فاجر اور جھوٹ بولنے میں مشہور ہیں،

اس لئے صرف ان کی گواہی پر نکاح کا فیصلہ نہیں ہوسکتا، ہاں! اگر ان گواہوں میں شرعی شرائط پائی جاتی ہوں تو ان کی گواہی سے قاضی نکاح کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ واضح رہے کہ گواہوں کا فسق انعقادِ نکاح سے تو مانع نہیں، لیکن ثبوتِ نکاح کے لئے قابلِ اعتماد گواہ ہونے ضروری ہیں۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۱۶/۳۰ د)

بالغ لڑکے کی عدمِ منظوری سے نکاح منعقد نہیں ہوتا

سوال:- ایک نابالغ لڑکی کو والد کی موجودگی میں چچا نے ایک دُوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرادیا تھا، اور لڑکے کے باپ نے لڑکی کی طرف سے قبول کیا لڑکا اس وقت بالغ تھا، نہ لڑکے کو یہ پیغام اس وقت سنایا ہے، اور نہ زوج نے منکوحہ کو دیکھا ہے، اور لڑکی نے اس کو دیکھا ہے، اور عین نکاح کے وقت ایک تولہ سونا مہر لڑکی کے حوالے کردیا، چند ماہ بعد لڑکی کے والدین نے برما سے ہجرت کا قصد کرلیا تو لڑکے کے والدین کو بولا، لیکن انہوں نے انکار کردیا، (اس وقت نکاح نہیں ہوا تھا) اس میں اَن بن ہونے کی وجہ سے مذکورہ دیا ہوا مہر واپس کردیا گیا اور لڑکے کے والدین نے لے لیا، جب لڑکی کے والدین کراچی آئے تو اس لڑکے کے چچا نے ایک خط برما بھیجا، جس میں لکھا تھا کہ لڑکی کو دُوسرے آدمی کے نکاح میں دے دو، کراچی میں والد نے دُوسرے شخص کے ساتھ نکاح کی بات چیت کرلی تھی، مگر لڑکی جس وقت بالغ ہوئی تو وہ اس شخص پر راضی نہ تھی، جس کی وجہ سے لڑکی والدین کے گھر سے نکل کر چلی گئی اور اپنی خوشی سے ایک لڑکے کے ساتھ نکاح کرلیا، اب والدین لڑکی پر زور ڈال رہے ہیں کہ لڑکی کا نکاحِ اوّل اب تک باقی ہے، کیا نکاحِ اوّل ہنوز باقی ہے؟

تنقیح:-

۱:- لڑکی کے باپ نے اس نکاح کو منظور کیا تھا یا نہیں؟
۲:- لڑکے نے زبان سے اس نکاح کو منظور کیا تھا یا نہیں؟
۳:- جس وقت لڑکی بالغ ہوئی، اس وقت اس نے اپنے نکاح کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا؟

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۲۱ الی ۲۳ (طبع سعید) وشرط حضور شاهدین .... مسلمین لنکاح مسلمة ولو فاسقین أو محدودین فی قذف .... الخ. وفی ردّ المحتار قوله (ولو فاسقین) اعلم أن النکاح له حکمان، حکم الانعقاد، وحکم الاظهار، فالأوّل ما ذکره والثانی انّما یکون عند التجاحد فلا یقبل فی الاظهار الا شهادة من تقبل شهادته فی سائر الأحکام .... الخ. وفی الدر المختار کتاب الشهادات ج:۵ ص:۴۶۵ (طبع سعید) ونصابها لغیرها من الحقوق سواء کان الحق مالا أو غیره کنکاح وطلاق ووکالة .... رجلان أو رجل وامرأتان ولزم فی الکل لفظ أشهد لقبولها والعدالة لوجوبه فی البنابیع العدل من لم یطعن علیه فی بطن ولا فرج. وفی الشامیة (قوله العدل) قال فی الذّخیرة: واحسن ما قیل فی تفسیر العدالة أن یکون مجتنبًا للکبائر، ولا یکون مصرًا علی الصغائر، ویکون صلاحه أکثر من فساده وصوابه أکثر من خطئه .... الخ.

ان سوالات کے جواب آنے پر اصل مسئلے کا جواب دیا جائے گا۔

جوابِ تنقیح:-

۱:- جس وقت چچا نے لڑکی کو نکاح دیا تھا اس پر باپ راضی تھا۔

۲:- لڑکے نے زبان سے اس نکاح کو منظور نہیں کیا بلکہ صرف لڑکے کے باپ نے منظور کیا۔

۳:- لڑکی جب بالغ ہوئی، کوئی رویہ اختیار نہیں کیا، صرف لڑکے کی طرف سے کچھ بات چیت ہوئی تھی اور ایک مہر دیا تھا، پھر واپس کرلیا۔

جواب:- جبکہ لڑکا بوقتِ نکاح بالغ تھا اور اس نے نہ خود مجلس میں شرکت کی، اور نہ بعد میں اسے منظور کیا تھا، تو یہ نکاح شرعاً منعقد ہی نہیں ہوا، لہٰذا لڑکی آزاد ہے، جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۶/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۲/ ۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۶/۷ھ

بالغہ لڑکی کا نکاح اُس کی اجازت کے بغیر دُرست نہیں

سوال:- ایک لڑکی بالغہ کا نکاح پڑھایا جائے اور اس میں لڑکی سے کسی نے نہیں پوچھا اور لڑکی موقع پر موجود بھی نہیں، اور نہ لڑکی کا باقاعدہ شرع کے مطابق کوئی وکیل ہے، کیا اس حالت میں نکاح منعقد ہوجائے گا یا نہیں؟

۲:- لڑکی کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے انکار کردیا، اور اب بھی تقریباً تین سال گزرنے کے بعد بھی انکار کرتی ہے۔

۳:- لڑکا، جس کے والد نکاح کے دعویدار ہیں، وہ لڑکا اس وقت ہیروئن پیتا ہے، چرس اور ہر قسم کے نشے اور جوئے کا عادی ہے، اور فی الحال اس جرم کی پاداش میں جیل میں بند ہے، کیا مندرجہ بالا تفصیل کے ساتھ یہ نکاح ہوگیا ہے؟ اگر نہیں ہوا تو چھڑانے کے لئے طلاق تو لینی نہیں پڑے گی؟ اگر نکاح ثابت ہوچکا ہے تو نمبر ۳ میں بیان کردہ وجوہات کی بناء پر اس لڑکی سے شادی کرسکتا ہے یا لڑکی کے والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ لڑکی کی شادی نہ کرائیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔

جواب:- اگر یہ دُرست ہے کہ نکاح کے وقت نہ لڑکی سے پوچھا گیا، نہ لڑکی نے کسی کو نکاح کا وکیل بنایا، نہ نکاح کی اجازت دی اور نہ وہ نکاح کے وقت موجود تھی اور بعد میں بھی جب اسے نکاح

کی اطلاع ہوئی تو اس نے نکاح کو منظور نہیں کیا تو یہ نکاح شرعاً منعقد ہی نہیں ہوا،[۱] لہٰذا لڑکی جہاں چاہے اپنا نکاح کر سکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۷/۵/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۷۴۹/۳۸ ب)

دُوسرے کے کئے ہوئے نکاح کی عملی اجازت دینے سے نکاح منعقد ہو جائے گا

سوال:- ایک شخص کے لئے اس کے بھائی نے نکاح کر دیا، جب وہ آیا تو اس نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے تو بالکل معلوم نہیں اور نہ مجھ سے کسی نے پوچھا ہے، تو کیا یہ نکاح صحیح ہے؟ اور اس کے بعد یہ شخص اپنی بیوی کو لینے کے لئے گیا ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب نکاح کا عقد اس شخص کے بھائیوں نے اس کی عدم موجودگی میں کیا تو اگر اس کی اجازت سے ایسا کیا تھا تو وہ بھائی وکیلِ نکاح ہوگئے اور ان کا ایجاب و قبول کرنا کافی ہوگیا۔ اور اگر بھائیوں نے نکاح کرتے وقت اس شخص سے اجازت نہیں لی تھی تو وہ نکاحِ فضولی ہوا، اور اس کے بعد جب یہ شخص اپنی بیوی کو لینے کے لئے گیا تو اس کا جا کر بیوی کو لے آنا عملاً نکاح کی اجازت ہے، اس لئے کہ اگرچہ عقدِ نکاح تو تعاطی سے نہیں ہوسکتا، لیکن فضولی کے کئے ہوئے نکاح کی اجازت عمل سے ہوسکتی ہے، قال الشامی رحمہ اللہ: وھل یکون القبول بالفعل کالقبول باللفظ کما فی البیع. قال فی البزازیة .... أنه یکون قبولًا وأنکرہ صاحب المحیط وقال الامام ما لم یقل بلسانه قبلت بخلاف البیع .... وبخلاف اجازة نکاح الفضولی بالفعل لوجود القول ثمه اھ (شامی ج:۲ ص:۲۶۵)۔[۲] لہٰذا یہ نکاح دُرست ہوگیا اور اب ازسرِنو ایجاب و قبول کی ضرورت نہیں، لیکن یہ حکم اس وقت ہے جبکہ بھائیوں نے عقدِ نکاح گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و

---

(۱) وفی الهندية كتاب النكاح الباب الرابع ج:۱ ص:۲۸۷ (طبع ماجديه) لا يجوز نكاح أحد على بالغة صحيحة العقل من أب أو سلطان بغير اذنها بكرًا كانت أو ثيبًا فان فعل ذلك فالنكاح موقوف على اجازتها فان أجازته جاز وان ردّته بطل .... الخ. وفی الدر المختار، كتاب النكاح، باب الولی ج:۳ ص:۵۸ (طبع سعيد) ولا تجبر البالغة البكر على النكاح لانقطاع الولاية بالبلوغ. وفی الهداية كتاب النكاح ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع شركت علميه) وينعقد نكاح الحرّة العاقلة البالغة برضائها .... الخ.

(۲) ردّ المحتار كتاب النكاح قبيل مطلب التزوّج بارسال كتاب ج:۳ ص:۱۲ (طبع سعيد).

وفی الهندية كتاب النكاح، الباب الرّابع فی الأولياء ج:۱ ص:۲۹۹ (طبع ماجديه) وتثبت الاجازة لنكاح الفضولی بالقول والفعل. كذا فی البحر الرّائق.

وفی البحر الرائق كتاب النكاح باب الأولياء والأكفاء ج:۳ ص:۱۲۳ (طبع بيروت وفی طبع مكتبه رشيديه كوئٹه ج:۳ ص:۱۱۵) رجل زوّج رجلًا بغير امره فهنّاه القوم وقبل التهنئة فهو رضا لأنّ قبول التهنئة دليل الاجازة.

قبول کر کے کیا ہو، اگر کوئی اور صورت ہوئی تھی تو دوبارہ مسئلہ پوچھ لیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۴۶۶/۲۲ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

بالغ لڑکی کا، نکاح کی منظوری دینے کے بعد انکار کرنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام شرع متین اس مسئلے کے بارے میں؟ فتویٰ چاہتا ہوں۔ مسئلہ:- اگر فرض کیا کہ ایک عاقلہ، بالغہ اور مسلمان لڑکی رُو بروئے پنچایت یا عدالت وغیرہ، نکاح کے بعد یہ بیان دیتی ہے کہ اُس نے نکاح اپنی بلوغت کی عمر میں اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا، بلکہ اپنی حقیقی ماں کا دِل رکھنے کے لئے کیا تھا، تو اس نکاح کی قرآن وسنت کی روشنی میں کیا حیثیت ہے؟ اور اس بیان کی کیا حیثیت ہے؟ میرے خیال کے مطابق لڑکی کا یہ بیان اُس وقت قابلِ قبول ہونا چاہئے جبکہ لڑکی کا نکاح نابالغی کی عمر میں ہوا ہو اور لڑکی بالغ ہونے کے بعد بقائمی ہوش وحواسِ خمسہ بیان مذکورہ بالا دے، تو پھر قابلِ قبول نہیں ہونا چاہئے، فتویٰ صادر کیجئے اور یہ بھی تحریر کیجئے کہ ان حالات میں اسلامی قانون کی روشنی میں لڑکی اور اُسے اُکسانے والوں کے لئے کیا سزا تجویز ہے؟

جواب:- جب لڑکی بالغ ہو اور اس نے نکاح کی منظوری دے دی ہو تو نکاح ہوگیا[1]، بعد میں اس کا یہ کہنا کہ میں نے والدہ کا دِل رکھنے کے لئے کہا تھا، اس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نکاح قائم ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۰/۴/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۳/۱۰)

کیا شوہر کو قتل کروانے کے بعد عورت کا دُوسری جگہ نکاح ہوجائے گا؟

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں؟ فتویٰ چاہتا ہوں۔ مسئلہ: فرض کیا اگر میری بیوی اور اُس کے گھر والے وغیرہ یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ اب کسی بھی طریقے سے اور بذریعہ عدالت بھی اس خاوند سے جان نہیں چھوٹ سکے گی تو اگر میری بیوی اور اُس کے گھر والے اپنی لڑکی یعنی میری بیوی کی دُوسری شادی کرنے کے لئے مجھے قتل کروا دیتے ہیں تو

---

(۱) وفی الهداية كتاب النكاح ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع شركت علميه) وينعقد نكاح الحرّة العاقله البالغة برضائها.
وفی الهندية كتاب النكاح الباب الأوّل ج:۱ ص:۲۶۹ (طبع ماجديه) ومنها رضا المرأة اذا كانت بالغة بكرًا كانت أو ثيبًا .... الخ.

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں قتل کا گناہِ کبیرہ تو میری بیوی اور اُس کے گھر والوں وغیرہ پر ہوگا ہی لیکن کیا مجھے قتل کروانے کے بعد میری بیوی جو بیوہ ہوگی اُس کا نکاح کسی دُوسرے مرد کے ساتھ جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب:- قتل کا سخت گناہ ہوگا،[1] مگر عدّت گزارنے کے بعد دُوسرے شخص سے نکاح ہوجائے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۲۰/۴/۷ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷۳/۱۱)

والد کی طرف سے نابالغ لڑکی کا کیا ہوا نکاح دُرست ہے

سوال:- زید نے بکر کے طفل صغیر کے ساتھ اپنی دخترِ صغیرہ کا نکاح اپنی رضا و رغبت کے ساتھ کردیا ہے، اب صغیرہ مذکورۃ الصدر حدِ بلوغت کو پہنچ چکی ہے اور بکر کا طفل صغیر حدِ بلوغت کو نہیں پہنچا ہے، البتہ چار پانچ سال تک بالغ ہوجائے گا، لہٰذا زید اب یہ چاہتا ہے کہ میں اتنی مدت دراز تک اپنی لڑکی بالغہ کو کیسے بٹھائے رکھوں گا۔ شرع شریف میں میرے لئے کوئی نجات کی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ بلاطلاق اپنی لڑکی کا نکاح کسی نوجوان کے ساتھ کرسکتا ہوں یا بغیر طلاق لئے عقدِ ثانی نہیں ہوسکتا؟ ایسی مجبوری کی حالت میں دُوسرے ائمہ کی تقلید کرلینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید نے اپنی نابالغ لڑکی کا جو نکاح بکر کے نابالغ لڑکے کے ساتھ کردیا ہے، وہ شرعاً منعقد ہوگیا ہے، اب لڑکے کے بالغ ہونے تک طلاق[2] یا فسخِ نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۷/۳۶ ۲۸ ب)

نابالغ کے ایجاب وقبول سے نکاح منعقد نہیں ہوتا

سوال:- زید نے اپنی دخترِ صغیر کا عقدِ نکاح بکر کے نابالغ لڑکے کے ساتھ مجلسِ عام میں بولایتِ خود، اپنی رضا و رغبت کے ساتھ کر دیا ہے، اب چونکہ لڑکی بالغ ہوگئی ہے اور بکر کے لڑکے کو کسی حد تک کچھ دیر ہے، یعنی چھ سات برس کے بعد بالغ ہوگا، لڑکی کے بلوغ کے بعد ایک اختلاف پیدا ہوگیا

---

(۱) "وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا" سورۃ النساء:۹۳.

(۲) وفی الفتاویٰ الھندیة کتاب الطّلاق الباب الأوّل فصل فیما یقع طلاقه وفیمن لا یقع طلاقه ج:۱ ص:۳۵۳ (طبع ماجدیه کوئٹه) یقع طلاق کلّ زوج اذا کان بالغًا عاقلًا .... ولا یقع طلاق الصّبی وان کان یعقل.
وفی الھدایة کتاب الطلاق ج:۲ ص:۳۵۸ (طبع شرکت علمیه ملتان) ویقع طلاق کل زوج اذا کان عاقلًا بالغًا ولا یقع طلاق الصّبی والمجنون والنّائم لقوله علیه السلام: کلّ طلاق جائز الّا طلاق الصّبی والمجنون ولأنّ الأھلیة بالعقل الممیّز وھما عدیم العقل والنّائم عدیم الاختیار .... الخ.

ہے کہ بوقتِ ایجابِ نکاح بکر نے قبول نہیں کیا ہے، بلکہ بکر نے اپنے طفلِ صغیر کی زبان سے ایجاب و قبول کرایا ہے، نکاح کی مجلس کے بعض حضرات اس کی تصدیق کرتے ہیں، اور اکثریت عوام الناس اس بات کی تردید کرتی ہے کہ ایجاب و قبول بذاتِ خود بکر نے کیا ہے، ہاں! اگر خدانخواستہ بکر سے سہواً ایسا ہوگیا ہے یا عمداً ایسا کیا گیا ہے کہ صغیر کی زبانی اپنی موجودگی اور سرکردگی میں ایجاب و قبول کرایا ہے تو شرعاً یہ نکاح منعقد ہوا یا نہیں؟

جواب:- نابالغ کا ایجاب و قبول معتبر نہیں، لہٰذا اگر بکر نے اپنے نابالغ بچے کا نکاح کراتے وقت خود ایجاب و قبول کیا ہے تب تو نکاح صحیح ہوگیا، اور اگر خود کرنے کے بجائے نابالغ بچے سے کرایا ہے تو وہ نکاح صحیح نہیں ہوا۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷/۷/۲۸ ب)

وٹہ سٹہ کے نکاح کی شرعی حیثیت

خلاصۂ سوال:- زید نے عمر سے اپنے لڑکے کے لئے لڑکی طلب کی، حسبِ رواج زید نے عوضاً لڑکی طلب کی، عمر نے بھی اس کو لڑکی دینے کا وعدہ کیا، اور عمر کے تین چار لڑکے تھے، عمر نے کہا کہ اگر میرا نمبر دوم لڑکا راضی ہوا تو ان کے ساتھ نکاح کراؤں گا، ورنہ پھر اپنے جس لڑکے کو بھی اگر دوں تو تجھ کو اعتراض کا حق نہ ہوگا، زید رضامند ہوگیا، زید کی لڑکی نابالغ تھی، البتہ زید کا لڑکا اور عمر کی لڑکی جوان تھے، ان کا نکاح ہوگیا، اب عمر نے اپنے نمبر دوم لڑکے کی شادی دُوسری جگہ کی، زید کی لڑکی بھی جوان ہوگئی، عمر نے مطابق وعدہ لڑکی طلب کی تیسرے لڑکے کے لئے، زید کی زوجہ نے رواج کے مطابق منگنی وغیرہ بھی کی، مگر یاد رہے کہ اب تک شرعی نکاح نہیں ہوا ہے، جب زید نے لڑکی سے اجازت لینی چاہی تو لڑکی نے صاف انکار کردیا، زید نے بھی عوضاً لڑکی دینے سے انکار کردیا، حکم شرعی کیا ہے؟

جواب:- نکاح میں لڑکی کے بدلے لڑکی کے معاوضے کی شریعتِ اسلام میں کوئی حقیقت نہیں ہے،[2] اس لئے صورتِ مسئولہ میں اگر زید کی بالغ لڑکی عمر کے لڑکے سے شادی کرنے پر راضی نہیں

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح باب الولی ج:۳ ص:۵۵ (طبع سعید) وهو أی الولی شرط صحة نکاح صغیر ومجنون .... الخ. وفی الهندیة کتاب النکاح، الباب الأوّل ج:۱ ص:۲۶۷ (طبع ماجدیه) وأما شروطه فمنها العقل والبلوغ والحریة فی العاقد الّا ان الأوّل شرط الانعقاد فلا ینعقد نکاح المجنون والصبی الذی لا یعقل.

(۲) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۱۰۶، ووجب مهر المثل فی الشغار هو أن یزوّجه بنته علیٰ أن یزوّجه الآخر بنته أو أخته مثلًا معاوضة بالعقدین وهو منهی عنه لخلوه عن المهر، فأوجبنا فیه مهر المثل فلم یبق شغارًا وفی الشامیة (قوله هو أن یزوّجه) قال فی النهر: وهو ان یشاغر الرّجل أی یزوّجه حریمته علیٰ أن یزوّجه الآخر حریمته ولا مهر الّا هذا. وفی الشامیة أیضًا قوله وهو منهی عنه لخلوّه عن المهر .... هو أی النّهی محمول علی الکراهة، ای والکراهة لا توجب الفساد .... فیکون الشرع أوجب فیه أمرین الکراهة ومهر المثل .... الخ.

ہے تو اسے شادی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا،[۱] چونکہ لڑکی عاقل و بالغ ہے اس لئے اس کی مرضی کے خلاف نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔[۲]

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۹۱/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

اصل ولدیت ظاہر نہ کرنے کی صورت میں نکاح کا حکم

سوال:- مسماۃ مہر النساء انجم بنتِ سیّد شاکر علی مرحوم کا نکاح ہمراہ عشرت علی ولد انور علی سے ہوا، عشرت علی کے حقیقی والد تو کوئی اور صاحب تھے، انور علی، عشرت علی کے سوتیلے والد ہیں، کیا شرعاً نکاح میں کوئی سقم ہے؟ اگر ہے تو اس کا مداوا کس طرح ہوسکتا ہے؟

جواب:- عشرت علی صاحب کو اپنی ولدیت ہمیشہ اپنے اصل والد کی بتانی چاہئے،[۳] سوتیلے باپ کی طرف نسبت کرنا خلافِ واقعہ ہونے کی بنیاد پر جائز نہیں، لیکن اگر نکاح کے وقت غلط ولدیت بتادی گئی مگر عورت یا اس کا وکیل جانتا تھا کہ اس سے مراد کون سے عشرت علی ہیں، تو نکاح دُرست ہوگیا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۰۱/۳۲ ج)

سولہ سالہ گواہ کی گواہی سے نکاح دُرست ہوجائے گا

سوال:- ایک آدمی نے اپنی لڑکی مطلقہ سے اجازت لے کر اکیلے مکان میں روبرو دو گواہوں کے ایجاب وقبول نکاح کرایا (بغیر خطبہ وغیرہ)، مکانِ مذکور میں صرف چار آدمی تھے، باقی عورت وغیرہ کوئی موجود نہ تھا، مکان میں ایک سسر، دُوسرا شوہر اور دو گواہ تھے، گواہوں میں ایک کی عمر ۱۶ سال کی تھی، جس کے منہ پر داڑھی وغیرہ کے آثار نہیں تھے، اس کم عمر والے گواہ کے ہونے سے مذکورہ نکاح دُرست ہے؟

(۱، ۲) وفی الدر المختار کتاب النکاح باب الولی ج:۳ ص:۵۸ (طبع سعید) ولا تجبر البالغة البکر علی النکاح لانقطاع الولایة بالبلوغ. وفی الهندیة کتاب النکاح الباب الرابع ج:۱ ص:۲۸۷ (طبع ماجدیه) لا یجوز نکاح أحد علی بالغة صحیحة العقل من أب أو سلطان بغیر اذنها بکرًا کانت أو ثیبًا .... الخ. وفی الهدایة کتاب النکاح، باب فی أولیاء ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع شرکت علمیه) وینعقد نکاح الحرّة العاقلة البالغة برضائها .. الخ.

(۳) وقال الله تعالی: "اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللهِ." (سورة الأحزاب:۵).

جواب:- دُرست ہے، لڑکا پندرہ سال کی عمر کو پہنچنے سے بالغ شمار کیا جاتا ہے۔[1]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۷۹ الف)

حلالہ کی نیت سے کئے گئے نکاح کی شرعی حیثیت اور اسے موردِ لعنت قرار دینے کا حکم

سوال:- اگر حلالہ کرنے والے مرد اور عورت کو ایک دُوسرے کی نیت کا علم ہے مگر عقد میں اس کی تصریح نہیں کرتے تو کیا یہ نکاح بھی ناجائز اور موردِ لعنت ہے؟ ''احسن الفتاویٰ'' ج:۵ ص:۱۵۵ میں ہے:

> ایسے نکاح کی حرمت اور موردِ لعنت ہونے کے لئے شرطِ تحلیل کی تصریح ضروری نہیں بلکہ ایک دُوسرے کی نیت کا علم بھی بقاعدہ ''المعروف کالمشروط'' اسی میں داخل ہے، وھو مفھوم قولہ: اما اذا اضمر ذٰلک لا یکرہ۔
>
> حضرتِ والا کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

(مولانا) محمد عامر (اُستاذ جامعۃ الرشید کراچی)

جواب:- اَحوَط تو بیشک وہی ہے جو حضرتؒ نے ''احسن الفتاویٰ'' میں لکھا ہے، لیکن اس کو موردِ لعنت قرار دینا محلِ نظر ہے،[2] فقہاء کے کلام سے اس کی تائید نہیں ہوتی، علم ہونے اور ''معروف کالمشروط''[3] ہونے میں بظاہر فرق ہے، معروف اس وقت کہیں گے جب کسی عرف کی بناء پر کوئی بات بغیر صراحت کے بھی مشروط سمجھی جاتی ہو، محض متعاقدین کے علم سے یہ بات حاصل نہیں ہوتی، تمام حیلِ مباحہ میں متعاقدین کو علم ہوتا ہے مگر اسے مشروط نہیں سمجھا جاتا۔

واللہ اعلم
۱۴۲۴/۲/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۲/۳)

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب الحجر فصل فی بلوغ الغلام (طبع سعید) بلوغ الغلام بالاحتلام والاحبال والجاریۃ بالاحتلام والحیض والحبل فان لم یوجد فیھما شیء فحتّٰی یتمّ لکل منھما خمس عشر سنۃ بہ یفتٰی.
وفی الھندیۃ کتاب الحجر الفصل الثانی فی معرفۃ حدّ البلوغ ج:۵ ص:۶۱ (طبع رشیدیہ) والسن الّذی یحکم ببلوغ الغلام والجاریۃ اذا انتھیا الیہ خمس عشرۃ سنۃ عند أبی یوسف ومحمد رحمھما اللہ وھو روایۃ عن أبی حنیفۃ وعلیہ الفتوٰی.

(۲) حوالہ کے لئے ص:۴۲۰ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۴۲۷ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفی الشامیۃ ج:۳ ص:۱۳۰ (طبع سعید) أن المعروف کالمشروط. وکذا فی البحر الرّائق ج:۶ ص:۱۲۴ (طبع دار المعرفۃ بیروت).

﴿فصل فی الولایة والکفاءة وخیار البلوغ﴾

(ولایت، کفاءت (رشتوں میں برابری وہمسری) اور خیارِ بلوغ سے متعلق مسائل کا بیان)

معروف بسوء الاختیار کے نکاح کا حکم

سوال:- ایک شخص بدکردار کا ناجائز تعلق ایک پھوپھی زاد رشتہ دار شادی شدہ عورت کے ساتھ تھا، اس ناجائز تعلق کے دوران بچے بھی پیدا ہوئے، کچھ عرصہ بعد اس شخص نے جس عورت سے ناجائز تعلق رکھا ہوا تھا، اس کی سگی بہن سے شادی کرلی، جس کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی اور شادی کے بعد اس شخص نے ناجائز تعلقات جو اس عورت سے قائم کر رکھے تھے قطع کردیئے، اور اس عورت نے ایک اور غیر قوم کے مرد سے ناجائز تعلقات وابستہ کرلئے جس سے لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں، اب وہ پہلا شخص جو اپنی عورت کی سگی بہن سے شادی سے پہلے تعلق رکھ چکا تھا، چند معتبر آدمیوں کے مجبور کرنے پر اپنی نابالغہ لڑکی کا عقد سابقہ معشوقہ کے بطن سے جو غیر قوم کے مرد کے نطفہ سے لڑکا پیدا ہوا تھا، کردیا، جب لڑکی بالغ ہوئی اور سارے واقعات سے باخبر ہونے لگی تو لڑکی نے شادی کرنے سے انکار کیا کہ میں اس لڑکے کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ لڑکی دیندار اور دینی تعلیم بھی رکھتی ہے، اور لڑکا بدکار کلمہ طیبہ تک نہیں جانتا، اب حسبِ شرع کیا حکم ہے؟ عقد صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے اور لڑکی راضی نہیں تو اب کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟

جواب:- لڑکی کے باپ کے حالات جو نکاح سے قبل بیان کئے گئے ہیں، اگر وہ دُرست ہیں تو ان کے پیشِ نظر اسے معروف بسوء الاختیار کہا جاسکتا ہے، اور اس صورت میں جبکہ لڑکا لڑکی کے لئے کسی طرح کفو نہیں، اس لئے بعد بلوغ لڑکی کو خیارِ فسخ حاصل ہے، بشرطیکہ جس وقت آثارِ بلوغ ظاہر ہوں، فوراً بلاتأخیر زبان سے کہہ دے کہ میں نے اپنا نکاح فسخ کردیا، اور اس پر گواہ بھی بنالے، اور پھر کسی مسلمان جج کی عدالت میں دعویٰ دائر کرکے باقاعدہ نکاح فسخ کردے۔[1] وفی الدر المختار (لم

(۱) بعد میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق سامنے آئی کہ اس صورت میں عدالت میں جانے کی ضرورت نہیں، نکاح اصل سے باطل ہے۔ یہ تحقیق آگے ص:۲۸۹ پر آرہی ہے۔ (حاشیہ از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

یعرف منهما سوء الاختیار) مجانة وفسقا (وان عرف لا) یصح النکاح اتفاقًا وکذا لو کان سکران فزوّجها من فاسق أو شریر أو فقیر أو ذی حرفة دنیئة لظهور سوء اختیاره فلا تعارضه شفقته المظنونة بحر وقال الشامی والحاصل ان المانع هو کون الأب مشهورًا بسوء الاختیار قبل العقد فاذا لم یکن مشهورا بذلک ثم زوج بنته من فاسق صح وان تحقق بذلک انه سیئ الاختیار شامی.[۱] وفیه أیضًا ثم اعلم ان ما مر عن النوازل من أن النکاح باطل معناه انه سیبطل.[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۵۷/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

عجمیوں کے درمیان نسب میں کفاءت کا اعتبار نہیں

سوال:- ایک آدمی نے عاقلہ بالغہ لڑکی کو اغواء کیا اور اسے ڈرا دھمکا کر نکاح کرلیا، لڑکی کے والدین اس نکاح پر ناراض ہیں، کیونکہ لڑکی آرائیں قوم سے ہے اور لڑکے کا تعلق شیخ قوم سے ہے، (شیخ سے مراد کھوجہ قوم ہے) اور دونوں قوموں کی شرافت میں فرق ہے، آرائیں معزّز سمجھے جاتے ہیں اور شیخ ذلیل، تو کیا اس صورت میں نکاح ہوسکتا ہے؟

جواب:- آرائیں اور کھوجہ دونوں عجمی نسلیں ہیں، اور عجمیوں کے درمیان نسب میں کفاءت کا اعتبار نہیں ہے،[۳] اور مذکورہ نکاح چونکہ عاقلہ بالغہ نے اپنی اجازت و رضامندی سے کیا ہے اس لئے نکاح شرعاً منعقد ہوگیا، اب اگر لڑکی یا اس کے رشتہ دار نکاح ختم کرنا چاہتے ہیں تو سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں ہے کہ وہ لڑکے سے طلاق حاصل کریں، قال فی الدر المختار واما فی العجم فتعتبر حریة واسلاما. (شامی ج:۲ ص:۳۱۹)۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۵/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۳/۲۲ ب)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱، ۲) فتاویٰ شامیة ج:۳ ص:۶۶، ۶۷ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) وفی الشامیة ج:۳ ص:۸۷ (طبع سعید) فالنسب معتبر فی العرب فقط واسلام الأب والجد فی العجم فقط، والحریة فی العرب والعجم .... الخ.
(۴) فتاویٰ شامیة ج:۳ ص:۸۷ (طبع ایچ ایم سعید).

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد، آلِ رسول ہے اور کیا سیّد کا نکاح غیر سیّد میں ہوسکتا ہے؟

سوال:- زید کہتا ہے کہ سیّد کوئی قوم نہیں، کیونکہ نسب نرینہ اولاد سے چلتی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لڑکا صاحبِ اولاد نہیں تھا۔ کیا زید کا یہ کہنا صحیح ہے؟ اور کیا سیّد کا نکاح غیر سیّد میں ہوسکتا ہے؟

جواب:- زید کا خیال غلط ہے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد آلِ رسول ہے۔ اور غیر سیّد تو بہت سی قومیں ہوسکتی ہیں، بعض سادات کی کفو ہیں اور بعض نہیں،(۱) اور غیر کفو میں لڑکی اور اولیاء دونوں کی مرضی سے نکاح تو ہوجاتا ہے،(۲) مگر بہتر یہ ہے کہ نکاح کفو میں ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۵/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۲۹/۲۸ ج)

سوءِ اختیار ثابت کئے بغیر باپ، دادا کا کیا ہوا نکاح فسخ نہیں ہوسکتا

سوال:- زید بعمر ۵ سال کا، سعیدہ بعمر ۲ سال سے نکاح ہوا، بالغ ہونے پر سعیدہ نے نکاح کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کردیا، زید نے نوٹس کے ذریعے سعیدہ کی رُخصتی کا مطالبہ کیا، تو سعیدہ نے نوٹس کے جواب میں زید کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور عدالتِ عالیہ سے درخواست کی کہ اس کے اس حق کو تسلیم کیا جائے اور نکاح منسوخ قرار دیا جائے، سات سال کی مقدمہ بازی کے بعد عدالت نے اس حق کو تسلیم کرلیا اور اس بات کی تصدیق کردی کہ نکاح منسوخ ہوگیا ہے، اس کے خلاف اپیل کی جو مسترد ہوگئی، اب فرمائیں کہ نکاح شرعاً منسوخ ہوگیا یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر سعیدہ کا نکاح خود اس کے باپ نے کیا تھا تو اب بالغ ہونے کے بعد سعیدہ کو اسے فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے،(۳) تاوقتیکہ وہ سوءِ اختیار کو ثابت نہ کرے۔

---

(۱) سادات کی کفو قوموں میں صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی، عباسی، زبیری، یعنی شیوخ قریش وغیرہ شامل ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے: کفایت المفتی ج:۵ ص:۲۰۶ (طبع دارالاشاعت جدید ایڈیشن)۔

(۲) وفی المبسوط کتاب النکاح ج:۵ ص:۲۶ (طبع دار المعرفة بیروت) واذا تزوّجت المرأة غیر کفء فرضی به أحد الأولیاء جاز ذلک.

(۳) وفی الهندیة (ج:۱ ص:۲۸۵) فان زوجهما الأب والجد فلا خیار لهما بعد بلوغهما وان زوجهما غیر الأب والجد فلکل واحد منهما الخیار. وفی البحر الرائق کتاب النکاح باب الأولیاء ج:۳ ص:۱۲۸ (طبع بیروت وفی طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه ج:۳ ص:۱۲۰).

اور اگر سعیدہ کا نکاح کرنے والا خود اس کا باپ نہیں تھا، خواہ باپ کا وکیل ہی کیوں نہ ہو، تو لڑکی کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے،[1] اس صورت میں عدالت کا منسلکہ[2] فیصلہ شریعت کے مطابق ہوگا، ولـــزم النـكـاح ولـو بـغبن فاحش أو بغير كفو إن كان الولي المزوج بنفسه بغبن أبا أو جدا لم يعرف منـهـما سوء الاختيار .... وان كان المزوج غيرهما أى غير الأب وأبيه ولو الأم أو القاضى أو وكيـل الأب لا يـصـح من غير كفو أو بغبن فاحش أصلا وان كان من كفوء وبمهر المثل صح ولهما خيار الفسخ (الدر المختار باختصار مع الشامی ج:۲ ص:۴۱۷ تا ۴۲۰)[3]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۱/۱/۱۳۸۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۶/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

باپ کا کیا ہوا نکاح فسخ نہیں کیا جاسکتا

سوال:- مسمّٰی رحیم بخش نے اپنی حقیقی لڑکی کا نکاح بحالتِ نابالغی بعمر ۹، ۱۰ سال کے خوشی و رضامندی کے ساتھ شیر محمد کے ساتھ کردیا، کچھ عرصہ بعد مسمّٰی شیر محمد باہر چلا گیا اور عدم الخبر ہوا، عرصہ چار پانچ سال کے بعد لڑکی کے باپ نے عدالت میں تنسیخِ نکاح کا دعویٰ دائر کردیا، عدالت میں مقدمہ سات آٹھ ماہ چلتا رہا، اس دوران عدالت نے شیر محمد مذکور کے وارثوں کو حکم دیا کہ وہ شیر محمد کو تین ماہ کے اندر اندر حاضر عدالت کریں، ورنہ حکم تنسیخ کردیا جائے گا، چنانچہ اس قلیل وقت میں لڑکے کو عدالت میں حاضر نہ کیا جاسکا تو عدالت نے تنسیخِ نکاح کا حکم دے دیا، تنسیخ سے قبل عدالت نے سرکاری طور پر شیر محمد کو تلاش نہیں کیا، نہ تو عدالت نے کوئی نوٹس دیا اور نہ کوئی اعلان یا اخبار میں اشتہار دیا، تنسیخ کے بعد دُوسری شادی کی اجازت دے دی گئی، چنانچہ بعد تین ماہ عدّت گزارنے کے لڑکی کے باپ نے اس کی شادی ایک اور شخص مسمّٰی محمد شفیع سے کردی، نکاح کے دو تین ماہ بعد شیر محمد مذکور آگیا، اور اس نے اپنی بیوی کا مطالبہ کیا، مگر لڑکی کے والد نے انکار کردیا اور کہا کہ لڑکی دُوسرے شخص محمد شفیع کے گھر رہے گی، کیونکہ عدالت نے نکاحِ ثانی کی اجازت دے دی ہے اور اب تک بضد قائم ہے، لہٰذا اب صورتِ

---

(۱) وفي الهندية (ج:۱ ص:۲۸۵) فان زوجهما الأب والجد فلا خيار لهما بعد بلوغهما وان زوجهما غير الأب والجد فلكل واحد منهما الخيار وفي البحر الرائق كتاب النكاح باب الأولياء ج:۳ ص:۱۲۸ (طبع بيروت وفي طبع مكتبه رشيديه كوئٹه ج:۳ ص:۱۲۰).

(۲) رجسٹر نقل فتاویٰ میں یہ فیصلہ موجود نہیں ہے، سوال و جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ عدالت نے فسخ نکاح کا فیصلہ کیا تھا۔ (محمد زبیر)۔

(۳) الدر المختار ج:۳ ص:۶۶-۶۹ (طبع ایچ ایم سعید).

مذکورہ میں کیا نکاحِ اوّل منسوخ ہوگیا یا نہیں؟

جواب:- اس سوال کے ساتھ عدالت کا جو فیصلہ منسلک تھا، اس میں فسخِ نکاح خیارِ بلوغ کی بناء پر کیا گیا ہے، جس پر تنقیحات کی گئیں، ان تنقیحات کے بعد مندرجہ ذیل اُمور ثابت ہوئے، ۱:- لڑکی کا نکاح خود باپ نے کیا تھا، ۲:- لڑکی نے آثارِ بلوغ ظاہر ہوتے وقت نکاح کو نامنظور کرنے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا۔

لہٰذا اوّلاً تو یہ نکاح چونکہ باپ کا کیا ہوا ہے (اور اس کے سیئ الاختیار ہونے کا دعویٰ لڑکی نہیں کرتی) اس لئے اس میں لڑکی کو خیارِ بلوغ سرے سے حاصل ہی نہیں ہے، کما ھو مصرح فی سائر کتب الفقه[1]، دُوسرے اگر حاصل ہوتا تب بھی لڑکی نے خیارِ بلوغ کے حق کو استعمال کرنے کا وقت گزار دیا، لہٰذا شرعاً خیارِ بلوغ کی بناء پر عدالت کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار نہیں تھا، اور شریعت کی رُو سے اس کا فسخِ نکاح صحیح نہ ہوا، لہٰذا محمد شفیع سے اس کا نکاح باطل و کالعدم ہے، اور اصل خاوند شیر محمد بدستور لڑکی کا شوہر ہے، البتہ اگر محمد شفیع لڑکی کے ساتھ صحبت کرچکا ہو تو جب تک اسے تین حیض نہ آجائیں شیر محمد کے لئے اس سے صحبت کرنا جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۲/۱۹ الف)

ثیبہ کے نکاح کے لئے اس کی صراحتاً رضامندی شرط ہے

سوال:- کتاب تجرید صحیح بخاری کے صفحہ:۶۲ پر یہ حدیث نظر سے گزری، اُمید ہے کہ آپ اس کے بارے میں پوری تشریح فرمائیں گے (نابالغہ کو بالغ ہونے پر فسخِ نکاح کا اختیار) حضرت خنساء بنت حذام انصاریہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میرے والد نے میرا نکاح کسی شخص سے کردیا، اس سے قبل میری ایک مرتبہ شادی ہوچکی تھی، کنواری نہ تھی، اور اس نکاح سے میں خوش نہ تھی، میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ نے نکاح کو ناجائز قرار دیا اور لوٹا دیا.... الخ۔ اس کے علاوہ دیگر کتب سے سن بلوغ اور اختیارِ فسخِ نکاح پر روشنی ڈال کر مشکور فرمائیں۔

جواب:- یہ حدیث صحیح ہے، اور اسی کی بناء پر اسلامی فقہ میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ جو

---

(۱) وفی الهندية ج:۱ ص:۲۸۵ (طبع ماجدیه) فان زوجهما الأب والجد فلا خيار لهما بعد بلوغهما.
وفی البحر الرائق کتاب النكاح باب الأولياء ج:۳ ص:۱۳۰ (طبع رشيديه كوئٹه) ولهما خيار الفسخ بالبلوغ فی غير الأب والجد .... الخ.

عورت ثیبہ ہو یعنی پہلے ایک مرتبہ اس کی شادی ہوچکی ہو، تو اس کا نکاح اس وقت تک منعقد نہیں ہوتا جب تک کہ وہ صریح الفاظ میں رضامندی ظاہر نہ کرے،[۱] اس طرح رضامندی حاصل کئے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ حدیثِ مذکور میں حضرت خنساءؓ چونکہ ثیبہ تھیں اور ان کے والد نے ان کی مرضی لئے بغیر نکاح کردیا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نکاح کو ناجائز قرار دیا،[۲] لیکن اس حدیث کو نابالغ لڑکی کے فسخِ نکاح کے حق سے کوئی تعلق نہیں ہے، نابالغ کا حقِ فسخ دُوسری روایات سے ثابت ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ لڑکی کا نکاح اگر باپ دادا کے علاوہ کسی اور شخص نے نابالغی کی حالت میں کردیا تو لڑکی کو یہ حق ہے کہ وہ بالغ ہوتے ہی فوراً نکاح کو نامنظور ہونے کا اعلان کردے تو وہ نکاح ختم ہوجاتا ہے،[۳] جسے عدالت کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے، اور بالغ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لڑکی کو حیض آنا شروع ہوجائے یا شرعی عمر پورے پندرہ سال کی ہوجائے۔[۴]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲/۷/۱۳۸۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۲/۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

اولیاء کی رضامندی کے بغیر لڑکی کا غیر کفو میں نکاح کرنا

سوال:- خلاصہ سوال کا یہ ہے کہ باپ کی مرضی کے خلاف میری لڑکی نے ایک جگہ ایک ایسے آدمی سے نکاح کیا ہے جو نیک سیرت نہیں ہے، مزید براں اس کے پہلے سے ایک بیوی اور چار بچے بھی موجود ہیں، گھر میں جھگڑے وغیرہ کی بناء پر اب اس لڑکی کو میں عاق کرنا چاہتا ہوں، رہنمائی کیجئے۔

جواب:- سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی نے جس شخص سے شادی کی ہے، اس کو لڑکی کا باپ اپنے لئے کفو نہیں سمجھتا، اور شرعاً لڑکی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ باپ کی اجازت و رضامندی کے

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۲۲ .... بل لا بدّ من القول (کالثیّب) البالغة ... الخ.

(۲) وفی صحیح البخاری ج:۲ ص:۷۷۱ (طبع قدیمی کتب خانه) باب اذا تزوّج ابنته وهی کارهة فنکاحه مردود، عن خنساء بنت حذام الأنصاریة أنّ أباها زوّجها وهی ثیب فکرهت ذلک فاتت رسول الله صلی الله علیه وسلم فردّ نکاحها.

(۳) وفی الهندیة کتاب النکاح الباب الرابع ج:۱ ص:۲۸۵ (طبع ماجدیه) فان زوّجهما الأب والجد فلا خیار لهما بعد بلوغهما وان زوّجهما غیر الأب والجد فلکل واحد منهما الخیار ...... ویشترط فیه القضاء.
وکذا فی البحر الرائق کتاب النکاح باب الأولیاء ج:۳ ص:۱۲۰ (طبع رشیدیه کوئٹه).

(۴) وفی الدر المختار کتاب الحجر، فصل فی بلوغ الغلام ج:۶ ص:۱۵۳ والجاریة بالاحتلام والحیض والحبل فان لم یوجد فیهما شیء فحتّی یتم لکل منهما خمس عشرة سنة، وبه یفتٰی.
وفی البحر الرائق ج:۸ ص:۸۵ باب الحجر بلوغ الغلام بالاحتلام والاحبال والانزال .... والجاریة بالحیض والاحتلام والحبل، ویفتٰی بالبلوغ فیهما بخمسة عشرة سنة. وکذا فی البدائع ج:۷ ص:۱۷۱.

بغیر غیر کفو میں نکاح کرے، لہٰذا اگر وہ شخص واقعۃً کفو نہیں ہے، تو اس کا یہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوا،[۱] رشتہ داروں کو چاہئے کہ وہ لڑکی کو نرمی سے سمجھائیں کہ یہ نکاح دُرست نہیں ہوا، اور اس کے ساتھ رہ کر وہ حرام کی مرتکب ہوگی، لما فی الدر المختار: **فلا تحل مطلقة ثلاثا نكحت غير كفو بلا رضا ولی بعد معرفته اياهُ فليحفظ.** (شامی ج:۲ ص:۴۰۹)[۲]۔ لیکن عاق کرنے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، باپ کو کسی حال میں یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اپنی میراث سے محروم کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح — احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ — ۱۳۸۸/۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۳/۱۹ الف)

نابالغہ کا نکاح باپ نے کیا ہو تو بعد میں خود باپ وہ نکاح فسخ نہیں کرسکتا

سوال:- زید نے اپنی نابالغہ لڑکی کا نام بکر کے ساتھ اپنے وکیل سے کرایا اور ایجاب وقبول کی مجلس کے اندر موکل (یعنی باپ) موجود تھا، اور مہر اور خطبہ بھی پڑھا گیا، چند سال بعد زید اپنی لڑکی کے نکاح کے ایجاب وقبول سے انکار کرتا ہے، مگر پہلے نکاح کے وکیل اور گواہ موجود ہیں، اور اقرار بھی کرتے ہیں، اب زید اور اس کے معین فی ہذا عند الشرع کیا حکم رکھتے ہیں؟ اور جس مولوی صاحب نے نکاح پڑھایا وہ کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر نابالغ لڑکی کا نکاح کفو میں مہر کے ساتھ کیا گیا ہے تو یہ نکاح منعقد ہوگیا، اب زید کو اس نکاح کے فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے،[۳] البتہ لڑکی کو بلوغ کے وقت یہ اختیار ہوگا کہ اگر وہ چاہے تو بالغ ہوتے ہی فوراً اس نکاح کو نامنظور کردے، اس صورت میں نکاح فسخ ہوجائے گا، لما فی الدر المختار: **وإن المزوّج غيرهما أى غير الأب وأبيه ولو الأم أو القاضى**

---

(۱) وفى الدر المختار كتاب النكاح (باب الولى) ج:۳ ص:۵۶ ويفتى فى غير الكفو بعدم جوازه أصلًا وهو المختار للفتوىٰ لفساد الزمان. وفى المبسوط (باب الاكفاء ج:۵ ص:۲۵ طبع دار المعرفة بيروت) واذا زوّجت المرأة نفسها من غير كفؤ فللأولياء أن يفرّقوا بينهما، لأنّها الحقت العار بالأولياء.

(۲) الدّر المختار ج:۳ ص:۵۷ (طبع سعيد).

(۳) وفى الدر المختار ج:۳ ص:۲۳۰ كتاب الطلاق وأهله زوج عاقل. وفى الشامية احترز بالزّوج عن سيّد العبد ووالد الصغير.

أو وکیل الأب .... لا یصح النکاح من غیر کفؤ أو بغبن فاحش أصلًا، وان کان من کفؤ وبمهر المثل صحّ ولهما خیار الفسخ. (شامی ج:۲ ص:۳۱۹، ۳۲۰)۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۶ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری عفی عنہ

بچپن میں نکاح کی صورت میں بلوغت کے بعد لڑکی کو خیارِ بلوغ حاصل ہوگا

سوال:- زید نے اپنی نابالغ لڑکی کا ایجاب وقبول کرانے کے لئے بکر کے لڑکے کے ساتھ، ایک شخص کو وکیل بنایا، وکیل زید نے (مؤکل) کے رُوبرو ایجاب وقبول کرلیا، نکاح خوانی بھی ہوگئی، چند عرصہ کے بعد لڑکی نے انکار کردیا (یعنی جوان ہونے کے بعد)، اور زید نے بھی انکار کردیا، وکیل اور گواہ اقرار کرتے ہیں ایجاب وقبول کا۔ کیا اس صورت میں زید اپنی بیٹی کا نکاح دُوسری جگہ کرسکتا ہے؟ اور جس مولوی صاحب نے نکاح پڑھایا تھا اس کے پیچھے نماز کیسی ہوگی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی لڑکی کا نکاح بکر کے لڑکے کے ساتھ منعقد ہوگیا، البتہ لڑکی کو خیارِ بلوغ حاصل ہے،[2] جس کی تفصیل اس وقت بتائی جاسکتی ہے جب مندرجہ ذیل سوالات کا جواب آپ لکھ کر بھیج دیں:-

۱:- جب زید کی لڑکی پر آثارِ بلوغ (حیض) ظاہر ہوئے تو اس نے اپنے نکاح کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا؟

۲:- لڑکی نے بالغ ہونے کے کتنے عرصے کے بعد نکاح سے انکار کیا ہے؟

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۱/۲ھ

---

(۱) الدر المختار کتاب النکاح باب الولی ج:۳ ص:۶۷ الی ۶۹ (طبع سعید).
وفی الهندیة کتاب النکاح الباب الرابع ج:۱ ص:۲۸۵ (طبع مکتبہ ماجدیہ) وان زوّجهما غیر الأب والجد فلکل واحد منهما الخیار اذا بلغ .... الخ. وکذا فی البحر الرائق کتاب النکاح باب الأولیاء ج:۳ ص:۱۲۸ (طبع بیروت، وفی طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ ج:۳ ص:۱۲۰).
(۲) وفی الهندیة کتاب النّکاح الباب الرّابع ج:۱ ص:۲۸۵ (طبع ماجدیہ) وان زوّجهما غیر الأب والجد فلکل واحد منهما الخیار اذا بلغ .... الخ.

لڑکی نے بالغ ہوتے ہی اپنا خیار استعمال نہ کیا تو بعد میں فسخِ نکاح کا اختیار نہیں

سوال:- لڑکی نابالغہ کا نکاح چچا نے کردیا، جب تقریباً بائیس سال کی ہوئی تو اس نے تنسیخِ نکاح کا دعویٰ دائر کیا کہ میرے چچا نے میری مرضی کے مطابق نکاح نہیں کیا، اب کیا یہ نکاح قابلِ فسخ ہے یا نہیں؟

جواب:- لڑکی کو خیارِ بلوغ کے تحت فسخِ نکاح کا حق اسی وقت حاصل تھا جب اس پر بلوغ کے آثار (حیض) ظاہر ہوئے تھے، جب اس نے اس وقت نکاح فسخ نہیں کیا تو اس کے بعد سالہا سال گزر جانے پر وہ خیارِ بلوغ کا حق استعمال نہیں کرسکتی۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح — احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ — ۱۳۸۸/۱/۲ھ

اولیاء کی رضامندی سے غیرقوم میں نکاح کرنے کا حکم

سوال:- مسماۃ بی بی حنیف سیّد خاندان سے تعلق رکھتی ہے، اور جوان العمر ہے، وہ ایک غیرقوم سے نکاح کرنا چاہتی ہے، کیا اس کو یہ حق حاصل ہے؟

جواب:- اگر لڑکی کے اولیاء غیرقوم میں شادی کرنے پر راضی ہوں اور لڑکی بھی راضی ہو تو بلاشبہ وہ نکاح کرسکتی ہے،[2] اور اگر اولیاء راضی نہیں ہوں تو غیرقوم کی تفصیل لکھئے کہ جس قوم میں لڑکی شادی کرنا چاہتی ہے وہ کون سی قوم ہے؟ اور اولیاء اس کے ساتھ نکاح کرنے پر کیوں راضی نہیں ہیں؟ تب جواب دیا جاسکے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح — احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ — ۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

---

(۱) وفی قاضی خان کتابُ النّکاح فصل فی الخیارات ج:۱ ص:۳۸٦ (طبع ماجدیه) واذا بلغت وهی بکر فسکتت ساعة بطل خیارها فان اختارت نفسها کما بلغت واشهدت علیٰ ذٰلک صحّ. وفی الدر المختار ج.۳ ص ۷۴ (ولا یمتد الی آخر المجلس) وفی الشامیة تحتهٗ أی مجلس بلوغها أو علمها بالنکاح کما فی الفتح أی اذا بلغت وهی عالمة بالنکاح او علمت به بعد بلوغها فلا بدّ من الفسخ فی حال البلوغ او العلم فلو سکتت ولو قلیلًا بطل خیارها ولو قبل تبدّل المجلس.

(۲) وفی الهدایة کتاب النکاح ج.۲ ص:۳۱۳ (طبع شرکت علمیه) وینعقد نکاح الحرّة العاقلة البالغة برضائها. وفی البحر الرائق، کتاب النکاح، باب الأولیاء ج:۳ ص:۱۱۷ (طبع بیروت وفی طبع مکتبه رشیدیه کوئته ج:۳ ص:۱۰۹) نفذ نکاح حرّة مکلفة بلا ولی، لأنها تصرّفت فی خالص حقها وهی من أهله لکونها عاقلة بالغة ... وانما یطالب الولی بالتزویج کیلا تنسب الی الوقاحة .... الخ وفی الهندیة کتاب النّکاح الباب الأوّل ج:۱ ص:۲٦۹ (طبع ماجدیه) ومنها رضاء المرأة اذا کانت بالغة بکرًا کانت أو ثیّبًا .. . الخ.

بالغ لڑکی اپنا نکاح خود کرسکتی ہے

سوال:- میرے والد صاحب میں بہت سی بُری، خراب عادتیں موجود ہیں، جو ہمارے لئے تکلیف کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری عزتوں کی حفاظت میں رُکاوٹ بھی ہیں۔ نشے کے عادی ہیں، گھر میں خرچ نہیں دیتے، والدہ کے ساتھ گالی گلوچ کے ساتھ بات کرتے ہیں، کئی مرتبہ اُنہوں نے خودکشی کے لئے نشہ آور دوائیں کھائی ہیں، مگر خدا نے ہر مرتبہ بچایا، خاندان والوں نے اُن کو خاندان سے نکال دیا ہے، اچھی سے اچھی نوکری والد صاحب کو ملتی ہے، مگر چھ سات ماہ سے زیادہ نوکری نہیں کرتے، کچھ نہ کچھ ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ نوکری سے علیحدہ کردیئے جاتے ہیں۔ سات آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے کہ اچانک رات کو گھر سے غائب ہوگئے، رات بھر نہ آئے، دُوسرے دن ہمارے گھر پر آدمی آنے لگے اور کہنے لگے کہ: تمہارے والد نے ہم سے کئی ہزار روپیہ باہر بھجوانے کا لیا ہے، وعدہ کرکے بلایا ہے، کہاں ہیں؟ ان تمام واقعات کی روشنی میں اب یہ سوال ہے کہ: میری ایک چھوٹی بہن ہے، اُس کی عمر ۱۴ سال ہے، اُس کی شادی کی بات چیت چل رہی ہے، اب تک میرے ماموں سرپرست ہیں، ہمارا خرچ بھی برداشت کرتے ہیں، والد صاحب کو بتایا کہ میں اپنی بہن کا رشتہ فلاں جگہ کرنا چاہتا ہوں، وہ بولے کہ میری مرضی کے بغیر لڑکی کی شادی نہیں ہوسکتی ہے اور میں یہ شادی ہونے نہیں دوں گا۔ کیا شرعاً سرپرست، والد کی اجازت کے بغیر ہمارا نکاح کرسکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر لڑکی عاقل بالغ ہے تو وہ اپنا نکاح خود کرسکتی ہے، بشرطیکہ جس لڑکے سے نکاح کرے وہ خاندانی، نسبی اور دینی اعتبار سے اُس کا کفو ہو، ایسی صورت میں باپ سے اجازت لینا ضروری نہیں،(۱) لیکن بہتر ہے کہ اُس کو بھی کسی طرح راضی کرلیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۴/ ۲۸ الف)

---

(۱) وفی الهداية، كتاب النكاح ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع شركت علميه) وينعقد نكاح الحرّة العاقلة البالغة برضائها وان لم يعقد عليها ولی بكرًا كانت أو ثيبًا.

وفی البحر الرائق، كتاب النكاح، باب الأولياء ج:۳ ص:۱۱۷ (طبع بيروت وفی طبع مكتبه رشيديه كوئٹه ج:۳ ص:۱۰۹) نفذ نكاح حرّة مكلّفة بلا ولی لأنها تصرّفت فی خالص حقها وهی من أهله لكونها عاقلة بالغة .... وانما يطالب الولی بالتزويج كيلا تنسب الی الوقاحة .... الخ. وكذا فی الهندية، كتاب النكاح، الباب الأوّل ج:۱ ص:۲۶۹ (طبع ماجديه).

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ "کشف الغبار عن مسئلۃ سوء الاختیار" کے بارے میں حضرت والا دامت برکاتہم کی رائے

سوال:- جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دام ظلہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

حضرت سے گزارش یہ ہے کہ حضرت مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم کا رسالہ "کشف الغبار عن مسئلۃ سوء الاختیار" کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تحریر فرمادیں تاکہ آئندہ کام آسکے، اور دارالافتاء میں محفوظ رہے۔

جواب:-

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، اَمَّا بَعْدُ!

احقر نے احسن الفتاویٰ جلد پنجم میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم کا تحریر فرمودہ رسالہ "کشف الغبار عن مسئلۃ سوء الاختیار" کا مطالعہ کیا، اور متعلقہ عبارات پر غور کیا، حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے اس رسالہ میں جو تحقیق فرمائی ہے، وہ دُرست ہے، اس کے مطابق سوء الاختیار کی صورت میں جو نکاح غیر کفو یا غبنِ فاحش کے ساتھ کیا گیا ہو وہ اصلاً ہی باطل ہے اور غیر منعقد ہے، لہٰذا اس کے فسخ کے لئے قضاءِ قاضی کی ضرورت نہیں، البتہ جو نکاح کفو میں ہو، یا مہرِ مثل کے ساتھ ہو، وہ منعقد ہوجاتا ہے، لیکن اس صورت میں بھی کوئی ناگوار اور ناقابلِ برداشت صورتِ حال ہو، مثلاً عمر میں بہت زیادہ فرق ہو، جس کی وجہ سے لڑکی کا شوہر کے ساتھ نباہ نہ ہوسکتا ہو، تو وہاں بھی سوءِ اختیار واضح ہونے کی صورت میں لڑکی کو خیارِ بلوغ ملنے پر غور کرنا چاہئے، لیکن اس صورت میں عدالت سے نکاح فسخ کرانا بھی ضروری ہونا چاہئے، جیسا کہ اس رسالے کے آخر میں درج ہے۔ اور اس کی ایک بنیاد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ باپ، دادا کی شفقتِ مظنونہ کی وجہ سے انعقادِ نکاح کا جو حکم تھا، وہ سوءِ اختیار واضح ہونے کی صورت میں جب غیر کفو یا غبنِ فاحش کی صورت ہو تو مرتفع ہوگیا، اب باپ، دادا اور ولیِ غیر اَب برابر ہوگئے، کہ دونوں کا کیا ہوا نکاح غیر منعقد قرار پایا، تو کفو اور مہرِ مثل کی صورت میں بھی جب سوءِ اختیار واضح ہو تو باپ کا حکم ولیِ غیر اَب جیسا ہونا چاہئے کہ اس میں خیارِ بلوغ ملتا ہے، تو یہاں بھی ملنا چاہئے، لیکن یہ بات فی الحال حتمی نہیں محض ایک خیال ہے اور مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰/۱)

باپ، دادا کے کئے ہوئے نکاح میں لڑکی کے خیارِ بلوغ کا حکم

سوال:- والد نے لڑکی کا نکاح ایسی جگہ یا خاندان میں کرایا جہاں پردہ کا کوئی انتظام نہیں اور نہ لڑکی اور اس خاندان کے رہن سہن میں مطابقت ہے، اس لڑکی کے والد نے اس کی شادی سے پہلے لڑکی کے ماموں کو کہہ دیا تھا کہ آپ اپنے لڑکے کی شادی اس لڑکی کا بٹہ دے کر کرلو، مگر اس میں ایک شرط یہ ہے کہ مہاجرین سے رشتہ نہ کرنا، مگر لڑکی کے والد نے خود اس سے خلاف کیا اور لڑکی کا نکاح مہاجر سے کردیا، اور ان کا کاروبار کاشتکاری ہے۔۲:- لڑکی نے بلوغ پر خود ہی نکاح فسخ کرنا منظور کیا۔۳:- لڑکی بالغ ہونے پر ایک دن بھی اپنے شوہر کے ہاں آباد نہیں ہوئی۔ تو کیا اس صورت میں نکاح باقی ہے؟

جواب:- باپ، دادا کے کئے ہوئے نکاح میں لڑکی کو خیارِ بلوغ صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ باپ فاسق و فاجر ہو یا لالچی ہو، اور اس کا سوءِ اختیار معروف و مشہور ہو[۱] اور اس نے غیر کفو میں نکاح کیا ہو، اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے یہ نکاح محض لالچ کی بنا پر کیا تھا، بٹہ پر نکاح کرنا بوجہ رواجِ عام کے اس کی کافی وجہ نہیں ہے، اس لئے مذکورہ صورت میں خیارِ بلوغ کی بناء پر نکاح فسخ کرنے کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، اب اگر دونوں میں نبھاؤ کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے، تو سوائے اس کے کوئی صورت نہیں کہ شوہر سے معاوضہ وغیرہ کے ذریعے طلاق حاصل کی جائے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۵/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۶۹۱ ب)

بالغ لڑکی، والدین کی مرضی کے بغیر نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

سوال:- مسماۃ گلزار دختر ملکی امان عمر ۲۰ سال نے حلفی بیان دیا ہے کہ میری عمر تقریباً ۲۰ سال ہے، میں میر محمد سے شادی کرنا چاہتی ہوں، میں نے اپنی مرضی سے اپنے والدین کا گھر چھوڑا ہے، مجھے کسی نے اغواء نہیں کیا، میرے والدین میری مرضی کے خلاف شادی کرنا چاہتے ہیں، اس لئے اُن کا گھر چھوڑ دیا ہے۔

جواب:- استفتاء میں سوال کی وضاحت نہیں ہے، اگر یہ پوچھنا مطلوب ہے کہ مذکورہ بالغ لڑکی اپنے والدین کی مرضی کے بغیر نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بہتر یہی ہے کہ

---

(۱) وفی رد المحتار کتاب النکاح، باب الولی ج:۳ ص: ۶۶ و ۶۷ (طبع سعید) لو عرف من الأب سوء الاختیار لسفهه أو لطمعه لا یجوز عقدهٔ اجماعاً۔ نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ۔

والدین کی مرضی حاصل کرکے نکاح کرے، تاہم چونکہ وہ بالغ ہے اس لئے اگر والدین کی مرضی کے بغیر اپنے کفو میں شرعی طریقے سے نکاح کرلے گی تو نکاح منعقد ہوجائے گا،[۱] البتہ غیر کفو میں نکاح کیا تو وہ والد کی مرضی کے بغیر منعقد نہیں ہوگا۔[۲]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۴۳۱/۲۷ و)

باپ، دادا کا کیا ہوا نکاح، لڑکی بلوغ کے بعد فسخ نہیں کرسکتی

سوال:- زید نے اپنی چھ سالہ لڑکی کا نکاح ایک نابالغ لڑکے سے کردیا، لڑکی ابھی حد بلوغت کو نہیں پہنچی تھی کہ اس کو اپنے نکاح کا علم ہوگیا، تو اس نے ناخوشی کا اظہار کیا، اور بالغ ہونے کے بعد بھی وہ اس بات پر مصر ہے کہ مجھے وہ نکاح منظور نہیں، کیا اس صورت میں لڑکی کا والد اس کا نکاح دُوسری جگہ کراسکتا ہے یا نہیں؟ اور پہلا نکاح خودبخود فسخ ہوجائے گا یا نہیں؟

جواب:- باپ، دادا کا کیا ہوا نکاح لڑکی بلوغ کے بعد بھی فسخ نہیں کرسکتی،[۳] لہٰذا وہ نکاح دُرست ہوچکا ہے، اور لڑکی کے انکار سے فسخ نہیں ہوگا، البتہ اگر لڑکی بالغ ہونے کے بعد یہ دعویٰ کرتی ہو کہ میرے باپ نے کسی لالچ کی وجہ سے میری خیرخواہی کے برخلاف میرا نکاح کردیا تھا تو ایسی صورت میں اس لالچ کی تفصیل لکھ کر مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیا جائے، اس صورت کا حکم اسی وقت بتایا جائے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۳/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۱/۲۸ الف)

باپ کا کیا ہوا نکاح فسخ نہیں کیا جاسکتا

سوال:- زید نے اپنی رفیقۂ حیات زیب الٰہی کی سفارش پر اپنے بہنوئی کے طفلِ صغیر کے ساتھ اپنی صغیرہ نابالغہ لڑکی کا عقدِ نکاح مجلسِ عوام وخواص میں برضا ورغبت کردیا، اب لڑکی جوان ہوگئی

---

(۱) وفی الهداية، كتاب النكاح ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع شركت علميه) وينعقد نكاح الحرّة العاقلة البالغة برضائها.
وفی البحر الرائق، كتاب النكاح، باب الأولياء ج:۳ ص:۱۱۷ (طبع بيروت و فی طبع مكتبه رشيديه كوئٹه ج:۳ ص:۱۰۹) نفذ نكاح حرّة مكلّفة بلا ولی، لأنّها تصرّفت فی خالص حقها وهی من أهله لكونها عاقلة بالغة.
(۲) وفی الدر المختار، كتاب النكاح (باب الولی) ج:۳ ص:۵۶ و ۵۷ ويفتیٰ فی غير الكفو بعدم جوازه أصلًا وهو المختار للفتویٰ لفساد الزمان. وفی المبسوط باب الاكفاء ج:۵ ص:۲۵ (طبع دار المعرفة بيروت) واذا زوّجت المرأة نفسها من غير كفؤ فللأولياء أن يفرّقوا بينهما، لأنّها الحقت العار بالأولياء.
(۳) وفی الهندية كتاب النكاح، الباب الرّابع ج:۱ ص:۲۸۵ (طبع ماجديه) فان زوّجهما الأب والجد فلا خيار لهما بعد بلوغهما وفی البحر الرائق، كتاب النكاح، باب الأولياء ج:۳ ص:۱۲۸ (طبع بيروت وفی طبع مكتبه رشيديه كوئٹه ج:۳ ص:۱۲۰) ولهما خيار الفسخ بالبلوغ فی غير الأب والجد .... الخ.

ہے، لڑکا ابھی تک جوان نہیں ہوا ہے، البتہ دس سال تک جوان ہوجائے گا، اب زید یہ عذر پیش کرتا ہے کہ میں نے برضا و رغبت اپنی دختر صغیرہ نابالغہ کا نکاح نہیں کیا ہے، اور اتنی طویل مدّت کی زحمت کا متحمل بھی نہیں ہوسکتا (کہ مزید دس سال لڑکے کے بالغ ہونے کا انتظار کروں)، لہٰذا عدالتِ عالیہ میں دعویٰ دائر کرکے اپنی لڑکی کی طلاق لینا چاہتا ہوں، اور دُوسری جگہ اُس کا نکاح کردینا چاہتا ہوں، آج دعویٰ تنسیخِ نکاح کا رائج ہوگیا ہے، کیا یہ شرعاً دُرست ہوگا؟

جواب:- باپ کے کئے ہوئے نکاح میں عدالت کے ذریعے فسخِ نکاح کا کوئی سوال نہیں، شرعاً ایسا فسخِ نکاح معتبر نہ ہوگا۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۵/۷/ ۲۸ ب)

اولیاء کی رضامندی کے بغیر غیر کفو میں نکاح کا حکم

سوال:- ایک شخص بنام احمد جس کی لڑکی ہے، جب لڑکی عاقل بالغ ہوگئی تو احمد نے پانچ چھ گواہوں کے سامنے اپنی لڑکی اپنے چچازاد بھائی سے منگنی کروانے کا زبانی اقرار کیا اور واقعی وعدہ کیا، اور چچازاد بھائی جس کا نام غلام قادر ہے اس نے قبول کیا، اور منگنی کی شرائط کو گواہوں کے زوبرو قبول کیا، اس کے بعد لڑکی کی ماں لوگوں کے ورغلانے سے خاوند کا گھر چھوڑ کر لڑکی کو لے کر اسی کے گھر چلی گئی، وہاں پہنچ کر لڑکی کی ماں کہنے لگی کہ جہاں میرا خاوند میری لڑکی دینا چاہتا ہے، وہاں میں راضی نہیں ہوں، اور نہ میری لڑکی راضی ہے، کیونکہ وہ لڑکا پہلے سے شادی شدہ ہے، جس غیرقوم کے گھر ماں اور لڑکی گئی تھی اُس غیرقوم نے لوگوں کے مشورے سے لڑکی کا نکاح احمد کی مرضی کے خلاف کروادیا، جس لڑکے سے نکاح ہوا وہ احمد اور احمد کی بیوی کے ماموں کا لڑکا ہے، اس کے بعد احمد اپنے دو سگے لڑکے بھائی کے پاس چھوڑ کر اپنی بیوی اور لوگوں سے ناراض ہوکر سندھ چلا گیا، کیونکہ یہ نکاح اس کی مرضی کے خلاف ہوا تھا، نکاح کے وقت لڑکی نے نکاح کا ولی ماموں کو بنایا، ماموں نے ولی بن کر نکاح پڑھوایا، یہ نکاح رات کے وقت جبکہ لوگ سو رہے تھے کیا گیا، اور جس قوم میں یہ لڑکی دی گئی ہے، وہ قوم احمد کے گھر والے، احمد کی بیوی اور ماں اور دادی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، باقی احمد کے باپ اور دادا دُوسرے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، احمد کے باپ دادا کا نسب چودہ پندرہ پشت گزرنے کے بعد اس قوم سے ملتا ہے، آیا یہ نکاح جائز ہوا یا نہیں؟

---

(۱) وفی الفتاویٰ الهندیة، کتاب النکاح، الباب الرّابع ج:۱ ص:۲۸۵ (طبع ماجدیه) فان زوّجهما الأب والجد فلا خیار لهما بعد بلوغهما وان زوّجهما غیر الأب والجد فلکل واحد منهما الخیار .... الخ. وکذا فی الشامیة ج:۳ ص:۶۸.

تنقیح:-

۱:- احمد کی لڑکی نے جس مرد سے نکاح کیا ہے، وہ قومی اور خاندانی اعتبار سے احمد کا کفو ہے یا نہیں؟ یعنی کیا دونوں خاندانوں میں اتنا فرق ہے کہ ایک خاندان، دُوسرے خاندان میں شادی بیاہ کرنے کو عرفاً عار اور عیب سمجھتا ہو؟ یا اتنا فرق نہیں ہے اور دونوں خاندانوں میں بغیر کسی عار کے شادی بیاہ ہوتے ہیں؟

۲:- کیا دینداری کے اعتبار سے احمد کے گھرانے اور اُس مرد کے گھرانے میں فرق ہے؟

ان دو سوالات کا جواب اسی کاغذ پر لکھ کر بھیجئے، ان سوالات کا جواب آنے پر اصل مسئلے کا جواب دیا جائے گا۔ محمد تقی عثمانی

جوابِ تنقیح:-

وہ مرد اور اس کے گھرانے میں اتنا فرق دینداری کے اعتبار سے ہے کہ احمد اور احمد کے گھرانے موحد ہیں، اور جس مرد سے احمد کی لڑکی کا نکاح کیا گیا وہ مرد اور اُس کے گھرانے بدعتی ہیں، اور اُن میں مشرکانہ صفتیں بھی ہیں، چند صفتیں یہ ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھتا ہے، مشکلات میں پیر کو پکارتا ہے، مرنے کے بعد عہدنامہ کو قبر میں دفن کرتا ہے، نمازِ جنازہ پڑھ کر دائرہ بنا کر اسقاط کرتا ہے، احمد ان باتوں کے خلاف ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں احمد کی لڑکی کا نکاح جس شخص سے کیا گیا، وہ احمد کا کفو نہیں ہے، لما فی رد المحتار: فانهم قالوا لا یکون الفاسق کفوًا لبنت الصالحین. (شامی ج:۲ ص:۳۲۰ باب الاکفاء)[1]۔ اور فسقِ اعتقادی فسقِ عملی سے اشد ہے،[2] لہٰذا مذکورہ صورت میں احمد کی رضامندی کے بغیر جو نکاح کیا گیا وہ باطل ہے، احمد کی لڑکی کو چاہئے کہ وہ فوراً اُس شخص سے الگ ہوجائے، لما فی الدر المختار: وله اذا کان عصبة الاعتراض فی غیر الکفوء ما لم تلد منه، ویفتیٰ بعدم جوازہ أصلًا وهو المختار للفتویٰ لفساد الزمان. (شامی ج:۲ ص:۲۹۷)[3]۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۵۳۱ و)

---

(۱) فتاوی شامیة ج:۳ ص:۸۹ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) وفی حلبی کبیر شرح المنیة ص:۵۱۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) ..... فاسق من حیث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حیث العمل.

(۳) الدر المختار ج:۳ ص:۵۶، ۵۷ (طبع سعید)

ہندوستان میں مقیم لڑکی، پاکستان میں کسی سے نکاح کے لئے اپنا وکیل مقرّر کرسکتی ہے

سوال:- نفسِ مسئلہ پوری طرح واضح نہ ہوسکا، لہٰذا وضاحت کے لئے معاملے کی نوعیت بیان کرتا ہوں۔

لڑکی ہندوستان میں ہے، جہاں شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ایجاب کی تکمیل ہوچکی ہے، وکیل مقرّر شدہ جناب عبدالرحمٰن خان صاحب نے جو ہندوستان میں مقیم ہے، ارشاد علی خان صاحب جو پاکستان میں مقیم ہے، کو بذریعہ تحریر ہذا اپنا وکیل نامزد کیا تاکہ وہ نکاح خوانی کی مجلس منعقدہ لطیف آباد (حیدرآباد) میں نکاح خوانی کے متعلق وکیل کی نیابت قبول کرے، ایسی صورت میں معلوم کرنا ہے کہ جناب ارشاد علی خان صاحب لڑکی کے وکیل کی حیثیت سے لڑکی کی طرف سے ایجاب کرسکتے ہیں اور مجلس منعقدہ لطیف آباد (حیدرآباد) میں لڑکے کے قبول کرنے پر نکاح کی تکمیل شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ہوگی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ارشاد علی خان صاحب لڑکی کی طرف سے ایجاب کرسکتے ہیں، بشرطیکہ لڑکی ان کو وکیل بنانے پر راضی ہو۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کیا غیر کفو میں نکاح نہیں ہوتا؟ اور کفو میں نکاح کی شرعی حیثیت اور حکمت

سوال:- کیا نکاح اپنے کفو میں کرنا ضروری ہے؟ اس کے بغیر کسی اور خاندان میں نکاح نہیں ہوسکتا؟ کفو میں نکاح کیوں کرنا چاہئے؟ اور اپنے خاندان ہی میں نکاح کی کوشش کرنا کیسا ہے؟

جواب:- نکاح ہر ذات میں دونوں خاندانوں کی رضامندی سے ہوسکتا ہے[1]، لیکن کفو میں نکاح کرنا اس لئے بہتر ہوتا ہے کہ اس میں عموماً طبیعتیں مل جاتی ہیں، اگر اس خیال سے اپنے کفو میں نکاح کی کوشش کی جائے تو شرعاً کوئی حرج نہیں۔

واللہ اعلم

۱۴۱۰/۶/۲۸ھ[2]

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۲۸۷ کا حاشیہ نمبر۲ اور ص:۳۰۵ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔

(۲) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم نے ایک جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

﴿فصل فی الجهاز والمهر﴾
(جہیز اور مہر سے متعلق مسائل کا بیان)

نکاح میں مہر مقرّر نہ کیا ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک آدمی کی شادی ہوئی تقریباً دو سال ہوگئے، اس کو یہ پتہ نہیں کہ حق مہر کیا چیز ہوتی ہے؟ نہ اس نے دیا، وہ آدمی پنجاب کا ہے، دیہاتی ہے، اب اس کو معلوم ہوا ہے کہ حقِ مہر دینا ضروری ہے، اب وہ کیا کرے؟

جواب:- اگر نکاح کے وقت کوئی مہر مقرّر کیا گیا ہو تو مقرّر کی ہوئی مقدار اور تفصیل کے مطابق مہر ادا کر دیا جائے، اور اگر کوئی مہر مقرّر نہ ہوا ہو تو بیوی کے خاندان کی عورتوں کا عام طور پر جتنا مہر مقرّر ہوتا ہے، مثلاً بہنوں کا، اُتنا مہر واجب ہوگا جسے مہرِ مثل کہا جاتا ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۷/۱۷/۳۲ ج)

مہر دینا واجب ہے

سوال:- جنابِ عالی! گزارش ہے کہ محمد فرید خان ولد شیر زمان قوم ستی، تحصیل کوہِ مری، ضلع راولپنڈی نے اپنی بیوی کو طلاق دی، جبکہ پانچ لڑکے اس سے ہیں، اب بات یہ ہے کہ عدالت نے لکھا ہے کہ اس کا مہر حق داری باقی ہے، اب مہر حق داری جناب زمین، مکان، باغ وغیرہ کا ہے، محمد فرید خان کی بیوی افراز جان بی بی اپنا مہر کا حق وصول کرنے کی شریعت میں حق دار ہے یا نہیں؟ ضروری بات یہ ہے کہ ایک سال چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے، افراز بی بی کے لئے شرعی فتویٰ جاری کیا جائے، تاکہ سب وطن میں دین کا قانون جاری ہو جائے۔

جواب:- اگر محمد فرید خان نے طلاق دینے سے پہلے بیوی کو مہر ادا نہیں کیا تھا، تو اس پر واجب ہے کہ فوراً طے شدہ مہر ادا کرے، خواہ وہ مہر نقد روپے کی شکل میں ہو یا زمین یا باغ کی شکل

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۱۰۸ (طبع ایچ ایم سعید) (وکذا یجب) مهر المثل (فیما اذا لم یسمّ) مهرا.
وفی الشامیة قوله فیما اذا لم یسمّ مهرا ای لم یسمّه تسمیة صحیحة أو سکت عنه نهر.

میں ہو، فوراً ادا کرنا واجب ہے۔[1] اور نابالغ بچوں کا نفقہ بھی اس کے ذمے واجب ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۱۱/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۹۳/۳۰ د)

۱:- برادری کا مہر کی مقدار مقرّر کرنا، اور مہر کے ذکر کے ساتھ کئے گئے نکاح پر رضامندی مہر پر بھی رضامندی متصوّر ہوگی
۲:- شوہر اور لڑکی کے والدین کی طرف سے لڑکی کو دیئے گئے سامان کا حکم

سوال ۱:- ہماری میمن برادری میں عورتوں کا مہر بوقتِ نکاح اس وقت ۵۰۰ روپے مقرّر ہے، قبل ازیں ۱۲۵ روپے اور اس سے پہلے ۲۵ روپے تھا، یہ رقم برادری کی مجلسِ عامہ کی جانب سے مقرّر کی جاتی ہے، کیا مردوں کا یا ایک کمیٹی کا عورتوں سے پوچھے بغیر مہر مقرّر کرنا شرعاً صحیح و جائز ہے؟ نیز کیا عورت کی رضامندی ضروری ہے؟

۲:- دُلہن کو مرد کی طرف سے یا دُولہا کے خاندان کی طرف سے سونے کے زیورات دیئے جاتے ہیں، اگر طلاق ہوگئی تو زیورات واپس لئے جاتے ہیں، اس پر مطلقہ کا حق نہیں گردانا جاتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت کے پاس کچھ نہیں رہتا، وہ بے سروسامانی کی حالت میں میکے سدھارتی ہے، اگر مطلقہ صاحبِ اولاد ہو تو اور بھی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے، دین میں ایسی مطلقہ کو کیا رعایت حاصل ہیں؟

جواب ۱:- مہر مقرّر کرنے کے لئے عورت کی رضامندی ضروری ہے، لیکن نکاح کے وقت جب اس سے اجازت لی جاتی ہے اُس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ: ”تمہارا نکاح فلاں شخص سے اتنے مہر پر کیا جارہا ہے“ اگر اس نے اس وقت رضامندی دے دی تو مہر پر بھی رضامندی ہوگئی، جہاں تک

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب النکاح، باب المهر ج:۳ ص:۱۰۲ وتجب .... عند وطءٍ أو خلوة صحت من الزوج او موت احدهما أو تزوّج ثانيًا فی العدة وفی الشامية ج:۳ ص:۱۰۲ واذا تأكد المهر بما ذكر لا يسقط بعد ذلك وان كانت الفرقة من قبلها، لأن البدل بعد تأكده لا يحتمل السقوط الا بالابراء. وفی الهندية كتاب النّكاح الباب السابع الفصل الثانی ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع ماجديه) والمهر يتأكد بأحد معان ثلاثة، الدّخول والخلوة الصحيحة، وموت أحد الزوجين سواء كان مسمّى أو مهر المثل حتّى لا يسقط منه شئ بعد ذلك الا بالابراء من صاحب الحق.

(۲) وفی الفتاویٰ الهندية، كتاب الطلاق، الباب السابع عشر فی النّفقات ج:۱ ص:۵۶۰ (طبع ماجديه كوئٹه) نفقة الأولاد الصّغار على الأب لا يشاركهُ فيها أحد.

وفی الدر المختار، كتاب الطّلاق، باب النّفقة ج:۳ ص:۶۱۲ (طبع سعيد) وتجب النفقة بانواعها على الحرّ لطفله يعم الأنثىٰ والجمع الفقير الحر. وفی الشامية تحت (قوله الفقير) أى ان لم يبلغ حدّ الكسب .... الخ.

برادری کی طرف سے مہر کے تعین کا تعلق ہے، عورت اس کی پابند نہیں ہے، بلکہ اگر چاہے تو اس سے زیادہ بھی مقرّر کراسکتی ہے۔

۲:- اگر یہ زیورات عورت کو مالک بناکر صراحۃً نہیں دیئے گئے تو وہ شوہر ہی کی ملکیت ہیں،[۱] اور جدائی کے وقت شوہر واپس لے سکتا ہے، لیکن اس پر مہر کی ادائیگی واجب ہے اور لڑکی کو اس کے والدین کی طرف سے جو کچھ چڑھایا گیا ہو وہ اس کی ملکیت ہے،[۲] جو جدائی کے وقت اپنے ساتھ لے جاسکتی ہے، خلاصہ یہ کہ طلاق کے بعد شوہر کی طرف سے ایک تو مہر کی ادائیگی واجب ہے،[۳] بشرطیکہ وہ پہلے ادا نہ کیا ہو، دُوسرے عدت کے دوران اس کا نفقہ واجب ہے،[۴] اس کے علاوہ کوئی اور چیز اس کے ذمے واجب نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۲/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۰۳/۳۲ ج)

میکے اور سسرال کی طرف سے لڑکی کو دیا گیا سامان کس کی ملکیت ہے؟

سوال:- میری بھتیجی جس کو تین طلاقیں دی گئی ہیں، وہ اپنے گھر واپس آگئی ہے، اور طلاق کے وقت میری بھتیجی جو کپڑے اور زیور پہنے ہوئی تھی، اُس کے ساتھ آئی، اور وہ تمام جہیز کا سامان جو لڑکی کے والدین نے شادی پر اُس کو دیا تھا، اور وہ تمام سامان جو کہ اُس کے سابقہ شوہر نے اور اُس کے والدین نے (یعنی سابقہ شوہر کے) شادی پر دیا تھا یہ سب سامان سابقہ شوہر کے پاس ہے۔ طلاق مؤرخہ ۷۶/۸/۸ ۱۹ء کو دی گئی تھی، بہرحال جو سامان سابقہ شوہر اور سابقہ شوہر کے والدین نے شادی کے موقع پر دیا تھا وہ کس کی ملکیت ہے؟

---

(۱) وفی الدّر المختار کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعید) وشرائط صحتها فی الموهوب أن یکون مقبوضًا .... ورکنها هو الایجاب والقبول .... وحکمها ثبوت الملک للموهوب له .... وتصح بایجاب کوهبت ونحلت .... الخ.

(۲) وفی ردّ المحتار ج:۳ ص:۵۸۵ (طبع سعید) انّ الجهاز ملک المرأة وأنّه اذا طلّقها تأخذه کلّه واذا ماتت یورث عنها.

(۳) وفی الدّر المختار، کتاب النّکاح، باب المهر ج:۳ ص:۱۰۲ (طبع سعید) وتجب .... عند وطءٍ أو خلوة صحّت من الزّوج أو موت أحدهما أو تزوّج ثانیًا فی العدّة .... الخ. وفی الهندیة، کتاب النکاح، الباب السابع، الفصل الثانی ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع ماجدیه) والمهر یتأکّد بأحد معان ثلثة الدّخول والخلوة الصحیحة وموت أحد الزّوجین سواء کان مسمّٰی أو مهر المثل حتّٰی لا یسقط منه شیٔ بعد ذٰلک الا بالابراء من صاحب الحق .... الخ.

(۴) وفی الفتاوی الهندیة، کتاب الطّلاق، الباب السابع عشر فی النفقات، الفصل الثالث فی نفقة المعتدّة ج:۱ ص:۵۵۷ (طبع ماجدیه) المعتدّة عن الطّلاق تستحق النّفقة والسکنٰی کان الطّلاق رجعیًا أو بائنًا أو ثلثًا حاملًا کانت المرأة أو لم تکن، کذا فی فتاوی قاضی خان. وفی الدّر المختار، کتاب الطّلاق، باب النفقة ج:۳ ص:۶۰۹ (طبع سعید) وتجب لمطلّقة الرّجعی والبائن والفرقة بلا معصیة .... الخ.

جواب:- جو سامان سابقہ شوہر یا اس کے والدین نے شادی کے وقت دیا تھا، اگر وہ آپ کی بھتیجی کو ہبہ کر کے اور مالک بنا کر دینے کی صراحت کی تھی، تب تو وہ آپ کی بھتیجی کی ملکیت ہے،[1] اور اگر ایسی صراحت نہیں ہوئی تھی تو ہمارے زمانے میں عرف یہ ہے کہ وہ شوہر ہی کی ملکیت ہوتا ہے، لہٰذا اس عرف کے مطابق وہ شوہر کی ملکیت ہوگا،[2] البتہ جو جہیز لڑکی کو اس کے والدین نے دیا تھا، وہ لڑکی کی ملکیت ہے، اور شوہر پر واجب ہے کہ اس کو واپس کرے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۴/۲۸ الف)

مہر عورت کے لئے "اعزازیہ" ہے یا "عوض" اور "اُجرت"

(حضرتِ والا دامت برکاتہم کے مضمون "مہر شرعی کی حقیقت" کے تناظر میں حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی مدظلہم کا سوال)

سوال:- مکرمی ومحترمی جناب مولانا محمد تقی عثمانی زید مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۲ ر نومبر کے "جنگ" (لندن ایڈیشن) میں آں محترم کا کالم "مہر شرعی کی حقیقت" کے عنوان سے نکلا تھا، میں نے اس کو اسی وقت سے سامنے رکھا ہوا تھا، اس لئے کہ اس نے ایک کئی سال پُرانا سوال تازہ کر دیا تھا، مگر اس سلسلے میں جو لکھنا مقصود تھا اس کی نوبت آتے آتے اتنا وقت لگ گیا۔

یہاں ایک اہلِ تعلق انگریزی میں اسلام کی ترجمانی کے سلسلے میں لکھتے رہتے ہیں، ایک دفعہ مہر کے بارے میں انہوں نے یہی اعزازیہ (Honorarim) کی تعبیر اختیار کرنے کا خیال میرے سامنے ظاہر کیا، جو عنوان آپ نے اختیار فرمایا ہے، تو مجھے یہ اِشکال ہوا تھا کہ عنوان تو بہت اچھا ہے مگر مہر کا شرعی حکم اور شریعت کی بیان کردہ نوعیت اس تعبیر سے ہم آہنگ نہیں ہوتی، اس لئے کہ یہ منکوحہ عورت کا حق ہے، اور نوعیت اس حق کی وہ ہے جو قرآنی تعبیر "اُجُوْرَھُنَّ" سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کی تشریح میں آپ حضرات (یعنی فقہائے کرام) اسے "عوض ملک بضع" بتاتے ہیں۔ آپ کے

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب الھبۃ ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعید) وشرائط صحتھا فی الموھوب ان یکون مقبوضًا غیر مشاع ممیّزًا غیر مشغول .... ورکنھا ھو الایجاب والقبول .... وحکمھا ثبوت الملک للموھوب لہ .... وتصحّ بایجاب کوھبت ونحلت ... الخ۔

(۲) وفی الشامیۃ ج:۵ ص:۸۸: والعرف فی الشرع لہٗ اعتبار　لذا علیہ الحکم قد یدار۔

(۳) وفی الشامیۃ ج:۳ ص:۵۸۵ (طبع سعید) فانّ کل احد یعلم أن الجھاز ملک المرأۃ وانّہ اذا طلّقھا تأخذہٗ کلّہ واذا ماتت یورث عنھا .... الخ۔ نیز میکے اور سسرال سے لڑکی کو دیئے گئے سامان کے مذکورہ حکم کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد المفتین ص:۵۶۰ و ۵۶۱۔ (محمد زبیر)

مضمون میں یہ تعبیر پاکر بھی یہی اِشکال ہوا، اور کوئی جواب اس کا وہاں نظر نہ آیا۔ صحیح یہ ہے کہ اپنے ناقص فہم کی رو سے مہر کی نوعیت اگر ''اعزازیے'' کی ہو تو پھر آگے کوئی اِشکال نہیں ہوتا، چاہے زوج کی مالی حیثیت کی کمزوری کی بناء پر کتنا ہی کم تر ہو، لیکن اجر اور عوض کی صورت میں اس کے لئے ''کل ما جاز ان یکون ثمنًا وقیمةً لشیءٍ'' کا کافی ہونا یا مالکیہ اور حنفیہ کے مطابق تین درہم یا دس درہم کا کافی ہونا، اس میں تو اللہ معاف کرے اپنی ناقص عقل کے مطابق، عورت کی بڑی بے وقعتی کا پہلو نکلتا ہے، جبکہ شریعتِ الٰہی یقیناً اس سے بری ہے، کاش! آپ کے ذریعہ اس مسئلے میں مدد ملے، والسلام

آپ کا مخلص اور محبّ
عتیق الرحمٰن سنبھلی (لندن)
رجب ۱۴۱۶ھ

جواب:- بگرامی خدمت جناب مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ باعثِ افتخار و مسرّت ہوا، اتفاق سے میں کچھ عرصے سے کمر کے مہرے کی تکلیف میں ہوں، جس کی بناء پر بیٹھ کر کام نہیں کر پارہا، اس لئے لیٹے لیٹے یہ سطور اِملا کرا رہا ہوں اور براہِ راست مکاتبت کا شرف حاصل نہیں کرسکا، اُمید ہے کہ معذور قرار دیں گے۔

مہر کے لئے ''اعزازیہ'' کی تعبیر اختیار کرتے وقت میرے ذہن میں صاحبِ ہدایہ کی ایک عبارت تھی جس میں وہ فرماتے ہیں: ''ثم المهر واجب شرعًا ابانة لشرف المحل'' نیز چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں: ''ولأنه حق الشرع وجوبًا اظهارًا لشرف المحل، فيقدر بمالهٗ خطر'' اور علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''واما انه ابانة لشرفه فلعقلية ذلك اذ لم يشرع بدلًا كالثمن والأجرة والا لوجب تقديم تسميته، فعلمنا ان البدل النفقة، وهذا لاظهار خطره، فلا يستهان به، واذًا فقد تأكد شرعًا باظهار شرفه مرّة باشتراط الشهادة، ومرة بالزام المهر'' (فتح القدير مع الكفاية ج:۳ ص۲۰۵)[1]۔

نصوصِ شرعیہ پر غور کرنے سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مہر کی دو حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ عقدِ نکاح کا لازمی تقاضا ہے، اور اس طرح اس میں عوض ہونے کی ایک مشابہت ہے، اس حیثیت کے لحاظ سے قرآنِ کریم میں اس پر ''اُجُوْرَهُنَّ'' کے لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے، لیکن دُوسری طرف حقیقت یہ ہے کہ وہ ٹھیٹھ معنیٰ میں کسی مادّی چیز کا معاوضہ نہیں ہے، بلکہ وہ عورت کے اعزاز

(۱) طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔

کے لئے مشروع کیا گیا ہے، اسی لئے سورۃ النساء میں فرمایا گیا: "وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً"[۱] یہاں مہر کو "صدقہ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقات شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں: "وسمی به لانه یظهر صدق میل الرجل الی المرأة" میرے والد ماجد قدس اللہ سرہٗ مُلّا علی قاریؒ کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

> یعنی مہر کو "صَداق" اور "صَدُقہ" اس لئے کہتے ہیں کہ صدق کے اس مادّے میں "سچ" کے معنیٰ ہیں، اور مہر سے بھی چونکہ شوہر کا اپنی بیوی کی طرف سچا میلان ظاہر ہوتا ہے، اس لئے اس مناسبت سے مہر کو "صدق" کہنے لگے۔
>
> (معارف القرآن ج:۲ ص:۲۹۹ طبع ادارۃ المعارف کراچی)

نیز قرآنِ کریم نے اس کے ساتھ "نِحْلَةً" کا لفظ استعمال کیا ہے، جو عطیہ کو کہتے ہیں اور امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "انما سمی المهر نحلة، والنحلة فی الأصل العطیة والهبة فی بعض الوجوه، لأن الزوج لا یملک بدله شیئًا، لان البضع فی ملک المرأة بعد النکاح کهو قبله، الا تری انها لو وطئت بشبهة کان المهر لها دون الزوج، فانما سمی المهر نحلة لأنه لم یعتض من قبلها عوضا یملکه، فکان فی معنی النحلة الّتی لیس بإزائها بدلا، وانما الذی یستحقه الزوج منها بعقد النکاح هو الاستباحة لا الملک" (احکام القرآن للجصاصؒ ج:۲ ص:۵۷)۔[۲]

تقریباً یہی بات امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تحریر فرمائی ہے، (تفسیر کبیر ج:۹ ص:۱۸۰) قرآنِ کریم کی اس تعبیر اور امام جصاصؒ اور امام رازیؒ کی اس تشریح سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اصلاً مہر کسی بدل کا معاوضہ نہیں ہے، بلکہ عقد کا ایک ایسا تقاضا ہے جس کا منشا محلِ عقد کی تکریم اور اعزاز ہے، البتہ چونکہ اس کے بعض اَحکام ایسے ہیں جو عام طور پر معاوضوں کے ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ عورت اس کا مطالبہ کرسکتی ہے اور اسے شوہر کے ذمے دَین قرار دیا گیا ہے، وغیرہ، اس لئے اس مشابہت کی وجہ سے قرآنِ کریم میں بعض جگہ اسے "اُجور" سے تعبیر کیا گیا۔

اور معاوضے کے اَحکام جاری کرتے وقت بعض فقہائے کرام نے بھی اس مشابہت کی وجہ سے اسے ملک بضع کا بدل کہہ دیا ہے، لیکن جس طرح اس تعبیر میں "ملک" کا لفظ اپنے حقیقی معنیٰ میں استعمال نہیں ہوا، بلکہ اس سے مراد حقِ انتفاع ہے، اسی طرح "بدل" کا لفظ بھی من کل الوجوہ حقیقی معنیٰ میں نہیں ہے، بلکہ مذکورہ مشابہت کی وجہ سے مجازاً یہ تعبیر اختیار کی، جس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:-

---

(۱) سورة النساء:۴۔

(۲) طبع سهیل اکیڈمی لاهور۔

۱:- عقدِ معاوضہ میں بدل کا تعین عقد کی صحت کے لئے شرط ہوتا ہے، لیکن نکاح میں مہر کی تعیین کوئی ضروری نہیں، نکاح اس کے بغیر بھی ہوجاتا ہے اور مہرِ مثل واجب ہوتا ہے۔

۲:- بیع میں اگر یہ شرط لگادی جائے کہ خریدار کوئی قیمت ادا نہیں کرے گا تو بیع دُرست نہیں ہوتی، لیکن نکاح میں اگر یہ شرط لگادی جائے کہ کوئی مہر نہ ہوگا تو نکاح ہوجاتا ہے، اور مہرِ مثل واجب ہوتا ہے۔

۳:- معاوضات میں شرعاً بدل کی کوئی کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ مقدار مقرّر نہیں ہوتی، لیکن مہر کی کم سے کم مقدار کم از کم حنفیہ اور مالکیہ کے یہاں مقرّر ہے۔

۴:- عقودِ معاوضہ میں اگر معقود علیہ دُوسرے فریق کے حوالے نہ کیا جائے تو عوض واجب الاداء نہیں ہوتا، لیکن نکاح میں اگر رُخصتی سے پہلے ہی طلاق ہوجائے تو نصف مہر پھر بھی واجب ہوتا ہے۔

اس جیسے اور بھی متعدّد اُمور یہ بات ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ مہر میں عوض ہونے کی مشابہت ضرور ہے، لیکن عوض کے تمام اَحکام اس میں موجود نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ''اعزازیہ'' ہے، لیکن اس کی ادائیگی شوہر کے ذمے شرعاً لازم ہے، اور بیوی کو اس کے مطالبے کا حق بھی حاصل ہے، معاوضے کے مشابہ اور تکریم پر مبنی ہونے کی دونوں حیثیتوں کو تعبیر کرنے کے لئے مجھے ''اعزازیہ'' سے بہتر کوئی اور لفظ نہیں ملا، اور یہ تو آپ کے علم میں ہے کہ ''اعزازیہ'' بھی بعض اوقات واجب الاداء اور لائقِ مطالبہ ہوتا ہے۔

جہاں تک دس درہم یا تین درہم کی بے وقعتی کا تعلق ہے، سو یہ بات میں اپنے مضمون میں عرض کرچکا ہوں کہ عورت کا اصل حق شرعاً مہرِ مثل ہے، البتہ اگر وہ خود اپنا حق کسی وجہ سے کم کرنا چاہے تو کم سے کم ایسی حد شریعت نے مقرّر کردی ہے کہ فی الجملہ معتد بہ ہو، اور چونکہ یہ کم سے کم حد ہے، مہر کی مطلوب مقدار نہیں، اس لئے اس میں بے وقعتی کا کوئی پہلو نہیں۔

والسلام
۲۸ رجب ۱۴۱۶ھ (۱)

---

(۱) یہ جواب حضرتِ والا دامت برکاتہم نے سائلِ موصوف کے جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

﴿فصل فی أحکام الولیمة﴾
(ولیمہ کے مسائل)

ولیمہ کی شرعی حیثیت اور اس کا وقتِ مسنون

سوال:- ذی استطاعت پر ولیمہ کرنا سنتِ مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟ اور ایسا ولیمہ جو نکاح کے دس دن یا چار پانچ دن کے بعد کیا جائے یہ بھی مسنون و جائز ہوگا یا نہیں؟ اور ایسے ولیمہ کے کھانے کے لئے جانا جائز ہے یا نہیں؟ اور ولیمہ کب تک کیا جاسکتا ہے؟

جواب:- ولیمہ کرنا سنتِ مؤکدہ ہے، اس کا وقتِ مسنون زفاف کے بعد ہے، جس قدر جلد کیا جائے اتنا ہی سنت سے قریب ہوگا، چار پانچ دن کے بعد ولیمہ کیا جائے تو سنتِ ولیمہ ادا ہوجائے گی۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

ولیمہ کا مسنون وقت کون سا ہے؟

سوال:- دُلہن، عصر کے وقت چار بجے لائی گئی، نکاح سات بجے شام کو منعقد ہوا، آیا سات اور چار بجے کے درمیان طعام ولیمہ میں شمار ہوگا یا نہیں؟ زید کہتا ہے کہ ولیمہ بعد الدخول اور بعد النکاح ہی سنت ہے، اور بکر کہتا ہے کہ بعد الدخول اور بعد النکاح اور بعد الزفاف تمام سنت ہیں، کیونکہ:

قال فی الفتح: وقد اختلف السّلف فی وقتها عند العقد أو عقبه أو عند الدخول أو عقبه أو موسع من ابتداء العقد الٰی انتهاء الدخول علٰی أقوال. انتهٰی. والفرق بینهما ان عند یشترط فیه الحضور ۔معلوم ہوا کہ لفظ ''عند'' عقد کے بعد اور ماقبل کو بھی شامل ہے، **کما فی الحدیث: انه قالت ثلٰث اوقات نهانا رسول الله صلی الله علیه وسلم ان نصلّی فیها وان لا نقبر موتانا عند طلوع الشمس وعند غروبها وعند الاستواء. جزئیة ومنع عن الصلٰوة وسجدة التلاوة وصلٰوة الجنازة عند طلوع الشمس وعند الغروب والاستواء** ۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ ''عند'' عام ہے، نیز دُلہن نے اپنے آپ کو عقدِ نکاح کے لئے سپرد کیا تو یہ تمام وقت عقدِ نکاح کے لئے صالح ہے۔ نیز نکاح صدقہ اور ہبہ سے ہوسکتا ہے، جب دُلہن یا ولی نے شوہر کو زوجہ پر تسلط دیا تو تملیک اور قبضہ بھی

---

(۱) حوالے اور تفصیل کے لئے اگلا فتویٰ اور اس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب عفی عنہ)۔

آیا، ایجاب وقبول کی ضرورت نہیں، جیسے کہ حیلہ کے اندر ہے، تو طعام مذکور بھی ''ولیمہ'' میں شمار ہوگا یعنی (چار سے سات تک)۔

جواب:- ولیمہ کا وقتِ مسنون بعد الدخول ہے۔ **قال السبکی: والمنقول من فعل النبی صلی الله علیه وسلم انّها بعد الدّخول، وفی حدیث انس رضی الله عنه عند البخاری وغیره التصریح بأنّها بعد الدّخول لقوله اصبح عروسا بزینب فدعا القوم. (بذل المجهود ج:۴ ص:۳۲)[1]. السنّة فی الولیمة أن تکون بعد البناء وطعام ما قبل البناء لا یقال له: ولیمة عربیة. (فیض الباری ج:۴ ص:۳۰۰)[2].**

جن حضرات نے عند العقد اور عقب العقد ولیمہ کو مسنون کہا ہے، ان کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اوقات میں ولیمہ کرنے سے سنتِ ولیمہ ادا ہوجاتی ہے، جس طرح مسواک کے مسئلے میں (کہ برش کرنے سے سنتِ مسواک ادا ہوتی ہے، سنتِ آلہ ادا نہیں ہوتی)، اسی طرح یہاں سنتِ ولیمہ ادا ہوگئی، مگر سنتِ وقت ادا نہیں ہوئی، یعنی ولیمہ وقتِ مسنون میں ادا نہ ہوگا، لیکن عقدِ نکاح سے پہلے ''ولیمہ'' کی کوئی اصل نہیں، اس کے جو دلائل بیان کئے گئے ہیں وہ تمام محلِ نظر ہیں، ''عند'' اور ''لدی'' کا فرق اس وقت ہوتا ہے جبکہ ''عند'' مکان میں مستعمل ہو، ظرف کے وقت اطلاق قبل کے معنی پر نہیں ہوتا، **عند طلوع، بعد الطّلوع، عند الغروب، عند الاصفرار** میں بڑا فرق ہے۔ نہ ''هبه'' سے نکاح کا منعقد ہونا یہ معنی رکھتا ہے، **فالحاصل ان النکاح ینعقد بالهبة اذا کان علیٰ وجه النکاح، بحر (ج:۳ ص:۲۲)[3]۔**

واللہ سبحانہ اعلم

۱/۱۱/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۸/۱۸ الف)

---

(۱) بذل المجهود کتاب النکاح ج:۴ ص:۳۲ (طبع مکتبه قاسمیه ملتان). وکذا فی نیل الأوطار ج:۶ ص:۱۵۰.

(۲) طبع مکتبه اسلامیه شارع کانسی، کوئٹه.

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے شبِ زفاف کے بعد ولیمہ کرنا ثابت ہے، جیسا کہ درج ذیل حدیثِ بخاری میں تصریح ہے، اور یہی جمہور کا مسلک ہے، تاہم درج ذیل مختلف اقوال کی بناء پر سنتِ ولیمہ نکاح کے بعد یا رُخصتی سے قبل یا بعد کسی بھی وقت میں کرلینے سے ادا ہوجاتی ہے۔

وفی الصحیح للبخاری ج:۲ ص:۷۷۶ باب الولیمة حق .... وکان اوّل ما أنزل فی مُبتنٰی رسول الله صلی الله علیه وسلم بزینب ابنت جحش أصبح النبی صلی الله علیه وسلم بها عروسًا فدعا القوم فأصابوا من الطّعام .... الحدیث.

وفی هامشه: وقد اختلف السّلف فی وقتها، هل هو عند العقد أو عقبه أو عند الدّخول أو عقبه؟ .... واستحب مالک کونها أسبوعًا. وفی اعلاء السنن ج:۱۱ ص:۱۲ حدیث انس فی هذا الباب صریح أنّها أی الولیمة بعد الدّخول لقوله فیه أصبح عروسًا بزینب فدعا القوم. وفی التاج الجامع للأصول فی أحادیث الرسول، للشیخ منصور علی ناصف ج:۲ ص:۲۷۹ فصریح الحدیث ان الولیمة کانت صباح لیلة الدّخول فیکون وقتها بعد الدّخول عند الجمهور. وقال جماعة عند الدّخول وقال اخرون عند العقد، والظّاهر ان وقتها موسع من العقد الی الدّخول ففی أیّ وقت عملت کفی لأنّها نوع من اعلان النّکاح ومن أنواع البرّ والاکرام، والله اعلم. وفی المرقاة تحت رقم الحدیث: ۳۲۱۰ ج:۶ ص:۳۶۶ (طبع مکتبه حقانیه پشاور) قیل انها تکون بعد الدّخول، وقیل عند العقد، وقیل عندهما، واستحب أصحاب مالک ان تکون سبعة أیام والمختار أنه علیٰ قدر حال الزوج. وکذا فی فتح الباری ج:۹ ص:۱۹۹. و فتح الملهم ج:۳ ص:۴۸۹. و أوجز المسالک ج:۴ ص:۳۱۸. نیز دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۷ ص:۱۲۷.

(۳) البحر الرائق ج:۳ ص:۸۷ (طبع ایچ ایم سعید). وفی الشامیة (قوله کهبة) أی اذا کانت علیٰ وجه النکاح.

﴿فصل فی متفرّقات النّکاح والمسائل الجدیدۃ المتعلّقۃ بالنّکاح﴾

(نکاح کے جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

ٹیلی فون پر نکاح کی شرعی حیثیت

سوال:- ٹیلی فون پر آج کل نکاح ہوتا ہے، کیا یہ دُرست ہے اور نکاح ہوجاتا ہے؟

جواب:- نکاح میں چونکہ یہ ضروری ہے کہ دو گواہ مجلسِ نکاح میں حاضر ہوں اور ایجاب و قبول دونوں سنیں،(۱) اس لئے ٹیلی فون پر نکاح دُرست نہیں ہوتا، اگر دُوسرے شہر یا ملک میں نکاح کرنا ہو تو اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس شہر میں کسی شخص کو اپنے نکاح کا وکیل مقرّر کردیں، وکیل اس کی طرف سے دُوسرے فریق کے ساتھ دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول کرے، اس طرح نکاح صحیح ہوجائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۱۲ ج)

خطبۂ نکاح ایجاب وقبول سے پہلے ہو یا بعد میں؟

سوال:- بوقتِ نکاح خطبۂ نکاح ایجاب وقبول سے پہلے پڑھنا سنت ہے یا ایجاب وقبول کے بعد پڑھنا سنت ہے؟

جواب:- خطبۂ نکاح کا ایجاب وقبول سے پہلے پڑھنا سنت ہے۔(۲)　　واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۴۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب النکاح ج:۳ ص:۹ وینعقد بایجاب من أحدهما وقبول من الأخر، وفیه أیضًا ج:۳ ص:۲۱ وشرط حضور شاهدین حرّین أو حرّ وحرّتین مکلفین سامعین قولهما معًا. وفی الهدایة ج:۲ ص:۳۰۲ (طبع شرکت علمیه) ولا ینعقد نکاح المسلمین الا بحضور شاهدین حرّین عاقلین بالغین مسلمین. وفی الهندیة کتاب النکاح، الفصل الأوّل ج:۱ ص:۲۶۸ ومنها سماع الشاهدین کلامهما معًا. هکذا فی فتح القدیر.

(۲) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۸ ویندب اعلانه وتقدیم خُطبة. وفی الشامیة (وتقدیم خُطبة) بضم الخاء ما یذکر قبل اجراء العقد من الحمد والتشهد .... الخ. وفی البحر الرائق کتاب النکاح ج:۳ ص:۸۱ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) یستحب أن یکون النکاح ظاهرًا وأن یکون قبله خطبة.

آزاد شخص چار تک شادیاں کرسکتا ہے

سوال:- موجودہ زمانے میں غلامی کا نظام ختم ہوچکا ہے، صرف غلامی اور آقا کا نام رہ گیا ہے، ایک غلام کے گھر میں دو بیویاں ہیں، جو پہلے سے نکاح میں لاکر گھر میں رکھے ہوئے ہے، اب ان دو عورتوں کے علاوہ اس نے ایک آزاد عورت سے تیسری شادی کرلی ہے، جو کہ اس کے خاندان سے نہیں ہے، وہ تو خود عبد ہے، لیکن تیسری بیوی حر ہے، کیا یہ نکاح صحیح ہوا؟ اکثر فقہ کی کتابوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک عبد دو عورتوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتا ہے۔

جواب:- آج کل شرعی غلاموں اور باندیوں کا وجود نہیں ہے، اگر کسی شخص کے آباء واجداد غلام رہے ہوں تو محض اتنی بات سے وہ غلام نہیں ہوتا، آج کل سب احرار ہیں، لہٰذا چار تک بیویاں رکھنا ان کے لئے جائز ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲/۲۸ الف)

ٹیلی فون پر نکاح کا حکم

سوال:- ٹیلی فون پر نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بصورتِ اوّل کن شرطوں کے ماتحت؟

جواب:- ٹیلی فون پر نکاح نہیں ہوسکتا، کیونکہ دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول اس میں شرعی شرائط کے مطابق ممکن نہیں۔[2] البتہ غیر ممالک میں رہنے والے اگر نکاح کرنا چاہیں تو اس کی یہ صورت ممکن ہے کہ جس شہر میں لڑکی موجود ہو اس شہر کے کسی آدمی کو لڑکا اپنا وکیل بنادے اور اس سے کہہ دے کہ میرا نکاح فلاں لڑکی سے کردو، اب یہ وکیل دو گواہوں کی موجودگی میں لڑکی یا اس کے وکیل کے ساتھ ایجاب وقبول کرلے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۵/۱۱/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴/۱۷/۳۲ ج)

دو عیدوں کے درمیان نکاح بلاشبہ جائز ہے

سوال:- کئی آدمیوں کی زبانی سننے میں آیا ہے کہ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے درمیان شادی کرنا منع ہے اور جائز نہیں ہے، اگر دونوں عیدوں کے درمیان کوئی شادی کرلیتا ہے تو اس کو ۲۷/رمضان

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ: "فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ." سورۃ النساء:۳.

(۲) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۹ وینعقد بایجاب من أحدهما وقبول من الأخر، وفیه أیضًا ج:۳ ص:۲۱ وشرط حضور شاهدين حرّين أو حرّ وحرّتين مكلفين سامعين قولهما معًا. وفی الهداية ج:۲ ص:۳۰۶ (طبع شرکت علمیه) ولا ينعقد نكاح المسلمين الّا بحضور شاهدين حرّين عاقلين بالغين مسلمين.
وفی الهندية كتاب النكاح الفصل الأوّل ج:۱ ص:۲۶۸ ومنها سماع الشاهدين كلامهما معًا. هٰكذا فی فتح القدير.

المبارک کو نکاح پڑھانا پڑتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- شرعی اعتبار سے یہ بات قطعی بے بنیاد اور لغو ہے کہ دو عیدوں کے درمیان نکاح جائز نہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے شوال کے مہینے میں ہوا ہے۔[1] ایسی بے بنیاد باتوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، دو عیدوں کے درمیان نکاح باجماع اُمت جائز ہے، اور اس کے لئے ۲۷؍رمضان کو نکاح پڑھنے کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۹؍۷؍۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۱۸ ج)

رُخصتی کے انکار سے نکاح ختم نہیں ہوگا

سوال:- محمد عمر نے اپنے بھانجے یامین کی شادی شہداد پور میں محمد یوسف کی لڑکی کے ساتھ کی، اور اس کے بدلے میں محمد عمر نے اپنی لڑکی کی شادی محمد یوسف کے لڑکے کے ساتھ کی، اس شادی کا پسِ منظر یہ ہے کہ محمد عمر نے جب اپنے بھانجے کی منگنی محمد یوسف کی لڑکی کے ساتھ کی تو اس وقت محمد یامین کی عمر چالیس سال تھی، اور لڑکی کی عمر تقریباً سولہ سال تھی، تو محمد عمر نے بدلے میں اپنی لڑکی جو کہ آٹھ نو سال کی تھی محمد یوسف کے لڑکے کے نکاح میں دینا قبول کی اس کی عمر دس گیارہ سال تھی، اب جب محمد یامین نے شادی کی، واپسی پر معلوم ہوا کہ یامین نے اپنے سسر کو ڈھائی ہزار روپے بھی دیئے ہیں، اس لئے کہ محمد یوسف جلدی شادی کردے، اور کوئی شخص رُکاوٹ نہ ڈالے، جب محمد عمر کو پتہ چلا کہ یامین نے پیسے دیئے ہیں تو میں لڑکی بدلے میں کیوں دوں؟ محمد یامین کی شادی کے دو روز بعد محمد یوسف اپنے لڑکے کی بارات لے کر آگیا، لوگوں نے محمد عمر کو بہت سمجھایا، مگر نہ مانا، لوگوں نے کہا تو پھر محمد یوسف اپنی لڑکی لے جائے گا اور طلاق لے لے گا اور تمہارے بھانجے یامین کے پیسے بھی ڈوب جائیں گے، لہٰذا تم اپنی لڑکی کا نکاح کردو، لہٰذا بھائیوں کے سمجھانے پر محمد عمر نے کہا چلو نکاح کردیتا ہوں، لیکن لڑکی جب تک جوان نہ ہوگی اسے سسرال نہ بھیجوں گا، بھائیوں نے کہا کہ وہ تو بعد کی بات ہے، لہٰذا باقاعدہ قاضی کے ذریعے ایجاب وقبول ہوا اور مہر ۳۲ روپے ۸ آنے مقرّر ہوا، گواہوں کے سامنے لڑکی کی طرف سے محمد عمر نے قبول کیا، شادی کو دس بارہ سال ہوچکے ہیں، لڑکی بالغ ہوچکی ہے، اب محمد یوسف مرحوم جس کا انتقال ہوچکا ہے، کے بھائیوں نے محمد عمر کو لڑکی رُخصت کرنے کو کہا، تو محمد عمر کہتا ہے کہ

---

(۱) وفی مشکوۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب اعلان النکاح والخطبة والشرط ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عائشة قالت: تزوجنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی شوال وبنی بی فی شوال، فأیُّ نساء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان أحظیٰ عنده منی. رواہ مسلم. وفی حاشیة المشکوۃ تحته: فأی نساء انما قالت هذا ردًا علی أهل الجاهلیة فانهم کانوا لا یرون الیمن فی التزوج والعرس فی أشهر الحج.

میں ہمیشہ یہی کہتا رہوں گا کہ میری لڑکی کا نکاح نہیں ہوا ہے، دس برس میں دونوں فریقوں میں کوئی لین دین نہیں رہا، پھر پنچایت ہوئی، لوگوں نے کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے، محمد عمر کہتا ہے کہ بھائیوں کے مجبور کرنے پر نکاح کر دیا تھا، اس لئے نکاح لڑکی کا نہیں ہوا، فتویٰ منگوالو کہ نکاح ہوا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب محمد عمر نے اپنی لڑکی کا نکاح باضابطہ دو گواہوں کے سامنے قاضی کے ذریعے ایجاب و قبول کر کے دے دیا تو نکاح منعقد ہوگیا[1]، اور اس نے رُخصتی کرنے سے جو انکار کیا تھا، اس سے نکاح کے انعقاد پر کوئی فرق نہیں ہوتا، لہٰذا اس پر واجب ہے کہ وہ لڑکی کی رُخصتی کرے یا شوہر سے طلاق حاصل کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۹/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۶۱/۲۷ د)

دُوسری شادی کے لئے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری نہیں

سوال:- مطلقہ عورت کا دُوسرا نکاح ۱۰ ماہ ۱۸ دن کے بعد ہوا، پہلی بیوی کی موجودگی میں پہلی بیوی سے دُوسرا نکاح کرنے کی شرعی طور پر اجازت لی ہو اور پہلی بیوی اس بات پر بھی آمادہ ہو کہ ساتھ رہیں، کیا یہ نکاح دُرست ہے؟

جواب:- اگر شوہر کو یہ اطمینان ہو کہ وہ ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی صورت میں شرعی طور پر عدل و انصاف قائم رکھے گا تو وہ پہلی بیوی کی موجودگی میں دُوسرا نکاح کرسکتا ہے[2]، اور اس کے لئے پہلی بیوی سے اجازت لینا بھی ضروری نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۰۹/۳۲ ج)

ہندو مُردہ کے جلنے کا منظر دیکھنے سے نکاح نہیں ٹوٹتا

سوال:- ایک روز دِل میں خیال آیا کہ ہندو اپنا مردہ کس طرح جلاتے ہیں، دیکھنا چاہئے، ایک بڑے زمین دار ہندو کا انتقال ہوگیا، زید یہ دیکھنے کے لئے مسان گھاٹ چلا گیا، دُور چھپ کر دیکھتا رہا، چند سال گزر جانے کے بعد زید نے اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا، ایک دوست نے کہا کہ تمہارا نکاح فسخ ہوگیا، لہٰذا آپ دُوسرا نکاح کریں۔ کیا شرعاً یہ دُرست ہے؟

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب النکاح ج:۳ ص:۹ (طبع سعید) (وینعقد) (بایجاب) من أحدهما (وقبول) من الآخر.

(۲) "فانکحوا ما طاب لکم من النسآء مثنیٰ وثلث وربٰع" سورة النساء:۳. وفی الدر المختار ج:۳ ص:۷ ومکروها لخوف الجور. وفی الشامیة .... وترک الشارح قسما سادسًا ذکره فی البحر عن المجتبیٰ وهو الاباحة ان خاف العجز عن الایفاء بموجبه ای خوفًا غیر راجح وألّا کان مکروها تحریمًا لأنّ عدم الجور من مواجبه.

جواب:- غیر مسلموں کی مذہبی اور معاشرتی رسموں میں دیکھنے کے لئے بھی شرکت نہیں کرنی چاہئے، لیکن ایسا کرنے سے نکاح نہیں ٹوٹتا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں زید کا نکاح فسخ نہیں ہوا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۲۶/۲۷ و)

شوہر کو بھائی یا باپ کہنے سے نکاح پر اثر نہیں پڑتا

سوال:- شوہر اور بیوی کے جھگڑے میں بیوی نے اپنے شوہر کو بھائی باپ کہا، اور بعد میں افسوس کرنے لگی، کیونکہ وہ غصے میں بولی تھی، اب شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- بیوی کو ہرگز نہ چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کو بھائی یا باپ کہے، لیکن اس طرح کہنے سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا،[1] وہ بدستور میاں بیوی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۳۴/۲۸ ج)

لڑکی کی شادی کم سے کم کتنی عمر میں کر سکتے ہیں؟

سوال:- لڑکی کی شادی کم سے کم کتنی عمر میں کر سکتے ہیں؟ ازروئے شرع جواب سے مطلع فرمائیں۔

جواب:- شادی کے لئے کوئی عمر مقرر نہیں، ہر عمر میں نکاح کرنا جائز ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ بلوغ کے بعد نکاح کیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

بیوی کی طرف سے شوہر کو کافر کہنے پر نکاح نہیں ٹوٹتا

سوال:- ایک شخص اپنی بیوی سے ناراض ہو کر اپنے اوزار وغیرہ لے کر چلا گیا، بیوی کو غصہ آیا تو گھر کے کپڑے جلا دیئے اور کہنے لگی: ''کافر چلا گیا'' اور کئی دفعہ ایسا کہا، عورت کو اپنے خاوند کے متعلق کسی دُوسری عورت سے تعلق کا شبہ ہے، کیا عورت کا اپنے شوہر کو کافر کہنے سے نکاح ٹوٹا یا نہیں؟

جواب:- بیوی نے اپنے شوہر کو کافر کہہ کر سخت گناہ کا ارتکاب کیا،[2] اُسے چاہئے کہ اس پر

---

(۱) دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند باب الظہار ج:۱۰ ص:۲۱۱۔

(۲) وفي مشكوة المصابيح ج:۲ ص:۴۱۱ (طبع قديمی كتب خانه) عن ابن عمر رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أيما رجل قال لأخيه كافر، فقد باء بها أحدهما. متفق عليه. وفيه أيضًا بعدهٗ رقم الحديث: ۴۸۱۴ سباب المسلم فسوق وقتاله كفرٌ.

توبہ و اِستغفار کرے اور شوہر سے بھی معافی مانگے، لیکن اس سے نکاح نہیں ٹوٹا، نکاح برقرار ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۵۵۵/۲۸ ب)

دُوسری شادی کے لئے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری نہیں

سوال:- اگر کوئی شخص ایک سے زائد نکاح کا خواہش مند ہو تو کیا پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہے یا صرف برابری کرنا ضروری ہے اجازت لینا نہیں؟

جواب:- پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری نہیں، البتہ بہتر ہے، لیکن بیویوں کے درمیان ہر طرح سے انصاف رکھنا لازمی ہے، اگر اس میں ذرا بھی بے انصافی کا خطرہ ہو تو دُوسری شادی جائز نہیں۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۶/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۷۰۶/۲۹ ب)

۱:- شادی میں فائرنگ کی رسم واجب الترک ہے
۲:- ناجائز رُسومات والی شادی میں مقتداء علماء کو شرکت نہیں کرنی چاہئے

سوال ۱:- شادی میں لوگ فخر و اشتہار کے لئے فائرنگ کرتے ہیں، فائرنگ کی یہ رسم تبذیر ہے یا نہیں؟

۲:- کیا ایسی شادی بیاہ جس میں رُسومات ہوں اس میں کسی کی شرکت اور خاص کر علماء کی شرکت جائز ہے؟

جواب ۱:- فائرنگ کی یہ رسم فضول خرچی بھی ہے اور متعدد منکرات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے واجب الترک ہے۔

۲:- جس شادی میں شرعی منکرات ہوں اس میں مقتداء علماء کو شرکت نہ کرنی چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۷۲/۵۸)

(۱) وفي الدّر المختار كتاب النكاح ج:۳ ص:۷ (ايج ايم سعيد) (ومكروها لخوف الجور) فان تيقنه حرم ذٰلك، وفي الشامية (قوله فان تيقنه) أي تيقن الجور حرم لأن النكاح انّما شرع لمصلحة تحصين النفس وتحصيل الثواب وبالجور يأثم ويرتكب المحرمات فتنعدم المصالح لرجحان هٰذه المفاسد. بحر، وترك الشارح قسما سادسًا ذكره في البحر عن المجتبى وهو الاباحة ان خاف العجز عن الايفاء بموجبه اهـ. أي خوفا غير راجح وإلّا كان مكروها تحريمًا لأن عدم الجور من مواجبه .... الخ.

شوہر کتنا عرصہ بیوی سے جدا رہ سکتا ہے؟

(ملازمت یا تعلیم وتبلیغ کے لئے عرصہ دراز تک بیوی سے جدا رہنے سے متعلق مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب مدظلہ کے سوال کا جواب)

سوال:- بخدمت جناب مولانا عبداللہ میمن صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

آنجناب کی ارسال کردہ کتابوں کے ہدیہ کی تیسری قسط موصول ہوئی، جو کہ اصلاحی خطبات اور بیوی کے حقوق پر مشتمل تھی، اس انتہائی عنایت اور کرم فرمائی پر بہت ہی مشکور وممنون ہوں اور دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ جناب کی جان و مال اور علم وعمل میں برکت عطا فرمائیں۔

جناب کے ہدیہ کی مناسبت سے ایک سوال نوکِ قلم پر آ گیا لیکن اس کا جواب جناب کے اور حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے طیبِ خاطر پر موقوف کرتا ہوں۔

رسالہ ''بیوی کے حقوق'' میں مولانا مدظلہ نے تحریر فرمایا:-

فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ مرد کے لئے چار مہینے سے زیادہ گھر سے باہر رہنا بیوی کی اجازت اور اس کی خوشدلی کے بغیر جائز نہیں۔ (ص:۶۱)

مفہوم مخالف سے یہ نکلا کہ بیوی کی اجازت سے سال دو سال کے لئے باہر رہ سکتے ہیں۔

اُردو کی بعض کتابوں میں تو یہ مسئلہ ایسے ہی لکھا ہے لیکن کیا عربی فتاویٰ اور فقہ کی کتابوں میں بھی حنفیہ کے نزدیک مسئلے کے اس طرح ہونے کی تصریح موجود ہے؟ یہ تصریح تو موجود ہے کہ بیوی کی رضامندی اور خوش دِلی سے وطی کو چار ماہ سے زائد مؤخر کرسکتا ہے، لیکن اس سے یہ مطلب نکالنا کہ کوئی شخص جوان بیوی سے اجازت لے کر سال دو سال اور زائد مدّت کے لئے باہر جاسکتا ہے مشکل ہے۔ پھر اِکا دُکا کوئی واقعہ ایسا ہو تو شاید غیر معمولی حالات پر محمول کرلیا جائے، لیکن موجودہ دور میں بڑے پیمانے پر ملازمت، تعلیم اور تبلیغ کے لئے اس طرح نکلنا سمجھ سے باہر ہے۔

بہرحال اگر ایسا کوئی حوالہ جناب مولانا مدظلہ سے حاصل کر کے روانہ کریں تو بڑا احسان ہوگا۔

علاوہ ازیں اگر ایسا کوئی حوالہ موجود ہے تو پھر اس کی کیا توجیہ ہوگی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم جاری فرمایا کہ مجاہدین چار مہینے سے زیادہ گھر سے باہر نہ رہیں، اور یہ حکم کیوں نہ دیا کہ چار مہینوں سے زیادہ کے لئے بیویوں سے اجازت لے کر نکلا کریں۔

میں نے اپنے اِشکال کا خلاصہ تحریر کیا ہے، اگر اس بارے میں کوئی رہنمائی میسر آجائے تو

ممنون ہوں گا۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر شکریہ قبول فرمائیں۔ مولانا مدظلہٗ کی خدمت میں سلام پیش فرمائیں۔

والسلام علیکم

(مولانا ڈاکٹر عبدالواحد)

جامعہ مدنیہ لاہور

جواب:- گرامی قدر مکرّم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ مولانا عبداللہ میمن صاحب کے نام موصول ہوا، اور آنجناب نے جس پہلو کی طرف متوجہ فرمایا، اس پر غور کیا، آپ نے دُرست فرمایا ہے کہ چار ماہ سے زائد گھر سے باہر رہنے کے جواز کے لئے صرف بیوی کی اجازت اور خوش دِلی کافی نہیں ہونی چاہئے، اس مسئلہ میں فقہاء کی کوئی تصریح تو نہیں ملی، سوائے درمختار کی اس عبارت کے:

ویسقط حقها بمرة ویجب دیانةً احیانًا ولا یبلغ مدة الایلاء الا برضاها.

اسی کے تحت علامہ شامیؒ نے فتح القدیر کی مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے:-

ویجب ان لا یبلغ به مدة الایلاء الا برضاها وطیب نفسها به.

(درمختار مع شامی ج:۳ ص:۲۰۲)[1]

لیکن یہ مسئلہ حقِ جماع سے متعلق ہے، اور اس میں یہ تصریح ہے کہ عورت اپنی رضامندی سے اپنا یہ حق ترک کرسکتی ہے، لیکن یہ دُرست ہے کہ مطلق سفر کے بارے میں فقہاء کرامؒ کی کوئی تصریح احقر کی نظر سے بھی نہیں گزری، لیکن حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے علیٰ اختلاف الروایات چار مہینے یا پانچ مہینے یا چھ مہینے تک سفر پر رہنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے، لیکن ظاہر یہی ہے کہ یہ عورت کے حق کی وجہ سے ہے، اور یہ جب اس کا حق ہے تو وہ اس سے دست بردار بھی ہوسکتی ہے، رہا یہ معاملہ کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ کیوں نہیں فرمایا کہ بیوی کی اجازت سے سپاہیوں کو چار ماہ سے زائد کے سفر پر بھیجا جاسکتا ہے، تو اس کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو اپنے لشکر کے سپاہیوں کے لئے ایک ضابطہ مقرّر کرنا تھا کہ ان کو کتنی مدّت کے بعد واپس بلایا جائے، اس کے لئے انہوں نے چار ماہ کی مدّت علی الاطلاق مقرّر فرمادی، چنانچہ ان کے الفاظ یہ منقول ہیں کہ:-

---

(۱) (طبع سعید کراچی)

لا احبس الجیش اکثر من ھذا. (سنن بیھقی، کتاب السیر ج۹ ص:۲۹)[1]

اور:-

فکتب عمر ان لا تحبس الجیوش فوق أربعة أشهر.

(مصنف عبدالرزاق ج:۷ ص:۱۵۱، ۱۵۲)[2]

چونکہ سپاہیوں کے لئے کوئی نہ کوئی مدّت مقرّر کرنی ہی تھی، اس لئے آپؓ نے چار ماہ کی مدّت علی الاطلاق مقرّر فرمادی، اور اس تدقیق کی ضرورت نہیں سمجھی کہ کس کی بیوی اس سے زائد کے لئے راضی ہے، اور کس کی بیوی راضی نہیں۔

البتہ یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ گھر سے باہر رہنے میں کسی فتنے کا اندیشہ نہ ہو، جہاں فتنے کا اندیشہ ہو، وہاں صرف بیوی کی اجازت گھر سے باہر رہنے کے لئے کافی نہیں، اور فتنے کے اس دور میں اس طرزِ عمل کی ہرگز حوصلہ افزائی نہ ہونی چاہئے۔ آپ کا یہ فرمانا بھی بجا اور دُرست ہے کہ احیاناً ضرورت کے مواقع پر طویل سفر اختیار کرنا اور بات ہے اور اس عمل کو معمول بنالینا دُوسری بات ہے۔ اور چونکہ ایسی صورت میں فتنے کے امکانات بہت قوی ہوجاتے ہیں، اس لئے اس سے احتراز ہی کرنا چاہئے۔ خلاصہ یہ کہ جہاں فتنے کا ظن غالب ہو وہاں تو بیوی کی اجازت کے ساتھ بھی سفر اختیار کرنا جائز نہیں، اور اس میں مدّت کی کوئی قید نہیں، اور جہاں ظن غالب نہ ہو، لیکن معتد بہ احتمال ہو وہاں بھی حتی الامکان اس سے احتراز ہی لازم ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ فقہاء کرام نے چار ماہ کا جو ذکر فرمایا ہے وہ عوارض سے قطع نظر کرتے ہوئے محض عورت کے حق کی بنیاد پر فرمایا ہے، لیکن جہاں عوارضِ فتنہ موجود ہوں، وہاں اس تفصیل پر عمل ہونا چاہئے جو اُوپر عرض کی گئی۔

ھذا ما ظھر لی

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

والسلام

محمد تقی عثمانی

۱۴۱۴/۴/۹ھ[3]

---

(۱) طبع نشر السُّنّة ملتان.

(۲) ناشر مجلسِ علمی.

(۳) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

﴿کتاب الطّلاق﴾

(طلاق کے مسائل)

﴿باب ایقاع الطّلاق﴾

(طلاق دینے اور طلاق واقع ہونے کا بیان)

پاگل پن اور نیند کی حالت میں طلاق کا حکم
نابالغ کی طلاق کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں؟ فتویٰ چاہتا ہوں (فقہِ حنفی کی روشنی میں)۔

مسئلہ:- اگر کوئی مسلمان بالغ شخص جنون کی حالت میں، پاگل پن کی حالت میں یا نشے کی حالت میں یا نیند کی حالت میں یا غصے کی حالت میں یا مذاق سے یا دھمکی دینے کے انداز میں اپنی بیوی کو تین دفعہ طلاق دے دیتا ہے تو کیا طلاق ہوجاتی ہے یا نہیں؟ یا اگر ایک نابالغ خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو کیا طلاق ہوجاتی ہے یا نہیں؟ یا اگر ایک شخص قریب المرگ ہو اور وہ حالتِ نزع میں اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو کیا طلاق ہوجاتی ہے کہ نہیں؟

جواب:- پاگل پن اور نیند کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی،[1] نیز نابالغ کی طلاق واقع نہیں ہوتی،[2] باقی تمام صورتوں میں حنفی مسلک کے لحاظ سے طلاق ہوجاتی ہے۔　　واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۰/۴/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۷۳/۱۲)

مدہوش کی طلاق کا حکم

سوال:- زید دو راتوں کا جاگا ہوا بسلسلہ نوکری اپنی اَن تھک محنت سے فارغ ہوکر جب گھر

(۱،۲) وفی تنویر الأبصار کتاب الطّلاق ج:۳ ص:۲۴۲ لا یقع طلاق المولٰی علٰی امرأة عبدہٖ والمجنون والصبی .... والمدھوش. وفی الھندیة ج:۱ ص:۳۵۳ (طبع رشیدیه کوئٹه) ولا یقع طلاق الصبی وان کان یعقل والمجنون والنائم والمبرسم والمغمی علیه والمدھوش .. . الخ. وفی البدائع ج:۳ ص:۱۰۰ ومنھا ان لا یکون معتوھا ولا مدھوشًا ولا مبرسمًا ولا مغمی علیه ولا نائمًا فلا یقع طلاق ھؤلاء لما قلنا فی المجنون .... الخ. وفی شرح الوقایة باب ایقاع الطّلاق ج:۲ ص:۶۳ (طبع سعید) لا طلاق صبی ومجنون ونائم. وکذا فی البحر الرائق ج:۳ ص:۲۴۹ وفتح القدیر ج:۳ ص:۳۵۰. وفی فتح القدیر ج:۳ ص:۳۴۳ ویقع طلاق کل زوج اذا کان عاقلًا بالغًا ولا یقع طلاق الصبی والمجنون والنائم.

آجاتا ہے تو گھر میں اپنی بیوی سے ملنے سے پہلے کچھ لوگوں (گھر کے ہی) نے اس سے کانا پھوسی کی، جو اس کی بیوی کے خلاف تھی، زید نے مشتعل ہو کر بیوی کو بند کمرے میں پیٹنا شروع کر دیا، زید کی بیوی کی پٹائی دیکھ کر زید کے بھائیوں نے مداخلت کی جس پر زید اور مشتعل ہوا اور بحالتِ تکرار وغصہ وجنون سی کیفیت میں بھائیوں سے تکرار کرنے لگا اور اسی حالت میں زید اپنی بیوی کو تین مرتبہ سے زائد طلاق دیتا ہے، کیا وہ جنون اور غصے کی حالت میں دی ہوئی طلاق دُرست ہے؟ زید دو گھنٹے کے بعد جاگا تو ان کی حالت بدلی ہوئی تھی اور اپنے کئے ہوئے پر پریشان نہیں بلکہ روتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے کئے ہوئے میں میرے دِماغ کا دخل نہیں، مجھے علم نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے؟

جواب:- جوابِ تنقیح کے بیانات سے معلوم ہوا کہ طلاق کے وقت شوہر کے ہوش وحواس معطل تھے اور وہ اپنے قابو میں نہیں تھا، یہاں تک کہ اس نے والدین کو بھی نہیں پہچانا، اب اگر شوہر یہ حلفیہ بیان دے کہ جس وقت اس نے طلاق کے الفاظ زبان سے نکالے اس وقت اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا بول رہا ہے؟ اور اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟ تو صورتِ مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوتی اور اس کی بیوی بدستور اس کے نکاح میں ہے۔ **فی الشامیة والذی یظهر لی ان کلا من المدهوش والغضبان لا یلزم فیه ان یکون بحیث لا یعلم ما یقول بل یکتفی فیه بغلبة الهذیان واختلاط الجد بالهزل کما هو المفتی به فی السکران علی ما مرّ ولا ینافیه تعریف الدّهش بذهاب العقل فان الجنون فنون** (شامی ج:۳ ص:۲۴۴ طبع جدید)۔[1]

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۹۱/۷/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۸۵۲ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

طلاق واقع ہونے کے لئے عدالت کے تصدیق نامے کی ضرورت نہیں

سوال:- ایک لڑکی جسے تین طلاقیں دے دی گئی تھیں، اس لڑکی کے لئے دوبارہ شادی کرنے کی صورت میں عدالت سے کسی قسم کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے؟ کہ طلاق کب عدالت میں Confirm ہوئی، کیونکہ سابقہ شوہر نے 13-10-1976 کو چیئرمین کو نوٹس دے کر طلاق دی ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اور طلاق کنفرم Confirm کی جائے عدالت سے ابھی طلاق کنفرم نہیں ہوئی اور تاریخ پیشی 7-2-1977 مقرّر ہوئی ہے۔

---

(۱) تحت مطلب فی طلاق المدهوش (طبع سعید).

جواب:- طلاق واقع ہونا شرعاً عدالت کی تصدیق پر موقوف نہیں، جس روز طلاق ہوئی اس کے بعد تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزار کر عورت جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۳ھ

محض دِل میں طلاق کا خیال آنے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال:- عرض اینکہ زید نے ایک کتاب کا مطالعہ کیا جس میں نکاح وطلاق کے مسائل درج تھے، اور زید ایک شادی شدہ مرد ہے وہ اس بارے میں کافی محتاط ہوگیا، احتیاط اس حد تک بڑھ گیا کہ آرام وسکون بھی ختم ہوگیا، کبھی دِل میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر بیوی نے فلاں کام کیا تو طلاق، صرف خیال آتا ہے، منہ سے ایسا نہیں کہتا، کبھی دُوسرا خیال آتا ہے کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو بیوی کو طلاق، پھر توبہ کرتا ہے اور خدا سے مغفرت چاہتا ہے کہ اے خدا میرے دِل کو ان خیالات سے پاک کردے۔ عرض یہ ہے کہ طرح طرح کے خیالات ان کے دِل میں آتے ہیں اور توبہ کرتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی خیال آتا ہے کہ اگر توبہ کی تو طلاق، پھر توبہ بھی کی، اور خدا سے پھر معذرت چاہی۔ جنابِ عالی! کیا ان خیالات سے جو صرف دِل ہی میں ہوتے ہیں اور منہ پر نہیں لاتے، زید کے نکاح میں فرق تو نہیں آیا؟ نیز خدانخواستہ اگر زید کے دِل میں یہ خیال پیدا ہوجائے کہ اگر بیوی نے روٹی پکائی تو طلاق، اور بیوی نے روٹی پکائی تو کیا اس سے نکاح میں فرق آتا ہے یا نہیں؟ زید ہر وقت اپنے ذہن سے جھگڑتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ خیالات کیوں پیدا ہوتے ہیں؟

جواب:- محض دِل میں خیال آنے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی جب تک کہ طلاق کے الفاظ زبان سے نہ کہے جائیں،(۱) لہٰذا زید کے دِل میں جو خیالات آئے ہیں ان سے ان کے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑا مطمئن رہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۸/۷/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۴۳/۳۹ ہ)

حالتِ حمل میں طلاق واقع ہوجاتی ہے

سوال:- میرے اور میری بیوی کے درمیان جھگڑا ہوگیا تھا اور میں نے اپنی بیوی کو لفظ

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب الطلاق ج:۳ ص:۲۳۰ (طبع سعید) (ورکنه لفظ مخصوص) وفی الشامیة (قوله ورکنه لفظ مخصوص) هو ما جعل دلالة علٰی معنی الطلاق من صریح أو کنایة .... وأراد اللفظ ولو حکمًا لیدخل الکتابة المستبینة واشارة الأخرس .... الخ. وفیه أیضًا ج:۳ ص:۲۴۷ (طبع سعید) وأراد بما اللفظ أو ما یقوم مقامه من الکتابة المستبینة أو الاشارة المفهومة .... لأنّ رکن الطلاق اللفظ أو ما یقوم مقامهٗ ممّا ذکر کما مرّ.

طلاق تحریر میں لکھ کر دیا، اُس وقت میری بیوی حاملہ تھی، میں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ طلاق ہوئی یا نہیں؟

جواب:- حالتِ حمل میں بھی طلاق ہوجاتی ہے،[1] لہٰذا طلاق واقع ہوگئی، کس قسم کی طلاق ہوئی؟ یہ بات طلاق کے وقت جو الفاظ جتنی مرتبہ آپ نے کہے ہوں وہ لکھ کر بھیجئے تو ان کا حکم بتایا جاسکے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۴/۲۸ ج)

رسمی طلاق دینے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے

سوال:- مسمّٰی عبداللہ نے عقدِ ثانی کذ بانو سے کیا، شادی کے بعد دُلہن کو دُولہا نے اپنی جگہ پدری میں رکھا اور میکے میں داخل نہیں ہوسکا تھا، کیونکہ عبداللہ کی پہلی زوجہ کے ورثاء نے اس کو ڈانٹا اور جبراً عبداللہ سے طلاق دِلوادی، یعنی طلاق کی رسم پوری کرائی، میں (سائل) اس کے پاس گیا اس نے قسم اُٹھاکر کہا کہ میں نے رسمی طلاق دی تھی۔ کیا یہ طلاق ہوگئی یا نہیں؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات صحیح ہیں تو مسماۃ کذ بانو پر طلاق واقع ہوگئی ہے،[2] اور طلاق کے بعد اگر اس کو تین مرتبہ ماہواری آچکی ہو تو اس کی عدّت بھی ختم ہوگئی،[3] اب جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۸ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲۴/ ۱۹ الف)

ناسمجھی اور مفلسی کی وجہ سے دی گئی طلاق بھی ہوجاتی ہے

سوال:- میری شادی مسماۃ حسینہ سے ۱۷/اگست ۱۹۶۶ء کو ہوئی، سال ڈیڑھ کے بعد کچھ

---

(۱) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب طلاق السنة ج:۲ ص:۳۵۶ (طبع شركت علميه ملتان) وطلاق الحامل يجوز عقيب الجماع.

(۲) عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: ثلاث جدّهن جدّ وهزلهن جدّ: النكاح والطّلاق والرّجعة. (جامع الترمذی باب ما جاء فی الجد والهزل فی الطّلاق ج:۱ ص:۲۲۵ طبع سعيد).
وكذا فی ابی داوٗد (باب فی الطّلاق علی الهزل ج:۱ ص:۳۰۵ طبع حقانيه ملتان) وكذا فی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۳۵ والبحر الرائق ج:۳ ص:۲۴۴.

(۳) وفی الدّر المختار باب العدّة ج:۳ ص:۵۲۰ (طبع سعيد) ومبدأ العدّة بعد الطّلاق وبعد الموت علی الفور وتنقضی العدّة وان جهلت المرأة بهما.

معمولی جھگڑے ہوئے، کچھ معاشی تنگی کے باعث میرا دِماغ خراب ہوگیا تھا، اس درمیان میں بعض احباب جو اس عقد سے سے ناخوش تھے درمیان میں ہوکر علیحدگی کے چکر میں پڑ گئے، اور مسماۃ مذکورہ کو بھی ورغلایا، ایک دن مجبور ہوکر ٹاؤن کمیٹی لے جاکر معہ دو گواہان کے رُوبرو تین طلاق کا ایک طلاق نامہ لکھوا کر مجھ سے دستخط کروالئے، مسماۃ مذکورہ نے مہر بھی معاف کردیا، میں نے ناسمجھی اور مفلسی کے باعث یہ حرکت کردی، اور مسماۃ بھی اس معاملے سے خوش نہ تھی، مگر ان لوگوں کے رُعب کی وجہ سے ساکت ہوگئی، اس وقت سے اب تک میں اور وہ دونوں پریشان ہیں، قانونی طور پر چیئرمین نے نہ مجھ سے بیان لیا اور نہ مسماۃ حسینہ سے بیان لیا، اگر لیتا تو ہم انکار کرتے، اب ہم لوگ ایک دُوسرے سے ملنے کو تیار ہیں اور مسماۃ مذکورہ کا کوئی کفیل بھی نہیں ہے، اب اگر کوئی صورت ہو تو تحریر فرما کر ممنون فرماویں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں حسینہ پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اب آپ کے لئے بغیر حلالہ کے حلال نہیں ہوسکتی۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۰ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

شوہر کے گھر سے چلی جانے والی عورت کو طلاق دینے کا حکم اور طلاق دینے کا صحیح طریقہ

سوال:- ایک شخص نے دُوسری شادی پہلی عورت کی رضامندی سے کی، دُوسری شادی کے ایک سال بعد پہلی عورت میکے چلی گئی ناراض ہوکر، شوہر نے واپس لانے کی بہت کوشش کی، رشتہ داروں کو بطور جرگہ بھیجا، لیکن واپس نہ آئی، اب اس واقعہ کو پانچ سال گزر گئے ہیں، اب اگر اس کا شوہر طلاق دیدے تو کیا کوئی حرج ہے؟

جواب:- اگر سوال میں درج واقعات دُرست ہیں تو شوہر کو چاہئے کہ اوّلاً اپنے طرزِ عمل پر نظر ڈال کر یہ دیکھے کہ اس کی پہلی بیوی کے چلے جانے کا سبب اس کی کوئی ناانصافی تو نہیں ہے؟ اگر ناانصافی ہو تو اس کو دُور کرے، اور اس کو واپس لانے کی کوشش کرے، اگر وہ پھر بھی واپس نہ آئے تو اس کو تحریری طور پر متنبہ کرے کہ اگر تم واپس نہ آئیں تو تمہیں طلاق دے دُوں گا، اس کے باوجود وہ واپس نہ آئے تو پھر چاہے تو اسے طلاق دیدے،[2] لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے پچھلے صفحہ کا حاشیہ نمبر۲ اور ص:۳۷۹ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) وفی الشامیة ج:۳ ص:۴۴۱ (طبع سعید) السنة اذا وقع بین الزوجین اختلاف أن یجتمع أهلهما لیصلحوا بینهما فان لم یصطلحا جاز الطّلاق والخلع .... الخ.

جب عورت حیض سے پاک ہو تو اُسے صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دیا جائے[۱]، عدّت گزرنے کے بعد وہ خود نکاح سے خارج ہو جائے گی[۲]، تین طلاقیں بیک وقت دینا گناہ ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۸/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۸۸۰/۲۸ ج)

محض وہم سے طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال:- مسمّی اکبر خان نے عرصہ چار سال ہوئے کہ شادی کی تھی، خانگی تعلقات انتہائی خوشگوار رہے تھے، اچانک اکبر خان کو وہم کا مرض لاحق ہو گیا کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق بائن دے دی ہے، اور یہ مرض اکبر خان کے بیان کے مطابق اس حد تک ہے کہ اگر ایک کام کا تصور ذہن میں آیا اور وہ نہ ہو سکا تو یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کام کے نہ ہونے کی وجہ سے میری بیوی پر طلاق بائن پڑ جائے گی، چنانچہ اکبر خان کے سسرال والے اس رویے سے تنگ آکر اکبر خان کی بیوی کو اپنے گھر لے گئے ہیں، اکبر خان کہتا ہے کہ شریعت میں مجھ جیسے وہمی آدمی کے لئے کوئی خلاصی کا قانون ہے؟ بیوی سے جدائی بھی برداشت نہیں، کیونکہ صاحبِ اولاد ہوں اور اس حالت میں یہ خوف بھی رہتا ہے کہ کہیں عذابِ خداوندی کا شکار نہ ہو جاؤں۔ کیا میں اگر حقِ طلاق اپنی منکوحہ کو سونپ دُوں تو شرعاً جائز ہے؟ علاوہ ازیں کوئی اور صورت ہو کہ جس سے وہم و گماں کی صورت میں بھی یہ معتوب نہ ہو تو ارشاد فرمائیں۔

جواب:- اگر اکبر خان نے زبان سے کبھی طلاق نہیں دی تو طلاق کے محض وہم ہو جانے سے طلاق واقع نہیں ہوتی[۳]، اکبر خان کو چاہئے کہ وہ یہ وہم دِل سے نکال کر اطمینان سے بیوی کو گھر میں رکھے اور اُس کے ساتھ رہے، اور اپنے وہم کا علاج کرائے۔ طلاق کا حق بیوی کو دینے سے بیوی کو تو طلاق کا حق مل جاتا ہے[۴]، لیکن شوہر کا حقِ طلاق ختم نہیں ہوتا، لہٰذا مذکورہ وجہ سے بیوی کو حقِ طلاق دینے کی ضرورت نہیں ہے، اس کا حل تو وہم کا علاج کرانا ہی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۴۵/۲۸ ب)

(۱، ۲) وفی مصنف ابن أبی شیبۃ ج:۴ ص:۵ عن ابراهیم قال: کانوا یستحبّون أن یطلقها واحدۃ ثم یترکها حتّی تحیض ثلثة حیض. وفی الدر المختار ج:۳ ص:۲۳۰ (طبع سعید) وأقسامه ثلثة حسن وأحسن وبدعی .... طلقة رجعیة فقط فی طُهر لا وطئ فیه وترکها حتّی تمضی عدّتها أحسن .... الخ. وفی الهدایة ج:۲ ص:۳۵۴ (طبع شرکت علمیه ملتان) فالأحسن أن یطلّق الرّجل امرأته تطلیقة واحدۃ فی طهر لم یجامعها فیه، ویترکها حتّی تنقضی عدّتها .... الخ.

(۳) وفی الدّر المختار کتابُ الطّلاق ج:۳ ص:۲۳۰ (طبع سعید) (ورکنهٗ لفظ مخصوص) وفی الشّامیة (قوله ورکنه لفظ مخصوص) هو ما جعل دلالة علی معنی الطّلاق من صریح او کنایة .... وأراد اللّفظ ولو حکمًا لیدخل الکتابة المستبینة واشارۃ الأخرس .... الخ. وفیه أیضًا ج:۳ ص:۲۴۷ (طبع سعید) وأراد بما اللّفظ أو ما یقوم مقامه من الکتابة المستبینة أو الاشارۃ المفهومة .... لأنّ رکن الطّلاق اللّفظ أو ما یقوم مقامه ممّا ذکر کما مرّ.

(۴) وفی الدّر المختار کتاب الطّلاق باب تفویض الطّلاق ج:۳ ص:۳۱۵ (طبع سعید) قال لها: "اختاری أو امرک بیدک" ینوی تفویض الطّلاق او "طلقی نفسک" فلها أن تطلق فی مجلس علمها به .... الخ.

مذاق، غصّے اور حمل کی حالت میں طلاق واقع ہوجاتی ہے
کسی کے طلاق دینے کا واقعہ یا شرعی حکم بیان کرنے سے طلاق نہیں ہوتی

سوال:- میں نے اس سے پیشتر ایک فتویٰ منگایا، جس کا جواب مجھ کو موصول ہوگیا ہے، معلوم یہ کرنا تھا کہ آئندہ اگر میں نے طلاق کا لفظ زبان سے ادا کیا خواہ غصّے میں ہو یا سنجیدگی میں، اس بارے میں یہ دریافت کرنا ہے کہ ۱:- اگر عورت حمل سے ہو تو کیا طلاق ہوسکتی ہے؟ ۲:- اگر ذکراً یا مذاقاً طلاق کا لفظ زبان سے ادا ہوجائے تو کیا وہ اس مسئلے پر صادق آتا ہے؟ ۳:- آپ کے جواب میں اس جملے کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، ذرا تصریح فرمادیں وہ جملہ یہ ہے: ''اگر آئندہ تیسری مرتبہ میری زبان سے لفظِ طلاق نکل گیا خواہ وہ غصّے میں ہو یا سنجیدگی میں ہر حالت میں آپ کی بیوی آپ پر حرام ہوجائے گی اور دوبارہ نکاح بھی بغیر حلالہ کے نہ ہوسکے گا۔''

جواب ۱:- جی ہاں! حالتِ حمل میں بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔[۱]

۲:- مذاق میں طلاق دینے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔[۲]

۳:- طلاق کا لفظ زبان سے نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی بیوی سے یہ کہیں کہ میں نے تمہیں طلاق دی، یا تمہیں طلاق ہے، یا کسی اور سے کہیں کہ میری بیوی کو میری طرف سے طلاق ہے، اس مفہوم کے جملے خواہ غصّے میں کہے جائیں یا مذاق میں یا حالتِ حمل میں، بہرحال اُن سے طلاق واقع ہوجائے گی۔[۳] لہٰذا اس قسم کے جملوں سے احتیاط رکھیں، ہاں! اگر کسی اور شخص کے بارے میں آپ یہ نقل کریں کہ فلاں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے،[۴] یا طلاق دینے کا شریعت میں یہ حکم ہے، تو اس سے طلاق واقع نہ ہوگی۔[۵]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۹۴/۲۷ و)

---

(۱) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب طلاق السنّة ج:۲ ص:۳۵۶ (طبع شركت علميه، ملتان) وطلاق الحامل يجوز عقيب الجماع.

(۲،۳) وعن أبی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم ثلاث جدّهن جدّ وهزلهن جدّ: النّكاح والطّلاق والرّجعة. (جامع الترمذی باب ما جاء فی الجد والهزل فی الطّلاق ج:۱ ص:۲۲۵ طبع سعيد) وأبو داؤد باب فی الطّلاق علی الهزل ج:۱ ص:۳۰۵ طبع حقانيه ملتان). وفی الدّر المختار كتاب الطّلاق ج:۳ ص:۲۳۵، ۲۳۶ ويقع طلاق كل زوج بالغ عاقل ولو عبدًا أو مكرها أو هازلًا لا يقصد حقيقة كلامه. وفيه أيضًا ج:۳ ص:۲۴۲ بخلاف الهازل واللّاعب فانّه يقع قضاءً وديانةً لأن الشّارع جعل هزله به جدًّا. وفی البحر الرّائق كتاب الطّلاق ج:۳ ص:۲۴۴ ولم يشترط أن يكون جادًّا فيقع طلاق الهازل به واللّاعب للحديث المعروف ثلاث جدهن جد وهزلهن جد .... الخ. وفی الهندية ج:۱ ص:۳۵۳ وطلاق اللّاعب والهازل به واقع. وكذا فی فتح القدير ج:۳ ص:۳۴۴.

(۴، ۵) وفی الشّامية كتاب الطّلاق باب الصّريح مطلبٌ فی قول البحر ان الصّريح يحتاج فی وقوعه ديانةً الی النيّة ج:۳ ص:۲۵۰ (طبع سعيد) (قوله أو لم ينو شيئًا) لما مرّ أن الصّريح لا يحتاج الی النيّة ولٰكن لا بدّ فی وقوعه قضاء وديانة من قصد اضافة لفظ الطّلاق اليها عالمًا بمعناه ولم يصرفه الی ما يحتمله كما افاده فی الفتح وحققهٗ فی النّهر احترازًا عمّا لو كرّر مسائل الطّلاق بحضرتها أو كتب ناقلًا من كتاب امرأتی طالق مع التلفّظ أو حكی يمين غيره فانّه لا يقع أصلًا ما لم يقصد زوجته .... الخ. (محمد زبیر حق نواز)

غیر محرَم کے ساتھ سفر کرنے والی نافرمان بیوی کی اصلاح اور اُسے طلاق دینے کا حکم اور طریقہ

سوال:- زید کی بیوی نے کہا کہ: میرے والدین بیمار ہیں، مجھے ملنے کے لئے کراچی بھیج دو، کچھ روز کے بعد پھر یہ کہا کہ: میرے منجھلے بھائی نے پرمٹ بنواکر بھیج دیا ہے آپ مجھے خرچہ دیں، سیٹیں بک کراکر سوار کرادیں۔ چنانچہ زید نے خرچہ دے کر اور سیٹیں بک کراکر سوار کرادیا، وہ کراچی آگئیں، کراچی سے کسی غیر محرَم کے ہمراہ عراق تفریح کے لئے چلی گئیں، پھر اسی غیر محرَم کے ساتھ بمبئی تفریح کے لئے چلی گئیں، تقریباً ایک ماہ بعد واپس کراچی آگئیں۔ اس کے بعد زید بھی کراچی آیا، تمام مذکورہ بالا حالات معلوم ہوئے، اس کے منجھلے بھائی نے جو پرمٹ انڈیا بنواکر بھیجا تھا اُس میں ہندہ کو بیوہ ظاہر کیا گیا تھا، وہ خود بھی اپنے آپ کو بیوہ ظاہر کرتی ہے، زید کے کچھ مہمان لاہور سے آئے ہوئے تھے تو زید نے غیر محرَم سمجھ کر ایک کمرہ علیحدہ دے دیا، وہ دو تین روز وہاں رہتا رہا، ایک روز رات میں زید کمرے میں گیا تو دیکھا کہ مسہری پر آمنے سامنے غیر محرَم اور زید کی دھوکے باز بیوی کمبل اوڑھے بیٹھی ہوئی محوِ گفتگو ہے، مسہری صرف اتنی لمبی ہے کہ غیر محرَم جیسے پیر پھیلائے ہوئے تھا وہ شرم پر ٹھہرتا، دو روز کے بعد مہمان چلا گیا، تو میں نے اپنی بیوی کو بُرا بھلا کہا، اس نے قرآن کی قسم کھائی، حالانکہ زید کے سامنے کا واقعہ تھا۔ شرعاً اس کا حکم صادر فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان صحیح ہے تو عورت نے سخت گناہوں کا ارتکاب کیا ہے، اسے فوراً توبہ کرنی چاہئے اور اپنے شوہر سے معافی مانگنی چاہئے، شوہر کو چاہئے کہ وہ پہلے اپنی بیوی کو اس کی خطاکاریوں پر نرمی سے سمجھائے، اگر نہ مانے تو اس سے الگ سونے لگے، اگر اس پر بھی وہ راہِ راست پر نہ آئے تو تأدیب کے لئے اتنا مارنے کی بھی اجازت ہے جس سے نشان نہ پڑے،[1] اس کے باوجود اصلاح نہ ہو تو فریقین کے اہلِ خاندان کو جمع کرکے خرابیوں کی اصلاح کرائیں، پھر بھی اصلاح نہ ہو تو شوہر اگر ایسی بیوی کو نہیں رکھ سکتا تو طلاق دیدے،[2] لیکن تین طلاقیں بیک وقت دینا

---

(۱) وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ. الآیة. (سورة النساء:۳۴) تفصیل کے لئے دیکھئے: تفسیر معارف القرآن ''نافرمان بیوی اور اس کی اصلاح کا طریقہ'' ج:۲ ص:۳۹۹۔

(۲) وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا. (سورة النساء:۳۵) وفی ردّ المحتار باب الخلع ج:۳ ص:۴۴۱ (طبع سعید) السنة اذا وقع بین الزوجین اختلاف أن یجتمع أهلهما لیصلحوا بینهما فان لم یصطلحا جاز الطّلاق والخلع. وفی الدرّ المختار ج:۳ ص:۵۰ (طبع سعید) الّا اذا خافا أن لّا یقیما حدود الله فلا بأس أن یتفرّقا. وفی ردّ المحتار .... لأنّ التّفریق حینئذ مندوب بقرینة قوله فلا بأس لٰکن سیأتی اوّل الطلاق انه یستحب لو مؤذیة أو تارکة صلٰوة ویجب لوفات الإمساک بالمعروف.

ناجائز ہے،(۱) اس سے پرہیز کرے۔ هٰكذا أمرنا الله تعالٰی فی القرآن الکریم ورسول الله صلی الله علیه وسلم فی الأحادیث الکثیرة المعروفة۔

واللہ اعلم
۹/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۷/۲۸ ب)

لوگوں کا طلاق دینے پر اُکسانے اور بلاوجہ طلاق دینے کا حکم

سوال:- لڑکی کے والدین اپنی لڑکی کو پیسے کمانے کی خاطر لوگوں کو ٹھگتے ہیں، نکاح شرعی طور پر جائز ہوتا ہے، لڑکی کو چھڑانے کے لئے اُکساتے اور غلط بیان دلائے جاتے ہیں، تاکہ ان جھوٹے بیانوں سے لڑکی کو آزاد کرالیا جائے، لڑکی کے والدین جیسا کہ پہلے دو شوہروں سے طلاق حاصل کرچکے ہیں، تیسرے شوہر سے بھی کرنا چاہتے ہیں، جبکہ شوہر اپنی بیوی کو چھوڑنے پر ہرگز تیار نہیں۔ اپنے لئے پیسے کمانے کی خاطر مظلوم لڑکیوں کے ساتھ یہ کاروبار چلا رہے ہیں، ان حالات میں قرآن وسنت کی روشنی میں شہر کے قاضی، چیئرمین شہر کو لڑکی کے والدین اور لڑکی کو سزا دینے کا حق ہے یا نہیں؟

جواب:- جب تک شوہر خود طلاق نہ دے اس وقت تک وہ اس کی بیوی رہے گی، اور شوہر کو چاہئے کہ لوگوں کی بے بنیاد باتوں میں آکر اپنی بیوی کو طلاق نہ دے،(۲) اور جو لوگ خواہ مخواہ شوہر کو طلاق دینے پر بلاوجہ اُکسائیں وہ گناہگار ہیں، اگر کوئی شرعی قاضی ہو تو وہ ایسے لوگوں کو تعزیراً سزا بھی دے سکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۳/۱۲/۱۴۰۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۰۹/۳۲ ج)

طلاقِ مکرَہ کا حکم

سوال:- طلاقِ مکرَہ کے بارے میں زید کہتا ہے کہ واقع نہیں ہوتی، اور دلیل میں مشکوٰۃ کی

---

(۱) وفی سنن النسائی کتاب الطّلاق ج:۲ ص:۹۹ (طبع قدیمی کتب خانه کراچی) أُخبِرَ رسول الله صلی الله علیه وسلم عن رجل طلّق امرأته ثلٰث تطلیقات جمیعًا فقام غضبانًا ثم قال: أیُلعَبُ بکتاب الله وأنا بین أظهرکم؟ حتّی قام رجل وقال: یا رسول الله! ألا أقتله؟. وفی الهندیة کتاب الطلاق الباب الأوّل ج:۱ ص:۳۴۹ .... ان یطلّقها ثلاثًا فی طهر واحد بکلمة واحدة أو بکلماتٍ متفرّقة .... فاذا فعل ذٰلک وقع الطّلاق وکان عاصیًا .... الخ.

(۲) وفی سنن أبی داوٗد کتاب الطّلاق باب فی کراهیة الطّلاق ج:۱ ص:۲۹۶ (طبع سعید) عن محارب قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ما أحلّ الله شیئًا أبغض الیه من الطّلاق (وبعدهٗ). عن ابن عمر عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: أبغض الحلال الی الله عزّ وجلّ الطّلاق. وفی الشامیة ج:۳ ص:۲۲۸ (طبع سعید) وأمّا الطّلاق فانّ الأصل فیه الحظر بمعنٰی أنّه محظور الّا لعارض یبیحه وهو معنٰی قولهم الأصل فیه الحظر والاباحة للحاجة الی الخلاص فاذا کان بلا سبب أصلًا لم یکن فیه حاجة الی الخلاص بل یکون حمقًا وسفاهة رأی ومجرّد کفران النعمة واخلاص الایذاء بها وبأهلها وأولادها ... . فحیث تجرّد عن الحاجة المبیحة لهٗ شرعًا یبقی علٰی أصله من الحظر .... الخ.

حدیث: "لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق"[1] پیش کرتا ہے جبکہ حنفیوں کے نزدیک طلاقِ مکرَہ واقع ہوجاتی ہے، لہٰذا حنفیوں کی کون سی حدیث سے دلیل ہے؟

جواب:- حنفیہ کے نزدیک طلاقِ مکرَہ واقع ہوجاتی ہے، حنفیہ کے دلائل درج ذیل ہیں:-

الف:- قوله صلی الله علیه وسلم ثلاث جدّهن جدٌّ وهزلهنّ جدٌّ النّکاح والطّلاق والرّجعة. اخرجه الترمذی وقال حسن غریب.[2] وقد اخرج الجصاص فی أحکام القرآن عن سعید بن المسیّب عن عمر قال: أربع واجبات علی کل من تکلّم بهنّ العتاق والطّلاق والنّکاح والنذر.

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ محض تلفظِ طلاق موجبِ وقوعِ طلاق ہے، خواہ نیت وارادہ ایقاعِ طلاق کا نہ ہو، اور اکراہ میں بھی یہی صورت ہوتی ہے۔

ب:- عن صفوان بن عمران الطائی أن رجلًا کان نائمًا فقامت امرأته فأخذت سکینًا فجلست علی صدره فقالت: لتطلّقنی ثلاثًا أو لأذبحنّک، فطلّقها ثم أتی النبی صلی الله علیه وسلم فذکره له ذلک، فقال: لا قیلولة فی الطّلاق. أخرجه الامام محمدٌ والعقیلیٌّ. (مرقاة المفاتیح ج:٦ ص:٢٨٨).[3]

اور علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے "اعلاء السنن" ج:۱۱ ص:۱۲۵[4] میں اس بات پر دلائل دیئے ہیں کہ یہ حدیث سنداً قابلِ استدلال ہے۔

ج:- مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ مکرَہ کی طلاق کو واقع قرار دیتے تھے، اور یہی مذہب مصنف عبدالرزاق میں امام شعبیؒ، امام نخعیؒ، حضرت قتادہؒ اور حضرت ابو قلابہؒ سے بھی مروی ہے۔[5]

اور ابوداؤد کی حدیث: "لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق" کی توجیہ حنفیہ یہ کرتے ہیں کہ "اغلاق" کا لفظ اکراہ کے معنی میں صریح نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی غلبۂ عقل کے بھی ہیں، لہٰذا اس کا

---

(۱) سنن أبی داؤد ج:۱ ص:۳۰۵ (طبع مکتبه حقانیه ملتان).

(۲) جامع التّرمذی باب ما جاء فی الجدّ والهزل فی الطّلاق ج:۱ ص:۲۲۵ (طبع سعید) وابو داؤد باب فی الطّلاق علی الهزل ج:۱ ص:۳۰۵ (طبع حقانیه ملتان).

(۳) ان الفاظ سے یہ روایت "اعلاء السنن" ج:۱۱ ص:۱۷۷ (طبع ادارۃ القرآن) میں نقل کی گئی ہے، جبکہ چند الفاظ کے تغیر کے ساتھ "مرقاۃ المفاتیح" ج:۶ ص:۲۸۸ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان) اور "لسان المیزان" ج:۴ ص:۱۲۴ اور "نصب الرایہ" ج:۳ ص:۲۲۲ میں بھی مذکور ہے۔

(۴) دیکھئے: اعلاء السنن ج:۱۱ ص:۱۷۷ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔

(۵) دیکھئے: "مصنف عبدالرزاق" ج:۶ ص:۴۰۶ تا ۴۱۱ (طبع مجلس علمی) اور "اعلاء السنن" ج:۱۱ ص:۱۷۷ اور "سنن ابی داؤد" ج:۱ ص:۳۰۵۔

مطلب یہ ہے کہ مغلوب العقل ہونے کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی،[۱] اور اگر بالفرض ''اکراہ'' ہی کے معنی میں لئے جائیں تو مصنف عبدالرزاق کی ایک روایت سے اس کا منسوخ ہونا سمجھ میں آتا ہے،[۲] اور وہ روایت یہ ہے: ''عن سعید بن جبیر أنه بلغه قول الحسن لیس طلاق المکره بشیء، فقال: یرحمه الله! انّما کان أهل الشّرک یکرهون الرّجل علی الکفر والطّلاق، فذٰلک الّذی لیس بشیء وامّا ما صنع أهل الاسلام بینهم فهو جائز، حکاه الزّیلعی فی نصب الرّایة والحافظ فی الدّرایة وسکتا علیه. (راجع اعلاء السنن ج: ۱۱ ص: ۱۲۵)۔[۳]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۴/۲۸ ج)

نافرمان بیوی کو طلاق دینے کا حکم اور طلاق دینے کا صحیح طریقہ

سوال:- ایک نیک، دین دار مسلمان نے ایک مسلمان عورت سے چھ سال پہلے شادی کی، اُس سے دو بچے ہیں، عورت مذکورہ شادی کے بعد کچھ دنوں تک نماز پڑھتی رہی، جب بچہ پیدا ہوا نماز پڑھنا چھوڑ دیا اور بے پردہ بازار میں جانے لگی، مرد کی نافرمانی کرنے لگی، حکم نہیں مانتی، مرد نماز پڑھنے کو کہتا ہے، پردہ کرنے کو کہتا ہے مگر عورت نہیں مانتی، فارغ اوقات میں قرآن تلاوت کرنے کو کہتا ہے، اور شوہر کہتا ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہوگی لاکر دُوں گا مگر بے پردہ مت رہ، اللہ اور اس کے رسول کے دین کے مطابق چلو، لیکن وہ نہیں سمجھتی، اس لئے مرد چاہتا ہے کہ دُوسری شادی کرلے اور اس عورت کو طلاق دیدے، لیکن یہ عورت طلاق نہیں لیتی اور نہ طلاق لینا منظور کرتی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ بچوں کی زندگی خراب ہوگی، کیا حکم ہے؟

جواب:- بیوی کو طلاق دینے کو حدیث میں "أبغض المباح"[۴] فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ مباحات میں یہ چیز اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، لہٰذا حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ منکوحہ کو طلاق نہ دی جائے۔ قرآنِ کریم کا حکم یہ ہے کہ اگر عورت نافرمانی کرتی ہو تو پہلے اسے

---

(۱) دیکھئے: اغلاق کے معنی کی توجیہ اور اس کے معنی میں مختلف احتمالات کی تفصیل ''اعلاء السنن'' ج:۱۱ ص:۱۸۰ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔

(۲) وفی حاشیة اعلاء السنن ج: ۱۱ ص: ۱۷۸ (طبع ادارة القرآن کراچی) قال الشیخ العثمانی رحمة الله علیه: قلت وعلی هذا فحدیث عائشة رضی الله عنها: "لا طلاق ولا اعتاق فی اغلاق" منسوخ ولعلّه کان قبل الهجرة.

(۳) دیکھئے: ''اعلاء السنن'' ج:۱۱ ص:۱۷۷ و ۱۷۸ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔

(۴) وفی سنن أبی داوٗد کتاب الطّلاق باب فی کراهیة الطّلاق ج: ۱ ص: ۲۹۶ (طبع سعید) عن محارب قال. قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ما احلّ الله شیئًا أبغض الیه من الطّلاق (وبعدهٗ) عن ابن عمر رضی الله عنهما عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: أبغض الحلال الی الله عزّ وجلّ الطّلاق.

نرمی سے سمجھاؤ، اگر باز نہ آئے تو اپنے سونے کی جگہ اس سے الگ کرلو، اگر اس سے بھی اس پر کچھ اثر نہ ہو تو تادیب کے لئے ہلکے ہلکے مارنے کی بھی اجازت ہے،[1] (لیکن تکلیف دہ حد تک مارنے کی حدیث میں ممانعت آئی ہے)۔ اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو شوہر اور بیوی دونوں کے رشتہ داروں میں سے ایک ایک آدمی کو بیچ میں ڈال کر تنازعے کا تصفیہ کیا جائے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اگر فریقین اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ دونوں کے لئے بھلائی کی صورت پیدا کردے گا۔[2] لہٰذا طلاق دینے سے پہلے اصلاح کے لئے یہ تمام اُمور انجام دینے ضروری ہیں، اگر ان سے اصلاح ہوجائے تو طلاق کا اقدام نہیں کرنا چاہئے، لیکن اگر اصلاح کی کوئی اُمید باقی نہ رہے تو بہرحال! شریعت نے مرد کو طلاق کا اختیار دیا ہے،[3] اور بچوں کی وجہ سے یہ اختیار شرعاً ساقط نہیں ہوتا، البتہ بچوں کی عام مصلحت چونکہ بلاشبہ اسی میں ہے کہ طلاق نہ دی جائے، لہٰذا طلاق کا اقدام سخت مجبوری کے بغیر نہیں کرنا چاہئے، اور طلاق دینے کا عزم کرلیں تو اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جس طُہر میں بیوی سے جماع نہ کیا ہو اس میں اسے صرف ایک طلاق دی جائے،[4] عدّت گزرنے کے بعد وہ خودبخود نکاح سے نکل جائے گی۔[5] اور دُوسری شادی شرعاً جائز ہے، لیکن پہلی بیوی کی موجودگی میں دُوسری شادی کے جواز کے لئے شرط یہ ہے کہ انسان کو اپنے اُوپر پورا اعتماد ہو کہ میں دونوں بیویوں کے درمیان ہر اعتبار سے مکمل برابری کا سلوک اور انصاف کرسکوں گا، اگر بے انصافی کا ذرا بھی خطرہ ہو تو پھر دُوسرا نکاح شرعاً بھی جائز نہیں،[6] اور چونکہ آج کل بیویوں کے درمیان برابری کا سلوک بہت مشکل ہوتا ہے، اس لئے دُوسری شادی کا اقدام بھی انتہائی ضرورت کے موقع پر کرنا چاہئے، ہاں! اگر پہلی بیوی کو طلاق دے کر دُوسرا نکاح کرے تو یہ جائز ہے اور بچوں کی وجہ سے اس کی اجازت ختم نہیں ہوتی۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۷/ ۲۸ ب)

---

(۱) وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ. الاية (سورة النساء: ۳۴) تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر معارف القرآن ''نافرمان بیوی اور اس کی اصلاح کا طریقہ'' ج:۲ ص:۳۹۹۔

(۲) وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللهُ بَيْنَهُمَا. الأية. (سورة النساء: ۳۵)

(۳) وفی ردّ المحتار باب الخلع ج:۳ ص:۴۴۱ (طبع سعید) السنّة اذا وقع بين الزوجين اختلاف أن يجتمع أهلهما ليصلحوا بينهما فان لم يصطلحا جاز الطّلاق والخلع ... الخ. وفی الدّر المختار ج:۳ ص. ۲۲۹ (طبع سعيد) بل يستحب لو مؤذية أو تاركة صلوة وفی الشّامية (قوله ومفاده) ای مفاد استحباب طلاقها .... الخ.

(۴، ۵) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۲۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔

(۶) وفی الدّر المختار كتاب النّكاح ج:۳ ص:۷ ومكروهًا لخوف الجور فان تيقّنه حرّم ذٰلك. وفی ردّ المحتار تحته: قوله ومكروهًا أی تحريمًا بحر. (قوله فان تيقّنه) ای تيقّن الجور حرم لأنّ النّكاح انّما شرع لمصلحة تحصين النفس وتحصيل الثّواب، وبالجور يأثم ويرتكب المحرّمات فتنعدم المصالح لرجحان هذه المفاسد بحر ... الخ

محض طلاق کا خیال آنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ زید کو عرصہ چھ ماہ سے وہم اور وسوسہ کی بیماری ہے، اور وہ یہ ہے کہ زید کو عرصہ چھ ماہ سے اکثر طلاق کا وہم اور وسوسہ ہوجاتا ہے۔ اکثر غیرارادی طور پر طلاق کی سوچ آتی ہے، توجہ اِدھر اُدھر کرنے کے بعد پھر اچانک یہی طلاق کی غیراختیاری سوچ آجاتی ہے، اور اس میں اتنی شدّت ہوتی ہے کہ باتیں کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طلاق کے الفاظ نکل رہے ہیں، حالانکہ زید کا قطعی اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہے، اب اسی حالت میں ایک دفعہ اچانک غیرارادی طور پر مسلط خیال کی وجہ سے طلاق کا تلفظ ہوجاتا ہے، فوراً زید کلمہ پڑھتا ہے کہ ایسا تو نہیں ہوسکتا، برائے مہربانی فرمائیں کچھ واقع تو نہیں ہوگا؟ برائے مہربانی یہ بھی بتائیں کہ اس وہم کا علاج اور اس سے بچنے کا کیا طریقہ ہے؟ اکثر و بیشتر اسی وسوسے کا تسلط رہتا ہے۔

جواب:- اگر سوال میں بیان کردہ واقعات دُرست ہیں تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ محض طلاق کا خیال آنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی،[1] اسی خیال کے دوران اگر کوئی لفظ بھی اس طرح زبان سے نکل جائے کہ اسے بولنے والا خود بھی نہ سن سکے تو اس سے بھی طلاق نہیں ہوتی، اور اگر الفاظ اس طرح زبان سے ادا ہوئے کہ یقینی طور پر خود بھی سن لیا تو اس صورت میں مسئلہ دوبارہ پوچھ لیں، اور پوچھتے وقت وہ الفاظ لکھیں جو زبان سے ادا ہوئے اور انہیں خود سنا، نیز یہ بھی لکھیں کہ کیا اس طرح اور الفاظ بھی غیراختیاری طور پر زبان سے نکلتے رہتے ہیں یا نہیں؟ اور وہم کی بیماری دُور کرنے کے لئے کسی طبیب یا ڈاکٹر سے رُجوع کریں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۳/۳/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۵۴۳/۹۷)

نشے کی حالت میں طلاق کا حکم

سوال:- از رُوئے شرعِ محمدی ایک شخص غلام مصطفیٰ نامی نے شادی کی، اور بیوی کو عرصہ نو ماہ تک رکھا، پھر والدین کے سامنے کہا کہ: میں نے بیوی کو چھوڑ دیا، طلاق دیدیا میں نہیں رکھتا۔ والدین کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارا لڑکا چرس وغیرہ نشے کا عادی تھا، ہم نے سمجھا کہ یہ سب کچھ بکواس کی شکل میں

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۳۰ (طبع سعید) (ورکنهٗ لفظ مخصوص) وفی الشامیة تحته هو ما جعل دلالة علی معنی الطّلاق من صریح أو کنایة .... وأراد اللّفظ ولو حکمًا لیدخل الکتابة المستبینة واشارة الأخرس .... الخ. نیز دیکھئے سابقہ ص:۳۱۷ کا حاشیہ نمبر۱۔

اس نے کہہ دیا، مگر وہ دو ماہ گزر کر عورت کی طرف رُجوع نہیں کرتا اور اپنا سامان اُٹھا کر بیچ دیا اور کدھر باہر جا کر از عرصہ دو سال سے غائب ہے، باہر جاتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دماغی توازن خراب ہے۔ اب اس کی بیوی والدین کے کہنے کے پیشِ نظر مطلقہ ہے، اور دُوسری جگہ یہ نکاح کرسکتی ہے؟ مہربانی فرما کر وضاحت فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر غلام مصطفیٰ نے واقعی اپنی بیوی کے بارے میں وہی الفاظ کہے تھے جو سوال میں مذکور ہیں اور وہ اس وقت مجنون نہیں تھا، خواہ نشے میں ہو،[1] تو اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوچکی ہے،[2] اور جس وقت شوہر نے وہ الفاظ کہے تھے اس کے بعد سے تین ایامِ ماہواری پورے ہونے پر بیوی کی عدّت پوری ہوگئی۔ بہرصورت! عدّت کے پورے ہونے کے بعد مذکورہ عورت دُوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/۲۹۷ ب)

زبردستی طلاق کے الفاظ کہنے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں؟ فتویٰ چاہتا ہوں۔

مسئلہ:- جناب مفتی صاحب! آپ نے میری درخواست مؤرخہ 30-06-1999 کی پشت پر یہ تحریر کیا تھا کہ میں فقہِ حنفی کی روشنی میں طلاق کی بابت پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر زبردستی بھی طلاق کی بابت زبان سے کہلوادیا جائے تو فقہِ حنفی کی رُو سے طلاق ہوجاتی ہے۔

مفتی صاحب! میں فقہِ حنفی کی اس بات سے متفق نہ ہوں، کیونکہ خاوند بے چارے کا کیا قصور ہے؟ اُس سے تو زبردستی طلاق کے الفاظ کہلوائے گئے ہیں۔

میرے علم کے مطابق فقہ شافعی، فقہ مالکی، فقہ حنبلی اور فقہ جعفریہ والے فقیہ بھی نیک اور متقی لوگ تھے، اگر اِن میں سے کسی بھی فقہ کی رُو سے ''زبردستی طلاق کے الفاظ خاوند سے زبان سے کہلوانے سے طلاق واقع نہیں ہوتی'' تو اگر ایک حنفی مسلمان جیسے میں ہوں وہ متعلقہ فقہ یا فقہ ہائے مذکورہ بالا کے اِس مسئلے سے اتفاق کرتے ہوئے زبردستی زبان سے کہلوائے گئے الفاظ کو طلاق کا واقع

(۱،۲) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۲۳۹ (طبع سعید) أو سکران ولو بنبیذ او حشیش او أفیون أو بنج زجرًا به یفتی تصحیح القدوری .... الخ. وفی الهندیة کتاب الطّلاق فصل فی من یقع طلاقه وفیمن لا یقع طلاقه ج:۱ ص:۳۵۳ (طبع ماجدیه) وطلاق السکران واقع اذا سکر من الخمر أو النبیذ، وهو مذهب اصحابنا رحمهم الله تعالیٰ کذا فی المحیط .... ومن سکر من البنج یقع طلاقه ویحدّ لفشو هذا الفعل بین الناس وعلیه الفتوی فی زماننا ... الخ.

ہوتا نہیں سمجھتا تو کیا ایک حنفی مسلمان کے لئے اسلام ایسا دین نہیں ہے کہ جس میں ذرہ برابر بھی ظلم ہو، لہٰذا میں بالکل اس بات سے متفق نہیں ہوں، آپ واضح فرمائیں۔

جواب:- آپ نے فقہِ حنفی کے مطابق جواب مانگا تھا، فقہِ حنفی کے مطابق دارالافتاء سے جو جواب دیا گیا وہ صحیح ہے، حنفی فقہ میں زبردستی طلاق کے الفاظ کہنے سے بھی طلاق ہوجاتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۲۰/۴/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳/۳۷۳)

شادی سے پہلے زنا کرنے کے بعد توبہ کرنے والی عورت کو طلاق دینے کا حکم

سوال:- ایک لڑکی جو بڑے اچھے گھرانے کی شریف لڑکی ہے، نیک سیرت، نماز روزے کی پابند ہے، ایک ایسے ہی لڑکے سے شادی ہوگئی ہے، بیس سال کی عمر میں، تین ماہ تک خوشی سے زندگی بسر کرتے رہے، تین ماہ کے بعد لڑکے نے لڑکی سے کہا کہ سچ بتا تو نے کبھی کسی کے ساتھ بدفعلی تو نہیں کی؟ اس پر لڑکی نے کہا کہ آج سے چار سال قبل ایک لڑکے سے میں نے بدکاری کی تھی جس کا کسی کو علم نہیں۔ اس دن سے لڑکا اپنی بیوی سے نفرت ظاہر کرتا ہے اور طلاق کا ارادہ رکھتا ہے، کیا اس حالت میں طلاق دینا صحیح ہے؟

جواب:- توبہ اگر صدقِ دِل کے ساتھ کی جائے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم بھی دِل میں ہو تو اللہ تعالیٰ گناہ معاف فرمادیتا ہے، لہٰذا اگر لڑکی توبہ کرچکی ہے اور اَب اس کے حالات دُرست ہیں تو شوہر کو بھی درگزر کرنا چاہئے، اور اس بناء پر طلاق نہ دینا چاہئے۔

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۶ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹۷/ ۱۹ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار مع ردّ المحتار کتاب الطّلاق ج:۳ ص:۲۳۵ (طبع سعید) ویقع طلاق کل زوج بالغ عاقل ولو عبدًا او مکرھًا فانّ طلاقه صحیح .... الخ. وفی الھندیة ج:۱ ص:۳۵۳ (طبع ماجدیه کوئٹه) یقع طلاق کل زوج اذا کان بالغًا عاقلًا سواء کان حرًا او عبدًا طائعًا او مکرھًا.

﴿فصل فی الطّلاق الصّریح﴾

(طلاقِ صریح کا بیان)

ایک طلاقِ رجعی کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین ذیل کی صورت میں کہ کچھ لوگوں نے مجھے مجبور کردیا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو، میں نے بحالتِ مجبوری ایک طلاق دے دی، پھر اس کے بعد انہوں نے مجھ سے دستخط کرالئے جس کا مضمون مجھے معلوم نہیں تھا، کیا ایسی صورت میں طلاق واقع ہوگئی؟

جواب:- اگر سوال میں درج کئے ہوئے واقعات دُرست ہیں تو آپ کی بیوی پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ جس دن آپ نے زبان سے طلاق دی تھی اس دن کے بعد بیوی کو تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزرنے سے پہلے اگر آپ زبان سے یہ کہہ دیں کہ: ''میں نے طلاق سے رُجوع کرلیا'' تو عورت بدستور آپ کی بیوی رہے گی،[۱] لیکن اگر رُجوع کئے بغیر عورت کو تین مرتبہ ماہواریاں گزر گئیں تو نکاح ختم ہوجائے گا، البتہ اس کے بعد دونوں کی رضامندی سے نکاح ہوسکے گا۔[۲]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۸۸/۲/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۸/ ۱۹ الف)

دو طلاقیں دینے کے بعد رُجوع کا بہتر طریقہ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے میں کہ: شوہر بیوی کے درمیان گھریلو

---

(۱) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب الرّجعة ج:۲ ص:۳۹۴ (طبع شركت علميه ملتان) واذا طلّق الرّجل امرأتهٗ تطليقة رجعية أو تطليقتين فله أن يراجعها فى عدّتها. وفى الشامية ج:۳ ص:۳۹۹ (طبع ايچ ايم سعيد كمپنى) والمستحب ان يراجعها بالقول فافهم. وفى الهندية ج.۱ ص:۴۶۸ (طبع رشيديه كوئٹه) فالسُّنّى ان يراجعها بالقول.

(۲) وفى الهداية باب الرّجعة ج:۲ ص:۳۹۴ اذا طلق الرجل امرأته تطليقة رجعية أو تطليقتين فله أن يراجعها فى عدّتها رضيت بذلك أو لم ترض، لقوله تعالى: فَأَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ، من غير فصل ولا بدّ من قيام العدّة لأن الرّجعة استدامة الملك الا ترىٰ انّه سمى امساكًا وهو الابقاء وانّما يتحقق الاستدامة فى العدّة لأنّه لا ملك بعد انقضائها... الخ. وفى فقه السنة كتاب الطّلاق بحث حكم الطّلاق الرّجعى ج.۲ ص.۲۷۴ (طبع دار الكتاب العربى، بيروت) فاذا انقضت العدّة ولم يراجعها بانت منهُ .... الخ.

جھگڑے میں شوہر نے اپنی بیوی سے بحالتِ غصہ دو دفعہ الفاظ دُہرائے کہ: ''میں تجھے طلاق دیتا ہوں'' کیا دو دفعہ مندرجہ بالا الفاظ کہنے سے طلاقِ صریح یا مغلّظہ ہوگئی یا طلاقِ بائن ہوئی؟ اگر طلاقِ بائن ہوئی تو شوہر کب تک بیوی سے رُجوع کرسکتا ہے؟ اگر رُجوع کرسکتا ہے تو کیا نکاح ضروری ہے؟

جواب:- اگر سائل کا یہ بیان دُرست ہے کہ اس نے صرف دو مرتبہ طلاق کے مذکورہ بالا الفاظ کہے تھے، تین مرتبہ نہیں کہے تھے، تو صورتِ مسئولہ میں اس کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں، جس کا حکم یہ ہے کہ طلاق دینے کے وقت سے عورت کو تین مرتبہ ماہواری آنے تک اس کی عدّت ہے،[۱] اس عدّت کے دوران شوہر اگر چاہے تو طلاق سے رُجوع کرسکتا ہے،[۲] اور رُجوع کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے بیوی سے یہ کہہ دے کہ میں نے تجھ سے رُجوع کرلیا،[۳] اس کے بعد وہ دونوں حسبِ سابق میاں بیوی کی طرح رہ سکتے ہیں۔ البتہ آئندہ طلاق دینے سے سخت احتیاط لازم ہے، کیونکہ اگر ایک مرتبہ بھی طلاق دے گا تو بیوی اس پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوجائے گی، اور آپس میں دوبارہ نکاح بھی بغیر حلالہ کے نہیں ہوسکے گا۔[۴] واضح رہے کہ یہ جواب اس صورت میں ہے کہ جبکہ شوہر نے صرف دو مرتبہ طلاق کے الفاظ کہے ہوں، اگر شوہر نے تین مرتبہ الفاظ طلاق کہہ کر غلط بیانی سے یہ فتویٰ حاصل کرلیا تو اس کی ذمہ داری مفتی پر نہیں، ایسا کرنے سے وہ عمر بھر حرام کاری میں مبتلا رہے گا اور جھوٹ کا وبال الگ ہوگا۔

واللہ اعلم

۱۳۹۸/۴/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۴۳۴/۲۹ الف)

''جاؤ میں نے تجھے طلاق دیا'' دو مرتبہ کہنے کا حکم اور رُجوع کا بہتر طریقہ

سوال:- ایک شخص نے جھگڑے کی حالت میں اپنی بیوی سے دو مرتبہ یہ الفاظ کہے کہ: ''جاؤ میں نے تجھے طلاق دے دیا، جاؤ میں نے تجھے طلاق دے دیا۔'' آیا اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگئی؟

---

(۱) وفی الدر المختار باب العدّة ج:۳ ص:۵۱۶ (طبع سعید) وھی فی حق حرّة بعد الدّخول حقیقة أو حکمًا ثلاث حیض کوامل ... الخ.

(۲) وفی الھدایة کتاب الطّلاق باب الرّجعة ج:۲ ص:۳۹۴ (طبع شرکت علمیه) واذا طلّق الرجل تطلیقة رجعیة أو تطلیقتین فله أن یراجعها فی العدّة.

(۳) فی الدر المختار ج:۳ ص:۴۰۱ وندب اعلامها بها .... وندب الاشهاد بعدلین. فی الشامیة تحت قوله ولو بعد الرجعة بالفعل . . . فالسُّنی أن یراجعها بالقول ویشهد علی رجعتها ویعلمها. وفی الھندیة ج:۱ ص:۴۶۸ (طبع رشیدیه کوئٹه) فالسُّنی ان یراجعها بالقول ویشهد علی رجعتها شاهدین.

(۴) حوالے کے لئے آگے صفحہ ۳۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

اور کتنی طلاق سمجھی جاویں گی؟ کیا یہ عورت اس موجودہ شوہر کی زوجیت میں بدون حلالہ وغیرہ کے شرعاً رہ سکتی ہے؟ شریعتِ مطہرہ کی رُو سے مسئلہ واضح فرمائیں۔

جواب:- اگر واقعۃً طلاق صرف دو مرتبہ ہی دی ہے، تیسری بار مذکورہ الفاظ نہیں کہے تو صورتِ مسئولہ میں اس شخص کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئیں، جن کا حکم یہ ہے کہ اگر شوہر چاہے تو عدّت کے دوران (یعنی طلاق کے وقت سے تین ماہواریاں گزرنے سے پہلے پہلے) بیوی سے رُجوع کرسکتا ہے،(۱) اور رُجوع کا طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں اس سے یہ کہہ دے کہ میں نے تم سے رُجوع کیا''،(۲) اس کے بعد وہ دونوں پھر میاں بیوی کی طرح رہ سکتے ہیں، اور اگر رُجوع کے بغیر عدّت گزر گئی تو بعد میں باہمی رضامندی سے نیا مہر مقرّر کرکے نکاح ہوسکتا ہے،(۳) لیکن خواہ رُجوع کیا جائے یا دُوسرا نکاح، دونوں صورتوں میں شوہر کو صرف ایک طلاق کا حق باقی رہ گیا، یعنی اب اگر وہ صرف ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے گا تو بیوی مغلّظہ ہوکر حرام ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر دُوسرا نکاح بھی نہ ہوسکے گا،(۴) لہٰذا آئندہ طلاق کا لفظ استعمال کرنے سے بہت احتیاط رکھے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۷/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۵۰۷/۲۸ ب)

''میں نے تجھے طلاق دی'' کے الفاظ ایک مرتبہ کہنے کا حکم اور رُجوع کرنے کا طریقہ

سوال:- میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر جو بیان دیتا ہوں وہ میرے علم کے مطابق بالکل ٹھیک ہے، میرا اور میری بیوی کا جھگڑا لڑکے کے اُوپر ہوا، میں نے لڑکے کا گلا دبایا تھا، پھر میں نے اس کو چھوڑ کر کہا کہ: ''میں نے تجھے طلاق دی'' اس کے بعد اس نے کہا: ''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا'' اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور میں صوفے پر بیٹھ گیا، پھر اس کی والدہ آئی تو میں نے اس کو بتلایا کہ میں نے تمہاری لڑکی کو طلاق دے دی ہے، اب اس کو لے جاؤ، پھر اپنے والد کو بتلایا کہ میں نے نفیسہ کو طلاق دے دی ہے، آپ ان کے گھر والوں سے فیصلہ کرلیں، میرے خیال میں یہ تھا کہ میں نے اس کو تین مرتبہ طلاق دے دی ہے، لیکن میں نے دو دن تک سوچا پھر اپنی بیوی سے پوچھا، بلکہ اس نے قرآن مجید اُٹھایا، اس نے بھی یہی کہا کہ تم نے ایک مرتبہ طلاق دی تھی، دُوسری مرتبہ

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔ (۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر ۳۔
(۳) دیکھئے صفحہ:۳۱۸ کا حاشیہ نمبر ۲ اور اگلے صفحہ:۳۳۳ کا حاشیہ نمبر ۵۔ (۴) دیکھئے صفحہ:۴۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر ۱ تا ۳۔

میں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا، چنانچہ مجھے اپنی بیوی کی بات پر بھی یقین ہے، اس مسئلے میں شرعی طور پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان دُرست ہے اور واقعۃً سائل نے اپنی بیوی کو صرف ایک مرتبہ ہی طلاق دی تھی اور بعد میں بیوی کے والدین کو اسی طلاق کی خبر دی[1]، نئی طلاق دینا مقصود نہ تھا، تو اس کی بیوی پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوئی ہے[2]، جس کا حکم یہ ہے کہ عدّت کے دوران اگر شوہر رُجوع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے[3]، جس کی بہتر صورت یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے بیوی سے یہ کہہ دے کہ: ''میں نے تم سے رُجوع کرلیا ہے''[4]، اور اگر عدّت گزرنے تک رُجوع نہ کیا تو عدّت پوری ہونے پر بیوی بائنہ ہوجائے گی یعنی ازسرِ نو نکاح کئے بغیر اس کے نکاح میں نہ آسکے گی۔[5] یہ واضح رہے کہ شوہر رُجوع کرے یا عدّت کے بعد نیا نکاح کرے تو اب اسے صرف دو طلاقوں کا اختیار باقی ہوگا، یعنی اگر آئندہ اس نے صرف دو مرتبہ طلاق کے الفاظ کہہ دیئے تب بھی وہ مغلّظہ ہوجائے گی اور پھر بغیر حلالہ کے نکاح نہ ہوسکے گا، لہٰذا آئندہ سخت احتیاط لازم ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۰/۱۰/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۹۳/۳۱ د)

ایک طلاق رجعی کے بعد طلاق کی خبر دینے سے مزید طلاق واقع نہیں ہوگی، زبان سے رُجوع کرنے اور اس پر گواہ بنانے کا حکم

سوال:- میں نے اپنی بیوی کو غصّے میں کہہ دیا کہ: ''تم سب رشتہ داروں کے گھر چلی جاؤ مجھے تمہاری ضرورت نہیں، میں نے تمہیں طلاق دے دیا'' اس کے بھائیوں نے کہا کہ: اسے طلاق دے دو، میں نے جواب دیا کہ: ''میں نے اسے طلاق دے دیا ہے'' پھر تیسری مرتبہ بیوی کے چچا سے کہا کہ: ''میں نے اس کو طلاق دے دی ہے''، شرعاً کتنی طلاقیں ہوئیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب آپ نے اپنی بیوی کے بھائی اور چچا سے یہ کہا کہ: ''میں نے اسے طلاق دے دی ہے'' تو اگر آپ کی نیت نئی طلاق واقع کرنے کی نہیں تھی بلکہ بیوی کو دی

(۱، ۲) وفی الشامیة ج:۳ ص:۲۹۳ واذا قال: أنت طالق، ثم قیل له: ما قلت؟ فقال: قد طلقتها، أو قلت هی طالق، فهی طالق واحدة لأنه جواب، کذا فی کافی الحاکم. وفی الهندیة ج:۱ ص:۳۵۵ ولو قال لامرأته: أنت طالق، فقال له رجل: ما قلت؟ فقال: طلّقتها، أو قال: قلت هی طالق، فهی واحدة فی القضاء. کذا فی البدائع.

(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص.۳۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔ (۴) دیکھئے حوالہ سابقہ ص ۳۳۱ کا حاشیہ نمبر ۳۔

(۵) فی الدر المختار ج ۳ ص:۴۰۹ (طبع سعید) وینکح مبانة بما دون الثلاث فی العدّة وبعدها بالاجماع

ہوئی ایک طلاق کو نقل کرنا مقصود تھا تو آپ کی بیوی پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ عدّت یعنی تین مرتبہ ایامِ ماہواری کے گزرنے سے پہلے اگر زبان سے رُجوع کرلیں تو آپ کا نکاح بدستور قائم رہے گا،(۱) بہتر یہ ہے کہ اس رجعت پر گواہ بھی بنالیں۔(۲) اور اگر نیت تین طلاقیں دینے کی تھی تو طلاقِ مغلظ واقع ہوگئی اور آپ کی بیوی حلالہ کے بغیر آپ کے لئے ہرگز حلال نہیں ہوسکتی۔(۳)

واللہ سبحانہ اعلم	الجواب صحیح
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ	بندہ محمد شفیع
۱۳۸۸/۶/۶ھ	
(فتویٰ نمبر ۶۴۷/۱۹ الف)	

''میں نے تم کو طلاق دی'' دو مرتبہ کہنے کا حکم اور رُجوع کا طریقہ

سوال:- ایک شخص گھریلو تنازعے کی وجہ سے اپنی منکوحہ کو ایک ہی مجلس میں پہلے یہ کہتا ہے کہ: ''اگر تم نے زبان بند نہ کی تو میں تم کو طلاق دے دُوں گا'' اور اُس کے فوراً بعد دو مرتبہ کہہ دیتا ہے کہ: ''میں نے تم کو طلاق دی'' اب وہ شخص اپنی بیوی سے رُجوع کرنا چاہتا ہے، اس سلسلے میں شریعت اور قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب باصواب سے مطلع کریں۔

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ اُس شخص نے پہلی بار یہی الفاظ کہے تھے کہ: ''اگر تم نے زبان بند نہ کی تو میں تم کو طلاق دے دُوں گا'' اور اس کے بعد صرف دو مرتبہ یہ کہا کہ: ''میں نے تم کو طلاق دی'' تو اس کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں، جن کا حکم یہ ہے کہ عدّت یعنی تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزرنے سے پہلے پہلے شوہر رُجوع کرسکتا ہے،(۴) جس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے بیوی سے یہ کہہ دے کہ: ''میں نے تم سے رُجوع کرلیا''،(۵) اور اگر عدّت گزر گئی تو پھر باہمی رضامندی سے نیا مہر مقرّر کرکے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے،(۶) لیکن واضح رہے کہ اب شوہر کو صرف ایک طلاق کا اختیار رہ گیا ہے، اب اگر ایک مرتبہ بھی طلاق دی تو بیوی مغلّظہ ہوکر حرام ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر دُوسرا نکاح بھی نہیں ہوسکے گا۔(۷)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم	الجواب صحیح
احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ	محمد رفیع عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۷/۷/۲۶ھ	
(فتویٰ نمبر ۷۸۵/۲۸ ج)	

---

(۱) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔ (۲) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر ۳۔
(۳) دیکھئے: ص:۳۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر ۱ تا ۳۔ (۴) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔
(۵) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر ۳۔ (۶) حوالہ کے لئے ص:۳۷۳ کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۷) دیکھئے: ص:۳۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر ۱ تا ۳۔

ایک طلاقِ رجعی کے بعد رُجوع کا بہتر طریقہ اور رُجوع کے بعد بیوی پر شوہر کے گھر آنا لازم ہے

سوال:- مسمّٰی سلیمان ولد محمد صاحب نے اپنی منکوحہ بیوی مسماۃ سکینہ بی بی دُختر محمد صاحب کو ناراضگی کی وجہ سے ایک طلاق دے دی، مؤرخہ ۲۸/اپریل ۱۹۷۷ء کو، مسمّٰی سلیمان اپنی بیوی کو ایک طلاق دینے کے بعد رُجوع کرنے کے لئے متعدّد بار محلّے کے مرد اور عورتوں کو بلانے کے لئے بھیج چکا ہے، مگر فدوی کے سسرال والوں نے بھیجنے سے انکار کردیا ہے، ایسی صورت میں عورت کو تین طلاقیں ہوجاتی ہیں یا نہیں؟

جواب:- اگر واقعۃً صرف ایک طلاق دی تھی، تین مرتبہ طلاق کا لفظ نہیں کہا تھا تو عدّت کے دوران (یعنی طلاق دینے کے بعد سے تین ماہواری گزرنے سے پہلے پہلے) شوہر رُجوع کرسکتا ہے،[1] جس کا بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے یہ کہہ دے کہ: ''میں نے طلاق سے رُجوع کرلیا''،[2] لیکن اگر گواہوں کے بغیر کہہ دیا تب بھی رُجوع صحیح ہوگیا،[3] اس کے بعد بیوی پر واجب ہے کہ وہ شوہر کے پاس واپس آجائے، بیوی کے میکے والے اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے، البتہ اگر طلاق کے بعد تین ماہواریاں آچکی ہوں اور شوہر نے رُجوع نہ کیا ہو تو باہمی رضامندی سے نیا نکاح ہوسکتا ہے،[4] شوہر عورت کو واپس آنے پر مجبور نہیں کرسکتا، اور یہ جواب اسی صورت میں ہے جبکہ طلاق صرف ایک دی ہو، تین طلاقیں دے دی ہوں تو یہ حکم نہیں ہے، خوب اچھی طرح سمجھ لیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۵۷/۲۸ ج)

ایک طلاقِ رجعی کے بعد رُجوع کا بہتر طریقہ اور حاملہ کی عدّت

سوال:- مسمّٰی قاسم عمر ۸۵ سالہ نے اپنی زوجہ مسماۃ خدیجہ بائی بنت گل محمد کو حالتِ غصہ میں دس جولائی ۱۹۷۶ء کو ایک طلاق دے دی، جبکہ اس کی بیوی موجود نہیں تھی، دونوں الگ الگ رہ رہے ہیں، لیکن صلح کرنے کی نیت کرتے ہیں، اس کا شرعی حکم ارشاد فرمائیں۔

جواب:- اگر یہ دُرست ہے کہ مسمّٰی قاسم نے اپنی بیوی کو صرف ایک طلاق دی تھی تو یہ طلاقِ رجعی ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ عدّت کے دوران شوہر رُجوع کرسکتا ہے،[5] جس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے یہ کہہ دے کہ میں نے طلاق سے رُجوع کرلیا،[6] اور عدّت تین ماہ نہیں، بلکہ تین

---

(۱) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔
(۲،۳) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر ۲ و ۳۔
(۴) حوالہ کے لئے ص:۳۷۳ کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۵) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔
(۶) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر ۲ و ۳۔

حیض ہے،[1] اور اگر بیوی حاملہ ہو تو بچے کی پیدائش ہے،[2] عدّت کے بعد رُجوع نہیں ہوسکتا البتہ باہمی رضامندی سے نیا مہر مقرّر کرکے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے،[3] آئندہ طلاق دینے میں احتیاط رکھے کیونکہ اب اگر دو طلاق بھی دیدے گا تو بیوی مغلّظہ ہوجائے گی اور دوبارہ نکاح بھی نہ ہوسکے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۰۷/۲۷ و)

دو مرتبہ ''طلاق دیا'' کے الفاظ کہنے کا حکم

سوال:- میں نے ایک مرتبہ غصّے کی حالت میں اپنی بیوی کو دو طلاق کہا، طلاق اس طرح کہا: ''طلاق دیا، طلاق دیا'' اُس کے بعد بہت پشیمان ہوکر اُسی وقت بیوی کی خوشامد کی اور معافی مانگ کر اپنے گھر آٹھ روز تک نہایت خوش اور محبت سے رہ کر میکے چلی گئی، گھر لاکر میں نے بیوی کو کہا کہ میں نے تیرا نام کہہ کر تو نہیں کہا، میکے میں بھی ہم دونوں نہایت محبت اور خوشی سے ملتے رہتے ہیں، چھ بچے اور میاں بیوی اب بھی ہر روز محبت سے ملتے رہتے ہیں، میں نے کوئی تحریر بھی اس کو لکھ کر نہیں دی جس سے طلاق ہوجاتی ہے، اب اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ طلاق صرف دو مرتبہ دی تھی، تین مرتبہ نہیں، تو آپ کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں، جن کا حکم یہ ہے کہ عدّت (یعنی تین مرتبہ ایامِ ماہواری) گزر چکی ہو تو رُجوع نہیں ہوسکتا، لیکن باہمی رضامندی سے نئے مہر پر دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔[4]

بہرصورت! رُجوع کریں، یا نیا نکاح کریں، آئندہ آپ کو صرف ایک طلاق کا اختیار رہے گا، یعنی اگر آئندہ ایک مرتبہ بھی طلاق دے دی، خواہ زبانی ہو یا تحریری،[5] غصّے میں ہو،[6] یا مذاق میں،[7] بیوی آپ پر حرام ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر دُوسرا نکاح بھی نہ ہوسکے گا۔[8]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۰۶/۲۸ ج)

---

(۱) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۱۔
(۲) دیکھئے: حوالہ ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۳) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۳ کا حاشیہ نمبر۵۔
(۴) حوالہ کے لئے ص:۳۷۳ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۵) حوالہ کے لئے آگے ص:۳۷۹ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۶ و ۷) حوالہ کے لئے ص:۳۱۸ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۸) حوالہ کے لئے آگے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

لوگوں کے دباؤ کی بناء پر اپنی بیوی کے بجائے اس کی بہن کا نام لے کر طلاق دینے کا حکم

سوال:- ایک شخص سلطان کا نکاح مسماۃ صاحبزادی کے ساتھ ہوا، اور برادری نے اس کو مجبور کیا کہ تم اس لڑکی کو طلاقیں دے دو، سخت مجبوری کی وجہ سے اُس کو کہنے لگے کہ: ''تم صاحبزادی کو طلاقیں دے دو'' سلطان کہتا ہے کہ میری بیوی کا نام صاحبزادی ہے، اور اُس کی دُوسری بہن کا نام نواب زادی ہے، میرا ارادہ یہ ہوا کہ برادری کے دباؤ سے بچ جاؤں اور اپنی بیوی کو طلاق دینے سے بھی بچ جاؤں، اُنہوں نے کہا کہ اس کی بیوی کا نام کیا ہے؟ (اُس وقت لڑکی کا والد موجود نہیں تھا) اور دُوسرے لوگوں کو اس کا نام نہیں آتا تھا، انہوں نے سلطان سے پوچھا کہ تیری بیوی کا کیا نام ہے؟ اُس نے جان بوجھ کر نواب زادی کہا، اُنہوں نے کہا اس کو تو طلاق دیدے، سلطان نے کہا کہ میں نے کہا کہ: ''نواب زادی کو چھوڑا ہے'' تین مرتبہ کہا، وہ خوش ہوگئے، گھر آکر اُس نے دو تین آدمیوں سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی صاحبزادی کو طلاق نہیں دی ہے بلکہ نواب زادی کو دی ہے، ان لوگوں سے بچنے کے لئے فرضی طور پر چھوڑا کا لفظ استعمال کر دیا ہے۔ اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ تمام واقعات صحیح ہیں تو سلطان کے مذکورہ جملے سے اُس کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی،[1] وہ بدستور سلطان کے نکاح میں ہے، البتہ آئندہ اس قسم کی باتوں سے احتیاط کرنا چاہئے اور دباؤ کا خطرہ ہو تو پہلے سے کسی مفتی عالم سے ایسا طریقہ پوچھ لیں جس سے دباؤ بھی ختم ہو جائے اور طلاق بھی واقع نہ ہو، کیونکہ اس طرح بعض صورتوں میں طلاق ہو بھی جاتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۹۳۵/۲۸ ج)

''چل تجھے طلاق ہے، طلاق ہے'' الفاظ کا حکم

سوال:- بیان حق نواز ولد فیض قوم بلوچ 6-7-1980 بروز ہفتہ کا واقعہ ہے، میرے اور میری بیوی کے درمیان جھگڑا ہوا، میری بیوی ناراضگی کی وجہ سے اپنی ہمشیرہ شادی شدہ کے گھر چلی گئی اور میری ساس بھی آئی ہوئی تھی، میں اپنی سالی کے گھر گیا اور اپنی ساس کو سمجھانے لگا کہ خدا کے لئے تو

---

(۱) فی الهندیة ج:۱ ص:۳۵۸ ولو قال امرأته الحبشية طالق ولا نية له فی طلاق امرأته وامرأته ليست بحبشية لا يقع عليها وعلى هذا اذا سمى بغير اسمها ولا نية له فی طلاق امرأته. وفی الهندیة ج:۱ ص:۳۵۸ قال امرأته عمرة بنت صبيح طالق وامرأته عمرة بنت حفص ولا نية لهٗ لا تطلق امرأته... الخ.

اپنی لڑکی مسماۃ افضل خاتون کو سمجھا، وہ مجھے سخت الفاظ کہنے لگی، میرا اس کے ساتھ سخت کلام ہوا، میں نے کہا: نہ تو وہ میری روٹی پکاتی ہے اور نہ مال مویشی کو پانی پلاتی ہے۔ اتنے میں وہ آگئی یعنی میری بیوی، اس نے مجھے سخت بُرا بھلا کہا اور گالی گلوچ دینے لگی، میں نے غصّے میں آکر یوں کہا کہ: ''چل تجھے طلاق ہے، طلاق ہے'' موقع پر میری بیوی، میری سالی نذیراں، مریم، سکینہ، میری زوجہ موجود تھیں، نذیراں، مریم سکینہ کے بیانات میں سہ طلاق کا ذکر ہے، حق نواز کی سالی نے ۱۲ طلاق کا ذکر کیا ہے، جو کہ حق نواز کی مخالفت میں پیش پیش ہے، اس طرح حق نواز کی سالی بھی اپنی والدہ کی حمایت میں ہے، صرف دو عورتیں غیر جانبدار ہیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر حق نواز کا بیان دُرست ہے تو اس کی بیوی پر دو طلاق واقع ہوگئی ہیں، جن کا حکم یہ ہے کہ اگر عدّت کے دوران حق نواز نے رُجوع نہ کیا تو عدّت گزرنے پر اس کی بیوی بائنہ ہوجائے گی،[1] اور جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، البتہ عدّت کے دوران حق نواز کو رُجوع کرنے کا حق حاصل ہے،[2] اگر اس نے رُجوع کرلیا تو وہ بدستور حق نواز کی بیوی رہے گی، البتہ آئندہ اگر اس نے ایک مرتبہ بھی طلاق دی تو وہ ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہوجائے گی، اور بغیر حلالہ کے حلال نہ ہوگی۔[3]

واللہ اعلم
۲۱ر رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۶۶/۲۱ د)

''میں آپ کی لڑکی کو طلاق دے رہا ہوں'' کے الفاظ کا حکم

سوال:- ''آج میں آپ کی لڑکی کو طلاق دے رہا ہوں، میرے اس کو طلاق دینے کے وجوہات یہ ہیں، اس نے میری بے عزّتی دولڑکے ذات گوجر سالا اور بہنوئی کے پاس سے کرائی، اس بے عزّتی کی وجہ صرف اس کی بدمعاشی تھی، کیونکہ اس نے ان کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھے تھے، میں نے اس کو اس بات سے منع کیا، مگر اس نے میری پروا تک نہیں کی، آپ کی لڑکی کے کئی قسم کے فوٹو بھی اس لڑکے کے پاس ہیں جو کہ اس نے مجھے دِکھائے بھی تھے، مگر میں بات برداشت نہ کرسکا، اس لئے میں نے اس کو طلاق طلاق کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔'' کیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگئی؟

جواب:- مندرجہ بالا تحریر سے لکھنے والے کی بیوی پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوئی، جس کا حکم یہ ہے کہ شوہر عدّت کے دوران رُجوع کرسکتا ہے،[4] اور عدّت کے بعد باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۲۔ (۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۳) حوالہ کے لئے آگے ص:۳۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب الرجعة ج:۲ ص:۳۹۴ (طبع شركت علميه) واذا طلّق الرّجل امرأته تطليقة رجعيّة أو تطليقتين فلهٔ أن يراجعها فی عدّتها .... الخ.

ہوسکتا ہے،(۱) مذکورہ تحریر میں اگرچہ لفظِ ''طلاق'' تین مرتبہ استعمال ہوا ہے، لیکن آخری دو الفاظ طلاق دینے کے لئے نہیں طلاق کی وجہ بیان کرنے کے لئے ہیں، اس سے الگ طلاق واقع نہیں ہوئی۔

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۰/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۵۷۹/۲۱ الف)

''میں نے آپ کی بیٹی کو طلاق دی'' اور ''میں انہیں طلاق دیتا ہوں'' الفاظ کا حکم

سوال:- ۲۵ر نومبر کو میری زوجہ خالدہ بیگم اور اُن کی والدہ بغیر میری اجازت کے اپنے بہنوئی کے یہاں چلی گئیں، جبکہ اُن کو کورنگی سے جاکر کپڑے لانے تھے، میں دفتر سے تقریباً ۷ بجے گھر پہنچا، معلوم کرنے پر چھوٹے سالے نے بتایا کہ امی اور باجی کورنگی گئی ہوئی ہیں، رات کے ۹ بجے ہیں، مجھے پریشانی لاحق ہوئی، چھوٹا بچہ ساتھ ہے، بہرحال ½ ۹ بجے اسکوٹر پر اپنے بہنوئی کے ساتھ آئیں، میں غصے کی وجہ سے پلنگ پر لیٹ گیا، ساڑھو کے جانے کے بعد میں نے بیوی کو کافی ڈانٹا کہ کپڑے لینے نہیں گئیں اور بہن کے گھر چلی گئیں، اس پر انہوں نے کہا کہ: رُخسانہ بہن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، ملنے گئے تھے۔ میں گھر سے اُٹھ کر جانے لگا تو میرے سسر نے مجھے روکنے کی کوشش کی، میں غصے میں تھا، میں نے اُن سے کہہ دیا کہ ۱:- میں نے آپ کی بیٹی کو طلاق دی۔ ۲:- میں انہیں طلاق دیتا ہوں۔ اور پھر میری زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی خالدہ بیگم منہ پھیر کر باہر کمرے میں چلی گئیں، میں فوراً گھر سے چلا آیا۔ عزیز و اقارب کا اصرار ہے کہ تمہارا یہ فیصلہ غلط ہے، بیوی دو ماہ کی حاملہ بھی ہے، جواب سے مطلع فرمائیں تاکہ شریعت کے مطابق عمل کرسکوں۔

جواب:- اگر آپ نے سوال کے مطابق صرف دو مرتبہ ہی طلاق کے الفاظ استعمال کئے تھے، تین مرتبہ نہیں تو آپ کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں، جن کا حکم یہ ہے کہ عدّت کے دوران آپ رُجوع کرسکتے ہیں،(۲) جس کا طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں(۳) زبان سے یہ کہہ دیں کہ: ''میں نے اپنی بیوی کی طلاق سے رُجوع کرلیا''،(۴) اُس کے بعد وہ بدستور آپ کی بیوی رہیں گی، لیکن آئندہ آپ کو صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا، یعنی آئندہ اگر ایک مرتبہ بھی آپ کے منہ سے

---

(۱) حوالہ کے لئے ص:۳۲۷ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۱ و۲۔
(۳ و ۴) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۳۔

طلاق نکل گئی خواہ غصے میں ہو یا سنجیدگی سے ہر حالت میں آپ کی بیوی آپ پر حرام ہوجائیں گی[1]، اور دوبارہ نکاح بھی بغیر حلالہ کے نہ ہوسکے گا[2]، لہٰذا آئندہ طلاق کے معاملے میں انتہائی احتیاط سے کام لیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۸۲/۲۷ و)

''میں تجھے طلاق دیتا ہوں'' دو مرتبہ کہنے کا حکم اور رُجوع کا بہتر طریقہ

سوال:- مسمّٰی محمد تقی ولد حاجی عبدالغنی مرحوم ساکن 4-C 52/8 لانڈھی کالونی کراچی نے دو ماہ قبل اپنی منکوحہ بیوی نور جہاں بیگم دُختر نواب بیگ کو غصّے کی حالت میں اور مکان سے باہر سڑک پر کھڑے ہوکر دو بالغ گواہوں کی موجودگی میں اور مکان کی طرف منہ کرکے جیسے کہ وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہو دو مرتبہ بلند آواز میں یہ کہا کہ: ''میں تجھے طلاق دیتا ہوں، میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔'' بیوی نے کہا کہ: میں نے شوہر کے طلاق دینے کے جملے بالکل نہیں سنے۔ نور جہاں بیگم اپنے والد نواب بیگ کے گھر رہتی ہیں اور میاں بیوی میں جدائی ہوگئی ہے، اگر طلاق نہیں ہوئی تو کیا کفارہ کچھ واجب ہے؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ مسمّٰی محمد تقی نے صرف دو مرتبہ اپنی بیوی کو یہ جملہ کہا ہے کہ: ''میں تجھے طلاق دیتا ہوں''، تین مرتبہ نہیں کہا تو اس کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں، جن کا حکم یہ ہے کہ عدّت کے دوران (یعنی طلاق کے بعد سے تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزرنے سے پہلے پہلے) اگر شوہر رُجوع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے[3]، اور رُجوع کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے اپنی بیوی سے یہ کہہ دے کہ: ''میں نے تمہاری طلاق سے رُجوع کرلیا''۔[4] اور عدّت گزرنے کے بعد شوہر رُجوع تو نہیں کرسکتا البتہ باہمی رضامندی سے نئے مہر پر دُوسرا نکاح ہوسکتا ہے[5]، اور اس کا کفارہ کوئی نہیں۔

واضح رہے کہ شوہر رُجوع کرے یا نیا نکاح، ہر صورت میں اب اسے صرف ایک طلاق کا اختیار رہ جائے گا، اور آئندہ ایک مرتبہ بھی طلاق دی تو بیوی بالکل حرام ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر دُوسرا نکاح بھی نہ ہوسکے گا۔[6]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۶۶/۲۸ ج)

---

(۱) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۱۸ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر۱ تا ۳۔

(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۱ و۲۔

(۴) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۷۳ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۶) دیکھئے ص:۳۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر۱ تا ۳۔

''طلاق دیتا ہوں'' الفاظ کا حکم اور زبان سے رُجوع کا طریقہ

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک طلاق نامہ بھیجا، جن کے الفاظ یہ ہیں: ''میں محمد انور ولد گل محمد عثمانی باوانی مسماۃ مہرالنساء دُختر عثمانی نور محمد باوانی کو طلاق دیتا ہوں، وہ اب میری بیوی نہیں ہے۔'' اس طلاق نامے پر دو گواہوں کے دستخط بھی موجود ہیں، اس طلاق نامے کو مدِنظر رکھتے ہوئے شرعی فیصلے سے ممنون فرماویں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مہرالنساء پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ عدّت یعنی طلاق کے بعد سے تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزرنے کے بعد وہ جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، لیکن شوہر کو اختیار ہے کہ وہ عدّت گزرنے سے پہلے پہلے اگر چاہے تو رُجوع کرسکتا ہے[1]، اگر زبان سے کہہ دے کہ: ''میں نے طلاق سے رُجوع کرلیا'' تو مہرالنساء دوبارہ اس کی بیوی بن جائے گی[2]، لیکن عدّت گزرنے کے بعد اس کو یہ اختیار باقی نہ رہے گا۔[3]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۵ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

''میں نے اُسے چھوڑ دیا'' کہنے کا حکم

سوال:- ایک نابالغہ بچی کا ۳-۴ سال کی عمر میں نکاح کردیا گیا، بعد ازاں وہ مرد جس سے اس نابالغہ کا نکاح ہوا تھا، اُس نے رُوبرو گواہوں کے یہ کہہ دیا کہ: ''میں نے یہ رشتہ نہیں لیا، جدھر مرضی ہو وہ شادی کرلیں، کیونکہ لڑکی مجھے پسند نہیں ہے۔'' گواہ موجود ہیں جو یہ گواہی دیتے ہیں کہ اس مرد نے ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ بمعہ اہلِ خانہ کے اعلانیہ کہا کہ: ''میں نے اسے چھوڑ دیا، جدھر چاہیں دے دیں۔'' کیا اس لڑکی کا نکاح اس مرد سے رہا یا نہیں؟ بچی جوان ہے عصمت کا خطرہ ہے، مذکورہ بالا بیان حلفیہ ہے۔

جواب:- اگر یہ بیان دُرست ہے کہ مرد نے رُخصتی سے پہلے ہی اُس منکوحہ کے بارے میں یہ کہہ دیا ہے کہ: ''میں نے اُسے چھوڑ دیا'' تو صورتِ مسئولہ میں اس کی بیوی پر طلاقِ بائن واقع

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۱ و۲۔ (۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۳۔
(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۳۳ کا حاشیہ نمبر۵۔

ہوگئی ہے،(۱) اور چونکہ رُخصتی نہیں ہوئی، اس لئے اس پر عدّت بھی واجب نہیں، وہ جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، لیکن واضح رہے کہ یہ جواب اس صورت میں ہے کہ جبکہ شوہر نے واقعۃً یہ الفاظ کہے ہوں کہ: ''میں نے اُسے چھوڑ دیا'' اگر کوئی اور الفاظ کہے ہوں تو وہ لکھ کر بھیجئے ان کے مطابق جواب دیا جائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳/۷ ۲۹ ب)

میمنی زبان میں ''میں تم کو رجاء دیتا ہوں'' کے الفاظ کا حکم

سوال:- محمد طیب نے اپنی بیوی کو غصّے کی حالت میں یہ لفظ کہے: ''میں تمہیں اجازت دیتا ہوں'' اور اس سے مراد اس کی طلاق تھی، اب شریعت میں طلاق ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر ہوتی ہے تو کون سی طلاق ہوتی ہے؟ (اور یہ الفاظ گجراتی زبان میں ''میں تم کو رضا دیتا ہوں'' تین مرتبہ کہا ہے)۔

تنقیح:-

پہلے یہ بتایئے کہ گجراتی زبان میں جب بیوی سے یہ کہا جائے کہ: ''میں تم کو رضا دیتا ہوں'' تو کیا یہ لفظ صرف طلاق ہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یا اس کا کوئی اور مطلب بھی ہوسکتا ہے؟ اس سوال کا واضح جواب اسی کاغذ پر لکھ کر دیں، تو اصل مسئلے کا جواب دیا جاسکے گا۔

جوابِ تنقیح:-

جھگڑے کے درمیان بیوی نے شوہر سے کہا کہ: تم مجھ کو رضا دے دو، اس پر شوہر نے تین مرتبہ کہا کہ: ''میں تم کو رضا دیتا ہوں'' رضاء کے معنی اجازت کے بھی آتے ہیں، جیسے شادی میں کہیں جانا ہو تو بیوی رضا چاہتی ہے، اُس وقت بھی شوہر کہتا ہے کہ: ''میں تم کو رضا دیتا ہوں'' لیکن یہ جس موقع کی بات ہے اُس وقت اُس سے طلاق ہی کی نیت تھی اور اُس کے لئے ہی یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

جواب:- تحریری وزبانی جوابِ تنقیح سے، نیز میمنی زبان کے دُوسرے اہلِ زبان سے تحقیق کرکے معلوم ہوا کہ میمنی زبان میں لفظ ''رجا'' کے معنی اگرچہ دُوسرے بھی ہوتے ہیں، لیکن طلاق کے سوا دُوسرے معنی مراد لینے کے لئے قرینہ یا دلالتِ حال کی ضرورت ہے، اور کسی قرینے یا دلالتِ حال کے بغیر اگر کوئی شوہر اپنی بیوی سے کہے کہ: ''میں نے تم کو رجا دے دی ہے'' تو اس سے طلاق ہی کے معنی

---

(۱) وفي ردّ المحتار كتابُ الطّلاق باب الكنايات ج:۳ ص:۲۹۹ (طبع سعيد) فانّ سرّحتك كناية لكنه في عرف الفرس غلب استعماله في الصّريح فاذا قال: "رها كردم" أي سرّحتك يقع به الرّجعي مع انّ اصله كناية أيضًا، وما ذاك الّا لأنّه غلب في عرف الفرس استعماله في الطّلاق، وقد مرّ أن الصّريح ما لم يستعمل الّا في الطّلاق من أيّ لغة كانت ... الخ۔ نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۴۲۵، امداد المفتین ص:۶۱۶، امداد الاحکام ج:۲ ص:۴۴۳، اور آگے ص:۳۶۵ کا فتویٰ۔

سمجھے جائیں گے، اور یہ علامت اس لفظ کے صریح طلاق ہونے کی ہے،[۱] اور اس کی نظیر اُردو میں "چھوڑ دیا" ہے،[۲] اور فارسی میں "رہا کردم" [۳] کہ اگر یہ طلاق کے سوا بولے جائیں تو طلاق ہی کے معنی ہوتے ہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں تینوں طلاقیں چونکہ صریح ہیں اس لئے تینوں واقع ہوگئیں، اور محمد طیب کی بیوی مغلّظہ ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ حلالۂ شرعیہ کے بغیر وہ محمد طیب کے لئے حلال نہیں ہوسکتی،[۴] اور نہ حلالہ کے بغیر دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔[۵]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۹۹/۴/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۷۷/۲۸ ب)

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۹۷/۴/۶ھ

"ایک طلاق دے رہا ہوں" الفاظ سے ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگی

سوال:- ہماری ہمشیرہ افشین اعجاز جو کہ محمد یوسف کے نکاح میں تھی، محمد یوسف کے اس لیٹر پر جس میں اس نے اس کو طلاق دی ہے کیا پرچے کے حساب سے جو تاریخ اس نے دی ہے تاریخ گزر جانے پر اس کو طلاق ہوگئی ہے یا نہیں؟

جواب:- جس تاریخ کو محمد یوسف نے منسلکہ پرچہ تحریر کیا، اس تاریخ کو اس کی بیوی افشین اعجاز پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی، جس کی عدّت تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزرنا ہے،[۶] اگر عدّت کے دوران محمد یوسف نے اس طلاق سے رُجوع نہیں کیا تو عدّت گزرنے پر افشین اعجاز اس کے نکاح سے خارج ہوکر کسی دُوسری جگہ نکاح کرنے کے لئے آزاد ہوگی،[۷] البتہ اگر یہ میاں بیوی چاہیں تو آپس میں دوبارہ نئے مہر پر نئے ایجاب وقبول کے ساتھ عدّت کے بعد بھی نکاح کرسکتے ہیں۔[۸]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲۱ رمضان المبارک ۱۳۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۴۷/۲۹۵)

طلاق نامہ

میں محمد یوسف ولد محمود احمد نے تمہارے اور تمہارے والدین کے پیدا کئے ہوئے نامناسب حالات اور نازیبا اور جابرانہ سلوک اور زبردستی اور بار بار تمہاری اور تمہارے والدین کی طرف سے طلاق کی بلاجواز اور ناجائز مانگ کی وجہ

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۵۲ (طبع سعید) .... فیقع بلا نیّة للعرف. وفی الشامیة (قوله فیقع بلا نیّة للعرف) أی فیکون صریحًا لا کنایة .... وقد مرّ أن الصّریح ما غلب فی العُرف استعمالهُ فی الطّلاق بحیث لا یستعمل عرفًا الّا فیه من أیّ لغة کانت، وهذا فی عرف زماننا کذٰلک فوجب اعتباره صریحًا کما أفتی المتأخرون فی "انت علیّ حرام" بانّه طلاق بائن للعُرف بلا نیّة مع أنّ المنصوص علیه عند المتقدمین توقّفه علی النّیة.

(۳،۲) لفظ "چھوڑ دیا" کے طلاق صریح ہونے سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے ص:۳۶۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ و۲، اور اگلے صفحہ:۳۴۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔

(۵،۴) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳۔

(۶) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۷) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۸) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۷۳ کا حاشیہ نمبر۱۔

سے فیصلہ کیا ہے کہ میں تمہیں بطور تنبیہ ایک طلاق شریعت کے حکم کے مطابق دوں، کیونکہ تم لوگوں کی طرف سے تحریری اور زبانی کئی کئی بار اور کئی مواقع پر طلاق کا مطالبہ ہو چکا ہے، اور تم سب اسی بات پر بضد ہو، حالانکہ ہماری طرف سے یہ نکاح قائم رکھنے کی ساری کوششیں تم سب ضائع کر رہے ہو، جس کا جواب وہ دُنیا والوں اور اللہ تعالیٰ کے حضور، میں یا میرے خاندان والے ہرگز نہیں ہیں، اس کی مکمل ذمہ داری تم پر اور تمہارے والدین پر عائد ہوتی ہے، ہمارے خاندان میں تو طلاق کو نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور کوئی بھی باشعور آدمی اس لفظ کو اپنی زبان پر لانا بھی گوارا نہیں کرتا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ جائز اور حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسند اللہ تعالیٰ کو طلاق ہے۔

ایک طلاق میں اس لئے دے رہا ہوں کہ ہوسکتا ہے مستقبل قریب میں تم راہِ راست پر آجاؤ، اور غیروں کی باتوں میں اپنے کے بجائے میری فرمانبردار ہوجاؤ اور میری باتیں سنو اور سمجھ جاؤ، اور فی الحال جو چھوٹے چھوٹے مسائل اور فضول کی باتوں سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں انہیں دُور کردو، یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کیونکہ تم ابھی شرعاً اور قانوناً میری منکوحہ بیوی ہو۔

اس لئے بطور پہلے قدم کے میں تمہیں ایک طلاق دے رہا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ اس تنبیہ یا Warning کی وجہ سے انشاء اللہ تعالیٰ تم اپنا رویہ بدل ڈالو اور میرے ساتھ ایک اچھی اور خوشگوار زندگی مستقبل قریب میں بسر کرنے کے لئے راضی ہوجاؤ، لیکن اگر تم نے نفی میں اس بات کا جواب دیا تو میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناطہ توڑنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اس معاملے کو سنجیدگی اور فراخدلی سے زیرِ نظر رکھوگی، میں تمہارے جواب کا ایک مہینے تک انتظار کروں گا، فقط۔

محمد یوسف

۳رنومبر ۱۹۹۷ء

تین مرتبہ لفظ ''چھوڑا'' استعمال کرنے کا حکم

سوال:- زید نے بحالتِ غصہ اپنی بیوی کو یہ الفاظ کہے: ''چھوڑا، چھوڑا، چھوڑا'' کیا ان الفاظ سے طلاق ہوگئی؟

جواب:- سائل سے زبانی معلوم ہوا کہ طلاق کے ماحول کے پیشِ نظر ''چھوڑا'' کی اضافت زوجہ ہی کی طرف تھی، اور ''چھوڑا'' ہمارے عرف میں طلاقِ صریح ہے،[۱] لہٰذا صورتِ مسئولہ میں طلاقِ مغلظ واقع ہوگئی، اب حلالہ کے بغیر ہرگز حلال نہیں ہوسکتی۔ واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۱/ ۱۹ الف)

---

(۱) فی الشامیة ج:۳ ص:۲۹۹ (طبع ایچ ایم سعید) بخلاف فارسیة قوله سرحتک وهو "رها کردم" لأنّه صار صریحًا فی العرف علی ما صرّح به نجم الزاهدی الخوارزمی فی شرح القدوری .... فان سرحتک کنایة لکنه فی عرف الفرس غلب استعماله فی الصّریح، فاذا قال "رها کردم" أی سرحتک یقع به الرجعی مع ان اصله کنایة ایضًا وما ذاک الّا لأنّه غلب فی عرف الفرس استعماله فی الطّلاق وقد مرّ ان الصریح ما لم یستعمل الّا فی الطّلاق من أیّ لغة کانت

وفیها ایضًا ج:۳ ص:۲۵۲ (طبع ایچ ایم سعید) (قوله فیقع بلا نیّة للعرف) أی فیکون صریحًا لا کنایة ... وقد مرّ ان الصریح ما غلب فی العرف استعماله فی الطّلاق بحیث لا یستعمل عرفًا الا فیه من أیّ لغة کانت، وهذا فی عرف زماننا کذالک فوجب اعتباره صریحًا کما افتی المتأخّرون فی انت علیّ حرام بانّه طلاق بائن للعرف بلا نیّة مع ان المنصوص علیه عند المتقدّمین توقّفه علی النیّة. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۴۲۵، امداد المفتیین ص:۶۱۶، امداد الاحکام ج:۲ ص:۴۴۳۔

ایک مرتبہ طلاق کا لفظ کہنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے اپنے غیظ وغضب کی حالت میں زبان سے طلاق کا لفظ چھوڑ دیا، یعنی طلاق کہہ دیا، عدد استعمال نہیں کیا، اب مذکورہ صورت پر طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو کتنی واقع ہوگی؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعہ دُرست ہے اور طلاق کا لفظ ایک سے زائد مرتبہ استعمال نہیں کیا تو مذکورہ صورت میں اس کی بیوی پر ایک طلاقِ رجعی ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ عدّت کے دوران یعنی تین ماہواریاں گزرنے سے پہلے اگر شوہر چاہے تو رُجوع کرسکتا ہے،[1] جس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں بیوی سے یہ کہہ دے کہ: ''میں نے تم سے رُجوع کیا''،[2] اور عدّت گزرنے کے بعد دونوں کی رضامندی سے نئے مہر پر نیا نکاح ہوسکتا ہے،[3] البتہ دونوں صورتوں میں اب اس کو صرف دو طلاقوں کا اختیار باقی رہے گا، یعنی آئندہ اگر اس نے صرف دو مرتبہ بھی طلاق دی تو بیوی مغلظہ ہوکر حرام ہوجائے گی، پھر حلالہ کے بغیر نیا نکاح بھی نہ ہوسکے گا،[4] لہٰذا آئندہ طلاق کے معاملے میں انتہائی احتیاط سے کام لے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۱/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱/۲۹ الف)

''طلاق دے دُوں گا'' کے الفاظ سے طلاق نہیں ہوتی

سوال:- تین ماہ قبل میرے سسر مجھ سے اپنی لڑکی مسماۃ حمیدہ بیگم دختر نکا خان کے نام دباؤ ڈال کر زرعی اراضی لکھوانا چاہتے تھے، میں نے انکار کردیا اور کہا کہ: ''ایسی صورت میں تمہاری لڑکی کو طلاق دے دُوں گا''، اور کچھ نہیں کہا، اس وقت غصّے کی حالت میں تھا، آیا طلاق ہوئی یا نہیں؟

جواب:- اگر واقعۃً وہی خط کشیدہ الفاظ کہے تھے جو سوال میں لکھے ہیں، یعنی ''طلاق دے دُوں گا'' تو ان سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی،[5] لیکن آئندہ طلاق کے الفاظ بولنے میں سخت احتیاط

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۱و۲۔ (۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۳۔
(۳) حوالہ کے لئے ص:۳۷۳ کا حاشیہ نمبر۱ دیکھئے۔ (۴) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ تا ۳۔
(۵) وفی الفتاویٰ تنقیح الحامدیة کتاب الطّلاق ج ۱ ص:۳۸ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) صیغة المضارع لا یقع بها الطّلاق الّا اذا غلب فی الحال کما صرّح به الکمال بن الهمام.
وفی الدّر المختار کتاب الطّلاق باب تفویض الطّلاق ج:۳ ص:۳۱۹ (طبع سعید) .... بخلاف قوله طلّقی نفسک فقالت انا طالق، أو أنا اطلّق نفسی، لم یقع لأنّه وعد .... الخ.

لازم ہے، اور اگر الفاظ کچھ اور بولے تھے تو الفاظ ٹھیک ٹھیک یاد کر کے لکھیں اور دوبارہ مسئلہ پوچھ لیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۱۱ ج)

طلاق کی تعداد میں شک ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال:- قریباً ۴½ سال قبل میں (محمود شوکت)، میری بیوی اور ایک بیٹی عمر ۶ ماہ کے ہمراہ سسرال میں قیام پذیر تھا، میرا اپنا گھر پنجاب میں ہے، یہاں کراچی میں رہنے کی وجہ سے مجھے اکثر گیس ٹربل کی تکلیف ہوا کرتی تھی۔ ایک روز مجھے شدید تکلیف کا دورہ ہوا، اور اسی دوران ایک معمولی بات کی وجہ سے چھوٹی سالی سے تکرار کر بیٹھا، اُس کی باتوں کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے اپنی بیوی سے اُلجھا، اس سے پیشتر بیوی سے تعلقات اچھے تھے اور کوئی جھگڑا نہ تھا، لیکن اُس وقت شدید غصّے کے عالم میں اور اپنے مرض کی تکلیف میں مبتلا ہوتے ہوئے نادانی میں تحریراً طلاق لکھ دی، یہ عمل صرف سسرال پر دباؤ ڈالنے کے لئے کیا تھا، اس لئے مجھے طلاق کی تعداد کا کامل یقین نہیں ہے کہ کتنی دفعہ دی ہے۔ دُوسرے روز اپنی حرکت پر اس قدر پریشان ہوا اور اپنے سسر صاحب سے اپنی پشیمانی کا اظہار کیا، بیوی سے بھی معافی مانگی، اُس کو اپنے ہمراہ پنجاب چلنے پر آمادہ کیا، میرے بار بار اصرار پر میری بیوی نے معاف کردیا، چونکہ اپنی بیوی سے تعلقات ختم کرنے پر آمادہ نہیں تھا، اس لئے میں اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر اپنے بھائی کے گھر چلا گیا، اور لیٹر بھی (طلاق نامہ) پھاڑ دیا، اس واقعے کے چوتھے روز میں خود مفتی شفیع صاحب مرحوم کی قیام گاہ پہنچا، اُنہوں نے تعداد کے یقین کے بارے میں پوچھا، لیکن میں خود بھی تعداد کے بارے میں یقین نہ رکھتا تھا، اور اُسی دن اپنی بیوی اور بچی کو لے کر پنجاب چلا گیا۔

آج اُس واقعے کو گزرے ہوئے تقریباً ۴½ سال گزر چکے ہیں، لیکن میرے سسر صاحب اب تک مطمئن نہیں ہوئے ہیں، اور اُنہوں نے مجھ سے اور اپنی بیٹی سے تعلقات منقطع کر لئے ہیں، یہ حالات ہمارے خاندان کی رُسوائی کا موجب بنے ہوئے ہیں، ہمارے حالات اور میری نیت کو دیکھتے ہوئے ہمیں شرعی فیصلہ دیں تاکہ ہم اپنی آئندہ زندگی سکون سے گزار سکیں۔ نہ ہی میری بیوی کو تعداد کا یقین ہے کہ کتنی مرتبہ لکھی ہے، دو دفعہ یا تین دفعہ۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں محمود شوکت اور فرحت دونوں کو پوری احتیاط اور غور وفکر کے ساتھ یاد کرنا چاہئے کہ کتنی طلاقیں لکھی تھیں؟ اور جو دُوسرے لوگ اس وقت موجود تھے یا انہوں نے تحریر پڑھی تھی اُن سے بھی تحقیق کرنی چاہئے، اگر خود یاد آجائے یا کسی دُوسرے پڑھنے والے کے بیان سے

یہ گمانِ غالب قائم ہوجائے کہ تین طلاقیں دے دی تھیں، تو فرحت اپنے شوہر پر حرام ہوگئی، اس پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اور حلالہ کے بغیر دونوں کے درمیان دُوسرا نکاح بھی نہیں ہوسکتا، دونوں پر فرض ہے کہ فوراً ایک دُوسرے سے علیحدگی اختیار کرلیں، اور جتنا عرصہ طلاق کے بعد ساتھ گزرا اس پر توبہ و اِستغفار کریں، لیکن اگر غور وفکر اور تحقیق کے بعد بھی یاد نہ آئے کہ کتنی طلاقیں لکھی تھیں اور نہ کسی طرف گمان غالب ہو تو صورتِ مسئولہ کا حکم یہ ہے کہ محمود شوکت کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں اور چونکہ محمود شوکت نے عملاً ان سے رُجوع کرلیا ہے اس لئے فرحت بدستور اس کی بیوی ہے، البتہ اب محمود شوکت کو صرف ایک طلاق کا اختیار باقی ہے، یعنی اب اگر وہ ایک طلاق بھی دیدے گا خواہ غصے میں دے یا مذاق میں دے تو اُس کی بیوی اُس پر حرام ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر ہرگز حلال نہ ہوگی۔

مذکورہ صورت میں اگرچہ محمود شوکت کو اپنی بیوی کو رکھنے کا اختیار ہے، لیکن چونکہ حلال وحرام کا معاملہ نازک ہے، اور اس کو تردّد پیدا ہوگیا ہے، اور بعض فقہاء ایسی صورت میں بھی تین طلاقوں کے وقوع کا فتویٰ دیتے ہیں، لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ وہ بہرصورت بیوی سے علیحدگی اختیار کرلے، اور اس کی عدّت گزار کر بیوی کسی اور جگہ نکاح کرلے، پھر اگر کسی وجہ سے دُوسرا شوہر خود طلاق دیدے تو اس کی عدّت کے بعد محمود شوکت بھی اس سے نکاح کرسکے گا۔

والدلیل علی کل ذٰلک ما یأتی

۱:- قال اللہ تعالٰی: "فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ." (۱)

۲:- عن علیّ رضی اللہ عنہ قال: سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجلًا طلّق البتة فغضب وقال: تتخذون اٰیات اللہ ھزوًا أو دین اللہ ھزوًا أو لعبًا؟ من طلق البتة الزمناہ ثلاثًا لا تحل لہ حتی تنکح زوجًا غیرہ .... وفی حدیث ابن عمر قال: قلت: یا رسول اللہ! أرأیت لو طلّقتھا ثلاثًا، قال: اذًا عصیت ربک وبانت منک امرأتک. (المغنی لابن قدامة ج:۷ ص:۱۰۳)۔ (۲)

وقد أخرج البیھقی قصة طلاق الحسن بن علی امرأتہٗ ثلاثًا وفیہ حدیث مرفوع الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم.

۳:- قال ابن نجیم: شک أنہ طلّق واحدة أو أکثر بنی علی الأقل کما ذکرہ الاسبیجابی الّا ان یستیقن بالأکثر أو یکون أکبر ظنہ علٰی خلافہ وان قال الزّوج عزمت علٰی أنّہ ثلاث یترکھا. (الاشباہ والنظائر، مجتبائی ج:۱ ص:۸۱، القاعدة الثالثة)۔ (۳)

۴:- وعن الامام الثانی اذا کان لا یدری أثلاث أم أقلّ یتحرّی وان استویا عمل بأشد

---

(۱) سورة البقرة:۲۳۰

(۲) کتاب الطّلاق تحت مسئلة ۱۲۲۸ ج:۱۰ ص:۳۳۲ (طبع دار عالم الکتب ریاض)۔

(۳) الاشباہ والنظائر الفن الأول القاعدة الثالثة ص۹۱ (طبع ادارة القرآن کراچی و ص:۶۴ طبع قدیمی کتب خانہ)۔

ذلک علیہ اشباہ عن البزازیة قال ط وعلی قول الثانی اقتصر قاضی خان ولعلّه لأنّه یعمل بالاحتیاط خصوصًا فی باب الفروج اھ. قلت ویمکن حمل الأول علی القضاء والثانی علی الدیانة. (شامی ج:۲ ص:۳۵۴).[1]

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مفتی کو علمِ غیب نہیں ہوتا، اُس کے سامنے جیسا سوال کیا جائے گا، وہ اُس کے مطابق جواب دے گا۔ سوال کی صحت کی ذمہ داری سائل پر ہے، اور چونکہ معاملہ حلال وحرام کا ہے، اور ہر شخص کو آخرت میں اپنی جوابدہی کرنی ہے، لہٰذا بہت احتیاط اور غور وفکر کے ساتھ یہ متعین کیا جائے کہ کتنی طلاقیں دی تھیں؟ اگر ذرا بھی گمان غالب تین طلاقوں کا ہو تو دونوں کا ساتھ رہنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۸/۷/۱۳۹۸ھ

(فتویٰ نمبر ۸۰۵/۲۹ ب)

''میں نے اس کی بہن کو چھوڑا'' کے الفاظ دو مرتبہ کہنے کے بعد طلاق کی خبر کسی کو دینے سے مزید طلاق نہ ہونے کا حکم اور رُجوع کا طریقہ

سوال:- زید کی مار پیٹ سالے سے ہو رہی ہے، میرا میاں بیوی کا کوئی جھگڑا نہیں، میں نے طلاق دی تھی اور میری بیوی اندر کمرے میں تھی، میں نے دو دفعہ سالے کو یہ کہہ دیا: ''میں نے اس کی بہن کو چھوڑا'' فوراً ایک عورت نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، یہی عورت اس بات کی گواہ ہے، میں نے سالے کی دُکان پر جاکر غل مچایا: ''میں اس کی بہن کو چھوڑ آیا ہوں'' اب تو یہ بتلاکر میں نے اور کئی جگہ بھی کہا، یہ بات آٹھ روز پہلے کی ہے، ان لوگوں نے میری بیوی کی چوڑیاں بھی اُتار لیں، کیا اس صورت میں طلاق ہوگئی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں سائل کی بیوی پر دو طلاقیں واقع ہوگئی ہیں،[2] ان دو طلاقوں کے بعد سالے کی دُکان پر جو الفاظ سائل نے یعنی: ''میں اس کی بہن کو چھوڑ آیا ہوں'' یہ طلاقِ جدید کا انشاء نہیں بلکہ سابق دو طلاقوں کی خبر ہے، اُردو محاورے کے لحاظ سے ''چھوڑ آیا ہوں'' کا یہی مفہوم ہے، اور سائل سے زبانی دریافت کیا گیا تو اس نے بھی اسی مراد کا اظہار کیا ہے، لہٰذا اس جملے سے تیسری طلاق واقع نہیں ہوئی۔ تین مرتبہ ایامِ ماہواری سے پہلے پہلے اگر شوہر طلاق سے رُجوع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے،[3] اور رُجوع کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں بیوی سے کہے کہ: ''میں نے تمہاری

---

(۱) ردّ المحتار قبیل باب طلاق غیر المدخول بھا. ج:۳ ص:۲۸۳ (طبع سعید)

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص ۳۶۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱و۲، اور پچھلے صفحہ ۳۴۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔

(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۱و۲۔

طلاق سے رجوع کرلیا"،[1] اس کے بعد وہ بدستور اس کی بیوی ہوگی، لیکن طلاق دے دی تو بیوی بالکل حرام ہوجائے گی، اور بغیر حلالہ کے دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکے گا۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح — احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ — ۱۳۹۱/۷/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۸۹۵/۲۲ ب)

الفاظ "طلاق لے لو" کا حکم
"المرأة کالقاضی" کا مطلب
عددِ طلاق میں زوجین کے اختلاف کا حکم

(زوجین میں الفاظ اور وقوعِ طلاق میں اختلاف کے فیصلے اور تحکیم کی شرعی حیثیت سے متعلق حضرت مولانا سیاح الدین کاکا خیلؒ کے سوال کا مفصل و مدلل جواب)

سوال:- مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں تحقیقی اور کتبِ فقہ حنفی کے حوالوں کے ساتھ جواب تحریر فرمائیے، بڑی مہربانی ہوگی۔

ایک لڑکی کا دعویٰ یہ ہے کہ مجھے اپنے شوہر نے دو دفعہ طلاق دی تھی، جس کے بعد بھی مجھے پاس رکھا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ طلاق کن الفاظ سے واقع ہوتی ہے اور اس کا اثر کیا ہوتا ہے؟ اس لئے میں نے والدین سے کوئی ذکر نہیں کیا، اور شوہر کے ساتھ رہتی رہی، کچھ عرصہ بعد اُس نے ایک دفعہ غصے میں آکر ایک دم تین مرتبہ طلاق دے دی، مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ اس طرح کہنے سے عورت مرد پر مستقل حرام ہوجاتی ہے، اس لئے نہ عام طور سے کسی کو اس کا ذکر کیا اور نہ سمجھی کہ مجھے تین طلاقیں ہوچکی ہیں اور میں اُس شوہر پر حرام ہوچکی ہوں، البتہ اپنی والدہ سے اس کا ذکر کیا تھا، مگر ڈر تھا کہ والد صاحب کو داماد کی ایسی باتوں اور غصے کا علم ہوجائے تو اس سے ناراض ہوگا جھگڑا ہوجائے گا، اس لئے والد کو نہیں بتایا، اور والدہ نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا، کچھ عرصہ بعد کسی اور سے یہ مسئلہ معلوم ہوا، اور بہشتی زیور دیکھ کر خود بھی اس کا علم ہوا کہ ایسی صورت میں تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور عورت اس مرد کے لئے حرام ہوجاتی ہے، اس لئے خوفِ خدا کی بنا پر میں اب اس مرد کے پاس نہیں رہ سکتی، اور اب اُس نے والد کو بھی یہ واقعہ بتادیا ہے، (لڑکی کا خود لکھا ہوا تفصیلی بیان آپ ملاحظہ فرمائیے)۔ اس کے جواب میں شوہر کہتا ہے کہ ہاں میں نے پہلی دفعہ غصے میں آکر کہا تھا: "مجھ سے طلاق لے لو" پھر نادم ہوا اور اس کو میں نے طلاق سمجھا ہی نہیں تھا، پھر ایک دُوسرے موقع پر غصے میں آکر کہا کہ: "طلاق

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر ۳۔

لے لو' اور اس کو بھی میں نے طلاق نہیں سمجھا اور بیوی کو اپنے پاس رکھا، پھر ایک موقع پر غصّے میں آکر طلاق کے الفاظ دو دفعہ محض بیوی کو ڈرانے دھمکانے کے ارادے سے کہے، (شوہر کا اپنا تحریر کردہ بیان بھی آپ ملاحظہ فرمایئے)۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ لڑکی کہتی ہے کہ میرا نکاح ٹوٹ گیا ہے، میں اس شوہر کے ہاں نہیں رہ سکتی۔ لڑکا کہتا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے، کیونکہ میں نے ان الفاظ کو طلاق سمجھا ہی نہیں، اور اگر آخری الفاظ کو طلاق قرار بھی دیا جائے تو بس دو دفعہ کہا ہے، اور میں رُجوع کرچکا ہوں، اور بیوی کو اس کے بعد بھی اپنے پاس بیوی بنا کر رکھا تھا، اب بھی وہ میری بیوی ہے۔ ان دونوں نے تحریری بیان دے کر ایک عالمِ دین کو اس بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہے، جو وہ فیصلہ کریں گے دونوں مانیں گے، اس کا والد بھی کہتا ہے کہ حق واضح ہوجانے کے بعد شریعت کا فیصلہ مانوں گا، اور جو بھی فیصلہ شرعی طور پر صادر کردیا جائے میں اُسے تسلیم کروں گا۔

اس معاملے میں خصوصی اہمیت پر یہ طے کیا گیا ہے کہ دُوسرے علمائے کرام اور مفتیانِ اَحکامِ شرعی کی خدمت میں پیش کرکے اُن سے بھی استفادہ کیا جائے، اور پھر اُن فتاویٰ کی روشنی میں کوئی فیصلہ کیا جائے، لہٰذا آپ سے بھی عرض ہے کہ مندرجہ بالا صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟

۱:- کیا دو طلاقیں صرف واقع ہوئی ہیں اور مرد رُجوع کرکے بیوی کو رکھ سکتا ہے؟

۲:- یا تین طلاقیں واقع ہوئی ہیں اور حرمتِ مغلظہ ثابت ہوئی ہے؟

۳:- اگر وہ مرد قسم کھا کر کہے کہ میں نے صرف دو طلاقیں دی ہیں تو اس کے حلف کا اعتبار کرکے اس کا قول معتبر قرار دیا جائے گا یا نہیں؟

۴:- ظاہر ہے کہ گواہ تو بالکل موجود نہیں، تو اس صورت میں قضاءً و دیانۃً حکم ایک ہے یا مختلف؟

۵:- عورت اس حکم پر عمل کرے گی جو قضاءً ہے یا اس پر جو دیانۃً ہے؟ ایک مفتی اس کو کیا مسئلہ بتائے گا؟

۶:- فقہائے کرام جو عموماً "المراۃ کالقاضی" لکھتے ہیں، اس سے یہ مراد ہے کہ ایسی صورت میں قضاءً جو حکم ہوسکتا ہے عورت بھی اس حکم پر عمل کرے گی یا اس جملے کا مطلب کچھ اور ہے؟

۷:- جس عالم کو دونوں نے اس معاملے میں فیصلہ دینے کا اختیار دیا ہے، اس کی حیثیت حَکَم اور قاضی کی ہے اور وہ قضاءً فیصلہ دے گا یا اس کی حیثیت ایک مفتی کی ہے اور وہ دونوں کو وہ فیصلہ سنادے جو دیانۃً حکمِ شرعی ہے؟ اس مسئلے کے سارے پہلوؤں پر غور فرما کر کتبِ فقہ کے مفصل حوالے

دیجئے جس کی روشنی میں اُس عالمِ دین کو پوری جرأت کے ساتھ فیصلہ کرنے کا موقع ملے اور وہ عنداللہ ماخوذ نہ ہو۔

سائل:- (حضرت مولانا) سیّد سیاح الدین کاکاخیل
(مدرسہ اشاعت العلوم گھنٹہ گھر کچہری بازار فیصل آباد)

لڑکی کا بیان

میرے شوہر نے ایک دفعہ مجھے اپنے گھر میں کہا: ''جا میں نے تجھے طلاق دی''، اور اس پر میں نے اُن سے کہا: آپ یہ لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں، اور بہت سے الفاظ ہیں، اس کے علاوہ استعمال کے لئے، لہٰذا کچھ دنوں کے بعد یہ مجھ سے بولنے لگے ہیں یعنی خود میں نے اُن کو بلایا، دُوسری بار اُنہوں نے مجھے راہ والی میں کہا: ''جا تجھے میں نے طلاق دی'' صرف تمہارے والد کا انتظار کرتا ہوں، جب وہ آجائیں گے تو تم ان کے ساتھ چلی جانا، مجھے تمہاری ضرورت نہیں، اگر ابھی جانا چاہو تو ابھی چلی جاؤ، میں سیٹ بک کروادیتا ہوں، تم اکیلی جاؤ، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا، اس کے بعد جہاز میں ناراض ہوگئے اور مجھے بہت ناجائز باتیں کہہ دیں، میں نے کہا کچھ سوچ کر الفاظ نکالیں تو کہنے لگے: بکواس بند کرو، میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے، ''جا میں نے تجھے طلاق دی ایک، جا میں نے تجھے طلاق دی دو، جا میں نے تجھے طلاق دی تین'' یعنی ساتھ گنتے بھی رہے، لہٰذا میں خاموش ہوگئی یہ سوچ کر کہ گھر جاکر سب کچھ والدین سے کہہ دُوں گی، اور ساتھ یہ بھی سوچتی تھی کہ دادا کی وفات کا تازہ صدمہ اس کو پہنچا ہے اب یہ دُوسرا صدمہ کس طرح برداشت کریں گے؟ اس کے بعد راستے میں مجھے بڑی تاکید کی کہ دیکھنا جو تم نے کوئی بات اپنے والدین سے کی یعنی جو کچھ میں نے جہاز میں کہا ہے۔ میں اس کی بات سے ڈر گئی، گھر جاکر کسی سے کوئی بات نہیں کی، امی جان کو دو تین روز بعد یہ قصہ سنایا، وہ اس وقت جب یہ مجھ سے دوبارہ جھگڑنے لگے اور ساتھ ہی مجھے یہ بھی تاکید کی کہ ابا جان کو نہ بتاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا، میں نے امی جان کو تو بتادیا مگر یہ تاکید کی کہ ابا جان کو نہ بتانا کیونکہ اس کی طبیعت سخت ہے اس سے فتنہ پیدا ہوگا۔ مجھے اس وقت علم نہیں تھا کہ اس طرح طلاق دینے سے طلاق ہوجاتی ہے، میں تو یہ سمجھتی تھی کہ طلاق تو وہ ہوتی ہے جو گواہوں کے سامنے ہو اور لکھ کر دی جائے۔ پانچ ماہ گزرنے کے بعد مجھے صحیح مسئلے کا پتہ چلا تو میں نے امی جان کو کہا کہ اب وہ سارا واقعہ ابا جان کو بتادیں تاکہ وہ مفتی صاحب سے صحیح فیصلہ کرالیں، اس کے بعد رات کو خود میں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ آپ نے مجھے جہاز میں تین طلاق دی تھی، تو کہنے لگے: کیوں پوچھتی ہو؟ میں نے کہا: آپ میری بات کا جواب دیں پھر وجہ بتاؤں گی۔ لہٰذا انہوں نے کہا کہ: ''ہاں!'' یعنی تین بار طلاق دی تھی، میں نے کہا: اب میرا

آپ کے پاس رہنا ناجائز ہے، کل مفتی صاحب آپ کو صحیح فیصلہ بتادیں گے۔ جب مفتی صاحب نے پوچھا تو انہوں نے انکار کردیا، اور کہا کہ انہوں نے تو صرف دو بار کہا ہے، حالانکہ رات میں نے تصدیق کرالیا تھا، اس کے بعد میں نے اُن سے کہا کہ: آپ نے مفتی صاحب کے سامنے جھوٹ کیوں کہا؟ کہنے لگے: اب اس بات کو چھوڑ دو، لوگ تو ایسی باتیں چھپاتے ہیں اور تم ظاہر کرتی ہو۔ میں نے کہا: جہاں تک میرا تعلق ہے دُنیاوی معاملے کو تو میں چھپاسکتی ہوں لیکن یہ تو اللہ کا حکم ہے، اس کو میں کسی صورت میں نہیں چھپاؤں گی، لہٰذا آپ کو بھی اقرار کرنا ہوگا۔ مجھے میرے والدین اور بھائی بہنوں کا واسطہ دینے لگے کہ مفتی صاحب کے سامنے بھی دو بار کہو، میں نہیں مانی، تیسرے دن مجھے کہنے لگے: خدا کی قسم تجھے اُنگلی بھی نہیں لگاؤں گا، بس میرے ساتھ بولنا ہنسنا، لیکن کسی پر ظاہر نہ کرنا کہ میں نے تین بار کہا ہے۔ میں نے کہا کہ: میرا ہنسنا بولنا بھی حرام ہے، جبکہ آپ نے تین بار کہا ہے۔ پھر کہنے لگے: تم جھوٹی ہو، میں نے تمہارے سامنے اقرار نہیں کیا۔ میں نے کہا: یہ تو کچھ دن پہلے کی بات ہے، خدا سے ڈریں آخرت کو سوچ کر۔ کہنے لگے: اچھا اگر یہ بات ہے تو میں اپنے ۲ سالہ لڑکے کو لے کر چلا جاؤں گا، لیکن اس بات کا کبھی اعتراف نہیں کروں گا، تم چاہتی ہو کہ دُنیا کے سامنے ذلیل ہوجاؤں۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اُنہوں نے تین دفعہ مجھے جہاز میں کہا ہے، اب یہ جھوٹی قسم کھاتا ہے کہ میں نے دو دفعہ کہا ہے، یہ جھوٹی قسمیں بہت کھاتے ہیں۔ واللہ یشھد علی ما اکتب وھو علی کل شیء شھید۔

لڑکے کا بیان

جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ خدا کو حاضر ناظر جان کر لکھ رہا ہوں، جہاز چڑھتے وقت میری بیوی نے پردہ نہیں کیا تھا، جہاز میں بیٹھتے ہی میں نے اُسے پردے کے لئے کہا، معلوم نہیں اُس نے سنا، یا نہیں، دوبارہ میں نے پھر کہا تو اُس نے کہا: ''اچھا!'' اچھا اس طرح کہا کہ مجھے بُرا لگا، لیکن تھوڑی دیر بعد پھر میں نے تیسری بار پردے کے لئے کہا، اس نے پردہ تو کیا مگر غصّے سے اور عجیب طرح کیا، جس پر مجھے غصہ آگیا، اس وقت میں نے اُسے کہا: ''تو پھر جاؤ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' دوبارہ پھر تھوڑی دیر کے بعد میں نے دُوسری بار کہا: ''جاؤ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' اس کے بعد میں چپ ہوگیا اور دِل میں کہہ رہا تھا کہ اے اللہ جو میں نے غصّے کی حالت میں کہا ہے اس کو کہیں سچ نہ سمجھ بیٹھنا ویسے بھی دو دفعہ کہا تھا، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اگر تیسری بار کہہ دیتا تو یقیناً طلاق ہوجانی تھی، اس لئے دو دفعہ کے بعد چپ ہوگیا تھا، لیکن بعد میں کچھ اور باتیں اِدھر اُدھر غصّے میں ہوتی رہیں، لہٰذا میں قسم کھا کر کہتا ہوں میں نے دو دفعہ کہا ہے وہ بھی دِل سے نہیں کہا۔

اس واقعے سے قبل ایک دفعہ ''تو تو میں میں'' آپس میں ہوئی تھی تو اس وقت میں نے اپنی بیوی کو یہ کہا تھا کہ کیا تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہو تو مجھ سے طلاق لے لو، جاؤ طلاق لے لو، تو میں نے ویسے کہا تھا، دِل سے نہیں کہا تھا، لہٰذا اس وقت تھوڑی دیر کے بعد ہم آپس میں بالکل ٹھیک ہوگئے تھے، میں پھر عرض کرتا ہوں جہاز کے سوا کہنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور دُعا کریں، اللہ تعالیٰ ہمیں آئندہ آپس میں اتفاق سے رہنے کی توفیق دے، آمین۔

جہاز میں بھی کہے ہوئے تقریباً چھ ماہ گزر گئے ہیں، بالکل ٹھیک ٹھاک، ہنسی خوشی رہ رہے تھے، معلوم نہیں کیا بات ہوگئی جو اُس نے ایسا کہنا شروع کردیا کہ مجھے تین دفعہ کہا ہے، لیکن میں کہتا ہوں میں نے دو دفعہ کہا ہے، آپ ہی اس مسئلے کو طے کریں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں پہلا قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ شوہر نے جہاز کے واقعے سے قبل اپنی بیوی سے جو کہا کہ: ''کیا تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہو تو مجھ سے طلاق لے لو، جاؤ طلاق لے لو'' اس سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ بظاہر تو یہ جملہ عربی کے جملے: ''خذی طلاقک'' فقالت: ''أخذت'' اختلف فی اشتراط النیة، وصحح الوقوع بلا اشتراطها اھ. وظاهره أنه لا یقع حتی تقول المرأة ''أخذت'' ویکون تفویضًا وظاهر ما قدمناه عن الخانیة خلافه: وفی البزازیة معزیا الی فتاوی صدر الاسلام: والقاضی لا یحتاج الی قولها أخذت. (البحر الرائق ج:۳ ص:۲۷۰)[1]۔

علامہ شامیؒ نے بحر کی اس عبارت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:-

ومنه خذی طلاقک، فقالت: أخذت. فقد صحح الوقوع به بلا اشتراط نیّة کما فی الفتح وکذا لا یشترط قولها ''أخذت'' کما فی البحر. (شامی ج:۲ ص:۴۳۰ باب الصریح تحت قول الدر وما بمعناها من الصریح).[2]

لیکن جس سیاق میں شوہر نے مذکورہ جملہ کہا ہے، اس کے پیشِ نظر اُس میں اور عربی جملے ''خذی طلاقک'' میں فرق ہے، اور وہ فرق یہ ہے کہ اُردو محاورے میں مذکورہ جملے کے دو مطلب ہوسکتے ہیں، ایک یہ کہ ''جب تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتیں تو پھر میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق لے لو'' اور دُوسرا مطلب اُردو محاورے میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ: ''جب تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتیں تو پھر مجھ سے طلاق لے لو'' یعنی مجھ سے طلاق طلب کرلو، اُردو محاورے کے لحاظ سے مذکورہ جملے میں

---

(۱) باب الطلاق الصریح (طبع دار المعرفة بیروت) وفی طبع مکتبة سعید کراتشی ج:۳ ص:۲۵۱. وکذا فی الشامیة ج:۳ ص:۲۴۸ (طبع سعید).

(۲) ردّ المحتار ج:۳ ص ۲۴۸ (طبع سعید).

دونوں معنی کا یکساں احتمال ہے، اس کے برخلاف "خذی طلاقک" میں عربی محاورے کی رُو سے دُوسرا احتمال نہیں، بلکہ وہ پہلے معنی پر صریح ہے، اسی لئے وہاں نیت کی ضرورت نہیں۔

اب اُردو محاورے کے لحاظ سے اگر متکلم کی مراد پہلے معنی ہوں تب تو "خذی الطّلاق" کے معنی میں ہوکر اس سے طلاق واقع ہوجائے گی، لیکن اگر دُوسرے معنی مراد ہوں تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ وہ طلاق کا ایقاع نہیں بلکہ بیوی کو اپنے آپ سے طلاق طلب کرنے کا اَمر ہے، اس صورت میں فقہ کے قریب تر جزئیات یہ ہیں:-

امرأة طلبت الطّلاق من زوجها فقال لها: ''سہ طلاق بردار ورفتی'' لا یقع، ویکون ھٰذا تفویض الطّلاق الیھا، وان نویٰ یقع. (عالمگیریة ج:۱ ص:۳۸۲)۔[1]

رجل دعا امرأته الی الفراش فابت، فقال لها: اخرجی من عندی، فقالت: طلّقنی حتی اذھب، فقال الزوج: "اگر آرزوئے تو چنیں است چنیں گیر" فلم تقل شیئًا وقامت، لا تطلق، کذا فی المحیط. (عالمگیریة ج:۱ ص:۳۸۲)۔[2]

اور جب شوہر کے مذکورہ جملے میں دونوں کا احتمال ہے تو کسی ایک معنی کی تعیین میں اس کا قول معتبر ہوگا، لہٰذا وہ جو اِن الفاظ کو ''دھمکی اور مستقبل کا ارادہ'' بتلاتا ہے، اگر وہ اس پر حلف کرے کہ میرا مقصد طلاق دینا نہ تھا، بلکہ بیوی کو طلاق کے مطالبے کا حکم دینا تھا، تو اس کا قول قضاءً معتبر ہوگا، اور ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

البتہ شوہر نے جہاز کے واقعے میں جن الفاظ کے تکلم کا اقرار کیا ہے، یعنی ''تو پھر جاؤ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' اور تھوڑی دیر بعد پھر ''جاؤ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' کے الفاظ سے دو رجعی طلاقیں واقع ہوگئیں۔

لیکن اس میں پیچیدگی یہ ہے کہ شوہر جہاز کے واقعے میں صرف دو مرتبہ طلاق دینے کا اقرار کرتا ہے، اور عورت کا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے نہ صرف اس وقت تین مرتبہ طلاق دی ہے، بلکہ بعد میں تنہائی کے وقت ان تین طلاقوں کا اقرار بھی کیا ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ مفتی کے سامنے میں نے اصل واقعے کو چھپانے کے لئے صرف دو طلاقوں کا اقرار کیا ہے، اب اگر عورت کے پاس ان باتوں کے گواہ موجود ہوتے تب تو اس کے لئے اپنا دعویٰ ثابت کرنا آسان تھا، لیکن چونکہ اس کے پاس گواہ موجود نہیں ہیں اور یہ ساری باتیں تنہائی میں ہوئی ہیں، اس لئے ایسی صورت میں جب قاضی کے پاس معاملہ جائے گا تو وہ شوہر سے حلف کروائے گا، اور اگر اس نے اس بات پر حلف کرلیا کہ اس نے دو سے زیادہ

(۱، ۲) طبع رشیدیہ کوئٹہ۔

طلاقیں نہیں دیں، تو قضاءً اُس کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا، لیکن عورت نے چونکہ اپنے کانوں سے تین طلاقیں سن لی ہیں، اس لئے اس کے حق میں یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مرد کو مقاربت کا موقع دے، اور اس کی عملی تفصیل یہ ہے کہ اگر جہاز کے واقعے کے بعد (جس میں شوہر نے دو طلاقیں دینے کا اقرار کیا ہے) عدّت گزرنے تک شوہر نے زبانی یا عملی رُجوع نہیں کیا، تب تو وہ عدّت گزرتے ہی شوہر کے نکاح سے نکل گئی، اب اُس عورت کے لئے حلالہ کے بغیر اس مرد سے دوبارہ نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا، اور شوہر قضاءً بھی اُسے نکاحِ ثانی پر مجبور نہیں کرسکتا، ہاں! اگر شوہر نے جہاز کے واقعے کے بعد عدّت گزرنے سے پہلے پہلے زبانی یا عملی رُجوع کرلیا تھا تو اُس صورت میں وہ قضاءً بیوی کو اپنے پاس رہنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں عورت کو یہ چاہئے کہ اوّل تو وہ شوہر کو خدا کا خوف دِلائے اور عذابِ آخرت سے ڈرا کر اُسے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے کہ وہ غلط بیانی کرکے ساری عمر حرام کاری میں مبتلا ہونے کے بجائے یا تیسری طلاق کا اقرار کرے، یا پھر کم از کم عورت کو علیحدہ کردے، اور اگر وہ اس پر آمادہ نہ ہو تو اس کا مہر معاف کرکے یا روپیہ دے دِلا کر اس سے اپنی جان چھڑائے۔[1] اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس کے کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس کا گھر چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے یہاں رہنے لگے، اور ہر ممکن طریقے پر اس کو مقاربت سے باز رکھے، اور اگر زیادہ عرصہ اس طرح رہنا ممکن نہ ہو تو دیانۃً اس کی بھی گنجائش ہے کہ وہ عدّت کا زمانہ گزرنے کے بعد اس کی غیر موجودگی یا لاعلمی میں دُوسرا نکاح کرے، اور جب دُوسرا شوہر طلاق دیدے تو اُس کی عدّت گزار کر پہلے شوہر کے پاس جائے اور اس سے یہ کہہ کر تجدیدِ نکاح کا مطالبہ کرے کہ مجھے چونکہ نکاح میں شبہ پیش آگیا ہے اس لئے میں دوبارہ عقد کرنا چاہتی ہوں (کما فی العبارۃ الأولیٰ والثانیۃ)۔

اور اگر ان میں سے کسی بات پر عمل کرنا عورت کے لئے ممکن نہ ہو تو چونکہ عورت مجبور ہے، اور قاضی کے پاس شوہر کے حلف کرلینے کے بعد قاضی نے شوہر کے حق میں فیصلہ کردیا ہے، اس لئے اگر وہ شوہر سے کسی طرح جان چھڑانے پر قادر نہ ہو تو سارا گناہ مرد پر ہوگا، اور عورت عنداللہ معذور سمجھی جائے گی (کما فی العبارۃ الثالثۃ) بشرطیکہ اس نے جان چھڑانے کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کرلی ہوں، اور جان نہ چھڑا سکی ہو (کما فی العبارۃ الرابعۃ)، اس سلسلے میں فقہاء کی عبارات درج ذیل ہیں:-

---

(۱) آج کل عدالتوں میں جبری خلع کے غیر شرعی قانون پر عمل ہو رہا ہے، ایسے جبری خلع کے فیصلے شرعاً قابل قبول نہیں ہوتے، لیکن مذکورہ صورت میں عورت اگر عدالت سے جبری خلع کروا کر الگ ہوجائے تو یہ فیصلہ اگرچہ شرعاً نافذ نہ ہوگا، لیکن عورت کو چونکہ دیانۃً علیحدگی کا حکم ہے، اس لئے اس کی علیحدگی کو سرکاری تحفظ اس طرح حاصل ہوجائے گا، اور اس موقع پر عورت کے لئے اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، فلیتامل واللہ اعلم۔ (حاشیہ از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

۱:- البحر الرائق میں ہے:-

ولهذا قالوا لو طلقها ثلٰثا وأنكر، لها أن تتزوج بآخر وتحلل نفسها سرًّا منه اذا غاب فی سفر، فاذا رجع التمست منه تجديد النكاح لشک خالج قلبها، لا لانكار الزوج النكاح، وقد ذكر فی القنية خلافًا، فرقم للأصل بأنها ان قدرت على الهروب منه لم يسعها أن تعتد وتتزوج بآخر، لأنها فی حكم زوجية الأوّل قبل القضاء بالفرقة، ثم رمز شمس الأئمة الأوزجندی وقال: قالوا هٰذا في القضاء ولها ذٰلک ديانة، وكذٰلک ان سمعته طلقها ثلٰثا ثم جحد وحلف أنه لم يفعل وردها القاضی عليه لم يسعها المقام معه ولم يسعها أن تتزوج بغيره أيضًا، قال يعنی البديع: والحاصل أنه على جواب شمس الاسلام الأوزجندی ونجم الدين النسفی والسيّد أبی شجاع وأبی حامد والسرخسی يحل لها أن تتزوّج بزوج اخر فيما بينها وبين الله تعالٰی وعلى جواب الباقين لا يحل .... حلف بثلٰثة فظن أنه لم يحنث وعلمت الحنث وظنت أنها لو أخبرته ينكر اليمين، فاذا غاب عنها بسبب من الأسباب فلها التحلل ديانةً لا قضاء، قال عمر النسفی سألت عنها السيّد أبا الشجاع فكتب أنه يجوز، ثم سألته بعد مدة، فقال انه لا يجوز، والظاهر أنه انّما أجاب فی امرأة لا يوثق بها. (البحر الرائق ج:۴ ص:۵۷، ۵۸، فصل فيما تحلّ به المطلقة).[1]

۲:- وفی التاتارخانية.-

وسئل الشيخ الامام أبو القاسم عن امرأة سمعت من زوجها أنّه طلقها ثلٰثًا ولا تقدر أن تمنع نفسها منه هل يسعها أن تقتله؟ قال: لها أن تقتله فی الوقت الذی يريد أن يقربها ولا تقدر على منعه الا بالقتل، وهٰكذا كان فتویٰ شيخ الاسلام أبی الحسن عطاء بن حمزة والامام أبی شجاع، وكان القاضی الامام الاسبيجابی يقول: ليس لها أن تقتلهٗ وفی الملتقط وعليه الفتویٰ. (أيضًا ص:۵۸).[2]

۳:- فتاویٰ بزازیہ میں ہے:-[3]

سمعت بطلاق زوجها ايّاها ثلٰثًا ولا تقدر على منعه الّا بقتله ان علمت أنه يقربها تقتله بالدواء ولا تقتل نفسها، وذكر الأورجندی رحمه الله أنها ترفع الأمر الی القاضی، فان لم تكن لها بينة تحلفه، فان حلف فالاثم عليه .... وفی النوازل: حرمت عليه بثلٰث ويمسكها

---

(۱) طبع مكتبه رشيديه كوئٹه

(۲) التاتارخانية ج:۳ ص ۶۰۹ (طبع ادارة القرآن كراچی). وكذا فی البحر الرائق ج:۴ ص:۵۸ (طبع رشيديه كوئٹه)

(۳) فتاوی بزازیه علی هامش الهندية ج ۴ ص:۲۶۰، ۲۶۱ (طبع رشيديه كوئٹه).

يباح لها أن تتزوّج باٰخر من غير علم الزوج، ولا يطلق لها، وقال الامام صاحب النظم (التاسع في الحظر والاباحة من الطّلاق).

۴:- علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:-

والفتویٰ علٰی أنه ليس لها قتلهٗ ولا تقتل نفسها، بل تفدی نفسها بمال أو تهرب. ... وفي البزازية عن الأوزجندی أنها ترفع الأمر للقاضي، فان حلف ولا بينة لها فالاثم عليه اهـ. قلت: أی اذا لم تقدر على الفداء أو الهرب ولا علٰی منعه عنها، فلا ينافی ما قبله. (شامی ج:۲ ص:۴۳۲ باب الصّريح تحت قوله ولو صرح به ديّن فقط).[1]

مذکورہ بالا تفصیل سے جناب کے سوالات میں سے نمبرا تا نمبر۴ کا جواب ہوگیا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مرد اس بات پر حلف کرلیتا ہے کہ اس نے دو سے زیادہ طلاقیں نہیں دیں، تو قضاءً دو ہی طلاقیں واقع ہوں گی، البتہ عورت کے حق میں دیانۃً تین طلاقیں ہوچکی ہیں۔

اب باقی سوالات کا جواب درج ذیل ہے:-

۵:- عورت دیانت کے حکم پر عمل کرے گی، اور مفتی اس کو دیانت ہی کا وہ حکم بتائے گا جو اُوپر تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے، مفتی کا اصل منصب دیانت ہی کا حکم بتانا ہے، البتہ فقہائے متأخرین نے جب یہ دیکھا کہ قاضیوں میں جہالت عام ہوچکی ہے تو انہوں نے یہ حکم دیا کہ مفتی کو دیانت کے حکم کے ساتھ قضاء کا حکم بھی ضرور لکھنا چاہئے، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:-

لكن يكتب (المفتی) بعدهٗ ولا يصدق قضاءً لأن القضاء تابع للفتویٰ في زماننا لجهل القضاة، فربما ظن القاضي أنه يصدق قضاء أيضًا. (ردّ المحتار كتاب الحظر والاباحة).[2]

نیز تنقیح الحامدیہ میں ہے:-

المراد من قولهم يدين ديانة لا قضاء أنه اذا استفتیٰ فقيها يجيبه علٰی وفق ما نویٰ، ولٰكن القاضي يحكم عليه بوفق كلامه ولا يلتفت الى نيته اذا كان فيما نویٰ تخفيف عليه .... جرى العرف في زماننا أن المفتي لا يكتب للمستفتي ما يدين به بل يجيبه عنه باللسان فقط لئلا يحكم له القاضي لغلبة الجهل علٰی قضاة زماننا. (تنقيح الحامدية ج:۱ ص:۳).[3]

۶:- فقہائے کرامؒ کے مقولے "المرأة كالقاضی"[4] کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہر حال میں

---

(۱) شامية ج:۳ ص:۲۵۱ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) ج:۶ ص:۴۲۱ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) (طبع دارالمعرفة بيروت).
(۴) ردّ المحتار مطلب في قول البحر ان الصّريح يحتاج في وقوعه ديانةً الى النّية. ج:۳ ص:۲۵۱ (طبع سعيد).

اس حکم پر عمل کرے گی جو قضاءً ہوسکتا ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح قاضی کا یہ فریضہ ہے کہ وہ الفاظ کے ظاہری اور کثیر الاستعمال مفہوم پر عمل کرے، اور خلافِ ظاہر نیت کا اعتبار نہ کرے، اسی طرح عورت کا فرض بھی یہی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے الفاظ کے ظاہر کو دیکھے، اس کی خلافِ نیت پر بھروسہ نہ کرے، لہٰذا زیرِ بحث مسئلے میں "المراۃ کالقاضی" کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر قاضی نے خود اپنے کانوں سے شوہر کو تین طلاقیں دیتے ہوئے سنا ہوتا تو وہ اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرتا، اور تین طلاقیں نافذ کردیتا۔[1] اسی طرح عورت چونکہ خود بغیر کسی شک کے تین طلاقوں کے الفاظ سن چکی ہے، اس لئے اس کے لئے تین طلاقوں ہی کے حکم پر عمل کرنا لازم ہے، قاضی نے خواہ کچھ فیصلہ کیا ہو۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ "المراۃ کالقاضی" کوئی مستقل قاعدہ نہیں ہے، بلکہ فقہائے کرامؒ یہ جملہ ایسے ہی مواقع پر ذکر فرماتے ہیں جہاں شوہر اپنے الفاظ کے ظاہری مفہوم کے خلاف کسی اور معنیٰ کی نیت کا دعویٰ کرتا ہے، ایسے مواقع پر فقہاءؒ لکھتے ہیں کہ عدالتی فیصلہ اس کے ظاہری الفاظ پر ہوگا، نیت قضاءً معتبر نہ ہوگی، اور اس معاملے میں عورت کا حکم قاضی جیسا ہے کہ اگر اس نے خود وہ الفاظ سنے ہوں یا اُن الفاظ کے تکلم کا یقین ہوگیا ہو، تو وہ ظاہر پر عمل کرے گی شوہر کی نیت پر نہیں، چند عباراتِ فقہیہ ملاحظہ ہوں:-

الف:- اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو أنت طالق کہے اور یہ دعویٰ کرے کہ میرا مقصد طلاق دینا نہیں تھا، بلکہ قید سے آزاد ہونا تھا، تو اس کے بارے میں علامہ ابنِ نجیمؒ لکھتے ہیں:-

ویدیّن فی الوثاق والقید ویقع قضاء، الا أن یکون مکرھا، والمرأۃ کالقاضی اذا سمعتہ أو اخبرھا عدل لا یحل لھا تمکینہ، ھٰکذا اقتصر الشارحون وذکر فی البزازیۃ: وذکر الأوزجندی أنھا ترفع الأمر الی القاضی فان لم یکن لھا بینۃ تحلفہ، فان حلف فالاثم علیہ اھ. ولا فرق فی البائن بین الواحدۃ والثلاث. (البحر الرائق ج:۳ ص:۲۷۷ (طبع دار المعرفۃ، بیروت)[2] باب الطّلاق الصّریح تحت قولہ "وتقع واحدۃ رجعیۃ وان نوی الأکثر .... الخ).

(۱) طلاق کے معاملے میں اُصولِ حنفی مذہب کے مطابق قاضی اپنے علم وسماع کے مطابق فیصلہ کرسکتا ہے: "القاضی یقضی فی حقوق العباد بعلمہ بأن علم فی حال قضائہ فی مصرہ أن فلانا غصب مال فلان أو طلّق امرأتہ .... الخ." معین الحکام ص:۱۵۲، (مطبع حاجی عبدالغفار وپسران تاجرانِ کتب ارگر بازار قندھار افغانستان) اگرچہ فقہائے متأخرین نے قاضیوں کے فساد کی وجہ سے اس پر فتویٰ نہیں دیا۔ (شامی ج:۴ ص:۳۵۵)۔[1] (حاشیہ از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

(۱) وفی ردّ المحتار مطلبٌ فی حکم القاضی بعلمہ ج:۵ ص:۴۲۳ (طبع سعید) للقاضی العمل بعلمہ والفتوی علیٰ عدمہ فی زماننا کما نقلہ فی الأشباہ عن جامع الفصولین وقیّد بزماننا لفساد القضاۃ فیہ وأصل المذھب الجواز . ... الخ۔

(۲) وفی طبع مکتبۃ سعید کراتشی ج:۳ ص:۲۵۷. (محمد زبیر حق نواز)

ب:- یہی مسئلہ علامہ فخر الدین زیلعیؒ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:-

ولو قال لها أنت طالق ونوىٰ به الطّلاق عن وثاق لم يصدق قضاء، ويديّن فيما بينه وبين الله تعالىٰ، لأنه خلاف الظاهر، والمرأة كالقاضي، لا يحل لها أن تمكنه اذا سمعت منه ذٰلك أو شهد به شاهد عدل عندها. (زيلعي شرح كنز ج:۲ ص:۱۹۸ باب الطّلاق).[1]

علامہ شامیؒ نے بھی "المرأة كالقاضي" کا جملہ اسی مسئلے میں ذکر فرمایا ہے، (شامی ج:۲ ص:۴۳۲ باب الصریح)۔[2]

ج:- اسی طرح اگر کوئی شخص تین مرتبہ لفظ طلاق استعمال کرے اور یہ دعویٰ کرے کہ میری نیت تاکید کی تھی، نہ کہ تاسیس کی، تو اس کے بارے میں یہ مسئلہ مشہور ہے کہ دیانۃً اس کی تصدیق کی جائے گی لیکن قضاءً نہیں، اس کے بارے میں علامہ حامد آفندیؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے "المرأة كالقاضي" کا مذکورہ بالا مفہوم بالکل واضح ہوجاتا ہے:-

لا يصدق في ذٰلك قضاء، لأن القاضي مأمور باتباع الظاهر والله يتولى السرائر .... وقال في الخانية: لو قال أنت طالق، أنت طالق، أنت طالق، وقال: أردت به التكرار صدق ديانة، وفي القضاء طلقت ثلٰثًا اهـ. ومثله في الأشباه والحدادي، وزاد الزيلعي أن المرأة كالقاضي، فلا يحل لها أن تمكنه اذا سمعت منه ذٰلك أو علمت به، لأنها لا تعلم الّا الظاهر. (تنقيح الحامدية ج:۱ ص:۳۷ كتاب الطّلاق).[3]

اس سے واضح ہوگیا کہ قاضی سے عورت کی تشبیہ من کل الوجوہ نہیں، بلکہ حکم بالظاہر کے معاملے میں ہے۔

د:- اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ: "أنت عليّ كظهر أمّي" اور یہ دعویٰ کرے کہ میرا مقصد ماضی کی جھوٹی خبر دینا تھا، تو اس کے بارے میں فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

لو قال لامرأته أنت عليّ كظهر أمّي كان مظاهرا .... ولو قال أردت به الاخبار عما مضى كذبا لا يصدق في القضاء، ولا يسع المرأة ان تصدقه كما لا يسع القاضي، ويصدق فيما بينه وبين الله تعالىٰ. (عالگميرية ج:۱ ص:۵۰۷ باب الظهار).[4]

---

(۱) تبيين الحقائق ج:۳ ص:۴۱ (طبع دار الكتب العلمية، بيروت)

(۲) شامية ج:۳ ص:۲۵۱ (طبع ايج ايم سعيد).

(۳) تنقيح الحامدية ج:۱ ص:۳۶ و ۳۷ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

(۴) (طبع رشيديه كوئٹه)

ان تمام عبارتوں سے "المرأة کالقاضی" کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے کہ عورت نے اپنے شوہر سے جو الفاظ خود سنے ہوں اُن کے ظاہر پر عمل کرنا اُس پر واجب ہے، خواہ معاملہ قاضی کے پاس پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو، اور مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر قاضی نے بیّنہ کے فقدان کی بناء پر کوئی فیصلہ شوہر کے حق میں کردیا تو عورت بھی اس پر عمل کرے، خواہ اُس نے خود شوہر سے اس کے خلاف الفاظ سن رکھے ہوں، کیونکہ اگر "المرأة کالقاضی" کا مطلب یہ ہوتا تو تلفظ طلاق میں زوجین کے اختلاف کی صورت میں فقہاء یہ نہ فرماتے کہ قضاءً طلاق واقع نہیں ہوگی، لیکن عورت پر واجب ہے کہ اس سے دُور رہے اس مسئلے کی مفصل عبارتیں پیچھے گزرچکی ہیں۔

۷:- طلاق کے تنازعات میں تحکیم جائز ہے، اور اس میں حَکَم کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے، لما فی معین الحکام: **یجوز التحکیم فی الأموال والطّلاق والعتاق .... وینفذ حکم المحکّم فی سائر المجتهدات نحو الکنایات والطّلاق والعتاق وهو الصحیح، لٰکن شیوخ المذهب امتنعوا عن الفتویٰ بهٰذا لئلا یتجاسر العوام فیه.** (معین الحکام ص:۲۸ فصل نمبر۸)۔[1]

لہٰذا زوجین نے جس عالم کو حَکَم بنایا ہے وہ فیصلہ تو اس حکم کے مطابق کرے گا، جو قضاءً ثابت ہو، لیکن صورتِ مسئولہ میں اوّل تو اُسے چاہئے کہ شوہر کو خدا کا خوف دِلا کر صحیح صحیح بیان دینے پر آمادہ کرے، اور جھوٹے حلف کا گناہ، نیز مطلقۂ ثلاثہ کو اپنے پاس رکھنے کا گناہ اُسے بتادے، اس کے باوجود وہ اگر حلف کرے اور عورت کوئی بیّنہ پیش نہ کرسکے تو فیصلہ مرد کے حق میں دے، لیکن عورت کو بحیثیت مفتی دیانت کا مذکورہ بالا حکم بھی بتادے، بلکہ اگر اُسے عورت کی سچائی کا ذاتی طور پر گمان غالب ہو تو عورت کو مرد سے علیحدہ رکھنے کی جو تدبیر بھی اس کے اختیار میں ہو، اُسے نجی طور سے اختیار کرے، اور اس معاملے میں نجی طور پر عورت کی پوری مدد کرے، چنانچہ درمختار میں ہے:-

وعن الامام ان علم القاضی فی طلاق وعتاق وغصب یثبت الحیلولة علی وجه الحسبة لا القضاء.[2]

اس کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:-

قوله: "یثبت الحیلولة" أی بأن یأمر بأن یحال بین المطلق وزوجته والمعتق وأمته أو عبده والغاصب وما غصبه بأن یجعله تحت ید أمین الی أن یثبت ما علمه القاضی بوجه شرعی (قوله علی وجه الحسبة) أی الاحتساب وطلب الثواب لئلا یطأها الزوج أو السید أو الغاصب

(۱) مطبع حاجی عبدالغفار وپسران تاجرانِ کتب ارگر بازار قندهار افغانستان.
(۲) الدر المختار ج:۵ ص:۴۳۹ (طبع ایچ ایم سعید کمپنی)

(قوله لا القضاء) أي لا على طريق الحكم بالطّلاق أو العتاق أو الغصب. (رد المحتار ج:۴ ص:۳۵۵، ۳۵٦ باب كتاب القاضي الى القاضي، مطلب قضاء القاضي بعلمه)[1]۔

هٰذا ما ظهر لهٰذا العبد الضعيف
والله سبحانه وتعالىٰ اعلم
بالصواب واليه المرجع والمآب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱/۳/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۹/۲۸ ب)

الجواب صحیح
فلله دَرُّ المصيب كثّر الله تعالىٰ أمثاله
وزاده بسطةً في العلم والجسم
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح
بندہ عبدالحلیم غفرلہٗ

الجواب صحیح
العبد منیب الرحمٰن

''میں نے تجھے چھوڑ دیا'' کے الفاظ تین مرتبہ کہنے کا حکم

سوال:- میں نے چھ سات ماہ قبل اپنی بیوی سے یہ الفاظ کہے تھے کہ: ''میں نے تجھے چھوڑ دیا'' اور یہ الفاظ میں نے تقریباً دس بارہ دفعہ دُہرائے تھے، اور وجہ اس کی، ایک جھگڑا تھا جو میری بیوی اور میرے درمیان ہوا تھا، اس وقت نہ بیوی پاس موجود تھی اور نہ یہ الفاظ کہتے وقت بیوی کا نام لیا تھا، اس کے دو ماہ بعد بحکمِ والد صاحب میں نے اپنی بیوی سے ہم بستری کی، اور یہ الفاظ کہتے وقت میں نے طلاق کا نام یا لفظ بالکل نہیں کہا تھا۔

جواب:- ''میں نے اس کو چھوڑ دیا ہے'' یہ الفاظ اگر تین یا زائد مرتبہ کہہ دیئے ہیں تو آپ کی اہلیہ پر تین طلاق واقع ہوگئیں،[2] اب وہ آپ پر بغیر حلالہ کے ہرگز حلال نہیں ہوسکتیں، اس واقعے کے بعد جو ہم بستری کی گئی وہ جائز نہیں تھی، اس پر توبہ و استغفار کرنا چاہئے۔ لأن الألفاظ المذكورة صريحة في الطّلاق في عرفنا فلا تحتاج الى النيّة[3] وأما الضمير فينبغي عن تسمية المرأة اذا كان مرجعهٗ معلومًا۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲۴/۱۲/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۵۹/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

---

(۱) رد المحتار ج:۵ ص:۴۳۹ (طبع ایچ ایم سعید کمپنی)

(۲ و ۳) لفظ ''چھوڑ دیا'' سے متعلق تفصیلی حکم کے لئے اگلے ص:۳٦۵ کا فتویٰ اور اُس کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲، اور پچھلے صفحہ:۳۴۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

’’تجھے طلاق دے دیں گے‘‘ الفاظ کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ زید کی اپنی اہلیہ سے گھریلو باتوں پر تیز اور تلخ گفتگو ہوئی، بیوی نے اپنے شوہر سے کہا کہ: تم گھر سے چلے جاؤ، زید نے کہا کہ: ’’ہم چلے جائیں گے اور تجھے طلاق دے دیں گے‘‘ اور دو مرتبہ اُسے دُہرایا ہے، اس پر اہلیہ خاموش ہوگئی، پھر زید اس کے بعد طلاق وغیرہ دیئے بغیر اپنے کام میں باہر کہیں چلا گیا، اب سوال یہ ہے کہ صورتِ مذکورہ میں اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟

جواب:- اگر سائل کا بیان صحیح ہے او شوہر نے یہی الفاظ استعمال کئے ہیں کہ: ’’تجھے طلاق دے دیں گے‘‘ تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوئی،[1] وہ دونوں بدستور میاں بیوی ہیں، البتہ آئندہ طلاق کے الفاظ استعمال کرنے میں بڑی احتیاط لازم ہے، بعض صورتوں میں بیوی ہمیشہ کے لئے حرام ہوجاتی ہے، لہٰذا آئندہ کسی مستند عالمِ دین سے مشورہ لئے بغیر طلاق کا لفظ کبھی زبان سے نہ نکالیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۴/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۵۷۷ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

امداد الفتاویٰ میں دو بیویوں کو طلاق دینے کے مسئلے میں درمختار کا جزئیہ ذکر کرنے میں تسامح ہے

سوال:- امداد الفتاویٰ مبوب ج:۲ ص:۳۵۰ میں ہے کہ: خاوند نے اپنی دو بیویوں کو کہا تم کو دو طلاق ہے....الخ۔

حضرت حکیم الأمت قدس سرہٗ نے جواب لکھا کہ ہر بیوی پر دو دو طلاقیں واقع ہوگئیں، اس جواب پر کسی عالم نے تنقید کی کہ اس جواب میں تسامح ہے، صحیح یہ ہے کہ تحریر کردہ جزئیہ کے تحت ہر ایک بیوی پر ایک طلاق واقع ہوگی۔ چنانچہ یہ تنقید بھی اسی صفحے پر طبع ہوگئی ہے۔

مسئلہ بالا میں بندہ کی رائے یہ ہے کہ جوابِ اوّل صحیح ہے، لیکن اس جواب کے لئے حضرت تھانویؒ نے جو جزئیہ نقل کیا ہے وہ جزئیہ صورتِ سوال پر منطبق نہیں، کیونکہ جزئیہ میں "یسکن تطليقة أو تـطليقتان" کے الفاظ ہیں، اور صورتِ سوال میں ایسے الفاظ نہیں ہیں، الفاظِ جزئیہ ہی کو سامنے رکھ کر

---

(۱) حوالہ کے لئے ص:۳۴۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

ناقد نے تنقید کی ہے، اور ان الفاظ کے اعتبار سے یہ تنقید دُرست بھی ہے، لیکن صورتِ سوال کے لحاظ سے تنقید غلط ہے، الغرض جوابِ اوّل اور تنقید دونوں میں فی الجملہ تسامح معلوم ہوتا ہے، گو صحیح جواب اوّل ہے۔

بندہ کے نزدیک صورتِ سوال پر منطبق اور اقرب جزئیہ ذیل ہے:-

ولو قال لثلٰث نسوة له انتن طوالق ثلٰثًا أو طلقتکن ثلٰثًا یقع علٰی کل واحدة ثلٰث ولا ینقسم اھ. (ھندیة ج:۲ ص:۵۳)[1]۔

جس کی بناء پر صورتِ مسئولہ میں ہر بیوی پر دو دو طلاقیں واقع ہونی چاہئیں، آپ کی کیا رائے ہے؟

سائل:- (مولانا مفتی) عبدالستار (صاحب مدظلہم)

(جامعہ خیرالمدارس ملتان)

جواب:- مخدومِ گرامی قدر ومکرّم دامت الطافہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ باعثِ مسرّت ہوا۔

امداد الفتاویٰ[2] میں طلاق کے جس مسئلے سے متعلق آپ نے تسامح کی نشاندہی فرمائی ہے، احقر کو آپ کی رائے سے اتفاق ہے، واقعۃً عالمگیریہ کا جزئیہ یہاں قابلِ اتباع ہے، درمختار کا جزئیہ یہاں منطبق نہیں ہوتا۔ دُعاؤں کی درخواست۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی

۱۴۰۳/۳/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴/۵۴۲ ب)

لفظِ ’’چھوڑ دیا‘‘ طلاقِ صریح ہے یا کنایہ؟

(دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اور جامعہ دارالعلوم کراچی کا الگ الگ موقف)

سوال:- میں نے کہیں پڑھا تھا کہ لفظ ’’چھوڑ دیا‘‘ جبکہ کوئی شخص اپنی بیوی کو بلانیتِ طلاق بھی کہہ دے تو طلاق وقوع پذیر ہوجاتی ہے، غالبًا حضرت تھانویؒ کا دیا ہوا تھا، آپ کی کیا رائے ہے؟ مثلاً کسی شخص سے گھر کے دیگر افراد نے پوچھا کہ تمہاری بیوی کہاں ہے؟ تو اُس نے کہہ دیا کہ ’’میں نے اس کو میکے میں چھوڑ دیا ہے‘‘ اُس کا مطلب یہ تھا کہ ایک دو دن میکے ٹھہرے گی پھر واپس آجائے گی۔ مثلاً ایک گانا عموماً ریڈیو، ٹیلی ویژن پر گایا جاتا ہے جس کا مندرجہ ذیل شعر ہے:-

---

(۱) ج:۱ ص:۳۶۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ)۔

(۲) ج:۲ ص:۴۰۴ سوال نمبر ۴۹۰۔

دِل کا لگانا ہائے ہائے

دِل کا لگانا ہم نے چھوڑ دیا، چھوڑ دیا

اب اگر کوئی شخص یہ گانا سنتے وقت خود بھی گانے لگے اور بیوی موجود اور بیوی بھی گانے لگے (ایک دُوسرے کی طرف دیکھ کر) گانا گانے والے گویے کے ساتھ ساتھ گانے لگ گئے، (طلاق کا خیال تک بھی میاں بیوی میں نہ ہو) تو کیا ایسی صورت میں چھوڑ دیا لفظ کو یقیناً کنایہ نہ مانا جائے گا؟ مثلاً بیوی نے خاوند سے کہا کہ مجھے چھوڑ دو، میں فلاں جگہ ماں کے ہاں یا کہیں اور یہ کام کرنا ہے، تو خاوند نے کہہ دیا کہ ''اچھا'' یا کہہ دیا ''چھوڑ دیا'' جبکہ نیت طلاق قطعاً نہ ہو، جبکہ پنجاب میں یہ عرف نہ تسلیم کیا جاتا ہو، کیونکہ حقیقۃً کنایہ ہے کیا ان صورتوں میں آپ بھی طلاق کا فتویٰ دیتے ہیں یا کہ چونکہ اب ایسا لفظ عرفِ عام بدل لفظ طلاق بالکل نہیں ہے خاص کر خطۂ پنجاب میں تو اس سے بلانیت طلاق بالکل نہیں ہوتی ہے؟ مثلاً زوجہ نے خاوند سے جماع کے لئے اشارہ صاف طور پر کہہ دیا خاوند نے کہہ دیا ''چھوڑ دو''، غصّے سے بیوی نے کہہ دیا چھوڑو؟ (سوالاً صورت میں) تو خاوند نے کہہ دیا ''ہاں'' یا کہہ دیہ ''اچھا'' یا کہہ دیا ''چھوڑو'' تو کیا ان صورتوں میں طلاق کا ایقاع ہوتا ہے؟ مفتی محمود صاحب کے ایک شاگرد نے بتلایا کہ میرا خیال یہی ہے کہ اس لفظ کے استعمال سے بلانیت طلاق بالکل واقع نہیں ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ چونکہ ہمارے ہاں خصوصاً پنجاب میں یہ لفظ ''چھوڑ دیا'' دونوں صورتوں یعنی طلاق اور دیگر مقاصد کے لئے (جبکہ طلاق کا خیال تک نہیں ہوتا ہے) استعمال کیا جاتا ہے یعنی کنایہ ہے تو پھر بھی جبکہ کسی کی نیت بلکہ خیال طلاق تک نہ ہو تو کیا اس مذکورہ لفظ کے استعمال سے بلانیت بھی طلاق کا حکم دیتے ہیں یا کہ نہیں؟

(جواب از مفتی محمد فرید مدظلہم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک)

جواب:- واضح رہے کہ یہ لفظ ''چھوڑ دیا'' طلاق اور غیر طلاق دونوں میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے، قرائن کی وجہ سے کسی ایک کا تعین کیا جاتا ہے، بس بہ ظاہر یہ لفظ '' ترکتُھا'' کی طرح کنایات سے ہوگا، جن میں نیت کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی، نیز یہ لفظ اگر طلاق میں متعارف ہو تو طلاق بائن میں متعارف ہوگا، اہلِ عرف کے نزدیک بینونت مراد لی جاتی ہے، والصریح قد یقع بہ البائن کما فی رد المحتار ج:۲ ص:۶۳۹ [1]. والصریح لا یقع بہ الطلاق دیانۃً عند عدم النیّۃ کما فی رد

(۱) رد المحتار ج:۳ ص:۲۵۲ (طبع سعید).

المحتار ج:۲ ص:۵۹۳. نعم اذا کان هازلًا فیقع طلاقه لکونه ناویا زجرًا وللحدیث المشهور فافهم۔

محمد فرید عفی عنہ
دارالافتاء دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک ضلع پشاور
نمبر ۱۰۶۱۹

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم جامعہ دارالعلوم کراچی)

جواب:- اور اس سے زیادہ واضح مثال فارسی کے لفظ ''ہشتم'' اور ''پائے کشادہ کردم ترا'' کی ہے کہ ظاہر ہے یہ الفاظ مختلف لفظی قرائن کے ساتھ دُوسرے معنی میں بھی استعمال ہوتے تھے، اس کے باوجود فقہاء نے ان کو عرف کے غالب استعمال کی بناء پر صریح قرار دیا، چنانچہ فتاوی عالمگیریہ میں ہے: ولو قال الرجل لامرأته: ''ترا چنگ باز داشتم'' أو ''بهشتم'' أو ''یلہ کردم ترا'' أو ''پائے کشادہ کردم ترا'' فهٰذا کله تفسیر قوله ''طلقتک'' عرفًا، حتّٰی یکون رجعیًا، ویقع بدون النیّة، کذا فی الخلاصة، وکان الشیخ الامام ظهیرالدین المرغینانی رحمه الله تعالٰی یفتی فی قوله ''بهشتم'' بالوقوع بلا نیّة ویکون الواقع رجعیًا ویفتی فیما سواها باشتراط النیّة .... الخ. (عالمگیریه ص: ۳۷۹ فصل الطلاق بألفاظ الفارسیة)[1]۔

لہٰذا اگر دُوسرے قرائنِ لفظیہ کے ساتھ لفظ ''چھوڑ دیا'' غیر طلاق کے لئے مستعمل ہو تو یہ اس کے صریح ہونے کے منافی نہیں ہے، کیونکہ الفاظِ صریحہ بھی دُوسرے قرائنِ لفظیہ کی موجودگی میں غیرِ طلاق کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور اُن سے طلاق واقع نہیں ہوتی، لہٰذا اس سے ان علماء کے خلاف حجت قائم نہیں ہوتی جو لفظ ''چھوڑ دیا'' کو صریح قرار دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جو مثالیں آپ نے لکھی ہیں، اُن میں تو کسی کے نزدیک بھی طلاق واقع نہیں ہوتی، کیونکہ وہاں غیر طلاق کے معنی کے صریح قرائن موجود ہیں. لیکن جب اس قسم کے قرائن موجود نہ ہوں اور کوئی شخص بیوی کو کہے کہ ''میں نے تمہیں چھوڑ دیا'' تو راجح یہ ہے کہ اُردو محاورے میں یہ صریح لفظ ہے، تاہم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''امداد المفتین'' کے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے کہ: ''غرض اس میں علماء کا اختلاف ہے، سائل کو دیانۃً جس پر زیادہ اعتماد ہو اس کے فتوی کو اختیار کرنا چاہئے۔'' (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۲ ص:۵۰۲)[2]۔

اور یہ ساری گفتگو اُردو محاورے میں ہے، پنجاب کے عرف سے احقر کو علی وجہ البصیرۃ واقفیت نہیں ہے، اس میں پنجاب کے اہلِ فتویٰ سے رجوع کر کے عمل کرنا چاہئے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۷/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۵۶۹/ ۲۸ ب)

---

(۱) ج ۱ ص ۳۷۹ (طبع رشیدیه کوئٹه). (۲) ص:۲۱۲ (طبع دارالاشاعت کراچی)۔

﴿فصل فی الطّلاق بالکنایات﴾

(کنایاتِ طلاق کا بیان)

''جا اور شادی کرلے، میرا تیرے ساتھ کوئی واسطہ نہیں'' الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شوہر نے اپنی بیوی کو کہا کہ: ''تو جا اور شادی کرلے، میرا تیرے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے'' اس صورتِ حال میں شوہر سے پوچھا گیا کہ تو نے طلاق دی ہے، شوہر نے کہا کہ: میں نے رنج کی وجہ سے کہا ہے، سسر نے موقع پاکر ثبوتِ طلاق کرانے کی نیت سے داماد کو کہا کہ تیرے مذکورہ الفاظ سے طلاقِ بائنہ ہوچکی ہے، اب میں تم سے غیر آدمی کو ملاتا ہوں تیرا نکاح دوبارہ کرتے ہیں، یہ کہہ کر سسر ایک غیر آدمی کو گواہی کے طور طریقے سکھا سمجھا کر لایا کہ تو طلاق کے بارے میں پوچھ، غیر آدمی نے شوہر سے پوچھا کہ تو نے طلاق دی ہے؟ شوہر نے کہا: ہاں دی ہے، پھر کہا کس طرح دی ہے؟ شوہر چپ رہا، سسر نے کہا کہ: تو کہہ میں نے طلاقِ بائنہ دی ہے، پھر شوہر نے کہا کہ: میں نے طلاقِ بائنہ دی ہے۔ اب اس صورت میں مذکورہ مسئلہ اور شوہر کے اقرار کے حکمِ شرعی سے مطلع فرماویں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بیوی پر ایک طلاقِ بائن واقع ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ اگر شوہر اور بیوی دونوں باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں، اس لئے کہ ''جا اور شادی کرلے .... الخ'' الفاظ کنایہ ہیں، جو محتمل رد و جواب ہیں، **کما فی البحر ولو قال: اذھبی فتزوّجی، وقال: لم انو الطّلاق، لم یقع شیٔ لأن معناہُ تزوّجی ان امنک وحلّ لک.** (البحر الرائق ج:۳ ص:۳۲۶)[1]۔ اور صورتِ مسئولہ میں جب شوہر سے ان الفاظ کے ذریعہ طلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے نیتِ طلاق کی نفی نہیں کی، اور نہ کوئی ایسے معنی بتائے جن میں ردِّ طلاق کہا جاسکے، بلکہ یہ کہا کہ: ''میں نے رنج کی وجہ سے کہا ہے'' پھر جب اس سے کہا گیا کہ ان الفاظ کے

(۱) البحر الرّائق باب الکنایات فی الطّلاق ج:۳ ص:۳۰۲ (طبع سعید) وفی الھندیة کتاب الطّلاق الفصل الخامس فی الکنایات ج:۱ ص:۳۷۲ (طبع رشیدیه کوئٹه) ولو قال لھا إذھبی فتزوّجی تقع واحدة اذا نویٰ .... الخ.

ذریعہ طلاقِ بائن واقع ہوچکی ہے، تب بھی اس نے کوئی اور مفہوم واضح نہیں کیا، یہاں تک کہ پھر صراحۃً اقرار بالطلاق کیا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۹۰/۱۱/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۰/۲۱ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

”مجھ کو تیری ضرورت نہیں، جا چلی جا“ الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شخص کیمبلپور میں ہے اور اس کا داماد کراچی ملز میں ملازم ہے، شخصِ مذکور نے اپنی لڑکی کو داماد کے پاس پہنچادیا، چنانچہ میاں بیوی کچھ مدّت تک اتفاق وسلوک سے رہے، لیکن بعد میں ناچاقی ہوگئی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ لڑکی نے شوہر کو کہا کہ: اگر تجھ کو میری ضرورت نہیں تو مجھ کو ستانا نہیں، گھر بھیج دو۔ شوہر نے اس کو کہا کہ: ”مجھ کو تیری کوئی ضرورت نہیں، جا چلی جا“ اور سب چیزیں اس سے لے لی اور ایک برقعہ دے کر کہا کہ یہ تمہارا حق مہر ہے۔ اور مکان سے نکال کر تالا لگادیا، لڑکی اپنے والد کے گھر پہنچ گئی، لڑکی کے والد نے کچھ دنوں تک تو ناراضگی کی وجہ سے داماد کے پاس خط بھی نہیں بھیجا، کچھ دنوں کے بعد خط بھیجا کہ عزیز اپنی بیوی کو سنبھال اور اگر نہیں سنبھال سکتے یا تجھ کو ضرورت نہیں تو چھوڑ دے، کیونکہ وقت نازک ہے اور ہم غریب آدمی ہیں، اس پر داماد نے لکھا کہ: ”آپ نے جو کچھ بندہ کی عزّت کی ہے اور جو کچھ شادی کرنے سے آرام ملا ہے اور جو کچھ عزّت کی گئی ہے، یہ کافی ہے، اور اب بندہ کو ضرورت نہیں، اپنی لڑکی کو واپس لے کر بندہ کو شکریہ کا موقع دیں، کیونکہ میں اس کے سنبھالنے سے معذور ہوں۔“ اب لڑکا کہتا ہے کہ میں نے صریح طلاق نہیں دی اور طلاق سے انکار کر رہا ہے، تو کیا اس صورت میں طلاقِ بائن واقع نہیں ہوتی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں شوہر نے دو جملے استعمال کئے ہیں، ایک یہ کہ: ”مجھ کو تیری ضرورت نہیں“ اور دُوسرے ”جا چلی جا“ ان میں سے پہلے جملے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، خواہ طلاق کی نیت کی ہو، لما فی الھندیة ولو قال: لا حاجة لی فیک، ینوی الطّلاق فلیس بطلاق. (عالمگیریة نولکشور ج:۲ ص:۸۵)۔[1] البتہ دُوسرا جملہ یعنی ”جا چلی جا“ کنایاتِ طلاق میں سے

---

(۱) الفتاویٰ الھندیة الفصل الخامس فی الکنایات ج:۱ ص:۳۷۵ (طبع رشیدیہ کوئٹہ). وفی بدائع الصنائع الکنایات القسم الثالث ج:۳ ص:۱۰۷ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) ولو قال: لا حاجة لی فیک، لا یقع الطّلاق، وان نویٰ لأنّ عدم الحاجة لا یدلّ علیٰ عدم الزّوجیة فانّ الانسان قد یتزوّج بمن لا حاجة لهٗ الی تزوّجها فلم یکن ذٰلک دلیلًا علیٰ انتفاء النّکاح فلم یکن محتملًا للطّلاق .... الخ. وفی البحر الرّائق ج:۳ ص:۳۰۳ (طبع سعید) اذا قال: لا حاجة لی فیک .... فانّه لا یقع وان نویٰ .... الخ.

ہے، اور اس میں رد اور جواب دونوں کا احتمال ہے، اور حالت ہے مذاکرۂ طلاق کی، اس لئے بغیر نیت کے طلاق واقع نہیں ہوگی، لما فی العالمگیریة وفی حالة مذاکرة الطّلاق یقع الطّلاق فی سائر الأقسام قضاء الا فیما یصلح جوابًا وردًا فانه لا یجعل طلاقًا کذا فی الکافی ج:۲ ص:۸۴[1]۔
اس لئے مذکورہ صورت میں دار و مدار شوہر کی نیت پر ہے، اگر اس نے "جا چلی جا" کہتے ہوئے طلاق کی نیت کی تھی تو ایک طلاق بائن واقع ہوجائے گی، اور اگر اس نے نیت طلاق کی نہیں کی تو طلاق واقع نہیں ہوگی،[2] اور چونکہ اس معاملے میں شوہر کا قول قضاءً معتبر ہے اس لئے اس کا نیتِ طلاق سے انکار کرنا بحلف معتبر ہوگا، شوہر کو چاہئے کہ وہ یومِ آخرت کو پیشِ نظر رکھ کر صحیح صحیح بتائے کہ اس کی نیت کیا تھی؟ اگر وہ پھر بھی اس بات پر قائم رہے کہ اس کی نیت طلاق دینے کی نہیں تھی تو پھر لڑکی بدستور اس کی منکوحہ ہے، اور اب اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے یا تو اسی سے طلاق لینے یا خلع کرنے کی کوشش کی جائے، یا عدالت میں نان ونفقہ نہ دینے کی بناء پر فسخِ نکاح کا دعویٰ دائر کردیا جائے، عدالت شوہر کو بلاکر اسے نان ونفقہ دینے پر مجبور کرے، اگر وہ آمادہ نہ ہو یا حاضرِ عدالت ہونے سے انکار کرے تو عدالت نکاح فسخ کرسکتی ہے، اس کے بعد عدّت گزار کر لڑکی دُوسری جگہ نکاح کرسکے گی۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۹۱/۵/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۹۰/۲۲ ب)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

"تو میری ماں بہن ہے" الفاظ کا حکم

سوال:- مرد اپنی عورت کو ماں بہن کہے، یعنی یہ کہے کہ: "تو میری ماں بہن ہے، اگر میرے ساتھ نہیں آؤگی اپنا گاؤں چھوڑ کر نہیں آؤگی تو میری ماں اور بہن ہے۔" اتنا کہہ کر مرد چلا گیا، دو سال خرچہ بند کیا، یعنی میں باہر جارہا ہوں، اگر تم ساتھ نہیں چلتی، عورت نے کہا کہ: میں اپنا گاؤں چھوڑ کر نہیں ساتھ جاؤں گی، اس پر شوہر نے کہا: "تو میری ماں بہن ہے" اور یہ کہہ کر چلا گیا، اور میں نے شوہر کے پاس خط لکھا ہے کہ: "تو میری ماں بہن ہے" اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟

جواب:- "تو میری ماں بہن ہے" کہنے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، یہ جملہ لغو ہے، لہٰذا

---

(۱) الفتاوی الهندیة کتاب الطّلاق الفصل الخامس فی الکنایات ج:۱ ص ۳۷۵ (طبع رشیدیه کوئٹه).
(۲) دیکھئے امداد الفتاوی ج:۲ ص:۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۳ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔
(۳) فسخِ نکاح کا مفصل طریقۂ کار ص:۴۶۱ کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

صورتِ مسئولہ میں عورت بدستور اپنے شوہر کے نکاح میں ہے، اگر علیحدگی مقصود ہو تو شوہر کو صریح لفظوں میں طلاق دینی چاہئے، لما فی الدر المختار وان نوی بأنت علیّ مثل اُمّی أو کاُمّی ..... برّا أو ظهارا أو طلاقًا صحت نيّته ووقع ما نواه لأنه كناية والّا ينو شيئًا أو حذف الكاف لغا وتعين الأدنى. (شامی ج:۲ ص:۵۷۶، ۵۷۷)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۶/۲۸ ج)

''ہمارا رشتہ میاں بیوی والا ختم ہے'' کے الفاظ سے طلاق کا حکم

سوال:- ایک شخص محمد سلیمان ولد محمد اسلم نے اپنی بیوی مسماۃ عائشہ بیگم کو خط کے ذریعہ طلاق بھیجی ہے، اس عورت کو خالہ نے پالا پوسا تھا اور سلیمان باہر ملازمت پر جاتے وقت کہہ گیا تھا کہ اُسے اپنے پاس بلالوں گا، سات سال کا طویل عرصہ گزر گیا، اس دوران ایک مرتبہ پاکستان آیا اور لڑکی سے بغیر ملے چلا گیا، خط میں طلاق کے متعلق جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ حرف بحرف درج ذیل ہیں:-

''میں اپنے ہوش وحواس قائم رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاضر و ناظر کرتے ہوئے نہایت تسلی کے ساتھ آج مؤرخہ پہلی مارچ ۱۹۷۷ء بروز منگل کو تمہیں اطلاع کرتا ہوں کہ ہمارا رشتہ میاں بیوی والا ختم ہے، اور اس فیصلے کو شرعی یا قانونی طور پر جسے طلاق کہتے ہیں سمجھیں، اس کے بعد اور کوئی گنجائش، اُمید یا شک والی بات رہ ہی نہیں گئی جس سے یہ خیال کیا جاوے کہ ہمارا رشتہ میاں بیوی والا قائم ہے، میرے اس فیصلے سے اب تم اپنی مرضی سے جس طرح اپنی بہتری خیال کرتی ہو بے شک کرو، چونکہ میری طرف سے اب فارغ ہو۔''

لڑکی اپنی دادرسی کے لئے شرعی عدالت میں کن کن حقوق کے لئے دعویٰ کرسکتی ہے؟ مثلاً سات سال کا خرچہ، حق مہر اور عدّت کی مدّت کا خرچہ اس کے علاوہ وہ اور کن حقوق کا مطالبہ کرسکتی ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مسماۃ عائشہ بیگم پر طلاقِ بائن واقع ہوچکی ہے،[2] اور وہ عدّت

---

(۱) كتاب الطّلاق باب الظّهار ج:۳ ص ۴۷۰ (طبع سعید)۔ نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۴۸۰، ۴۸۲۔ عزیز الفتاویٰ ص:۴۹۳، ۴۹۴، سوال نمبر:۹۰۰، ۹۰۱۔ وامداد المفتین ص ۶۲۵۔

(۲) وفي الهندية كتاب الطّلاق الباب الثّاني في ايقاع الطّلاق الفصل الخامس في الكنايات ج:۱ ص:۳۷۶ (طبع ماجديه) ولو قال .... لم يبق بيني وبينك عمل ونوىٰ يقع كذا في العتابية. وفي الهندية أيضًا ج:۱ ص:۳۷۵ قال لم يبق بيني وبينك نكاح، يقع الطّلاق اذا نوىٰ .... الخ.

گزارنے کے بعد جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، اگر شوہر اس کے ساتھ خلوتِ صحیحہ کرچکا تھا تو اس پر پورا مہر واجب ہے[1]، اور مسماۃ عائشہ کو اس کے وصول کرنے کا بذریعہ عدالت حق حاصل ہے، نیز عدّت کے زمانے کا نفقہ بھی وہ اپنے شوہر سے وصول کرنے کا حق رکھتی ہے[2]، البتہ گزشتہ سات سال کے نفقے کا مطالبہ صورتِ مسئولہ میں نہیں ہوسکتا[3]، شوہر کو چاہئے کہ یہ نفقہ بھی ادا کردے، لیکن اگر وہ ادا نہ کرے تو بذریعۂ عدالت اُسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۵/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۴۵۴/۲۸ ب)

''اب تو مجھے نکاح پر شک ہے کہ وہ قائم ہے یا نہیں؟'' الفاظ کا حکم

سوال:- زید کی بیوی اپنے شوہر کا کہا دُنیاوی معاملات میں نہیں مانتی، ایک دن ایسے ہی واقعے کی بناء پر زید نے سخت غصّے کی حالت میں کہا کہ: ''اب تو مجھے نکاح پر شک ہے کہ وہ قائم ہے کہ نہیں؟'' زید کا مطلب اس سے یہ تھا کہ بیوی اگر شوہر کا کہا بالکل نہ مانے تو سخت گناہ کی بات ہے، بلکہ وہ محاورۃً بیوی نہیں رہی۔ زید کی بیوی کا کہنا ہے کہ چونکہ تم نے نکاح پر شک کیا ہے اس لئے دو گواہوں کے سامنے اقرار کرو کہ نکاح برقرار ہے ٹوٹا نہیں، براہِ کرم زید کی بیوی کے مطالبے کی شرعی حیثیت اور زید کے مندرجہ بالا الفاظ کی حیثیت واضح کریں کہ کیا زید کے ان الفاظ سے نکاح میں خدانخواستہ کوئی خلل واقع ہوگیا ہے، جبکہ زید کا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں، بیوی کا مطالبہ غلط ہے۔

جواب:- زید نے جو یہ الفاظ کہے ہیں کہ: ''اب تو مجھے نکاح پر شک ہے کہ وہ قائم ہے کہ نہیں'' ان الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اور نہ نکاح ٹوٹا ہے، دونوں کا نکاح بدستور قائم ہے، بیوی کو ایسا مطالبہ کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ ایسا کرنے سے مسئلے پر کچھ اثر پڑتا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۳/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۱۶/۳۲ الف)

---

(۱) وفی الهندية كتاب النكاح الباب السابع ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع ماجديه) والمهر يتأكّد بأحد معان ثلثة الدّخول والخلوة الصّحيحة وموت أحد الزّوجين سواء كان مسمّٰى أو مهر المثل حتّٰى لا يسقط منه شيء بعد ذٰلك الا بالابراء من صاحب الحق .... الخ.

(۲) وفی الهندية الفصل الثالث فی نفقة المعتدّة ج:۱ ص:۵۵۷ (طبع ماجديه) المعتدّة عن الطّلاق تستحق النفقة والسكنٰى كان الطّلاق رجعيًا أو بائنًا أو ثلثًا حاملًا كانت المرأة أو لم تكن، كذا فی فتاویٰ قاضی خان.
وكذا فی البحر الرّائق ج:۴ ص:۱۹۸ (طبع رشيديه كوئٹه).

(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۹۴ (طبع سعيد) والنفقة لا تصير دينًا الّا بالقضاء أو الرّضا أی اصطلاحهما علٰى قدر معيّن أصنافًا أو دراهم فقبل ذٰلك لا يلزمه شيء. وفی الشامية (قوله والنفقة لا تصير دينًا) أی اذا لم ينفق عليها بأن غاب عنها أو كان حاضرًا فامتنع فلا يطالب بها بل تسقط بمضی المدّة .... الخ. وكذا فی البحر الرّائق ج:۴ ص:۱۸۶ (طبع رشيديه كوئٹه).

''میری طرف سے فیصلہ ہے'' الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شخص کی دو بیویاں تھیں، پہلی بیوی کو دو دفعہ اور دُوسری بیوی کو ایک دفعہ طلاق دے کر رُجوع کر چکا تھا، پھر ایک موقع پر اس نے دونوں بیویوں کے متعلق کہا کہ: ''میری دونوں بیویاں کل تک ضرور میرے پاس آجائیں، اگر کل تک نہ آئیں تو میری طرف سے فیصلہ ہے۔'' مگر بیویاں اس کے پاس نہ گئیں، اس واقعے کی تفصیل آپ کے دارالافتاء لکھ کر بھیجی تھی، تو جناب کی طرف سے ۶/۳/۱۳۹۳ھ کو جواب موصول ہوا تھا کہ پہلی بیوی کو تینوں طلاقیں ہوچکی ہیں، اور دُوسری بیوی کو طلاقِ بائن ہوئی ہے کہ رُجوع نہیں ہوسکتا، باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہُوسکتا ہے۔ مگر دُوسری بیوی آمادہ نہ ہوئی نتیجتاً دونوں بیویاں اپنی اولاد کے پاس رہنے لگیں، اب وہ شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی ہے اور وہ الفاظ میں نے غصّے کی حالت میں کہے تھے، حالانکہ یہ بالکل واضح تھا کہ جب اس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ اس کی مراد طلاق تھی، اگر وہ شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں نے طلاق کی نیت سے یہ الفاظ نہیں کہے تھے تو اس کے اس دعویٰ کی کیا حقیقت ہے؟

جواب:- پہلے جواب میں یہ لکھ دیا گیا تھا کہ ''اگر یہ بات غصّے کی حالت میں کہی تھی تو نیت کے بغیر بھی طلاق ہوگئی۔'' اور موجودہ سوال میں شوہر خود اقرار کر رہا ہے کہ یہ بات اس نے غصّے کی حالت میں کہی تھی لہٰذا طلاق واقع ہوگئی،[1] اس کے علاوہ سوال میں (جس کا نمبر ۲۴/۳۴۸ ب ہے) یہ تصریح ہے کہ اس نے مذکورہ الفاظ کے ساتھ یہ بھی کہا کہ: ''یہ نہ سمجھنا کہ میں خالی دھمکی دے رہا ہوں، بلکہ پرسوں وکیل کے ذریعہ تحریری طلاق بھی ارسال کرؤوں گا۔'' یہ صراحۃً مذاکرۂ طلاق ہے، اور مذاکرۂ طلاق میں بھی نیت کا اعتبار نہیں ہوتا، لہٰذا طلاقِ بائن واقع ہوچکی ہے،[2] اور شوہر کے قول کا اعتبار نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۵ر رمضان ۱۳۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۰۵/۲۷ و)

(۱، ۲) ''فیصلہ دیا'' کے الفاظ کے حکم کے بارے میں دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے جاری شدہ حضرت والا دامت برکاتہم کے ایک مصدقہ فتویٰ میں درج ہے کہ: ''میں نے فیصلہ دیا'' کے الفاظ کنایہ ہیں جو کہ فارغ خطی کے ہم معنیٰ ہیں، اور فارغ خطی کے الفاظ میں امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۴۴۷ (جواب سوال نمبر ۵۳۶) میں حضرت تھانویؒ نے ایقاعِ طلاق بائن کو متعارف لکھا ہے، اور نیز یہ الفاظ کنایات کی تیسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں صرف جواب کا احتمال ہو اور اس قسم میں حالتِ غضب میں بلا نیت بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ کــذا فــی الشامیۃ ج:۳ ص:۳۰۱ (طبع سعید)۔ (فتویٰ نمبر ۴۷/۹۷۴/۴۰ ج) رجسٹر نقل فتاویٰ دارالعلوم کراچی۔

بطور گالی لفظِ ''حرام'' کہنے کی ایک مخصوص صورت کا حکم

سوال:- زید کی بیوی کی ایک سہیلی مصری تھی، وہ اپنے بچوں کو منع کرتی تو لفظِ ''حرام'' عموماً استعمال کرتی، زید کی بیوی کو بھی اس لفظ کی عادت ہوگئی، زید کی بیوی نے زید کو ایک مرتبہ کہہ دیا حرام، تو جواباً زید کی زبان سے نکل گیا: ''تو!'' زید کی نیت طلاق دینے کی قطعاً نہ تھی۔

۲:- زید نے ایک مرتبہ بطور گالی اپنی زوجہ کو ''حرام زادی'' کہنا چاہا مگر فوراً گالی کا ذہن میں آجانے سے صرف لفظِ ''حرام'' کہہ کر ہی رُک گیا، کیا مندرجہ بالا صورتوں میں طلاق ہوگی؟

جواب ا:- اگر واقعہ ایسا ہی ہے جیسے تحریر کیا گیا تو اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

۲:- اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو اس سے بھی کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، لأن المتأخرين انما أفتوا بانصراف لفظ الحرام الى الطّلاق لغلبة العُرف،[1] ولا عرف فيما ذكره السائل۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۵/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵۳/۲۸ ب)

بذریعہ مُبارات ایک طلاقِ بائن کا حکم

سوال:- شہری نقوی ولد فرزند علی نقوی نے اپنی بیوی یاسمین شیخ بنتِ عثمان شیخ کو جون ۱۹۹۳ء کو بذریعہ مُبارات طلاق دی تھی مطلقہ نے مہر معاف کیا تھا اور کفالت کے لئے عدّت کے دوران ۴۰ ہزار روپیہ طے پایا تھا، فریقین اس پر راضی تھے، دونوں نے معاہدے پر دستخط کئے تھے جو منسلک ہیں اور گواہان کے بھی دستخط ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا یہ طلاق مکمل ہے جبکہ فریقین نے ضلع کونسل کو نوٹس نہیں دیا تھا اور وکلاء کے مشورے پر خلع کونسل کو نوٹس مارچ ۱۹۹۷ء میں دیا گیا، برائے مہربانی اس پر رائے دی جائے جو برطانیہ میں عدالت میں پیش کیا جاسکے۔

جواب:- میں نے منسلک معاہدے کا مطالعہ کیا، یہ ایک مبارأۃ کا معاہدہ ہے، اور اس کی رُو سے شہری نقوی نے اپنی بیوی یاسمین شیخ کو مہر کی معافی اور دیگر شرائطِ معاہدہ کے عوض طلاق دی ہے، لہٰذا شرعاً اس معاہدے کی رُو سے یاسمین شیخ پر شہری نقوی کی طرف سے ایک طلاقِ بائن واقع ہوگئی ہے، جس کا حکم شرعاً یہ ہے کہ اب شہری نقوی کو رُجوع کرنے کا اختیار نہیں ہے، یاسمین ان کے نکاح سے

---

(۱) وفي البحر الرّائق ج:۳ ص:۳۰۰ لو قال لها أنت عليّ حرام والحرام عندهٔ طلاق وقع وان لم ينو، وذكر الامام ظهير الدين لا نقول لا تشترط النيّة ولٰكن نجعله ناويًا عرفا .... الخ. وفي الدّر المختار ج:۳ ص:۴۳۳ الىٰ ۴۳۵ قال لامرأته أنتِ عليّ حرام .... يفتىٰ بانّه طلاق بائن وان لم ينوه لغلبة العُرف. (راجع للتّفصيل الى ردّ المحتار تحت قوله لغلبة العُرف).

علیحدہ ہوچکیں، البتہ اگر دونوں باہمی رضامندی سے نئے مہر پر نکاح کرنا چاہیں تو ان کے درمیان دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے،[1] نیز جس تاریخ کو اس معاہدے پر دستخط ہوئے اور شوہر نے طلاق دی، اس[2] تاریخ سے تین ایامِ ماہواری گزر جانے کے بعد یاسمین کسی اور جگہ شرعاً نکاح کرسکتی ہیں،[3] البتہ اس کے قانونی تقاضے پورے کرنے کے لئے کسی قانون داں سے رُجوع کیا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳/۱۱/۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۷/۹)

ایک طلاقِ بائن کے بعد نکاحِ جدید کی صورت

سوال:- پشت پر مندرجہ اقرار نامے کے ذریعہ زوجین کے مابین علیحدگی کے بعد ان کے درمیان مصالحت اور یکجائی کے لئے شریعتِ اسلامیہ کیا راستہ تجویز کرتی ہے؟

۲:- اگر مصالحت کا واحد راستہ زوجین کے درمیان دوبارہ نکاح کا انعقاد ہو تو یہ فرمایا جائے کہ اس میں شرعاً کراہت کا کوئی پہلو تو نہیں ہے؟

۳:- مذکورہ اقرار نامہ سخت غیظ کے عالم میں تحریر کیا گیا، نیز زوجین سات ماہ کے لڑکے کے والدین بھی ہیں، ایسی صورت میں مصالحت کے شرعی و سماجی مصالح کیا ہیں؟

۴:- محولہ اقرارنامے کے ذریعے علیحدگی کے بعد رجعت یا نکاحِ جدید کے لئے وقت اور میعاد کی کیا شرط ہے؟

۵:- اگر دوبارہ نکاح کرنا ضروری ہو تو کیا اس کے لئے تحلیل (حلالہ) ضروری ہے یا اس کے بغیر بھی براہِ راست دُوسری بار نکاح پڑھایا جاسکتا ہے؟

۶:- اگر دوبارہ نکاح ضروری ہو تو کیا اس کے لئے اسی اہتمام، اعلان اور اسی پیمانے کی تقریب کی ضرورت ہے جیسی پہلی بار منعقد ہوئی تھی یا گھر میں نکاح پڑھایا جاسکتا ہے؟

جواب:- مندرجۂ پشت اقرار نامے کی رُو سے محمد جنید فاروقی صاحب کی بیوی صبیحہ گل اندام صاحبہ پر ایک طلاقِ بائن واقع ہوگئی ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ شوہر اب یک طرفہ طور سے رُجوع

---

(۱) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب الرّجعة فصل فيما تحلّ به المطلّقة ج:۲ ص:۳۹۹ (طبع شرکت علمیہ ملتان)
واذا كان الطّلاق بائنًا دون الثلاث فله أن يتزوّجها فی العدّة وبعد انقضائها .... الخ.
وفی الدرّ المختار ج:۳ ص:۴۰۹ (طبع سعید) وینکح مبانة بما دون الثلاث فی العدّة وبعدها بالاجماع.
وكذا فی الهندية ج:۱ ص:۴۷۲، ۴۷۳ (طبع رشیدیہ کوئٹہ)
(۲،۳) وفی الشامية ج:۳ ص:۵۲۹ (طبع سعید) ويظهر ان ابتداء العدّة من وقت وقوع الطّلاق لا من وقت الأخبار .... الخ. وفی الدّر المختار باب العدّة ج:۳ ص:۵۰۴ و ۵۰۵ وهی فی حقّ حرّة .... بعد الدّخول حقيقة أو حكمًا ثلاث حيض كوامل .... الخ.

نہیں کرسکتا، ہاں! اگر فریقین راضی ہوں تو ازسرِنو نکاح کرسکتے ہیں،(۱) اس نکاح کے لئے عدت گزرنا شرط نہیں، بلکہ جب چاہیں نکاح ہوسکتا ہے،(۲) اور صورتِ مسئولہ میں حلالہ کی ضرورت نہیں، نکاح کے لئے اُس اہتمام اور اعلان اور تقریب کی ضرورت نہیں جو پہلے نکاح میں ہوئی تھی بلکہ صرف دو مسلمان مردوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کرلیں تو نکاح منعقد ہوجائے گا،(۳) کسی عالم سے نکاح پڑھوائیں تو بہتر ہے، البتہ اس نکاح کے لئے الگ مہر مقرّر کرنا ہوگا، اور آئندہ شوہر کو صرف دو طلاقوں کا اختیار رہ جائے گا، اس کے بعد احتیاط رکھیں کیونکہ اب صرف دو طلاقوں سے بھی بیوی مغلّظہ ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر سہ بارہ نکاح بھی نہیں ہوسکے گا۔(۴)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹/۴۸ الف)

۱:- طلاقِ صریح میں رجعت کے اختیار اور بائن میں نیا نکاح ضروری ہونے کی وجہ

۲:- بیوی کو زنانی (عورت) کہنے سے کوئی طلاق نہیں ہوئی

۳:- ”بیوی کو اُس کی ماں کے گھر چھوڑ آؤ“ کہنے کا حکم

سوال:- بعض علمائے کرام کے نزدیک جب کوئی شخص اپنی زوجہ کو کہہ دے کہ میں نے تمہیں چھوڑ دیا، تو اس سے طلاقِ صریح کا وقوع پذیر ہونا مانا جاتا ہے، یعنی طلاقِ صریح سے طلاقِ رجعی مراد ہوتی ہے اور نکاح کی ضرورت نہیں ہوتی، اب اگر کوئی اپنی زوجہ کو یہ کہہ دے کہ: ”تو مجھ پر حرام ہے“ تو اس سے طلاقِ صریح کیوں واقع نہیں ہوتی بلکہ بائن واقع ہوتی ہے جس میں نکاح کی ضرورت پڑتی ہے، ایسا کیوں ہے؟ اس میں فرق کیا ہے؟

۲:- بیوی نے مجھے کسی بات پر ٹوکا تو میں نے کہا کہ: زنانیوں (عورتوں) کی عادت ہوتی ہے، اور میں نے شک دُور کرنے کے لئے اُس سے کہہ دیا کہ تو بھی تو میری زنانی (بیوی) ہے، شک یہ دُور کرنا ہے کہ میں نے ”بیوی“ کیوں نہ کہا؟ ”زنانی“ کیوں کہا؟ غالباً نعوذ باللہ یہ مطلب نہ لیا جائے کہ اُسے میں اپنی بیوی نہیں سمجھتا، بہرکیف جب میں نے اُسے کہا کہ تو بھی تو میری زنانی (بیوی) ہے

(۱، ۲) دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر۱۔

(۳) وفی الدّر المختار کتاب النّکاح ج:۳ ص:۹ (طبع سعید) وینعقد بایجاب من أحدهما وقبول من الأخر.
وفیه أیضا ج:۳ ص:۲۱ وشرط حضور شاهدین حرّین أو حرّ وحرّتین مکلّفین سامعین قولهما معًا.

(۴) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳۔

پھینی پھینی، پنجابی زبان میں چپٹے ناک والی کو کہتے ہیں، کیا صورتِ مذکورہ میں نکاح پر تو کوئی اثر نہیں پڑا؟ طلاق کی نیت نہیں تھی۔

۳:- آج سے تقریباً ۴½ سال قبل جب میں نے نئی نئی شادی کی تھی تو بیوی کو کسی بات پر غصہ آ گیا تھا، والدہ اور دیگر رشتہ دار عورتوں کے سامنے میں نے والدہ کو اپنی زوجہ کے سامنے (زوجہ کو سنانے کے لئے) یہ مندرجہ ذیل لفظ پنجابی زبان میں کہہ دیا تھا جس کا اُردو ترجمہ یہ ہے: ''اس کو (بیوی کو) اس کی ماں کے گھر چھوڑ آؤ'' یا یہ کہا تھا: ''چھوڑ آؤ اس کو اس کی ماں کے گھر'' معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا اس فقرۂ مذکورہ سے طلاق پڑتی ہے یا نہیں؟ میں نے یہ رُعب ڈالنے اور دھمکانے کے لئے کہا تھا۔

جواب ۱:- اس فرق کو سمجھنے کے لئے فقہ پڑھنے کی ضرورت ہے، لہٰذا یا تو آپ فقہ کی تعلیم حاصل فرمائیں یا پھر اہلِ علم سے مسئلہ پوچھ کر اس پر عمل فرمائیں اور دلائل کے پیچھے نہ پڑیں۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوئی، کچھ شک اور تردّد میں نہ پڑیں۔

۳:- اگر آپ کی نیت ان الفاظ سے طلاق کی نہیں تھی تو ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوئی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۹/۲۸ ب)

''یہ ہیں تمہارے لے لو'' الفاظ طلاق کی نیت سے بولے جائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- محمد صالح اور اُس کی بیوی کے درمیان ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا، اس جھگڑے کے دوران ایک دن محمد صالح نے غصّے میں اپنا ہاتھ اپنی جیب کے قریب لاکر سامنے بیٹھی ہوئی اپنی بیوی سے کہا کہ: ''یہ ہیں تمہارے لے لو'' (جیب سے کچھ نہیں نکالا)، دُوسری بار پھر یہی الفاظ دُہرائے تھے کہ فوراً اُس کی بیوی وہاں سے اُٹھ گئی اور باہر جاکر رونے لگی۔ بعد میں محمد صالح سے مذکورہ بات کہنے کا مقصد پوچھا گیا کہ کیا مقصد تھا؟ تو اس نے کہا کہ میرا مقصد اپنی بیوی کو طلاق دینا تھا، شرعاً طلاق ہوئی یا نہیں؟

جواب:- اس کا صریح جزئیہ تو نہیں ملا، لیکن قواعد اور مماثل جزئیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، اس لئے کہ ''یہ ہیں تمہارے لے لو'' میں طلاق کا نہ کوئی صریح لفظ ہے نہ کنایہ اور نہ مقتضا اور مقدّر، اور ایسی صورت میں نیت کے باوجود طلاق واقع نہیں ہوتی۔ علامہ شامیؒ، علامہ رملیؒ سے نقل کرتے ہیں: وبه يعلم جواب ما يقع من الأتراك من رمي ثلاث حصوات قائلاً: أنت هكذا ولا ينطق بلفظ الطّلاق، وهو عدم الوقوع تأمل. (منحة الخالق

حاشیہ البحر الرائق ج:۳ ص:۳۰۹، باب الصریح تحت قولہ "انت طالق ھکذا")[۱]۔ اور عالمگیریہ میں ہے: ولو قال لھا بعد ما طلبت منہ الطّلاق: ''گفتہ گیر'' لا یقع وان نویٰ، کذا فی الخلاصۃ. (عالمگیریۃ ج:۱ ص:۳۸۰)[۲]۔

تاہم چونکہ صریح جزئیہ نہیں ملا، اس لئے اگر دُوسرے علماء سے بھی رُجوع کر کے معلوم کرلیا جائے تو بہتر ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵٦۸/۲۸ ب)

''بیوی کو اپنے اُوپر حرام کرتا ہوں'' الفاظ سے طلاق بائن کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مندرجہ ذیل الفاظ طلاق کے لئے استعمال کئے: ''میں اپنی بیوی مسمات فلاں کو اپنے اُوپر حرام کرتا ہوں'' ان الفاظ سے کون سی قسم کی طلاق واقع ہوگی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ایک طلاقِ بائن واقع ہوگئی ہے،[۳] بغیر ازسرِ نو نکاح کے زوجین میں تعلقاتِ زوجیت قائم نہیں ہوسکتے۔

واللہ اعلم بالصواب

۱۳۸۷/۱۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۸۷/۱۸ الف)

''البائن لا یلحق البائن'' میں دُوسرے بائن سے مراد وہ ہے جو اصل وضع میں بائن ہو اگرچہ عرف کی وجہ سے صریح بن گیا ہو

سوال:- بخدمت شیخی واُستاذی مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ نے حضرتِ والا کی خدمت میں ایک فقہی سوال لکھا تھا، حضرتِ والا نے اس کا جواب یوں تحریر فرمایا:-

اس کے لئے مراجعت کرنی ہوگی، اور وقت بھی درکار ہے، لہٰذا اگر یہ سوال الگ ارسال فرمادیں تو اس کی مستقل تحقیق کرلی جائے۔

حضرتِ والا کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بندہ الگ سے اس سوال کو دوبارہ مزید منقح کر کے

---

(۱) ج:۳ ص:۲۸۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

(۲) (طبع مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ).

(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۳۳۳ الی ۳۳۵ (طبع سعید) قال لامرأتہ انتِ علیّ حرام ...... یفتیٰ بانّہ طلاق بائن وان لم ینوہ لغلبۃ العُرف، وکذا فی البحر الرّائق ج:۳ ص:۳۰۰. نیز دیکھئے امداد المفتین ص:۲٦٦۔

لکھ رہا ہے۔

سوال:- وہ طلاقِ بائن جو عرف کی وجہ سے صریح بن گئی ہے، اس سے بلانیت کے بھی طلاق ہوجاتی ہے (مثلاً: تو مجھ پر حرام ہے، تو آزاد ہے، وغیرہ)، کیا وہ طلاق سابق (خواہ وہ صریح ہو یا کنایہ) سے عدّت کے دوران لاحق ہوجائے گی یا نہیں؟

رد المحتار ج:۳ ص:۳۰۶[1] کی درج ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ لاحق نہیں ہوگی:

"قال ح: ولا یرد انت علی حرام علی المفتی به من عدم توقفه علی النیة مع انه لا یلحق البائن، ولا یلحقه البائن لکونه بائنا لما أن عدم توقفه علی النیة امر عرض له لا بحسب اصل وضعه اهـ"۔

اسی عبارت کے مطابق امداد المفتین ص:۶۲۶ میں عدمِ لحوق کا فتویٰ مذکور ہے۔ مگر ردالمحتار ج:۳ ص:۳۰۸[2] کی درج ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے لاحق ہونی چاہئے: **"(قوله لا یلحق البائن البائن) المراد بالبائن الذی لا یلحق هو ما کان بلفظ الکنایة لأنه هو الذی لیس ظاهرًا فی انشاء الطلاق کذا فی الفتح"۔**

اس عبارت میں طلاق بائن بالکنایۃ (ثانی) کے عدم لحوق کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ انشاء طلاق میں ظاہر نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طلاق انشاء طلاق میں ظاہر ہو اس کو لاحق ہونا چاہئے، اور طلاق بائن صریح (مثلاً: تو مجھ پر حرام ہے، تو آزاد ہے، وغیرہ) تو انشاء طلاق میں ظاہر ہے، لہٰذا اس کو بھی طلاق سابق سے لاحق ہونا چاہئے۔

احسن الفتاویٰ ج:۵ ص:۱۸۳[3] میں اسی کے مطابق لحوق کا فتویٰ مذکور ہے۔

اس بارے میں صحیح بات کیا ہے؟

سائل:- مولانا محمد عامر صاحب
دار الافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی

جواب:- مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ردّ المحتار میں لحوق کی بحث تفصیل سے پڑھی جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صورتِ مسئولہ میں طلاقِ ثانی لاحق نہیں ہوگی، جیسا کہ امداد المفتین میں مذکور ہے، اور اس میں جو حوالہ دیا ہے وہ بھی اس پر صریح ہے، علامہ شامیؒ کی جس عبارت سے آپ کو اِشکال ہوا ہے، یعنی: **"لأنه هو الذی لیس ظاهرًا فی انشاء الطّلاق"** اس کا مطلب ہے **"لیس ظاهرًا باعتبار أصله"** چنانچہ خود انہوں نے اگلے صفحے پر **"قوله: أو أبنتک بتطلیقة"** کے تحت اس کی تقریباً صراحت کردی ہے، فرماتے ہیں:-

---

(۱ تا ۳) طبع ایچ ایم سعید کمپنی.

واشار بـه الـى أنه لا يشترط اتحاد اللفظين، فشمل ما اذا كان الأول بلفظ الـكـنـاية البـائـنـة ..... بعد كون الثاني بلفظ الكناية البائنة كالخلع ونحوه مما يتوقف على النية، ولو باعتبار الأصل، كانت حرام.[1]

صورتِ مسئولہ میں عدمِ لحوق پر مندرجہ ذیل دلائل مزید ہیں:-

۱:- بائن کے بائن کو لاحق نہ ہونے کی علت تمام کتبِ فقہ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ ثانی کو اخبارعن الاول قرار دینا ممکن ہوتا ہے، اسی لئے درمختار میں فرمایا: "اذا امکن جعله اخبارا عن الأول"[2] اور "أنت حرام" میں ایسا ہی ہے۔

۲:- کافی حاکمؒ سے علامہ شامیؒ نقل فرماتے ہیں: "واذا طلـقهـا تطليقة بائنة ثم قال لها فی عـدتهـا: انـت عـلـیّ حرام .... وهو يريد به الطّلاق لم يقع عليها شیء، لأنه صادق فی قوله هی علیّ حرام" اھ۔[3] علامہ شامیؒ اس پر لکھتے ہیں: "ای لأنه يمكن جعل الثانی خبرًا عن الأول" یہاں علت وقوعِ طلاق کے موقوف علی النیۃ ہونے کو قرار نہیں دیا، بلکہ اس بات کو علت قرار دیا ہے کہ ثانی کو اخبارعن الاول بنانا ممکن ہے، اور عرف سے توقف علی النیۃ ختم ہوا ہے، احتمال الاخبار ختم نہیں ہوا۔

۳:- علامہ شامیؒ نے نہایت مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے کہ البـائـن يـلـحق الصّريح میں صریح سے مراد صریحِ رجعی ہے، صریحِ بائن نہیں، لہٰذا صریحِ بائن کو بائن لاحق نہیں ہوتی، اور "انـت علیّ حـرام" صریح ہونے کے باوجود بائن ہے، شامی میں یہ پوری بحث غور سے پڑھنے پر اُمید ہے کہ آپ کو کوئی اِشکال نہیں رہے گا۔

احسن الفتاویٰ ج:۵ ص:۱۸۳ میں لحوق کے مسئلے سے بحث نہیں فرمائی گئی صرف حرام کے صریح ہونے کا ذکر ہے، البتہ قوسین میں لکھا ہے کہ: ''اس پر اِشکال و جواب تتمہ میں ہے'' یہ تتمہ مجھے نہیں ملا، لیکن رد المحتار کی پوری بحث پڑھنے کے بعد کم از کم بندے کو کوئی اِشکال نہیں کہ یہ طلاق لاحق نہیں ہوگی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی
۶رشوال ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۶/۱)

---

(۱) ج:۳ ص:۳۱۰ رد المحتار (طبع ایچ ایم سعید کمپنی)۔
(۲) الدر المختار ج:۳ ص:۳۰۹ (طبع أيضًا)۔
(۳) رد المحتار ج:۳ ص:۳۰۸ (طبع أيضا)۔

﴿فصل فی الطّلاق بالکتابة﴾

(تحریری طلاق دینے کا بیان)

خود طلاق نامہ لکھنے، یا کسی سے لکھوانے کے بعد دستخط کرنے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے

سوال:- ان السیّد المرحوم رفیع الرحمٰن قد طلّق زوجته نجمة بنت منظور بوثیقة الطّلاق المرفقة باللّغة الانکلیزیة مع ترجمتها العربیة، وانه قد کتب هذه الوثیقة للثامن والعشرین من شهر ابریل سنة ۱۹۸۰م، وتزوج السیّد رفیع الرحمٰن زوجةً أخریٰ، وله من کل واحد من الزوجتین أولاد، وقد توفی قریبًا، فالمرجو افادتنا، هل طلقت نجمة بنت منظور بالوثیقة المرفقة؟ وهل ترث الأن من السیّد رفیع الرحمٰن أم لا ترث؟ بیّنوا وتؤجروا.

جواب:- ان کان السیّد المرحوم رفیع الرحمٰن کتب هذه الوثیقة[1] بنفسه أو استکتبها من غیره ووقّع علیها، فان نجمة بنت منظور وقع علیها الطّلاق منه[2] وخرجت من نکاحها وجاز لها أن تتزوّج غیره بعد انقضاء العدّة. وبما أنّ رفیع الرحمٰن توفّی قریبًا، فی حین أن وثیقة الطّلاق کتبت قبل أکثر من عشر سنوات، فالظّاهر أن نجمة قد أکملت عدّتها، وهی ثلٰث حِیَض، وبما أنها لم تکن زوجته وقت وفاة رفیع الرحمٰن، فانها لا ترث منه شیئًا، أما الأولاد، فانهم یرثون من کلّهم، سواء کانوا من بطن نجمة أو من بطن زوجته الثانیة.

واللہ سبحانه وتعالیٰ أعلم

محمد تقی العثمانی

دار الافتاء، دار العلوم کراتشی ۱٤

غرة ذی الحجة سنة ۱٤۱٤هـ

---

(۱) یہ وثیقہ (طلاق نامہ) اس جواب کے بعد آرہا ہے۔

(۲) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۴۶ (طبع سعید) کتب الطّلاق ان مستبینًا علی نحو لوح وقع ان نوی وقیل مطلقًا. وفی ردّ المحتار "مطلب فی الطّلاق بالکتابة" ان أرسل الطّلاق بأن کتب: امّا بعد! فانتِ طالق. فکما کتب هذا یقع الطّلاق. وبعد أسطر.... ولو قال للکاتب اکتب طلاق امراتی کان اقرارًا بالطّلاق وان لم یکتب ولو استکتب من اٰخر کتابا بطلاقها وقراه علی الزّوج فاخذهٔ الزّوج وختمه وعنونه وبعث به الیها فأتاه وقع .... الخ. وکذا فی الفتاویٰ الهندیة کتاب الطّلاق الباب الثانی فی ایقاع الطّلاق الفصل السادس فی الطلاق بالکتابة ج:۱ ص:۳۷۹.

وثیقة طلاق

انــی سیّــد رفیــع الـرحمٰن بن سیّد سعید الرحمٰن المسلم، البالغ، العمر حوالی ٤٠ سنة، المهنة خدمة خاصة، الساکن ب - ۱۸۰ بلوک - ۱۱، منطقة فیدرل بی، کراتشی، اقرر تحریرا باننی قد اطلق زوجتی نجمة بنت منظور علی المسلمة، البالغة، عمرها حوالی ۳۵ سنة القاطنة فی ۱/۱۵ دهرم بورة، لاهور (باکستان) بناء علی ما یلی:-

۱:- بأن منذ مدة ۸ سنوات ماضیة خلال مدة زواجها معی انها کانت متمردة ومنازعة معی.

۲:- بأنها تسئی التّصرف والسلوک وتتعسف لی.

۳:- وبالعموم لکل الوقت خلال اسکانها فی البیت انها یبدعت قذع وتعارض علی اساس نجمة.

وبنتیجة هٰذا غیر ممکن لی بالرغم عن جهدی المخلص السکن معها بین حدود اللہ.

اننی لذٰلک الفظ طلاق لها.

۱:- انـی سیّد رفیـع الرحمٰن بن سیّد سعید الرحمٰن اطلق لکم نجمة عالیة بنت منظور علی.

۲:- ــــــــ کالمذکور ــــــــ

۳:- ــــــــ کالمذکور ــــــــ

سیّد رفیـع الـرحمٰن بـن سیّـد سعید الرحمٰن. الساکن ب - ۱۸۰ بلوک - ۱۱، منطقة فیدرل بی، کراتشی.

توقیع الشاهد — توقیع:

سیّد محمد الحق — ۱۹۸۰/٤/۲۸م

سعود اباد کراتشی

تین طلاق لکھ کر دینے سے بھی تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں

سوال:- فیاض علی کا نکاح مسماۃ نسیم اختر کے ساتھ ۱۴ر نومبر ۱۹۶۰ء کو ہوا، بعد نکاح نہ لڑکی سسرال گئی اور نہ لڑکے نے آکر سسرال میں قرابت کی، اس وجہ سے کہ لڑکی کے والدین نے یہ شرط رُخصتی کے لئے عائد کی تھی کہ جب تک لڑکا بی. ایس. سی کرے گا جب لڑکی کی رُخصتی ہوگی، اور یہ شرط لڑکے نے منظور کرلی تھی، لیکن کچھ عرصہ بعد فریقین میں نزاع پیدا ہوگیا، اور لڑکی کے والدین نے طلاق طلب کی اور لڑکے نے تحریری تین طلاق دے دی، اب کیا اس لڑکی کا نکاح اس لڑکے کے ساتھ ہوسکتا ہے؟

جواب:- طلاق نامہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ لڑکے نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں، لہٰذا اب وہ لڑکے کے لئے قطعی طور پر حرام ہوچکی ہے، اب اس کے ساتھ حلالہ کے بغیر نکاحِ ثانی بھی

نہیں ہوسکتا۔ (۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۷/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۷۹۵/ ۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

تحریر سے بھی طلاق ہوجاتی ہے اور طلاق کے لئے گواہ ضروری نہیں

سوال:- عرض یہ ہے کہ میری ہمشیرہ نجمہ اعوان بنتِ غلام ربانی اعوان کی شادی ایک صاحب بنام ڈاکٹر ہارون ایم قاضی ولد قاضی محمد اسحاق سے مؤرخہ ۳۰؍جون ۱۹۸۶ء کو قرار پائی، یعنی نکاح ہوا، اور پھر ۲؍جولائی کو رُخصتی ہوئی، شادی کے دُوسرے ہی روز سے موصوف نے اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ گالی گلوچ اور میری مرحومہ والدہ کو گالیاں دینا شروع کردیں، ساتھ میرے بوڑھے والد صاحب کے بارے میں بھی یہی رویہ اختیار کیا، شادی کے چند روز کے بعد ہی دونوں میاں بیوی امریکہ روانہ ہوگئے، کیونکہ میرا بہنوئی امریکہ میں سرجن کی حیثیت سے پچھلے بیس سال سے وہاں آباد ہے۔ امریکہ پہنچنے کے پندرہویں روز میرے بہنوئی نے اپنی بیوی (میری ہمشیرہ کو) مارنا پیٹنا شروع کردیا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کی گالی گلوچ اور مار پیٹ میں شدّت آتی گئی، اور ایسے واقعات اکثر پیش آتے رہے، جب اس طرح ایک سال گزر گیا اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے آپ کو تبدیل نہ کیا تو آخرکار میری ہمشیرہ نے تنگ آکر طلاق کا مطالبہ کیا، انہوں نے طلاق نہ دی، دونوں کے کراچی آنے پر ان کے بڑوں نے اور ہم نے دونوں کو سمجھایا، جب ڈاکٹر صاحب سے پوچھا گیا کہ انہیں بیوی سے کیا شکایات ہیں تو انہوں نے کہا کہ: ''مجھے یاد نہیں کہ یہ کیا کہتی ہے یا کرتی ہے؟'' الغرض ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں مار پیٹ اور گالی گلوچ کی عادت ہے اور شکایت کچھ نہیں۔ ہم نے خدا کی ذات پر بھروسہ کرکے ان کی بیوی کو امریکہ اس اُمید پر روانہ کردیا کہ خدائے پاک کی ذات رحیمی اپنے فضل سے ڈاکٹر صاحب کو ایک محبت کرنے والا شوہر بنادے اور حالات بہتر ہوجائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے وعدہ بھی کیا کہ اب وہ مار پیٹ سے گریز کریں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا، تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے یہ حرکات دوبارہ شروع کردیں، بہت مار پیٹ کی، ننگی گالیاں میرے والد اور مرحومہ والدہ کو دیں، جب یہ سب کچھ برداشت نہ ہوا، تو میری بہن نے طلاق کا مطالبہ کیا، ہر دفعہ کی طرح انہوں نے اس بار بھی انکار کیا، اس کے بعد بھی گالی گلوچ کا سلسلہ تقریباً ہر روز ہونے لگا اور وقتاً فوقتاً ہاتھ گھمانا ان کا مشغلہ بنتا چلا گیا، آخر میری ہمشیرہ نے ایک دن جب انہوں نے ہمیشہ کی طرح بے وجہ بے گناہ مارا پیٹا اور گالیاں دیں تو ان سے

(۱) حوالہ کے لئے ص:۳۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

مطالبہ کیا کہ وہ ہر حال میں طلاق دے دیں، اس کے بعد انہوں نے اُٹھ کر ایک پرچے میں انگریزی میں تحریر کر دیا کہ: ''میں نجمہ کو تین طلاق دیتا ہوں۔'' اور نیچے اپنے نام کے دستخط کر دیئے، مگر طلاق دیتا ہوں کے الفاظ منہ سے ادا نہ کئے۔

اس واقعے کے بعد میری ہمشیرہ کچھ عرصہ تو وہیں رہیں، مگر تھوڑے عرصے کے بعد انہوں نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ تم کراچی واپس چلی جاؤ، انہوں نے مجھے ایک خط بھی امریکہ سے بھیجا جس میں یہ تحریر کیا کہ نجمہ کو واپس کراچی بلالو، میں اُسے گھر لے دُوں گا، خرچہ وغیرہ اس کا اور بچوں کا بھیجتا رہوں گا، اس طرح شادی ٹوٹنے سے بچ جائے گی۔ ابھی ہم اس بات پر غور کر ہی رہے تھے کہ انہوں نے نجمہ کو زبردستی ٹکٹ وغیرہ دِلا کر کراچی روانہ کر دیا، اور بہت سے وعدے کئے، واپسی پروگرام بتایا جیسے وہ خوشی خوشی روانہ کر رہے ہوں۔ کل مؤرخہ ۱۹؍اگست ۱۹۸۸ء کو ہمیں ایک خط موصول ہوا جس میں انہوں نے حالات تحریر کرنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ چونکہ میں پہلے نجمہ کو ''طلاق مقرتین'' جس کا مطلب وہ کہتے ہیں کہ ''دو طلاقیں'' دے چکا ہوں اس لئے اب میں تیسری طلاق بھیج رہا ہوں، اور ہمارا اب ایک دُوسرے سے واسطہ نہیں رہا۔

اب سوال یہ ہے کہ تینوں طلاقیں ڈاکٹر ہارون نے تحریر تو کر دیں مگر زبان سے ادا نہیں کی ہیں، اور اس کی بیوی حاملہ بھی ہے، طلاق واقع ہوگئی ہے؟ اگر طلاق ہوگئی ہے تو تین ماہ کے اندر دوبارہ صلح ہوسکتی ہے؟ شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔ کیا وقوعِ طلاق کے لئے طلاق دیتے وقت گواہوں کا ہونا ضروری نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی ہمشیرہ نجمہ اعوان پر تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں، طلاق کے لئے زبان سے کہنا ضروری نہیں، تحریر سے بھی طلاق ہوجاتی ہے[۱]، اور اس کے لئے گواہوں کی موجودگی بھی شرط نہیں، تیسری طلاق کے بعد اب وہ کسی صورت میں اپنے شوہر کے لئے حلال نہیں ہیں، اور اب مصالحت کر کے ایک ساتھ رہنا بھی شرعاً جائز نہیں ہے[۲]، آپ کی ہمشیرہ چونکہ حمل سے ہیں، اس لئے ان کی عدّت بچے کی پیدائش پر پوری ہوگی[۳]، بچے کی پیدائش کے بعد وہ جہاں چاہیں نکاح کرسکتی ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۹/۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰/۵ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۲۴۶ (طبع سعید) کتب الطّلاق ان مستبیناً علٰی نحو لوح وقع ان نویٰ وقیل مطلقًا.

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳۔

(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر۲۔

طلاق نامہ لکھنے کے بعد طلاق نامے سے انکار کرنے یا الفاظِ طلاق لکھتے وقت سر چکرانے کا دعویٰ کرنے کی ایک مخصوص صورت

خلاصۂ سوال:- مسمّٰی جلال الدین نے بغرضِ خودکشی خواب آور گولیاں کھالیں، اور اس پر بے ہوشی طاری ہوئی، ڈاکٹر کو بلایا گیا، تفتیش کرنے سے اس کی جیب سے ایک رقعہ برآمد ہوا جس میں وصیت لکھی ہوئی تھی، وصیت نامے کے آخر میں اپنی بیوی کو یہ الفاظِ طلاق لکھے تھے: ''طلاق، طلاق، طلاق دی، طلاق، طلاق، طلاق دی، اور خود بھی خودکشی کر رہا ہوں، پرچہ میں نے ہوش و حواس میں لکھا ہے، کسی دُوسرے کا ہاتھ اس میں نہیں ہے۔'' آخر میں تاریخ اور اپنا نام درج کر دیا ہے۔ علاج معالجے کے بعد جلال الدین صحت یاب ہوگیا ہے، اور اب کبھی کہتا ہے کہ میں نے الفاظ طلاق نہیں لکھے اور کبھی اقرار کرتا ہے، ایک دُوسری جگہ سے فتویٰ منگوایا گیا ہے اس میں طلاقِ مغلّظ کا لکھا ہے، اب عرض یہ ہے کہ جلال الدین کبھی تو پورے پرچے کا انکار کرتا ہے اور الفاظِ طلاق کا انکار کرتا ہے اور کبھی تمام باتوں کا اقرار کرتا ہے اور کبھی کہتا ہے کہ اور پرچہ تو ہوش و حواس میں لکھا ہے مگر لفظ طلاق اس وقت لکھا ہے جب میں بے ہوش ہو رہا تھا، اور میرے سر میں چکر تھا۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ ایک مرتبہ جلال الدین اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ طلاق کے الفاظ اُس نے لکھے ہیں اس لئے اس کی بیوی پر طلاقِ مغلّظ واقع ہوگئی،[۱] حلالہ کے بغیر وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوسکتی، سر چکرانے کی جو حالت جلال الدین بیان کرتا ہے اس کی وجہ سے مسئلے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، **لأنه لا يصدق عليه حد السكران على مذهب ابي حنيفةؒ حتّى لا يعرف الأرض من السماء ولا على مذهب الجمهور حتّى يهذى ويخلط كلامهٗ،**[۲] **ولو صدق عليه السكران فان لي شبهة في وقوع الطلاق فانه ينبغي أن لا يقع طلاق السكران بالكتابة كما لا يقع طلاق المكره على ما صرحوا به،**[۳] **لا سيما اذا كانت الكتابة غير مرسومة فانّ وقوع الطّلاق بها يحتاج الى النيّة عند البعض،**[۴] **وعلّل صاحب البحر عدم وقوع طلاق المكره بالكتابة**

---

(۱) وفي الدّر المختار ج:۳ ص:۲۴۶ (طبع سعيد) كتب الطّلاق، ان مستبينًا على نحو لوح وقع ان نوىٰ وقيل مطلقًا ... الخ.

(۲) راجع التفصيل الى ردّ المحتار مطلب في تعريف السكران وحكمه ج:۳ ص:۲۳۹ (طبع سعيد).

(۳) وفي الشامية قبيل مطلب في المسائل الّتي تصح مع الاكراه ج:۳ ص:۲۳۶ (طبع سعيد) وفي البحر ان المراد الاكراه على التلفّظ بالطّلاق، فلو اكره على أن يكتب طلاق امرأته فكتب لا تطلق لأنّ الكتابة أقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا ... الخ

(۴) وفي الشامية مطلب في الطّلاق بالكتابة ج:۳ ص:۲۴۶ ففي غير المستبينة لا يقع الطّلاق وان نوىٰ وان كانت مستبينة لٰكنّها غير مرسومة ان نوىٰ الطّلاق يقع والّا لا .... الخ.

بقوله: لأن الكتابة اقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا.[۱] (راجع رد المحتار ج:۲ ص:۵۷۹،[۲] و ج:۲ ص:۵۸۲،[۳] و ج:۲ ص:۵۸۹[۴]) فليتامل۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی
۱۳۸۷/۱۲/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۱۸/۱۸ الف)

صورتِ مسئولہ میں مغلّظہ طلاق واقع ہوگئی
الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

انگریزی طلاق نامے میں "Divorce" کے بجائے "Divorse" لکھ دینے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے

سوال:- میں نے اپنی بیوی کو جو میری بغیر اجازت کے اپنے والدین کے یہاں چلی گئی تھی، اس کو ڈرانے کے لئے ایک تحریرنامہ لکھا جو انگریزی میں تھا، بذریعہ ڈاک بھیج دیا، اس میں لفظ "Divorse" انگریزی میں لکھا ہوا ہے، جس کے معنی طلاق کے بالکل نہیں ہوتے، میرا منشاء بالکل طلاق دینے کا نہیں تھا، صرف اس لئے لکھا تھا کہ آئندہ کے لئے میری بیوی اس حرکت کا ارتکاب نہ کرے، تو کیا اس صورت میں طلاق ہوگئی؟

جواب:- اس مسئلے کا جواب دارالعلوم کراچی کی طرف سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے پہلے لکھ دیا ہے، وہ جواب پورے غور وفکر اور تحقیق کے بعد لکھا گیا ہے، اور وہی دُرست ہے، ہجاء کی مذکورہ غلطی سے کہ "Divorce" کو "Divorse" لکھ دیا، کوئی فرق نہیں پڑتا، تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، آپ کی بیوی آپ پر حرام ہوچکی ہیں، اور اب دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا، اِلَّا یہ کہ وہ عدت گزارنے کے بعد کہیں اور نکاح کریں، پھر اس شوہر کا انتقال ہوجائے یا وہ بھی کسی وجہ سے صحبت کے بعد طلاق دیدے، اس کی عدت گزارنے کے بعد باہمی رضامندی کے ساتھ آپ سے نکاح ہوسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۵/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۸۱/۲۲ ب)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱ تا ۴) متعلقہ عبارات پچھلے صفحہ کے حاشیہ نمبر ۱ تا حاشیہ نمبر ۴ میں ذکر کردی گئی ہیں۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

بیوی نے جعلی طلاق نامہ تیار کیا ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال:- میری زوجہ نے میری جانب سے جعلی تحریر و دستخط کے ذریعہ اپنی جانب سے طلاق نامہ پیش کر کے طلاق فرضی حاصل کی ہے، نقول جعلی طلاق نامہ پیشِ خدمت ہیں، کیا اس صورت میں میری جانب سے میری بیوی کو طلاق واقع ہوگئی ہے؟

جواب:- اگر سوال میں درج کیا ہوا بیان دُرست ہے، یعنی منسلکہ تحریر[1] جعلی ہے، تو آپ کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، اس لئے کہ طلاق کے وقوع میں اگر زوجین کا اختلاف ہو تو یہ ضروری ہے کہ یا تو شوہر طلاق دینے کا اقرار کرے یا گواہوں کے ذریعہ شرعی طریقہ پر عدالت میں یہ ثابت کر دیا جائے کہ شوہر نے طلاق دی ہے۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۶۷۶/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

طلاق نامہ پر زبردستی دستخط کروانے کا حکم

سوال:- کسی خانگی جھگڑے کی وجہ سے میری بیوی میکے چلی گئی، کچھ عرصہ بعد واپس آگئی، اور میری غیر موجودگی میں مکان خالی چھوڑ کر واپس میکے چلی گئی، جب میں نے والدین سے یعنی بیوی کے والدین سے سبب دریافت کیا کہ تم لوگوں نے کیوں یہ اقدام کیا تو وہاں ان کے دُوسرے رشتہ دار بھی موجود تھے، انہوں نے مجھے طلاق کی دھمکی دے دی، اور پھر چیئرمین اور ممبران کی زبردستی سے طلاق نامہ تحریر کیا، اور مجھ سے زبردستی اس پر دستخط لے لئے، نہ مجھے تحریر سنائی اور نہ میں نے زبان سے الفاظِ طلاق کہے تھے۔

تنقیح:-

زبردستی دستخط کرانے کی کیا صورت پیش آئی؟ اگر آپ دستخط نہ کرتے تو آپ کو کیا اندیشہ تھا؟ اس کا جواب آنے پر اصل مسئلہ کا جواب لکھا جائے گا۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۲ھ

---

(۱) ریکارڈ میں یہ تحریر موجود نہیں۔ (مرتب)

(۲) وفی الدر المحتار ج:۳ ص:۳۵۶ (فان اختلفا فی وجود الشرط) أی ثبوته لیعم العدمی (فالقول له مع الیمین) لانکاره الطلاق.

جوابِ تنقیح:۔
وجہ یہ تھی کہ میری چچا زاد بہن میرے سالے کے گھر تھی، تو انہوں نے اس کو کافی تکلیف دینے کے بعد طلاق کا کاغذ دے دیا تھا تو بعد میں مجھے دھمکی دینے لگے کہ تم سے بھی یہی معاملہ کردیں گے، چونکہ میں اکیلا ہوں، میرا کوئی بھائی و مددگار نہیں، اس لئے میں نے وہاں سے گھر بھی بھاگنے کی کوشش کی مگر انہوں نے نہ چھوڑا اور زبردستی دستخط کرنا پڑے۔

جواب:۔ صورتِ مذکورہ میں اگر آپ کو یہ معلوم تھا کہ جس کاغذ پر مجھ سے دستخط لئے جارہے ہیں وہ طلاق نامہ ہے، تو اس پر دستخط کرنے سے طلاق واقع ہوگئی، کتنی طلاقیں واقع ہوئیں؟ اور دوبارہ زوجیت کا تعلق قائم کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ ان باتوں کا جواب طلاق نامہ دیکھ کر دیا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی
۱۳۸۸/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۵۴/ ۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

﴿فصل فی تعلیق الطّلاق﴾
(طلاق کو کسی شرط پر معلق کرنے کا بیان)

”کُلّمَا طلاق کی قسم فلاں کام نہیں کروں گا“ الفاظ کا حکم

(حضرت مولانا علی محمد رحمہ اللہ مہتمم دارالعلوم کبیروالا کے سوال کے جواب میں)

سوال:- غیر متزوج (غیر شادی شدہ) نے یوں کہا: ”مجھے کلما طلاق کی قسم فلاں فلاں کام نہیں کروں گا“ پھر کرلیا، کیا نکاح کرسکتا ہے؟

۲:- اگر قسم صحیح ہوجائے تو کیا تزویج فضولی واجازت بعملہ کا حیلہ یہاں چل سکتا ہے؟

(حضرت مولانا) علی محمد (صاحب)
(مہتمم دارالعلوم عیدگاہ کبیروالا، ملتان)

جواب:- ان الفاظ کا کوئی صریح حکم کتب میں نہیں ملا، البتہ قواعد کا مقتضا یہ ہے کہ صورتِ مسئولہ میں نکاح کرنے سے طلاق واقع نہ ہو۔ قال الشامیؒ فی ردّ المحتار نقلًا عن الفتح وقد تعورف فی عُرفنا فی الحلف: الطّلاق یلزمنی لا أفعل کذا یرید ان فعلته لزم الطّلاق ووقع فیجب أن یجری علیهم لأنّه صار بمنزلة قوله ان فعلت فأنتِ طالق، وکذا تعارف أهل الأریاف الحلف بقوله علیّ الطّلاق لا أفعل اهـ وهٰذا صریح فی أنّه تعلیق فی المعنٰی علٰی فعل المحلوف علیه بغلبة العُرف وان لم یکن فیه أداة تعلیق صریحًا. (شامی ج:۲ ص:۴۳۳)۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ جب کلام میں صریح الفاظِ تعلیق موجود نہ ہوں تو اعتبار عرف کا ہوتا ہے، جن صورتوں میں فقہاء نے وقوعِ طلاق کا حکم دیا ہے، وہ سب شادی شدہ شخص سے متعلق ہے، کیونکہ شادی شدہ شخص ایسے الفاظ استعمال کرے تو عرفاً ان کا مطلب تعلیقِ طلاق ہی ہوتا ہے، لیکن غیر شادی شدہ شخص کا یہ کہنا کہ مجھے طلاق کی قسم فلاں کام نہیں کروں گا، یہ تعلیق مضاف الی الملک میں متعارف نہیں ہے۔[2]

---

(۱) ردّ المحتار ج:۳ ص:۲۵۳ (طبع سعید)۔
(۲) حاشیہ نمبر۲ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

خاص طور پر ''کلما طلاق کی قسم'' الفاظ متعارف تو کیا، عوام کی سمجھ سے بھی باہر ہیں، اور جب عرف میں ان الفاظ کو تعلیقِ طلاق مضاف الی الملک نہیں سمجھا جاتا تو ان سے طلاق بھی واقع نہیں ہوگی، لأنّ مبنی الأیمان علی العُرف۔[1]

البتہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مذکورہ شخص اپنا نکاح خود نہ کرے، بلکہ کوئی فضولی اس کے حکم کے بغیر اس کا نکاح کردے، اور پھر وہ اسے اپنے عمل سے، مثلاً مہر ادا کرکے نافذ قرار دیدے، اس طرح نکاح دُرست ہوجائے گا[2] اور بلاشبہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۹/۵ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۲۲/۵۶۴ ب)

''میں نے اس کو طلاق دیا، طلاق، طلاق اِن شاء اللہ'' الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شخص نے سخت غصّے کے عالم میں اور ناسمجھی میں اپنی بیوی کو جبکہ وہ غیرحاضر تھی اس طرح الفاظ کہے: ''میں نے اس کو طلاق دیا، طلاق، طلاق انشاء اللہ'' اب جبکہ غصہ دُور ہوگیا، کیا یہ شخص اپنی بیوی سے رُجوع کرسکتا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ''اِن شاء اللہ'' اگر متصلاً کہہ دیا تھا، یعنی بیچ میں خاموشی نہیں آئی تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، لما فی البحر والفاصل اللغو یبطل المشیئة فلذا طلقت ثلاثًا

(حاشیہ متعلقہ صفحۂ گزشتہ) ....(۲) اور تعلیقِ طلاق کے صحیح ہونے کے لئے اضافت الی الملک یا اضافت الی سبب الملک کا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ فتح القدیر ج:۳ ص:۴۴۲ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) میں ہے: ولا بدّ من التصریح بالسبب فی المحیط لو قال کلّ امرأة اجتمع معها فی فراش فهی طالق فتزوّج امرأة لا تطلق. وفی مجموعة رسائل ابن عابدین، امّا الزیادة علی شرط الحالف بدلالة العُرف لا تجوز لأنّه لا تأثیر لها فی جعل ما لیس بملفوظٍ ملفوظًا ولهٰذا لو قال لأجنبیة ان دخلت الدّار فانت طالق کان لغوًا ولا یراد الملک فی لفظه بالعُرف لیصیر کأنّه قال ان دخلت الدّار وانت فی نکاحی فأنت طالق، وان کان المتعارف فیما بین الناس لأنّ الملک لیس بمذکور فی لفظه ولا تأثیر للعُرف فی جعل ما لیس بملفوظٍ ملفوظًا (رفع الانتقاض ودفع الاعتراض علی قولهم الأیمان مبنیة علی الألفاظ لا علی الأغراض ص:۲۹۸). اور فتاویٰ محمودیہ ج:۱۱ ص:۲۴۶ میں ہے: قسم کا مدار الفاظ پر ہوتا ہے نہ کہ اغراض پر، جیسا کہ فقہ میں تصریح ہے: مبنی الأیمان علی الألفاظ دون الأغراض.... لہٰذا ''کلما کی قسم'' منعقد ہی نہیں ہوئی، کیونکہ غیراللہ کی قسم کھانے سے قسم منعقد نہیں ہوتی۔

(مذکورہ حاشیہ رجسٹر نقلِ فتاویٰ دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے فتویٰ نمبر ۴۴/۲۵۸ سے ماخوذ ہے)۔ (محمد زبیر حق نواز)

(۱) دیکھئے: فتاوی شامیه مطلب الأیمان مبنیة علی العُرف .... الخ. ج:۳ ص:۷۴۳ (طبع سعید)

(۲) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۸۴۶ (طبع سعید) حلف لا یتزوّج فزوّجه فضولی .... فاجاز نکاح فضولی بالفعل لا یحنث .... الخ.

فی قوله أنت طالق ثلاثًا وثلاثًا ان شاء الله وفی قوله أنت طالق وطالق وطالق ان شاء الله .... بخلاف أنت طالق واحدة وثلاثًا ان شاء الله لکونه أفاد التکمیل کقوله أنت طالق وطالق ان شاء الله. (البحر الرائق ج:۴ ص:۳۷)۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۶۲ ج)

''اگر اب تم میرے گھر آئی تو اِن شاء اللہ تمہیں طلاق ہوجائے گی'' الفاظ کا حکم

سوال:- مسئلہ کہ سین کی بیوی ن آپنے والدین کے گھر چلی گئی اور س نے بیوی سے کہا کہ: ''اگر اب تم میرے گھر آئی تو اِن شاء اللہ تمہیں طلاق ہوجائے گی'' جبکہ کچھ دنوں کے بعد س کے چھوٹے برادران، ہمشیرگان ن کے والدین کے گھر جاکر زبردستی یعنی س کی بیوی خود راضی نہ تھی، س شوہر کے گھر لے آئے، شوہر نے جب بیوی کو اپنے گھر دیکھا تو اس پر ناراض ہوا اور کہا کہ منع کیا تھا کہ گھر مت آنا ورنہ تین طلاق ہوجائے گی، اور پھر شوہر نے ایک ہی نشست میں تین بار کہا کہ: ''اِن شاء اللہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' واضح رہے کہ بیوی ن نو ماہ کی حاملہ بھی ہے، جواب دیں۔

جواب:- اگر یہ دُرست ہے کہ دونوں خط کشیدہ جملوں کی ادائیگی کے وقت آپ نے ''اِن شاء اللہ'' کہا تھا تو صورتِ مسئولہ میں آپ کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، وہ بدستور آپ کے نکاح میں ہیں، لیکن اگر کسی ایک مرتبہ بھی ''اِن شاء اللہ'' نہ کہا ہو تو جواب مختلف ہوگا، اس صورت میں مسئلہ دوبارہ پوچھ لیں اور معاملہ چونکہ حلال وحرام کا ہے اس لئے خوب سمجھ سوچ کر فیصلہ کریں۔[2]

واللہ اعلم
۱۴۰۶/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷/۱۷۹۴ د)

---

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ). وفی الهدایة باب الأیمان فی الطّلاق ج:۲ ص:۳۸۹ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان) واذا قال لامرأته أنتِ طالق ان شاء الله تعالیٰ متصلًا لم یقع الطّلاق. وفی الدّرّ المختار باب التّعلیق ج:۳ ص:۳۶۶ الیٰ ۳۶۸ (طبع سعید) قال لها: أنتِ طالق ان شاء الله متصلًا مسموعًا لا یقع.

(۲) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۳۶۶ و ۳۶۸ قال لها: أنتِ طالق ان شاء الله، متصلًا مسموعًا لا یقع. وفیه أیضًا ج:۳ ص:۳۷۲ فالمفتی به عدم الوقوع اذا قدّم المشیئة ولم یأت بالفاء .... الخ. نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

''اگر زوجہ کے باپ نے ایک ہفتے کے اندر عورت نہ دی تو میری طرف سے طلاق ہے'' الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شخص نے اپنی زوجہ کے متعلق جو کہ اس وقت باپ کے گھر میں ناراض بیٹھی ہوئی ہے، کہا کہ: ''اگر زوجہ کے باپ نے ایک ہفتے کے اندر عورت نہ دی تو میری طرف سے طلاق ہے'' اس پر لڑکے کے والد نے ڈانٹا اور لڑکے نے پھر وہی الفاظ دُہرائے، پھر والد نے ڈانٹا اور لڑکے نے پھر کہا کہ: ''اگر ایک ہفتے کے اندر نہ دی تو میری طرف سے آزاد ہے'' اب اس گفتگو کی نہ عورت کو خبر ہے نہ اس کے والد کو اطلاع ہے، نہ زوجہ کے پیچھے کوئی لانے کے لئے گیا ہے، کیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر زوجہ کا باپ اس کو ایک ہفتے کے اندر شوہر کے پاس نہیں بھیجے گا تو زوجہ پر تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی، لما فی الدّر المختار فی أیمان الفتح ما لفظه وقد عرف فی الطّلاق أنه لو قال ان دخلت الدار فأنت طالق، ان دخلت الدار فأنت طالق، ان دخلت الدار فأنت طالق، وقع الثلاث. (شامی ج:۲ ص:۵۱۵)۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۱/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۶ الف)

''اگر میں ہندہ کو آئندہ چاہوں اور بدخیالی کروں تو جو بیوی ابھی میرے نکاح میں ہے مجھ سے تین طلاق'' الفاظ کہنے کا حکم

سوال:- زید نے اپنے چچازاد بھائی جو رضاعی بھائی بھی ہے، اُن کی لڑکی ہندہ سے خفیہ تعلقات قائم کئے، باپ کو اطلاع ہونے پر زید کو مارنا چاہا تو لوگوں نے خلافِ مصلحت بتا کر روک دیا، لوگوں نے کہا کہ زید سے ایک اقرارنامہ لے لیا جائے تا کہ دوبارہ اس کا ارتکاب نہ کر سکے، مضمون اس طرح ہے: ''میں اقرار کرتا ہوں کہ اگر میں ہندہ کو آئندہ چاہوں اور بدخیالی کروں تو جو بیوی ابھی میرے نکاح میں ہے مجھ سے تین طلاق ہوجائے گی اور اس مجلس میں بدرستگیٔ دماغ اقرار کر رہا ہوں کہ اس لڑکی کو آئندہ اپنی بیٹی سمجھوں گا۔''

---

(۱) الدّر المختار مع ردّ المحتار کتاب الأیمان باب التّعلیق ج:۳ ص:۳۷۶ (طبع سعید).
وفی الهندیة کتاب الطّلاق، الباب الرّابع فی الطّلاق بالشّرط، الفصل الثالث فی تعلیق الطّلاق بکلمة إن وإذا وغیرهما ج:۱ ص:۴۲۰ (طبع ماجدیه کوئٹه) واذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط اتفاقًا مثل أن یقول لامرأته ان دخلت الدار فأنت طالق. وفی الهدایة کتاب الطّلاق، باب الأیمان فی الطّلاق ج:۲ ص:۳۸۵ (طبع شرکت علمیه، ملتان) واذا اضافه الی شرط وقع عقیب الشرط مثل أن یقول لامرأته ان دخلت الدّار فأنت طالق.

اس مضمون کی تحریر پر چار گواہوں کے دستخط بھی ہیں، اس اقرارنامے کے بعد ہندہ کے باپ نے دُوسری جگہ شادی کردی، شادی کے دس پندرہ روز کے بعد ایک نکاح نامہ بنواکر اپنے چند حامیوں کی مدد سے ہندہ کے شوہر (یعنی داماد) کے پاس گئے اور نکاح نامہ دِکھلاکر کہا کہ: میری بیوی دو، ورنہ پولیس سے گرفتار کرادُوں گا، لیکن داماد اور چند آدمیوں نے زید کو جعل باز و مکار کہہ کر بھگادیا، دو ایک روز کے بعد زید، ہندہ کو زبردستی اُٹھا کر لے گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس اقرارنامے کے بعد اُن شرطوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ملوّث ہوا ہے، لہٰذا وجودِ شرط ہوتا ہے یا نہیں؟ اور زید کی منکوحہ مطلقہ ہوئی یا نہیں؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں اور زید نے واقعۃً ہندہ کو جھوٹے طریقے پر اپنی بیوی بنانے یا اُسے اغوا کرنے کی کوشش کی ہے تو اس کے خط کشیدہ الفاظ کی رُو سے اُس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں،[1] اور وہ حلالہ کے بغیر اس کے لئے حلال نہیں ہوسکتی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۵۸/۲۸ ج)

تعلیق کی ایک مخصوص صورت میں طلاق کے عدمِ وقوع کا حکم

بیوی کے کلمۂ کفر کہنے پر طلاق کو معلق کیا اور بیوی نے کلمۂ کفر کہہ دیا تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ہمارے دفتر میں دیگر ساتھیوں نے ایوبیہ جاکر سیر کرنے کا پروگرام بنایا، میں نے بیوی کو بتایا کہ ایوبیہ جارہا ہوں، اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ کر اکیلے سیر کو جاؤگے، میں نے کہا کہ: ''تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا، صبح جاؤں گا شام کو آجاؤں گا'' اس پر وہ کہنے لگی کہ اس کا مطلب ہے کہ مجھے ساتھ لے جاؤگے، میں نے کہا: وہاں صرف مرد جائیں گے۔ خط کشیدہ فقرہ اس لئے کہا کہ خیالِ طلاق دِل میں آگیا تھا، بہرکیف بعد میں اُس نے پوچھا کہ: تم پھر کل جاؤگے، میں کسی اور دھیان میں تھا، کہہ دیا: ''ہاں!'' اب اگر کل میں چلا جاؤں (طلاق کی نیت بالکل نہیں ہے اور نہ تھی) تو کیا اس سے طلاق واقع ہوجائے گی؟ اور فرض کریں کہ اگر پٹائی کے دوران یہ کہا جائے کہ ''اب تو چھوڑتا ہوں آئندہ نہیں چھوڑوں گا'' اس سے طلاق تو نہیں ہوگی؟

---

(۱) وفی التاتارخانیۃ ج:۳ ص:۵۰۳ قال لامرأتہ ان دخلت الدار فانت طالق، فدخلت امرأتہ وقع الطّلاق لوجود الشرط۔ نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

۲:- اگر زید نے اپنی بیوی کو کہا کہ: ''اگر تم کفریہ کلمہ کہوگی یا کفریہ بات کروگی تو تمہیں طلاق ہوگی'' تو اُس کی بیوی نے کسی مصیبت کی حالت میں غلطی سے کہہ دیا (معاذ اللہ) ''خدا بھی تو رحم نہیں کرتا'' (جبکہ کفر حاصل کرنے کی غرض سے نہ کہے) کیا طلاق ہوگئی؟ اور کیا دوبارہ نکاح کرنا ہوگا؟

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں آپ کے ایوبیہ جانے سے طلاق واقع نہیں ہوگی، نیز مارنے کی صورت میں جب یہ کہے کہ: ''اب تو چھوڑتا ہوں، آئندہ نہیں چھوڑوں گا'' اس سے بھی طلاق نہیں ہوگی۔

۲:- ''خدا بھی تو رحم نہیں کرتا'' (معاذ اللہ) کلمۂ کفر ہے، ایسی صورت میں بیوی سے توبہ کرا کر دوبارہ نکاح کرنا چاہئے، اور صورتِ مسئولہ میں نکاحِ جدید کے بعد احتیاطاً یہ سمجھنا چاہئے کہ آئندہ وہ صرف دو طلاقوں سے مغلّظہ ہوجائیں گی، کیونکہ اس کا صریح جزئیہ نظر سے نہیں گزرا۔

وفي العالمگيرية من نسب الله تعالىٰ الى الجور فقد كفر. (عالمگيرية ج:۲ ص:۲۵۹)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۷۷/۵۷/۲۸ ب)

شوہر کے الفاظ ''تمہیں طلاق تو ہوجائے گی'' میں شوہر کی نیت کی ایک مخصوص صورت

سوال:- فتویٰ مجریہ دار الافتاء دار العلوم کراچی، ۱۳۹۱/۴/۱ھ مرسل خدمت ہے، یہ مسئلہ حسبِ ارشاد دوبارہ رُجوع خدمتِ عالیہ ہے، تاکہ کوئی حتمی و قطعی فتویٰ صادر فرمایا جائے، اس کے لئے چند اُمور اور واقعات متعلقہ مختصراً درج ذیل ہیں:-

نمبر۱:- شوہر کا اصل خط از لاڑکانہ مؤرخہ ۱۵/اپریل ۱۹۷۱ء جس کی نقل (فتویٰ کی پشت پر ہے) عالی جناب نے پڑھ لیا ہے، اس میں شوہر نے دُوسری صورت کے متعلق ''تمہیں طلاق تو ہوجائے گی'' کی مدّت، اس مہینے کی آخر تک یعنی ۳۰/اپریل تک مشروط رکھی ہے کہ اس کو خط لکھ کر سامانِ جہیز اور مہر وغیرہ سے متعلق باتوں کا تصفیہ اس مہینے کے آخر تک کرلیں۔

نمبر۲:- بیوی کے والد نے اس کو جواباً ایک خط مؤرخہ ۲۶/اپریل ۱۹۷۱ء ذریعہ رجسٹری لکھا، اس کی نقل منسلک ہٰذا ہے، جس میں جہیز اور مہر وغیرہ کا ذکر کئے بغیر یہ لکھا گیا ہے کہ شوہر اور اس کے

---

(۱) طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ.

والد صاحب ''جلد از جلد اندرون ایک ہفتہ آئیں تاکہ معاملات کو مناسب طریقے سے سلجھایا جاسکے''، مگر افسوس کہ شوہر نہ آئے اور نہ ان کے والد صاحب آئے، اس طرح کوئی بات نہ بنی۔

نمبر۳:- بیوی کے والد نے اپنی ایک لڑکی کی شادی کے موقع پر شوہر اور اس کے والد کو بلایا لیکن پھر بھی حاضر نہ ہوئے۔

نمبر۴:- بیوی کے والد کا قیام لندن میں ہے، وہ اپنی دو بیٹیوں کی شادی کے موقع پر حاضر ہوئے اور چاہا کہ اس معاملے کا بھی تصفیہ ہوجائے، لیکن ناکام رہے۔

نمبر۶:- جملہ ''تمہیں طلاق تو ہوجائے گی'' کے متعلق فتویٰ منسلکہ کے پہلے پیراگراف کے آخری سطور میں شوہر کا مقصد دریافت کیا گیا ہے۔ غیب کا علم اللہ کو ہے، لیکن بندہ صرف یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ شوہر تہذیب یافتہ ہے اور مرنجان و مرنج طبیعت کا حامل ہے، کسی سنگین معاملے کی خود ابتداء کرنا نہیں چاہتا اور نہ اس کی ذمہ داری اپنے سر لینا چاہتا ہے۔

نمبر۷:- اس کی بیوی اس ماہ اندازاً آٹھ مہینے کی حاملہ ہے، اور وسط فروری ۱۹۷۱ء سے اپنے میکے میں ہے، شوہر اس بارے میں اپنی بیوی کو حسرت و یاس میں رکھتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس طلاق کے احتمال کی خبر کی بابت شوہر کا مقصد عیاں نہیں مبہم ہے، وہ اپنے آپ پر اس کی ذمہ داری لینا نہیں چاہتا، شوہر نے اپنے مذکورہ خط مؤرخہ ۱۵راپریل ۱۹۷۱ء کے بعد اب تک اپنی بیوی سے ملاقات نہیں کی، اور نہ ہی بیوی اپنے شوہر کے گھر جاسکتی ہے، یعنی بیوی تادمِ ہٰذا اپنے میکے میں ہے، اور اِن شاء اللہ اگلے مہینے اپنی پہلی زچگی سے فارغ ہوگی، بیوی اب تک آپ کے وقیع اور مؤثر فتویٰ کی خواہاں ہے تاکہ وہ اپنی ازدواجی زندگی استوار کرسکے۔

جواب:- جو حالات آپ نے دوبارہ لکھے ہیں، ان سے فتویٰ کے جواب میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، جہاں تک طلاق کا مسئلہ ہے اس کے بارے میں پہلے ہی لکھا جاچکا ہے کہ شوہر نے جو یہ الفاظ لکھے ہیں کہ: ''دُوسری صورت میں تمہیں طلاق تو ہوجائے گی'' ان کی صحیح مراد شوہر ہی سے معلوم کی جاسکتی ہے کہ کیا وہ ان الفاظ کی تحریر کے وقت طلاق واقع کرنے کی نیت رکھتا تھا یا محض آئندہ واقع ہوجانے کی خبر دے رہا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ سابقہ فتویٰ اس کے پاس بھیج کر اس سے وضاحت طلب کی جائے، اور وضاحت میں وہ جو کچھ تحریر کرے وہ یہاں بھیج دیا جائے اُسے دیکھ کر ہی کوئی حتمی جواب دیا جاسکے گا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اگر شوہر جواب میں یہ ظاہر کرے کہ ان الفاظ سے وہ طلاق ہی واقع کرنا چاہتا تھا تب بھی ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگی، جس کا حکم یہ ہے کہ عدت کے دوران (یعنی بچے کی

پیدائش سے پہلے پہلے) وہ رُجوع کرسکتا ہے،[1] اور عدّت کے بعد دوبارہ باہمی رضامندی سے نکاح بھی ہوسکتا ہے، لہٰذا اس طلاق کی وجہ سے آئندہ تصفیہ کی راہ میں کوئی خاص رُکاوٹ نہیں ہوگی، آپ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ یہاں سے شوہر کے نام کوئی مشورہ کا خط لکھا جائے، لیکن فریقین کے حالات سے کما حقہٗ واقفیت کے بغیر محض یک طرفہ بیان پر ایسا کوئی خط لکھنا دارالافتاء کا منصب نہیں ہے، اس لئے اس معاملے میں معذرت قبول فرمائیں، یہ معاملہ باہمی گفتگو ہی سے سلجھانا چاہئے، اگر وہ آپ کے پاس نہیں آتا تو آپ اس کے پاس جاسکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۴/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۵۷۹/۲۲ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

شوہر کے الفاظ ''اپنے دو بھائیوں کی گھر والیوں سے کچھ نہ مانگوں گا، اگر مانگوں تو مجھ پر میری بیوی سات شرطوں پر طلاق'' کا حکم

سوال:- تین بھائی ہیں، دو بھائیوں کے درمیان گھر کے کسی معاملے میں بات بڑھ گئی، ایک بھائی نے یہ کہا کہ: ''میں اپنے دونوں بھائیوں کی گھر والیوں سے کچھ نہیں مانگوں گا، اگر مانگوں تو مجھ پر میری بیوی سات شرطوں پر طلاق ہوگی۔'' کیا اگر وہ اب کوئی چیز مانگے یا بغیر اُس کے مانگے، بھابیاں اگر خود اُس کو چائے، پانی دے دیں تو طلاق ہوجائے گی؟

جواب:- اگر اُس بھائی نے ٹھیک وہی الفاظ استعمال کئے تھے جن کا خط کھینچ دیا گیا ہے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ یہ بھائی جب بھی کبھی اپنی دونوں بھاوجوں میں سے کسی سے کوئی چیز مانگے گا تو اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔[2] اور پھر اس بیوی سے دوبارہ نکاح بھی حلالہ کے بغیر نہ ہوسکے گا، ہاں! اگر وہ خود کوئی چیز دیں اور یہ لے لے تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی، لیکن مانگنے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہوگی، اور اگر اس خطرے سے مکمل طور پر بچنا ہو اور بھاوجوں سے کچھ مانگنا ضروری ہو تو اس مشکل سے نکلنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی بیوی کو صرف ایک طلاقِ رجعی دیدے اور عدّت گزر جانے دے، عدّت گزرنے کے بعد بیوی نکاح سے نکل جائے گی، اب دونوں بھابیوں سے کچھ

---

(۱) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب الرجعة ج:۲ ص:۳۹۴ (طبع شركت علميه، ملتان) واذا طلّق الرّجل امرأته تطليقة رجعية أو تطليقتين فله أن يراجعها فی عدّتها ..... الخ.

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۹۰ اور ص:۳۹۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

مانگ لے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی[1]، پھر اپنی مطلقہ بیوی سے دوبارہ نئے مہر پر نکاح کرلے[2]، تو اس نئے نکاح کے بعد ہمیشہ کے لئے بھابھیوں سے کچھ مانگنا اس کے لئے ممکن ہوجائے گا اور پھر اس سے کبھی طلاق واقع نہ ہوگی[3]، البتہ آئندہ اُسے صرف دو طلاقوں کا اختیار رہ جائے گا، لیکن اس طریقے پر عمل کرنے سے پہلے کسی مستند عالم سے اس کو اچھی طرح سمجھ لیں، کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی سے معاملہ خراب ہوسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۹/۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۳۴/۲۸ ج)

''تم اگر بغیر اجازت گھر سے باہر قدم رکھوگی تو تمہاری جانب سے خلع یعنی طلاق ہوجائے گی'' الفاظ کا حکم

سوال:- میری شادی کو ساڑھے تین سال کا عرصہ ہوا ہے، اور ڈھائی سالہ لڑکی بھی ہے، اور گزشتہ ساڑھے تین سال سے ہی میرے گھریلو حالات ٹھیک نہیں ہیں، اکثر میری بیوی معہ بچی کے اپنے گھر بیٹھ جاتی ہے، اور اس طرح ہم دونوں کی صحت پر بُرا اثر پڑا ہے، میرا خیال ہے کہ میرے سسرال والوں کی جانب سے میری بیوی کو شہ ملنے کی وجہ سے صورتِ حال بد سے بدتر ہوتی گئی، میں بدنام اور بے عزت ہوا، اکثر گھر کا بے گھر ہوا، مجھے ڈرایا دھمکایا گیا، اور کبھی کبھی ان کے بھائی اور والدہ صاحبہ ان کو میرے گھر آکر لے گئے، اس طرح ہماری زندگی گزرتی رہی، ان کے گھر والوں کی جانب سے کاروائی بھی کرنے کا یعنی لڑکی کو روکے رکھنے کا ارادہ کرلیا تھا، بہرحال اب جبکہ میری بیوی دو مہینے گزار کر میرے گھر واپس لوٹی تو ہم اچھی طرح رہ رہے تھے، چھ دن میں بیمار رہا اور گھر میں پھر تنازعہ پیدا ہوگیا، اس طرح آفس کو آٹھ دن نہ جاسکا، مجھے میری بیوی کا بغیر اجازت میرے غائبانہ میں باہر کسی کے گھر جاکر ملنا بالکل ناپسند ہے، گوکہ میری بیوی پر مجھے کامل بھروسہ ہے۔ ایک دفعہ جب میں آفس جانے لگا تو میری بیوی نے میری چابیوں میں سے گھر کی چابی نکال کر رکھ لی، اس پر میں نے ان کو کہا: تم کہیں بھی نہیں جانا۔ اس پر میری بیوی نے کہا کہ: میں ضرور جاؤں گی، اکیلی گھر میں بند نہیں رہ سکتی۔ اس پر میں برہم ہوگیا اور کہا کہ: تم کو میں ہر بار سمجھاتا ہوں پر تم نہیں مانتی۔ پھر میں نے قرآن شریف کو

(۲،۱) وفی الدّر المختار باب التّعلیق ج:۳ ص:۳۵۵ (طبع سعید) فحیلة من علّق الثّلاث بدخول الدّار أن یطلّقها واحدة ثمّ بعد العدّة تدخلها، فتنحلّ الیمین فینکحها ..... الخ.

وکذا فی الهندیة الباب الرّابع فی الطّلاق بالشرط الفصل الأوّل فی الفاظ الشّرط ج:۱ ص:۴۱۶ (طبع ماجدیه)

(۳) وفی الدر المختار مع ردّ المحتار کتاب الطّلاق باب التّعلیق ج:۳ ص:۳۵۲ (طبع سعید) تنحلّ ای تبطل الیمین ببطلان التّعلیق اذا وجد الشرط مرّة ..... الخ. (محمد زبیر حق نواز)

گواہ رکھ کر یہ الفاظ کہے: ''تم اگر بغیر اجازت میرے غائبانہ میں گھر سے باہر قدم رکھوگی تو تمہاری جانب سے خلع یعنی طلاق ہوجائے گی۔'' اس کے بعد پڑوسی جو مالکِ مکان ہے، اُس کو بھی کہہ دیا کہ میں نے اپنی بیوی کو باز رکھنے کے لئے ایسا کہہ دیا ہے، اس کی خلاف ورزی کرے گی تو خود ذمہ دار ہوگی، پھر میں گھر کے اندر آیا اور جب میں نے اپنی بیوی کی ضد دیکھی تو میں نے جانے کی اجازت دے دی اور قرآن شریف کو گواہ رکھا، پھر میں نے اُسی وقت مالکِ مکان کو آواز دے کر کہا کہ: آپ اپنی بیوی کو میری بیوی کو سمجھانے کے لئے بھیج دیں، اسے میں نے اجازت دے دی ہے۔ اُس کے بعد میں سسرال گیا اور اپنے سسر صاحب کو پورا واقعہ سنایا، وہ آئے اور غصہ ہوئے اور کہا کہ: میں تمہاری بیوی کو بطور امانت لے جارہا ہوں، آفس فون کردوں گا آپ جمعہ کو آکر لے جائیں۔ اُنہوں نے کہا کہ میں آپ کے اُوپر کے جملے کی تصدیق کراؤں گا، اس پر میں نے بہشتی زیور اور اُوپر کے کہے ہوئے الفاظ لکھ کر ان کے والد صاحب کو دے دیئے کہ کسی سے تصدیق کرلیں، کہیں یہ لوگ غلط فہمی میں میری بیوی کو بٹھا کر مجھ سے دُور نہ کردیں، اس کا فتویٰ صادر فرمائیں۔

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں تو آپ کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، وہ بدستور آپ کی بیوی ہیں، اور آپ انہیں اپنے گھر لاسکتے ہیں، اور خط کشیدہ الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، کیونکہ ان الفاظ میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ بیوی کی طرف سے شوہر پر طلاق کے وقوع کو خروج من الدار پر معلق کیا گیا ہو اور اس صورت میں طلاق کا عدمِ وقوع ظاہر ہے۔

لما فی ردّ المحتار: (اذا قال أنا منک طالق یلغو) فان قوله أنا منک طالق منه وصف الرجل بالطّلاق صریحًا فلا یقع لأن الطّلاق صفة للمرأة. (شامی ج:۲ ص:۴۳۳)۔[1]

دُوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ شوہر کی طرف سے خلع کی معلّق پیشکش ہو، اس صورت میں یہ زوجہ کے قبول پر موقوف ہوگی، اور قبول تعلیق کے وقت ہوا نہیں، اور شرط ابھی تک پائی نہیں گئی، اور شوہر زبانی اس احتمال کی نفی کرتا ہے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اِخبار ہو بیوی کے خلع کرنے سے، یعنی مطلب یہ ہو کہ تیرا خروج بلا اذن علامت ہوگی تیری خواہشِ خلع یا ایجابِ خلع کی (اور شوہر اپنے جملے کا یہی مطلب زبانی بیان کرتا ہے) اس صورت میں یہ قولِ کذب یا کم از کم لغو ہے، اس سے کوئی انشاء طلاق نہیں ہوتا۔ بہرصورت! مذکورہ الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱۴/۲۸ ج)

---

(۱) ردّ المحتار تحت مطلب فی قوله علیّ الطّلاق من ذراعی ج:۳ ص:۲۵۴ (طبع سعید).

شوہر کے الفاظ ''اگر پھر دوبارہ والدہ کے بارے میں کچھ کہا تو میں طلاق، طلاق، طلاق دیتا ہوں'' کا حکم

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ الف کی اپنی بیوی ب سے شدید تکرار ہوئی، جس پر ب نے الف شوہر کی والدہ صاحبہ کی شان میں گستاخی کی، الف نے بیوی کو کہا کہ: ''اگر پھر دوبارہ والدہ صاحبہ کے بارے میں کچھ کہا تو میں تمہیں طلاق، طلاق، طلاق دیتا ہوں۔'' بیوی بدستور لڑتی رہی، لیکن دوبارہ والدہ صاحبہ کے بارے میں کچھ نہ کہا، کیا بیوی کو طلاق ہوگئی؟ جواب دیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں الفؔ کی بیوی الفؔ کی والدہ کی زبان سے گستاخی کرے گی یا ان کے بارے میں کوئی ایسی بات کہے گی جو ان کی بُرائی پر مشتمل ہو تو الفؔ کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی[1]، اور وہ حلالہ کے بغیر الفؔ کے لئے ہرگز حلال نہ ہوگی۔ لیکن جب تک والدہ کے بارے میں کچھ بُرائی کی بات نہ کہے اس وقت تک وہ بدستور الفؔ کے نکاح میں ہے۔ تاہم شدید احتیاط کی ضرورت ہے، اگر کبھی کوئی کلمہ غلطی سے بھی منہ سے نکل گیا تو طلاق واقع ہوجائے گی، اگر شوہر اس خطرناک صورت سے بچنے کے لئے اپنے مذکورہ طلاق کے جملے کو بے اثر اور کالعدم کرنا چاہے تو اس کا طریقہ کسی وقت زبانی آکر سمجھ لے۔　　واللہ اعلم

۱۴۰۶/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۹۳/۳۷ و)

کسی کو اس کی ہجو بتانے پر طلاق کو معلق کرنے کے بعد اُسے ہجو سنادی تو بھی طلاق واقع ہوجائے گی

سوال:- خالد نے زید و بکر کے رُوبرو عمرو کی ہجو کی ہے، زید نے بکر کو کہا کہ: یہ ہجو عمرو کو بتادے۔ تو دونوں شخص عمرو کے پاس گئے، تو بکر نے عمرو سے کہا کہ: خالد نے ہماری ہجو کی ہے، چنانچہ وہ ہجو زید نے عمرو کو سنادی، تو اس نے اس کو اپنی توہین جان لیا، عمرو جب خلاف میں دامن گیر ہوا تو قدم کشیدی زید نے اختیار کی کہ میں نے ہجو کو بتادینے سے عمرو کو مطلع نہیں کیا بلکہ بکر نے مطلع کیا ہے، چونکہ اس نے خود ہجو سنادی ہے اور بتائی نہیں، اس لئے پہلے پہلے بکر نے ہجو بتادینے سے عمرو کو مطلع کردیا ہے، نیز بکر کی زبانی شہادت اور باقی گواہوں کی شہادت کو بکر نے صرف زید کے مشورے سے اتنی کہا کہ خالد نے تمہاری ہجو کی ہے، چونکہ ہجو زید خوب جانتا ہے مجھے معلوم نہیں گزارش یہ ہے کہ جب

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۹۰ و ص:۳۹۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

بستی والوں نے زید سے سوال کیا کہ تم نے عمرو کو ہجو کیوں بتادی؟ زید نے کہا کہ: میں نے ہجو سنادی ہے اور سنانے کی میری حلف نہیں۔

جواب:- پہلے دو مرتبہ اس سوال کا جواب دیا جاچکا ہے، بتانے اور سنانے میں کوئی فرق نہیں، اگر ہجو بتانے پر طلاق کو معلق کیا تھا اور بعد میں ہجو سنادی تو طلاق واقع ہوگئی[1]، اگر اس پر آپ کو اطمینان نہیں ہوتا تو اطمینان پیدا کرنا کسی کی قدرت میں نہیں ہے، فضول بار بار سوالات کرکے وقت ضائع نہ کیجئے، دین وشریعت کے معاملے میں بہانہ جوئی سخت گناہ ہے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۹/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۸ھ

''ہم پر اپنی عورتیں بشرعِ محمدی حرام ہوں اگر فلاں واقعہ نہ ہوا ہو'' الفاظ کا حکم

سوال:- غلام محمد ولد ہر محمد قوم قصاب سکنہ بھرال۔ ۲:- محمد عباس ولد شاہول قوم اعوان سکنہ بھرال۔ ۳:- بشیر محمد ولد دوست محمد قوم اعوان۔ ۴:- سردار ولد شیر محمد۔ ۵:- دوست محمد ولد محمد شیر نے اوّلاً جھوٹی قسم اُٹھائی کہ غوث محمد ولد نور محمد کو مظفر خان ولد حاجی محمد خان نے بمع گیارہ ہمراہیوں کے اغواء کرلیا ہے، پھر دُوسرے دن کو غوث محمد نے اور اس کے ہمراہوں نے حاجی محمد خان مسماۃ صاحبہ خاتون دختر حاجی محمد خان خالد مظفر خان، اسلم خاتون دختر مظفر خان کو قتل کردیا ہے، پھر انہی

۱:- مذکورہ پانچ اشخاص نے پولیس کے رُوبرو ان الفاظ سے طلاق اُٹھائی ہے، باوضو ہوکر قرآن شریف سر پر اُٹھاکر اور زبانی بولا کہ: ''ہم قسم اُٹھاتے ہیں اس کلامِ پاک کی کہ غوث محمد ولد نور محمد کو مظفر خان ولد حاجی محمد خان نے بمع گیارہ اشخاص کے اغواء کرلیا ہے۔

۲:- ہم پانچوں اشخاص نے اپنی اپنی بیویوں کے نام لے کر تین تین دفعہ یہ الفاظ بولے کہ: ''ہم پر اپنی عورت بشرعِ محمدی حرام ہو، اگر غوث محمد ولد نور محمد کو مندرجہ بالا اشخاص نے اغواء نہ کیا ہو۔''

جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ غوث محمد ولد نور محمد کی زندگی کا ثبوت اور اشتہاری ملزم ہونے کا ثبوت ہر اخبار میں درج ہے، اور اس کی گرفتاری 26-8-1968 کو عمل میں آئی ہے۔

جواب:- اگر سوال کا یہ بیان دُرست ہے کہ غوث محمد کو کسی نے اغواء نہیں کیا تو پولیس کے

---

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۳۹۰ اور ص:۳۹۱ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

سامنے قسم کھانے والے تمام افراد کی بیویوں پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں،[۱] اب وہ حلالہ کے بغیر ان کے لئے ہرگز حلال نہیں ہوسکتیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۱۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

تعلیق کی ایک مخصوص صورت میں شوہر کی نیت کا اعتبار

سوال:- زید نے ایک دن اپنے خاص کمرے میں آرام کیا، جس وقت وہاں اس کی بیوی سوئی ہوئی تھی، اتنے میں زید کے والد اس کے کمرے کے قریب گزرے، اس علاقے میں دن میں بیوی کے ساتھ سونا عیب سمجھا جاتا ہے، جب زید اپنے کمرے سے نکلا تو والدہ نے اس کو کہا کہ: تم دن کو کیوں بیوی کے ساتھ سوتے ہو؟ زید نے اپنی امی کے زجر پر کہا کہ: ''اگر ایسا ہے تو میری بیوی پر تین طلاق ہے''، اب اس سے پوچھا گیا کہ تمہارے اس کلام کا کیا مطلب ہے؟ اس نے کہا کہ: میرا مطلب یہ ہے کہ اگر میرے والد صاحب نے مجھے بیوی کے ساتھ سوتے ہوئے دیکھا ہے تو بیوی تین طلاق ہے۔ چونکہ کمرے کا دروازہ بند تھا، لہٰذا اس کے والد صاحب کے دیکھنے کا امکان بھی نہیں، اب سوال یہ ہے کہ مندرجہ بالا صورت میں طلاق ہوگئی یا نہیں؟ نیز زید کے کلام کا کیا مطلب ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کے کلام ''اگر ایسا ہے ....الخ'' کا مطلب خود اسی سے معلوم کیا جائے گا، اگر وہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ بیان دیتا ہے کہ اس کی مراد والد صاحب کا میاں بیوی کو ساتھ سوتے ہوئے دیکھنا ہے تو اس کی تصدیق کی جائے گی، اور طلاق کا دار و مدار والد کے دیکھنے پر ہوگا، اگر انہوں نے ان دونوں کو ساتھ سوئے ہوئے دیکھ لیا ہو تو تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی، ورنہ نہیں۔[۲]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۹۰/۱۲/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۸/۲۱ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۳۹۰ اور ص:۳۹۱ کا حاشیہ نمبرا ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی الھندیة کتاب الطّلاق الباب الرّابع فی الطّلاق بالشّرط الفصل الثالث فی تعلیق الطّلاق ج:۱ ص:۴۲۰ (طبع ماجدیہ کوئٹہ) واذا اضافه الی الشّرط وقع عقیب الشّرط اتفاقًا. وفی البحر الرّائق ج:۳ ص:۳۴۰ (طبع سعید) والمعلّق بالشّرط کالمرسل عند وجود الشّرط .... الخ. وفی الھدایة باب الأیمان فی الطّلاق ج:۲ ص:۳۸۵ (طبع شرکت علمیه) واذا اضافه الی شرط وقع عقیب الشرط ... الخ. نیز دیکھئے ص:۳۹۰ اور ص:۳۹۱ کا حاشیہ نمبرا۔

''اگر اُس نے نماز نہ پڑھی تو اس کو طلاق'' الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی کی عدمِ موجودگی میں یہ الفاظ کہے: ''اگر اُس نے نماز نہ پڑھی تو اس کو طلاق ہے'' بعینہٖ پورے الفاظ کی حاضری نہیں ہے، لیکن غالباً یہ الفاظ یاد آتے ہیں، ایسے الفاظ دو یا تین دفعہ کہے گئے ہیں، غالباً یہ بھی تین دفعہ کا گمان ہے، بعد میں انہوں نے بیوی کو اس کی اطلاع کردی، کچھ عرصہ تک تو وہ نماز پڑھتی رہی، یعنی جب تک خاوند کے گھر میں تھی، جب والدین کے ہاں چلی گئی تو نماز بالکل نہیں پڑھتی تھی، اور بعد میں پھر جب خاوند کے ہاں آئی تو پھر نماز کی پابند ہوگئی۔ یاد رہے کہ اس بیوی کو سلسل البول کا عارضہ ہے، کیا ایسی صورت میں طلاق واقع ہوگئی؟

جواب:- طلاق کے اَحکام کا تمام تر دارومدار الفاظ پر ہوتا ہے، کہنے والے کو چاہئے کہ وہ اچھی طرح الفاظ کو یاد کرے کہ کیا کہا تھا؟ اگر غالب گمان انہی الفاظ پر قائم ہوتا ہے جو سوال میں درج کئے گئے ہیں تو ان سے مندرجہ حالات میں طلاق واقع نہیں ہوگی، لیکن اگر الفاظ اس کے علاوہ کچھ اور یاد آئیں تو دوبارہ مسئلہ پوچھ لیا جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

''اگر فلاں زمین کو فروخت نہ کروں تو میری بیوی کو طلاق'' الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شخص مسمّٰی میر اَکبر نے والد سے ناراض ہوکر بات چیت کے دوران ایسے کہا کہ ''فلاں زمین کا رقبہ جو میری حق اسامی ہے موقع ملنے پر باہر فروخت نہ کروں تو میری عورت پر تین طلاق سے طلاق ہے'' اور یہ بھی کہا کہ: ''تجھ کو دُوں تب بھی بیوی تین طلاق سے طلاق''۔ ازاں بعد چھ مہینے خاموش رہ کر یہ زمین والد کے پاس رہن کردی البتہ فروخت نہیں کی، اب یہ پریشان ہے، زمین باہر فروخت کرنے سے بھی سخت مجبور ہے، کیونکہ زمین کم ہے اور والد کے ہاتھ بھی فروخت نہیں کرسکتا، اگر ایسا کرے گا تو طلاق ہوگی۔ طلاق سے بچنے کی کیا صورت ہوگی؟

جواب:- میر اکبر نے ایسے الفاظ استعمال کرکے گناہ کا اِرتکاب کیا جس پر اسے توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے، اور موجودہ صورتِ حال سے بچنے کی صورت صرف یہی ہے کہ یہ زمین کسی شخص کو فروخت کردے، فروخت کرنے کے بعد پھر اس سے دوبارہ خرید لے تو پھر زمین اپنے پاس رکھنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی،(۱) اور آئندہ اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے سے مکمل پرہیز کیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۳/۳۳ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب الأيمان فی الطّلاق ج:۲ ص:۳۸۵ (طبع شركت علميه ملتان) واذا اضافه الى الشرط وقع عقيب الشرط مثل أن يقول لامرأته: ان دخلت الدّار فأنت طالق. وفی الهندية كتاب الطّلاق الباب الرّابع ج:۱ ص:۴۲۰ (طبع ماجديه كوئٹه) واذا اضافه الى الشرط وقع عقيب الشرط اتّفاقًا. نیز دیکھئے ص:۳۹۵ کا حاشیہ نمبر۳۔

﴿فصل فی تفویض الطّلاق﴾
(کسی کو طلاق واقع کرنے کا حق دینے کا بیان)

''تین طلاق تفویض'' کہنے کا حکم

سوال:- زید جس کی عمر تقریباً سترہ سال ہوگی، اس نے اپنی بیوی ہندہ کو بالفاظِ واضح دو عدد شاہدان کے سامنے یہ الفاظ کہے ''تین طلاق تفویض''، اب اس میں بعض جاہل بضد ہوکر اختلاف کر رہے ہیں کہ زید نابالغ ہے اس لئے طلاق نہیں ہوئی، دُوسرے کہتے ہیں کہ زید کی عمر جب سترہ سال ہے تو بالغ ہے اور طلاق بالغ کی ہوجاتی ہے، شرعاً صحیح صورت کیا ہے؟

جواب:- سترہ سال کی عمر کا لڑکا شرعاً بالغ ہے[1]، اگر وہ طلاق دے تو طلاق واقع ہوجاتی ہے[2]، اور سوال میں جو تفویض کے الفاظ لکھے ہیں اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اُس نے خود طلاق دے دی تب تو طلاق بلاشبہ ہو ہی گئی، اور اگر تفویض سے مراد یہ ہے کہ اُس نے عورت کو اپنے اُوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار دے دیا ہے تو معاملہ عورت کے ہاتھ میں ہے، اگر وہ اپنے نفس پر طلاق واقع کرلے تو طلاق ہوجائے گی، ورنہ نہیں۔[3]

واللہ اعلم

الجواب صحیح

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۱۵۳ (طبع سعید) بلوغ الغلام بالاحتلام والاحبال والانزال .... فان لم یوجد فیهما شئ فحتّی یتم لکلّ منهما خمس عشرة سنة به یفتٰی.

(۲) وفی الهندیة کتاب الطّلاق الباب الأوّل ج:۱ ص:۳۵۳ (طبع ماجدیه) یقع طلاق کل زوج اذا کان بالغًا عاقلًا.

(۳) فی الدّر المختار ج:۳ ص:۳۱۴ (طبع سعید) وأنواعه ثلاثة تفویض وتوکیل ورسالة والفاظ التفویض ثلاثة تخییر، وأمر بید، ومشیئة.

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ ۳۰؍۱۰؍۱۳۸۷ھ

شرائط کی خلاف ورزی پر طلاق کا حق بیوی اور سسر کو تفویض کرنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے ایک سفید کاغذ پر مندرجہ ذیل اقرارنامہ لکھا۔ ۱:- اپنی زوجہ کو پردۂ شرعی کا پابند کروں گا۔ ۲:- نان نفقہ وغیرہ رزقِ حلال کا ضامن رہوں گا۔ ۳:- اپنی زوجہ کو زدوکوب نہیں کروں گا۔ ۴:- سسرال کے پڑوس و جوار میں رہوں گا اور مکان اپنا بناؤں گا۔ ۵:- سسرال وغیرہ کا خدمت گزار رہوں گا، صلہ رحمی کروں گا۔ ۶:- بیوی کو فی ماہ کے حساب سے مبلغ ۵ روپے نفقہ کے طور پر ادا کروں گا۔ ۷:- بدون اجازتِ بیوی دُوسری شادی نہیں کروں گا۔ ۸:- دینی اُمور مثل صوم وصلوٰۃ وغیرہ کا حتی المقدور ادا کرنے کا پابند رہوں گا۔ بصورتِ عدمِ پابندی مذکورہ بالا ہر ایک شرائط یا کسی شرط میں زوجۂ ام کو یا باپِ زوجہ کو طلاقِ بائنہ واقع کرنے کا پورا پورا اختیار ہوگا۔

اب خلاف ورزی کرکے زوجہ کو مارنے لگا، سسر کے چھڑانے پر سسر کو کہتا ہے کہ تو کافر ہے، بے ایمان ہے۔ مذکورہ فساد کی بناء پر سسر نے اس کو دو لاٹھی ماری، داماد نے سسر کو گردن سے پکڑ کر زمین پر گرادیا۔ ۲:- دُوسرے دن زوجہ کو طلب کرنے میں سسر پر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر حقیقی بھائی کے روکنے سے باز رہا اور فساد وحملہ کے ڈر سے سسرال سے چھ میل دُور دیہات میں بسنے لگا۔ دو تھانہ میں درخواست دی کہ سسرال میری زوجہ اور ۷۵ روپیہ اور زیورات لے گئے ہیں۔ یہ بالکل جھوٹ تھا۔ ۳:- عدالتِ دیوانیہ میں زن آشوئی کا مقدمہ دعویٰ دائر کرچکا ہے۔ ۴:- رقم نقدی سسرال سے اُدھار تھوڑے دن میں واپس کرنے کا عہد کرکے واپس نہیں دیتا، گیارہ ماہ گزر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں گزری ہوئی قربانی میں سسر سے اپنی قربانی کے حصے کی رقم گاؤں میں دِلا کر اب تک ادا کرنے میں ٹال مٹول کرتا ہے اور حق مہر بھی نہیں دیتا، کیا ان خلاف ورزیوں کی صورت میں طلاق ہوگئی؟

جواب:- اگر مذکورہ واقعات دُرست ہیں تو بلاشبہ شوہر نے اقرارنامے کی کئی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس صورت میں بیوی یا سسر کو طلاق واقع کرنے کا اختیار صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ کسی شرط کی خلاف ورزی کے فوراً بعد طلاقِ بائنہ واقع

(۱ تا ۳) وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار کتاب الطّلاق باب تفویض الطّلاق ج:۳ ص:۳۱۵ و ۳۱۲ (طبع سعید) قال لها اختاری أو امرک بیدک ینوی تفویض الطّلاق .... أو طلّقی نفسک فلها أن تطلق فی مجلس علمها به مشافهة أو اخبارًا وان طال .... ما لم تقم لتبدّل مجلسها حقیقة أو حکمًا بان تعمل ما یقطعه .... لا تطلق بعده أی المجلس .... الخ.

کرے،[۱] اور اس میں بالکل تاخیر نہ کرے،[۲] اگر شرط کی خلاف ورزی کے فوراً بعد طلاق واقع نہیں کی اور ذرا بھی دیر ہوگئی تو عورت یا سسر کا طلاق واقع کرنا صحیح نہ ہوگا،[۳] البتہ اقرارنامہ چونکہ کئی شرائط پر مشتمل ہے اس لئے اگر بیوی یا سسر نے کسی ایک شرط کی خلاف ورزی پر فوراً طلاق واقع نہیں کی تو اب انہیں آئندہ اسی شرط کی دوبارہ خلاف ورزی پر طلاق کا اختیار نہ ہوگا، لیکن اس کے بعد اگر شوہر کسی اور شرط کی خلاف ورزی کرے تو اس وقت انہیں پھر اختیار ملے گا بشرطیکہ خلاف ورزی کے فوراً بعد طلاق واقع کریں، اب مذکورہ صورت میں اگر بیوی نے کسی شرط کی خلاف ورزی کے بعد مذکورہ بالا احکام کے مطابق طلاق دی ہے تو وہ واقع ہوگئی،[۱] اور اگر شرط کی خلاف ورزی کے بعد دیر کردی اور پھر طلاق واقع کی تو طلاق نہیں ہوئی۔[۲]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۰/۱۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۲/۲۱ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مسئلہ غلط سمجھنے کی بناء پر تفویضِ طلاق متحقق نہ ہونے کے باوجود طلاقِ بائن کا وقوع سمجھنا

سوال:- میری شادی لاہور میں ۲۴؍جولائی ۱۹۵۴ء کو یعنی چوبیس سال قبل نجمہ خاتون سے ہوئی، نجمہ خاتون کے ماں باپ نہیں تھے، اپنی خالہ، اور پھر ان کی وفات کے بعد خالہ زاد بہنوں کے پاس پرورش پائی، میری شادی ان کی خالہ زاد بہن کے ذریعہ ہوئی، شادی سادہ طریقے پر ہوئی، مہر مبلغ پانچ ہزار معجل عند الطلب قرار پایا۔ میں پاکستان ایئرفورس میں ملازم تھا، پانچ اولادیں ہوئیں، تنخواہ قلیل تھی لیکن زندگی ہنسی خوشی سے گزری، اس کے بعد میری بیوی نے مانع حمل دوائیں استعمال کرکے اپنے کو مزید اولاد سے بچالیا (چونکہ کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور مزید بچوں کی پیدائش تعلیم میں مانع ہوسکتی تھی)۔

جب میری شادی ہوئی تو وہ معمولی پڑھی لکھی تھی، چنانچہ میں نے اپنی بیوی کو گھر پر پڑھانا شروع کیا، جب میری پہلی بچی پیدا ہونے والی تھی اُسے آٹھویں جماعت کا کورس پڑھانا شروع کردیا، اور ۱۹۶۰ء میں جبکہ میرا تیسرا بچہ پیدا ہوا تھا تو میں نے اس کو میٹرک کا امتحان دِلوادیا، جس میں وہ دو تین پرچوں میں فیل ہوگئی، اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں جبکہ میری بچی میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دے رہی تھی میں نے اپنی بیوی کو بھی ساتھ پڑھایا اور دونوں کا امتحان دِلوایا، خدا کے فضل سے دونوں کامیاب

(۱،۲) گزشتہ صفحے کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

ہوگئیں۔ بعد میں میری بچی نے بی اے کرلیا، اور میں نے اپنی بیوی کو طبیہ کالج کراچی میں چار سالہ کورس کے لئے داخلہ دِلوادیا، اور میں نے یہ اس خیال سے کیا کہ اگر میں مرجاؤں تو میری بیوی کسی پر بار نہ بنے اور عزّت کے ساتھ اپنا پیٹ بھرکر بچوں کی پرورش وتعلیم دِلا سکے۔

۱۹۶۵ء کی سترہ دن کی جنگ میں ایک دَم بوڑھا ہوگیا، جب میں سرگودھا سے واپس آیا تو میرے سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہوچکے تھے، ۱۲؍فروری ۱۹۶۴ء کو پاکستان ایئرفورس کی طرف سے میں دو تین سال کے لئے ابوظہبی ایئرفورس میں مقرّر ہوکر چلا گیا، اس وقت میری بیوی طبیہ کالج میں زیرِ تعلیم تھیں اور میں کورنگی کریک میں رہتا تھا، جانے سے قبل ناظم آباد میں کرایہ پر مکان لے کر اس میں بیوی بچوں کو منتقل کردیا اور چلا گیا۔

۱۹۶۷ء میں طبیہ کالج سے انہوں نے اپنا چار سالہ کورس مکمل کرلیا، اور اپنے کالج کے ایک ساتھی جو اِن سے دو سال پہلے فارغ ہوگئے تھے وہ اِن دنوں کلینک چلا رہے تھے اور اپنی ہونے والی بیوی کے لئے علیحدہ کلینک بھی چلانے کا پروگرام بنا رہے تھے، اُن سے ان شرائط پر کہ ان کی زیرِ نگرانی شام کے اوقات میں کلینک پر یہ بیٹھیں گی اور وہ جلد ہی ان کو رجسٹریشن کے لئے سرٹیفکیٹ دے دیں گے اور ساتھ ہی اپنی آمدنی میں سے بھی کچھ حصہ ان کو مل جایا کرے گا۔ لہٰذا وہ بیٹھنے لگیں، یہ تمام باتیں میری بیوی نے مجھ کو خط کے ذریعہ مطلع کیں اور میں نے اجازت دے دی، چونکہ مجھے اپنی بیوی پر مکمل اعتماد تھا اور میں اس کی کسی بات پر شک نہیں کرتا تھا، اب تک ہماری زندگی انتہائی پُرمسرّت گزری تھی۔

ابوظہبی کے دورانِ قیام میں تین ہزار روپیہ ماہوار بھیجتا رہا، دو ہزار خرچ کے لئے اور ایک ہزار مکان کی تعمیر کے لئے، یا مکان خریدنے کے لئے، لیکن بعد میں یہ پتہ چلا کہ تین ہزار روپے خرچ ہوتے رہے اور پھوٹی کوڑی بھی جمع نہیں کرسکی، اس دوران اُنہوں نے دُوسرا مکان ناظم آباد میں کرایہ پر لے لیا جس کا کرایہ چار سو روپے ماہوار تھا، اس میں ٹیلیفون بھی تھا، مجھے یہ کہا گیا کہ ٹیلیفون سے یہ فائدہ ہے کہ مہینے میں کم از کم ایک بار بھی ٹرنک کال پر بات ہوسکتی ہے، میں مطمئن بلکہ خوش تھا۔ لیکن یہ ٹیلیفون میرے لئے سب سے بڑی پریشانی کا سبب بنا، اس کے ذریعہ میری بیوی نے دوستیاں بڑھانا شروع کردیں، اس بات پر ماں بیٹے میں جھگڑے شروع ہوگئے، میرے بڑے لڑکے کو ان باتوں پر اعتراض ہوتا تھا، تنگ آکر لڑکے نے مجھ کو ایک خط میں ان حالات سے مطلع کیا، میں نے لڑکے کو بہت سخت اور ڈانٹ کر خط لکھا کہ تم نے اپنی ماں کے بارے میں ایسا کیونکر سوچا؟ ساتھ ہی اپنی بیوی کو بھی کافی ڈانٹ کر سخت خط لکھا، یہ بات فروری ۱۹۶۶ء کی ہے، لیکن میری بیوی نے مجھے اور اپنی اولاد سے اب جھوٹ بولنا شروع کردیا، اور اُن کی دوستی کا سلسلہ چلتا رہا، انتہا یہ کہ انہوں نے اپنے ایک ''بھائی'' کے اشتراک

میں علیحدہ کلینک کھول لی اور مجھ کو انہوں نے یہ باور کرایا کہ یہ لڑکا شادی شدہ ہے (جو کہ غلط تھا)، اور ایک ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے (یہ بھی غلط تھا)، خود میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا ہے (یہ بھی غلط تھا)، غرضیکہ مجھ سے تمام باتیں جھوٹ اور غلط لکھ کر نئی کلینک کھولنے کی اجازت لے لی، اب حالات اور خراب ہوگئے، دو دو ماہ تک خط کا منتظر رہتا، خیریت کی اطلاع نہیں ملتی، روپیوں کا کوئی حساب نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ ان کے پاس کس قدر رقم جمع ہوئی ہے؟

دُوسرے لوگوں کے جو خطوط آئے ان کے ذریعہ معلوم ہوتا کہ گھر کا ہر فرد تباہ ہو رہا ہے، بچے اسکول نہیں جا رہے ہیں، اور مسلسل ناغوں کی وجہ سے ایک بچے کا نام کٹ گیا ہے، غرضیکہ نہایت پریشان کن اطلاعات ملتی رہیں، ان حالات سے تنگ آکر ایک تفصیلی خط لکھا اور اس میں ان تمام حالات کی نشاندہی کی، ساتھ ہی ساتھ خط میں ایک جملہ محض روانی میں تحریر کر دیا: ''حالات اس قدر خراب ہوگئے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو جائز کاموں میں سب سے ناپسند کام طلاق نہ ہوتا تو شاید کب کا دے چکا ہوتا، بہرحال اگر تم چاہو تو میں اس پر غور کر سکتا ہوں۔''

حسنِ اتفاق سے میں انہی دنوں تفہیم القرآن کا مطالعہ کر رہا تھا، اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ اس دن جو سورت زیرِ مطالعہ تھی وہ سورۂ اَحزاب کی سورت تھی، جس میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر یہ ظاہر کیا کہ اگر تمہاری بیویاں دُنیا کی آسودگیاں چاہتی ہیں تو اُن کو کچھ دے کر علیحدہ کر دو، اور اگر اللہ اور رسول کا قرب چاہتی ہیں تو اس کا بڑا اجر وثواب ہے، جب میں نے اس کی یہ تفسیر پڑھی تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، اور میں یہ سمجھا کہ میرے اس مذکورہ جملے سے میں نے اپنی بیوی کو یہ حق منتقل کر دیا ہے، حالانکہ قبل ازیں میرا کوئی ارادہ یا مقصد نہیں تھا اور نہ ہی بعد میں کوئی ارادہ ہوا اور نہ اب ہے، چنانچہ میں نے اس جملے کے بعد کا سارا مضمون جو زیادہ اہمیت کا حامل نہیں تھا، حذف کر دیا اور تفہیم القرآن کی وہ تمام عبارت جو اس سورۃ سے متعلق تھی نقل کی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ: ''میں نے محض اتفاقیہ طور پر نادانستگی میں یہ جملہ لکھ دیا تھا، لیکن اب پتہ چلا کہ اگر مرد، عورت کو طلاق کا اختیار دیدے اور وہ اس کو حاصل کرنے کے بعد طلاق مانگ لے تو ایک عدد طلاقِ بائن واقع ہو جاتی ہے، اور اس کے بعد سارا معاملہ ختم ہو جاتا ہے، لہٰذا تم کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح حالات کو دیکھ لو، اسی لئے میں نے تم کو پوری تفسیر کی نقل کر کے روانہ کی ہے، ساتھ ہی ساتھ میں اس تفسیر کے مطالعے کے بعد وقت بھی معین کر رہا ہوں یعنی ۲۴ر جولائی ۱۹۷۶ء کو رات بارہ بجے تک تم مجھ کو اپنے جواب سے مطلع کر دو۔ خیال رہے کہ یہ تاریخ ہماری شادی کی سالگرہ بھی ہے، تمہارا جواب مجھ کو ۳۰-۳۱ جولائی تک مل جائے گا، میں بہت بے چینی سے تمہارے خط کا منتظر ہوں۔'' وغیرہ۔ اس کے جواب میں انہوں نے جو

خط بھیجا اس میں اس سے متعلق جو جملہ تھا وہ اس طرح کا تھا: ''آپ کو یاد ہوگا میں نے ایک بار کہا تھا کہ ہماری زندگی میں لفظ طلاق اگر کبھی مذاق میں بھی آیا تو میں سمجھوں گی کہ ہوگئی، اور اس خط میں تو آپ نے یہ لفظ طلاق سینکڑوں بار استعمال کیا ہے۔''

میں نے اُن کے اس جواب سے یہ سمجھا کہ انہوں نے طلاق مانگ لی، چنانچہ میں نے ان کو جو خط لکھا اس میں جو جملہ تحریر کیا تھا وہ یہ تھا: ''آپ کے خط کے بموجب ایک عدد طلاق بائن واقع ہوگئی ہے، باقی کی طلاقیں خودبخود وقتِ مقرّرہ پر ہوجائیں گی، جس کی تفصیل میں اپنے پچھلے خط میں تحریر کرچکا ہوں۔'' ساتھ ہی ان کو ہدایات کیں کہ اب آپ اپنی رہائش کے لئے کسی جگہ کا انتخاب کرلیں، حق مہر اداء کرچکا ہوں، پھر بھی اگر آپ کہتی ہیں کہ نہیں ملا تو جو رقم آپ کے پاس بینک میں جمع ہے اس میں سے آپ اپنا مہر لے سکتی ہیں، گھر کی ہر چیز آپ کی ملکیت ہے، البتہ بچی کے جہیز کی جو چیزیں ہیں وہ اس کو دے دیں اور اگر بچوں کے کپڑے دے دیں گی تو بڑا احسان ہوگا۔ ساتھ ہی میں نے اپنی بچی کو بڑا تفصیلی خط لکھا کہ تمہاری ماں کو میں نے محض اتفاقیہ یہ جملہ لکھا تھا اور اُنہوں نے فوراً طلاق حاصل کرلی، میں ان کو زندگی کے کسی حصے میں سکون سے رہنے نہیں دُوں گا، بچوں سے پوچھ لو کہ وہ کس کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں؟ اگر ماں کے ساتھ رہنا پسند نہ کریں تو تم ان کو میرے بڑے بھائی کے گھر پہنچادو۔

اس خط کے جواب میں ۲۳ راگست کو میری بیوی کا جو خط آیا اس میں اُنہوں نے لکھا کہ آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ نہ تو میں نے جب طلاق مانگی تھی اور نہ ہی اب مانگ رہی ہوں، میں نے اس خط میں آپ کو محض ایک بات یاد دِلائی تھی، آپ ذرا ذرا سی بات کو کس قدر اہمیت دے رہے ہیں، میرا کون ہے اور میں اب طلاق لے کر کیا کروں گی؟ وغیرہ وغیرہ۔ جب یہ خط مجھ کو ملا میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور نمازِ شکرانہ ادا کی، لہٰذا ۲۴ رستمبر سے پہلے ۱۳ رستمبر کو میں پاکستان آیا اور باقاعدہ تعلقات زن وشو قائم کئے۔

اب میری بیوی کو چند لوگوں نے یہ یقین دِلا دیا کہ اُس کو طلاق ہوچکی ہے، چنانچہ میں ابوظہبی سے اپنا قیام ختم کرکے جون ۱۹۷۷ء میں واپس آیا تو کچھ عرصہ بعد ہی اس نے یہ کہنا شروع کردیا کہ ہماری طلاق ہوچکی ہے، اور ۱۸ رستمبر ۱۹۷۷ء کو بچوں اور گھر کو چھوڑ کر چلی گئی اور عدالت میں تنسیخِ نکاح کا دعویٰ بھی کردیا، اس کا کہنا یہی ہے کہ یہ مجھ کو طلاق دے چکے ہیں۔ آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ واقعی ان حالات میں طلاق ہوگئی یا نہیں؟

تنقیح:۔

صفحہ:۵ کے آخر کی خط کشیدہ عبارت اور صفحہ:۶ کی شروع کی خط کشیدہ عبارت کے متعلق چند باتیں وضاحت طلب ہیں، جن کے بارے میں آپ کی زبانی وضاحت زیادہ مناسب ہے، لہٰذا آپ جمعہ کے علاوہ کسی بھی صبح ۹ بجے دار الافتاء دارالعلوم کورنگی کے ایریا کراچی نمبر۱۴ میں تشریف لاکر ملاقات کریں۔

والسلام

بندہ عبدالرؤف سکھروی

۱۳۹۸/۴/۱۶ھ

جوابِ تنقیح:-

۱:- حالات اس قدر خراب ہوگئے ہیں کہ اگر اللہ کو جائز کاموں میں سب سے ناپسند کام طلاق نہ ہوتا تو شاید میں کب کا دے چکا ہوتا، بہرحال اگر تم چاہو تو اس پر غور کرسکتا ہوں۔ (خط کشیدہ سیاہ)

۲:- لیکن اب پتہ چلا کہ اگر مرد، عورت کو طلاق کا اختیار دیدے اور وہ اُس کو حاصل کرنے کے بعد طلاق مانگ لے تو ایک عدد طلاقِ بائن واقع ہوجاتی ہے، اور اس کے بعد معاملہ ختم ہوجاتا ہے۔ (سرخ)

۳:- ساتھ ہی ساتھ اس تفسیر کے مطالعے کے بعد وقت معین کر رہا ہوں، یعنی ۲۴ر جولائی ۱۹۷۶ء رات بارہ بجے تک تم مجھ کو اپنے جواب سے مطلع کردو۔ (سرخ)

۴:- آپ کو یاد ہوگا میں نے ایک بار کہا تھا کہ ہماری زندگی میں لفظِ طلاق اگر کبھی مذاق میں بھی آیا تو میں سمجھوں گی کہ ہوگئی، اور اس خط میں تو آپ نے یہ لفظِ طلاق سینکڑوں بار استعمال کیا ہے۔ (سرخ)

۵:- آپ کے خط کے بموجب ایک عدد طلاقِ بائن واقع ہوگئی ہے، باقی طلاقیں خود بخود وقتِ مقررہ پر ہوجائیں گی، جس کی تفصیل میں اپنے پچھلے خط میں تحریر کرچکا ہوں۔ (سرخ)

۶:- آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ نہ تو میں نے جب طلاق مانگی تھی اور نہ ہی اب مانگ رہی ہوں، میں نے اس خط میں (سیاہ) تو آپ کو محض ایک بات یاد دِلائی تھی، آپ ذرا ذرا سی بات کو کس قدر اہمیت دے رہے ہیں، اور میں اب طلاق لے کر کیا کروں گی۔ (سرخ)

۷:- میں نے ان خطوط کی نقل اپنے پاس رکھ لی تھی جو میں نے پھاڑ کر جلادیئے تاکہ اس تلخ واقعے کی یاد پھر کبھی نہ آئے۔

۸:- یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ واقعی ان حالات میں طلاق ہوگئی ہے یا نہیں؟

جواب:- جس قدر باتیں سوال میں لکھی گئی ہیں، اگر وہ دُرست ہیں تو صورتِ مسئولہ میں سائل کی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوئی، کیونکہ سائل نے جو جملے صفحہ:۴ کے آخر میں نقل کیا ہے کہ: ''اگر اللہ تعالیٰ کو جائز کاموں میں سب سے ناپسند کام طلاق نہ ہوتا تو شاید میں کب کا دے چکا ہوتا، بہرحال

اگر تم چاہو تو میں اس پر غور کرسکتا ہوں‘‘ اس جملے سے تفویضِ طلاق متحقق نہیں ہوتی، لیکن سائل نے تفہیم القرآن کے مطالعے سے غلط طور پر یہ سمجھا کہ مذکورہ جملے سے تفویضِ طلاق ہوگئی ہے، اس کی بنیاد پر جب بیوی نے اس کو خط لکھا تو سائل نے یہ کہا کہ: ’’آپ کے خط کے بموجب ایک عدد طلاقِ بائن واقع ہوگئی ہے۔‘‘

یہ انشاءِ طلاق نہیں بلکہ حکمِ شرعی کا غلط بیان ہے، اس لئے اس سے بھی طلاق واقع نہ ہوگی، لیکن یہ جواب صرف اُس صورت میں ہے جبکہ سائل نے اپنے خطوط میں یا زبانی انشاءِ طلاق کا کوئی جملہ استعمال نہ کیا ہو، اگر کوئی ایسا جملہ اس نے کہا یا لکھا ہو جس کا ذکر اس سوال میں نہیں ہے تو صورتِ حال مختلف ہوگی، لہٰذا بہت سوچ سمجھ کر اور آخرت کو پیشِ نظر رکھ کر عمل کریں۔

هٰذا ما عندی
واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۵/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۵۳۷ ب)

شرائط کی خلاف ورزی پر بیوی کو طلاق کا حق دیا ہوا ہو تو بیوی اپنے اُوپر طلاق واقع کرسکتی ہے

سوال:- اقرار نامہ جو تین بار لکھا گیا ہے، حسبِ ذیل ہے۔ ۱:- یہ کہ زوجہ کے لئے شرعی پردہ کا انتظام کروں گا۔ ۲:- یہ کہ نفقات وغیرہ رزقِ حلال کا ضامن رہوں گا۔ ۳:- یہ کہ زوجہ کو زدوکوب نہیں کروں گا، حسنِ سلوک سے گزر کروں گا۔ ۴:- یہ کہ سسرال کا خدمت گزار رہوں گا اور صلہ رحمی کروں گا۔ ۵:- یہ کہ دینی اُمور مثل صوم وصلوٰۃ وغیرہ میں پابند رہوں گا۔ اس صورت میں داماد نے سسر کو گردن سے پکڑ کر گرادیا، چند منٹ تک سسر اور داماد آپس میں لڑتے رہے، جن کو کافی آدمیوں نے مل کر چھڑایا تھا۔ ۲:- سسر نے داماد کے قربانی کے لئے رقم دی تھی، چند بار طلب کرنے پر نہیں دیتا، ان خلاف ورزیوں کے باوجود عورت نے اپنے اُوپر تین طلاقیں واقع کی ہیں جس کا تمام لوگوں میں اعلان ہوچکا ہے، اس بناء پر شوہر کہتا ہے کہ طلاق زوج کرتا ہے عورت کی طلاق کیوں جائز ہے؟ بلکہ شوہر کہتا ہے کہ مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ میرے اقرار نامہ کی وجہ سے میری زوجہ پر طلاق ہوگی، اب قابلِ دریافت اَمر یہ ہے کہ شوہر کا عذر طلاقِ زوجہ میں کیا حق رکھتا ہے، چاہے عذر سچا ہو یا جھوٹا؟ عورت پر طلاق بائن کن خلاف ورزیوں سے پڑتی ہے؟

جواب:- اگر مذکورہ واقعات دُرست ہیں تو بلاشبہ شوہر نے اقرارنامے کی کئی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس صورت میں بیوی یا سسر کو طلاق واقع کرنے کا

اختیار صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ کسی شرط کی خلاف ورزی کے فوراً بعد طلاقِ بائن واقع کرے اور اس میں بالکل تاخیر نہ کرے، اگر شرط کی خلاف ورزی کے فوراً بعد طلاق واقع نہیں کی اور ذرا بھی دیر ہوگئی تو اس کے بعد عورت یا خسر کا طلاق واقع کرنا صحیح نہیں ہوگا،[1] البتہ اقرار نامہ چونکہ کئی شرائط پر مشتمل ہے، اس لئے اگر بیوی یا خسر نے کسی ایک شرط کی خلاف ورزی پر فوراً طلاق واقع نہیں کی تو اب انہیں آئندہ اسی شرط کی دوبارہ خلاف ورزی پر تو طلاق کا اختیار نہ ہوگا، لیکن اس کے بعد شوہر کسی اور شرط کی خلاف ورزی کرے تو اس وقت انہیں پھر اختیار ملے گا بشرطیکہ وہ خلاف ورزی کے فوراً بعد طلاق واقع کرلیں،[2] اب مذکورہ صورت میں اگر بیوی نے کسی شرط کی خلاف ورزی کے فوراً بعد مذکورہ بالا اَحکام کے مطابق طلاق دی ہے تو وہ واقع ہوگئی اور اگر شرط کی خلاف ورزی کے بعد دیر کردی اور پھر طلاق واقع کی تو طلاق واقع نہیں ہوئی۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱ تا ۳) وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار کتاب الطّلاق باب تفویض الطّلاق ج:۳ ص:۳۱۵ (طبع سعید)
قال لھا اختاری أو أمرک بیدک ینوی تفویض الطّلاق .... أو طلّقی نفسک فلھا أن تطلق فی مجلس علمھا بہ مشافھۃ أو اخبارًا وان طال .... ما لم تقم لتبدّل مجلسھا حقیقۃ أو حکمًا بان تعمل ما یقطعہ .... لا تطلّق بعدہ أی المجلس .... الخ.

﴿فصل فی الطّلاق الثلٰث وأحکامه﴾
(تین طلاق کے اَحکام)

تین طلاق کا مسئلہ اور حاملہ کی عدّت اور شرعی حلالہ کا طریقہ

سوال ۱:- میاں بیوی میں جھگڑا ہوگیا، میاں نے انتہائی غصّے کی حالت میں کہا کہ: ''خاموش ہوجاؤ ورنہ طلاق دے دُوں گا'' بیوی نے کہا: ''دے دو'' میاں نے کہا: ''اچھا! طلاق، طلاق، طلاق'' آیا شوہر کے فقط یہ الفاظ کہنے سے اُس کی بیوی کو طلاق ہوگئی یا نہیں؟

۲:- اگر ہوگئی تو رجعی ہوئی یا مغلّظ؟

۳:- یہ عورت حمل سے ہے، اس کی عدّت کیا ہوگی؟

۴:- اگر عورت مرد کے نکاح میں رہنا چاہے تو اس کی کیا صورت ہوگی؟

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں۔

۲:- مغلّظ طلاق ہوئی۔ [۱]

۳:- صورتِ مسئولہ میں اس کی عدّت وضعِ حمل یعنی بچے کی ولادت ہے۔ [۲]

۴:- کوئی صورت نہیں، بجز اس کے کہ عدّت گزارنے کے بعد وہ کسی اور شخص سے نکاح کرے اور وہ شخص اپنی مرضی سے کسی وقت اس کو ہم بستری کے بعد طلاق دیدے یا اس کا انتقال

---

(۱) وفی الفتاویٰ الهندیة کتاب الطّلاق، الباب الأوّل ج:۱ ص:۳۴۹ (طبع ماجدیه کوئٹه) وامّا البدعی .... أن یطلّقها ثلٰثًا فی طهر واحد بکلمة واحدة أو بکلمات متفرّقة .... فاذا فعل ذٰلک وقع الطّلاق وکان عاصیًا.
وفی الهدایة کتاب الطّلاق باب طلاق السنّة ج:۲ ص:۳۵۵ (طبع مکتبه شرکت علمیه ملتان) وطلاق البدعة أن یطلّقها ثلٰثًا بکلمةٍ واحدة أو ثلٰثًا فی طهر واحد فاذا فعل ذٰلک وقع الطّلاق وکان عاصیًا .... الخ.
وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۳۲ (طبع سعید) والبدعی ثلٰث متفرّقة. وفی الشامیة (قوله ثلٰثة متفرّقة) وکذا بکلمةٍ واحدة بالأولٰی........ وذهب جمهور الصّحابة والتّابعین ومن بعدهم من أئمّة المسلمین الی أنّه یقع ثلٰث.
(۲) وَأُوْلَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ. (الطّلاق:۴)
وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار باب العدّة ج:۳ ص:۵۱۱ (طبع سعید) وفی حق الحامل مطلقًا .... وضع جمیع حملها .... الخ. وفی الهدایة ج:۲ ص:۴۲۳ (طبع شرکت علمیه ملتان) وان کانت حاملًا فعدّتها أن تضع حملها .... الخ

ہوجائے تو اس کی عدت گزارنے کے بعد یہ عورت پہلے شوہر سے نئے مہر پر نیا نکاح کرسکتی ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۴/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۷۰۳ ب)

ایک وقت میں تینوں طلاقیں واقع ہونے پر ائمہ کا اجماع ہے، اور اس اجماع کے خلاف کوئی بات قابلِ قبول نہیں

سوال:- زید کی بیوی اپنے لڑکے کو مار رہی تھی اور گالیاں دے رہی تھی، اتنے میں زید بھی آ گیا، زید نے بیوی کو گالیاں دینے سے منع کردیا، مگر بیوی باز نہ آئی اور شوہر کو بھی گالیاں دینی شروع کردیں، جس پر زید کو غصہ آیا اور اس نے یہ الفاظ کہے: ''طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے'' لفظِ طلاق تین مرتبہ سے بھی زائد کہا ہے، مگر اس کو یاد نہیں ہے، اور یہ بات زید نے اپنے خاندان کے تقریباً تیس آدمیوں کے سامنے بیان کی ہے، کیا طلاق واقع ہوگئی اور کتنی؟ اب کوئی صورت ہے حلال ہونے کے لئے؟

۲:- اگر مذہبِ حنفی کے مطابق تین طلاق ہوچکی ہیں تو اہلِ حدیث سے فتویٰ لے کر عمل کیا جائے؟ کیونکہ نہ شوہر بیوی کو جدا کرنا چاہتا ہے، اور نہ بیوی جدا ہونا چاہتی ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اب وہ زید کے لئے مغلّظاً حرام ہوچکی ہے اور حلالہ کے بغیر ہرگز اس کے ساتھ نکاحِ ثانی بھی جائز نہیں ہے، دونوں کو فوراً الگ ہوجانا چاہئے، اگر وہ الگ نہ ہوں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان سے بیزاری کا اظہار کریں۔

۲:- تین طلاق دینے کی صورت میں چاروں ائمہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت مغلّظاً حرام ہوجاتی ہے،[۲] اور بغیر حلالہ کے حلال نہیں ہوسکتی، اس اجماع کے خلاف جو بات بھی کہی جائے وہ قابلِ قبول نہیں،[۳] اور کسی سے خلافِ اجماعِ أئمہ اربعہ فتویٰ

---

(۱) وفي مشكوة المصابيح ج:۲ ص:۲۸۴ (طبع قديمي كتب خانه) عن عائشة رضي الله عنها قالت: جاءت امرأة رفاعة القرظي الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت: انى كنت عند رفاعة، فطلّقني فبتّ طلاقي فتزوّجت بعدهٗ عبدالرحمن بن الزبير وما معه الا مثل هدبة الثّوب، فقال: اتريدين أن ترجعي الى رفاعة؟ قالت: نعم! قال: لا! حتّى تذوقي عُسَيْلته ويذوق عسيلتكِ. متفق عليه. وفي الهداية كتاب الطّلاق، باب الرّجعة، فصل فيما تحلّ به المطلّقة ج:۲ ص:۳۹۹ (طبع شركت علميه ملتان) وان كان الطّلاق ثلثًا في الحرّة أو ثنتين في الامة لم تحلّ لهٗ حتّى تنكح زوجًا غيره نكاحًا صحيحًا ويدخل بها ثم يطلّقها أو يموت عنها والأصل فيه قوله تعالى: "فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ." والمراد الطلّقة الثّالثة.

(۲، ۳) حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

لے کر اس پر عمل کرنا اور بھی گناہ ہے۔
واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندی شہری عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۰/۱۹ الف)

حاشیہ متعلقہ صفحہ گزشتہ...... (۲ و ۳) ایک وقت میں تین طلاقیں دینے سے تینوں طلاقیں واقع ہوجانے اور اس پر ائمہ اربعہؒ کے اجماع اور مخالفین کے دلائل کے جوابات سے متعلق مدلل اور مفصل تحقیق حضرتِ والا دامت برکاتہم کے مصدقہ درج ذیل فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

سوال:- میں اپنے ایک مسئلے کے بارے میں فتویٰ لینا چاہتا ہوں، اُمید ہے کہ آپ رہنمائی فرمائیں گے۔ میں نے اپنی بیوی کو کچھ گھریلو مسائل سے پریشان ہوکر اور اس کے علیحدہ گھر کے مطالبے پر باقاعدہ تین طلاقیں لکھ کر بذریعہ کورٹ بھیج دیں، میری بیوی انتہائی غصے والی ہے اور میری نافرمان بھی رہی، طلاق سے پہلے معاملات کو سنبھالنے کے لئے میں نے اپنے ماموں کو بھیج بھی ڈالا مگر اس سے اور کچھ ان کے رویے سے غلط فہمیاں اور بڑھیں اور مجھے یہ قدم اُٹھانا پڑا، میں نے یہ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۸ء کو کیا، اب تک ایک ماہ اور ۱۵ دن گزر چکے ہیں، میری بیوی اب تمام باتوں کی معافی مانگتی ہے اور بقول اس کے کہ وہ پہلے بھی تیار تھی مگر میرے ماموں کی غلط باتوں کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا، اس لئے میں بھی رُجوع کرنا چاہتا ہوں، میرا تعلق حنفی فرقے سے ہے، میری معلومات کے حساب سے اہلِ حدیث حضرات رُجوع کی اجازت دیتے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:- سائل کے سوالات کے حل پیش کرنے سے پہلے ہم اصل مسئلہ کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں، جس میں یہ ثابت کریں گے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں خواہ ایک جملے سے دی ہوں یا الگ الگ جملوں سے دی ہوں، تین طلاقیں شمار ہوں گی اور تینوں طلاقیں واقع ہوں گی اور حرمتِ مغلظہ ثابت ہوگی جس میں رُجوع نہیں ہوسکتا، اور حلالہ کے بغیر دوبارہ باہم نکاح بھی نہیں ہوسکتا، اور یہ کہ مذکورہ موقف قرآنِ کریم، احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، اور اسی پر جمہور صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم اور چاروں اماموں یعنی حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کا اتفاق ہے۔

اگر کسی نے ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، خواہ ایک جملے سے ہوں یا الگ الگ جملوں سے ہوں تو اس کا یہ فعل خلافِ سنت اور ناجائز ہے، تاہم اگر کسی نے اس طریقے سے تین طلاقیں دیں تو اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوکر حرمتِ مغلظہ ثابت ہوجائے گی، ذیل میں اختصار کے ساتھ قرآنِ کریم، احادیثِ مبارکہ، آثارِ صحابہؓ اور عباراتِ فقہ ملاحظہ ہوں:-

قال اللہ تعالیٰ: "اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ. الآیة." (سورة البقرة).[1]

"طلاق دو مرتبہ کی ہے، پھر خواہ قاعدے کے مطابق رکھ لے، خواہ اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے۔"

اس آیتِ کریمہ سے علمائے کرام نے ایک دفعہ میں تین طلاقیں دینے سے تینوں کے واقع ہونے پر استدلال کیا ہے، اور وہ اس طرح کہ اس آیتِ کریمہ کا مضمون یہ ہے کہ طلاق دو دفعہ کی ہے، اب اس میں دونوں احتمال ہیں کہ دو طلاق الگ الگ طہر میں دیدے یا ایک ساتھ دیدے، بہرصورت دونوں واقع ہوں گی، اور جب ایک وقت میں دو طلاقیں واقع ہوسکتی ہیں، تو تین بھی واقع ہوں گی، .... (باقی اگلے صفحے پر)

---

(۱) آیت نمبر:۲۲۹ پ۲۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)..........اس لئے کہ دو اور تین میں فرق کرنے والا کوئی نہیں ہے، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب صحیح بخاری میں "باب من اجاز الطّلاق الثلث" [1] میں تین طلاقوں کے واقع ہونے پر اسی آیتِ کریمہ سے استدلال کیا ہے۔

قال ابوبکر الرازی تحت عنوان "ذکر الحجاج لایقاع الثلث معًا" قوله تعالیٰ: الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان، الأیة. یدل علیٰ وقوع الثلث معًا مع کونه منهیا عنه وذٰلک لأن قوله تعالیٰ: "الطّلاق مرتان" قد ابان عن حکمة اذا وقع اثنتین بان یقول: أنتِ طالق، أنتِ طالق، فی طهر واحد، وقد بینا ان ذٰلک خلاف السنّة فاذا کان فی مضمون الأیة الحکم بجواز وقوع الاثنتین علی هٰذا الوجه دلّ ذٰلک علیٰ صحة وقوعهما لو أوقعهما معًا لأن أحدًا لم یفرق بینهما اهـ.
(رساله حکم الطّلاق الثلث بلفظ واحد فتویٰ علماء الحرمین الشریفین)

وفی الصحیح للامام البخاری رحمه الله تعالیٰ: باب من أجاز طلاق الثلث لقوله تعالیٰ: الطلاق مرتان فامساک بمعروف أو تسریح باحسان. اهـ.(ج:۲ ص:۷۹۱). [2]

وفی عمدة القاری شرح الصحیح للامام البخاریؒ: وجه الاستدلال به ان قوله تعالیٰ: ("الطّلاق مرتان") معناه مرة بعد مرة، فاذا جاز الجمع بین اثنتین جاز بین الثلث. اهـ.(ج:۹ ص:۵۳۸) [3]

اس آیتِ کریمہ کے علاوہ بھی چند آیاتِ مبارکہ اور بھی ہیں، جن سے تین طلاقوں کے واقع ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، ہم نے ایک آیت کے ذکر کو کافی سمجھا۔ اب چند احادیثِ طیبہ ملاحظہ ہوں جن سے مذکورہ موقف ثابت ہو رہا ہے:-

فی سنن النسائیؒ [4]: اخبر رسول الله صلی الله علیه وسلم عن رجل طلّق امراته ثلث تطلیقات جمیعًا، فقام غضبانا، ثم قال: ایُلعب بکتاب الله وانا بین أظهر کم؟ الحدیث.

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہنچی کہ ایک شخص نے اکٹھی تین طلاقیں دے دی ہیں، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصے میں کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ: میری موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیلا جارہا ہے۔''

اس روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے کا اظہار تو کیا، لیکن تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار نہیں دیا، بلکہ تینوں کو نافذ فرمایا، جیسا کہ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "فلم یرده النبی صلی الله علیه وسلم بل امضاه."

عن سهل بن سعد فی هٰذا الخبر قال: فطلّقها ثلث تطلیقات عند رسول الله صلی الله علیه وسلم فانفذه رسول الله صلی الله علیه وسلم.(ابوداؤد ج:۱ ص:۳۰۶). [5]

''حضرت عویمرؓ نے اپنی بیوی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین طلاقیں دے دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں کو نافذ فرمایا۔''

کان ابن عمر رضی الله عنهما اذا سُئل عمّن طلّق ثلثاً قال: لو طلقت مرة أو مرتین فان النبی صلی الله علیه وسلم أمرنی بهٰذا، فان طلّقها ثلثًا حرمت حتّی تنکح زوجًا غیره. (بخاری شریف ج:۲ ص:۷۹۲)۔ [6]

(باقی اگلے صفحے پر)

(۱) ج:۲ ص:۷۹۱ (طبع قدیمی کتب خانه). (۲) (طبع قدیمی کتب خانه)
(۳) ج:۲۰ ص:۲۳۲ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت). (۴) ج:۲ ص:۹۹ (طبع قدیمی کتب خانه).
(۵) (طبع میر محمد کراچی). (۶) (طبع قدیمی کتب خانه).

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)......... ''حضرت ابنِ عمرؓ سے جب اس شخص کے متعلق سوال کیا جاتا جس نے تین طلاقیں دی ہوں تو فرماتے: اگر تو نے ایک یا دو طلاقیں دی ہوتیں (تو رُجوع کرسکتا تھا)، اس لئے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اس کا (یعنی رجعت کا) حکم دیا تھا، اور اگر تین طلاقیں دے دیں تو عورت حرام ہوجائے گی یہاں تک کہ وہ دُوسرے مرد سے نکاح کرے۔''

ان احادیثِ مبارکہ کے علاوہ بھی ایسی روایات موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں تین طلاقیں تین ہی شمار ہوتی تھیں۔

غیرمقلدین حضرات جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کرتے ہیں، وہ عام طور پر دو روایات سے استدلال کرتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:-

حدیث نمبر۱:- **عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: طلّق رکانة بن عبد یزید اخو بنی مطلب امراته ثلثًا فی مجلس واحد فحزن علیها حزنًا شدیدًا، قال: فسأله رسول الله صلی الله علیه وسلم وکیف طلقتها؟ قال: طلقتها ثلثًا، قال: فقال: فی مجلس واحد؟ قال: نعم! قال: فانما تلک واحدة فارجعها ان شئت. قال: فرجعها. اسناده صحیح.** (مسند احمد ج:۴ ص:۴۷۷)۔[1]

''حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیں اور پھر وہ بہت افسردہ ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ: تم نے کیسے طلاق دی؟ انہوں نے عرض کیا: تین طلاقیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ایک مجلس میں؟ عرض کیا: جی ہاں! اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تو رُجوع کرلو، چنانچہ انہوں نے رُجوع کرلیا۔''

حدیث نمبر۲:- **عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: کان الطلاق علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم وابی بکر وسنتین من خلافة عمر طلاق الثلث واحدة. الحدیث.** (مسلم شریف ج:۱ ص:۴۷۷)۔[2]

''حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اور حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت کے شروع میں (ایک مجلس کی) تین طلاقیں ایک ہوا کرتی تھیں۔''

غیرمقلدین اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے عام طور پر مذکورہ بالا ان دو روایتوں سے استدلال کرتے ہیں، لیکن ان روایتوں سے مذکورہ موقف پر استدلال دُرست نہیں، وجوہات درج ذیل ہیں:-

حدیث نمبر۱ میں حضرت رکانہؓ کی طلاق کا جو قصہ مذکور ہے، اس میں روایات کے اندر اضطراب پایا جاتا ہے، بعض روایات میں ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں جیسا کہ مذکورہ روایت میں ہے، اور بعض روایات میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو لفظ ''بتّہ'' سے طلاق دی تھی، اور طلاقِ ''بتّہ'' سے مراد وہ طلاق ہے جس میں ایک سے تین طلاقوں تک کی گنجائش ہوتی ہے، یعنی اگر ایک طلاق کی نیت ہو تو ایک، اور تین کی نیت ہو تو تین طلاقیں واقع ہوں گی، اسی اضطراب کی وجہ سے اس روایت کے بارے میں علمائے حدیث نے مختلف اقوال اختیار کئے، مثلاً:

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو ''معلول'' قرار دیا۔

علامہ ابنِ عبدالبر رحمہ اللہ نے اس کو ''ضعیف'' کہا۔ (باقی اگلے صفحے پر)

(۱) ج:۴ ص:۲۱۵ (طبع مؤسسة الرسالة بیروت).
(۲) ج:۱ ص:۴۷۷ (طبع قدیمی کتب خانه).

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)..........حضرت امام ابوبکر جصاص اور علامہ ابن الہمام رحمہما اللہ نے اس کو "منکر" فرمایا۔

کیونکہ یہ روایت ان معتبر اور ثقہ راویوں کی روایت کے خلاف ہے جنہوں نے لفظِ "بتّہ" کے ذریعہ طلاق دینا نقل کیا ہے۔

حضرت امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے بھی اس کو ترجیح دی ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو طلاقِ "بتّہ" دی تھی، کیونکہ حضرت رکانہؓ کے گھر والوں نے اس کو روایت کیا ہے اور گھر والے گھر کے قصے کو دُوسروں سے زیادہ جانتے ہیں، چنانچہ امام ابوداؤدؒ نے فرمایا:-

عن عبدالله بن علي بن يزيد بن ركانة عن أبيه عن جده أنه طلّق امرأته "البتة" فاتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: ما اردت؟ قال: واحدة! قال: آلله؟ قال: الله! قال: هو على ما اردت، قال ابو داوٗد: وهٰذا أصح من حديث ابن جريج ان ركانة طلّق امرأته ثلٰثًا لأنهم أهل بيته وهم أعلم به. (سنن ابی داوٗد).(۱)

"حضرت یزید اپنے والد حضرت رکانہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاقِ "بتّہ" دے دی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ: تمہاری نیت کیا تھی؟ عرض کیا: ایک طلاق کی! آپ نے فرمایا: خدا کی قسم؟ عرض کیا: جی ہاں خدا کی قسم! آپ نے فرمایا: جو تم نے نیت کی وہی معتبر ہے (یعنی نیت کے مطابق ایک طلاق واقع ہوئی)۔ امام ابوداؤدؒ نے فرمایا کہ: یہ حدیث کے بیان کرنے والے ان کے اپنے گھر کے افراد ہیں، اور وہ اس واقعے کو دُوسروں کے مقابلے میں زیادہ جانتے ہیں۔"

خلاصہ یہ کہ حضرت رکانہؓ نے اس وجہ سے رُجوع نہیں کیا تھا کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طلاق شمار کرکے ان کو رُجوع کا حکم دیا تھا، بلکہ اس وجہ سے انہوں نے رُجوع کیا تھا کہ انہوں نے اپنی بیوی کو ایک طلاق کی نیت سے طلاقِ "بتّہ" دی تھی۔

حدیث نمبر۲:- اسی طرح غیرمقلدین کا اس حدیث شریف سے بھی اپنے موقف پر استدلال کرنا دُرست نہیں، وجوہات درج ذیل ہیں:-

الف:- اس روایت میں راوی کو "وہم" ہوا ہے، کیونکہ ابنِ طاؤسؒ سے اس کے خلاف روایت منقول ہے، اور علامہ باجیؒ نے حضرت ابنِ طاؤسؒ کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے، چنانچہ اوجز المسالک میں اس مضمون کو درج ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

في أوجز المسالك شرح المؤطا للامام مالك نقلًا عن الباجيؒ: وما روى عن ابن عباس في ذٰلك من رواية طاؤس، قال فيه بعض المحدثين: هو وهم، وقد روى ابن طاؤس عن أبيه عن ابن وهب خلاف ذٰلك وانما وقع الوهم في التأويل، قال الباجي: وعندى ان الرواية عن ابن طاؤس بذٰلك صحيحة فقد رواه عنه الأئمة معمر وابن جريج وغيرهما. (ج:۴ ص:۲۳۱)۔(۲)

وفي السنن الكبرىٰ للبيهقي: وهٰذا الحديث أحد ما اختلف فيه البخاري ومسلم فأخرجه مسلم وتركه البخاري وأظنه انما تركه لمخالفته سائر الروايات عن ابن عباس. (ج:۷ ص:۳۳۷)۔(۳)

(باقی اگلے صفحے پر)

(۱) ج:۱ ص:۳۰۱ (طبع میر محمد)۔　(۲) ج:۱۰ ص:۷ و ۸ (طبع تالیفات اشرفیہ ملتان)۔
(۳) (طبع نشر السنة ملتان)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)........." اس حدیث کے بارے میں حضرت امام بخاری و امام مسلم رحمہما اللہ کا اختلاف ہوا، سو امام مسلمؒ نے اس کو اپنی کتاب میں نقل کیا اور امام بخاریؒ نے چھوڑ دیا، اور میرے خیال میں امام بخاریؒ نے اس روایت کو اس لئے نہیں لیا کہ یہ روایت حضرت ابنِ عباسؓ کی دیگر روایات کے خلاف ہے۔"

وفي الجوهر النقي على هامش السنن الكبرىٰ: وذكر صاحب الاستذكار: ان هٰذه الرواية وهم وغلط لم يعرج عليها أحد من العلماء اهـ. (ج:۷ ص:۳۳۷)۔ (۱)

"صاحبِ استذکارؒ نے فرمایا کہ: یہ روایت واہم اور غلط ہے، علماء میں سے کسی نے اس کو ذکر نہیں کیا ہے۔"

ب:- اگر وہم وغیرہ سے قطع نظر بھی کی جائے تو بھی اس حدیث کے کئی معنیٰ و مطلب ہوسکتے ہیں، ایک مطلب وہ بھی بن سکتا ہے جو غیر مقلدین نے لیا ہے، لیکن یہ مطلب دُوسری احادیث کی بناء پر دُرست نہیں، اور فقہائے کرامؒ میں سے کسی نے بھی اس مطلب کو صحیح قرار دے کر یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین نہیں بلکہ ایک شمار ہوگی، لہٰذا اس کا سب سے زیادہ صحیح اور قوی معنیٰ و مطلب ذیل میں بیان کیا جاتا ہے جسے حضرت امام قرطبیؒ نے پسند فرمایا ہے اور جس کو خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے تقویت ملتی ہے۔

اس حدیث شریف میں کسی عام قاعدہ کا ذکر نہیں، بلکہ اس کا تعلق ایک خاص صورت سے ہے، اور یہ کہ شوہر لفظِ طلاق کو "تاکید" کی نیت سے دُہرائے، ہر جملہ سے الگ الگ طلاق کی نیت نہ ہو، تو اس صورت میں شوہر کی تصدیق کی جائے گی اور ایک ہی طلاق کے واقع ہونے کا حکم جاری کیا جائے گا، لیکن شوہر کی تصدیق اس وقت تک کی جاتی تھی اور شوہر پر اس وقت تک اعتماد کیا جاتا تھا جب لوگوں کے سینے اور دِل دھوکا وفریب سے صاف وشفاف تھے، لیکن جب حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں لوگوں میں جھوٹ، دھوکا اور فریب کا رواج ہونے لگا اور اب کسی کی دیانت پر بھروسہ کرکے اس کے دعویٰ کی تصدیق مشکل ہوگئی، تو حضرت عمرؓ نے ظاہر تکرار کو دیکھ کر اس کے مطابق تینوں طلاقوں کو نافذ فرمایا اور نیتِ تاکید کے دعویٰ کو قبول نہیں فرمایا۔

في تكملة فتح الملهم: وهٰذا الجواب ارتضاه القرطبي وقوّاه بقول عمر: ان الناس استعجلوا في أمر كانت لهم فيه اناة وكذا قال النووي: ان هٰذا أصح الأجوبة. (ج:۱ ص:۱۵۸)۔ (۲)

"اس جواب کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے پسند فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے اس کی تائید بھی فرمائی جس میں انہوں نے فرمایا کہ: لوگوں نے مہلت والی چیز میں جلد بازی سے کام لیا، حضرت امام نووی رحمہ اللہ نے بھی یہی فرمایا ہے اور یہ صحیح ترین جواب ہے۔"

اب چند مشہور اور کبار صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ ملاحظہ ہوں جن میں تین طلاقیں تین ہی شمار کی ہیں، یہ فتاویٰ مصنف ابنِ ابی شیبہ میں مذکور ہیں:-

كان عمر اذا أتي برجل قد طلّق امرأته ثلاثا في مجلس أوجعه ضربًا وفرّق بينهما. (۳)

"حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جب کسی ایسے شخص کو حاضر کیا جاتا جس نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہوں، تو حضرت عمرؓ اس کو سزا دیتے اور میاں بیوی کے درمیان علیحدگی بھی فرماتے۔"

(باقی اگلے صفحے پر)

(۱) (طبع نشر السنة ملتان). (۲) (طبع مكتبه دار العلوم كراچی).
(۳) مصنف ابن أبي شيبة ج:۵ ص: ۱ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه).

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)......... جاء رجل الی عثمان فقال: انی طلّقت امرأتی مائة، قال: ثلاث تحرمها علیک وسبعة وتسعون عدوان.(۱)

''ایک آدمی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ: میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں، اس پر انہوں نے فرمایا کہ: تین طلاقوں سے بیوی تمہارے اُوپر حرام ہوگئی اور باقی ستانوے حد سے تجاوز ہے۔''

جاء رجل الی علیّ فقال: انی طلّقت امرأتی الفًا، قال: بانت منک بثلاث اھ.(۲)

''ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آکر عرض کرنے لگا کہ: میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دیں، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: تین طلاقوں سے بیوی تم سے الگ ہوگئی۔''

عن عبداللہ انہ سئل عن رجل طلق امرأته مائة تطليقة، قال: حرمتها ثلاث.(۳)

''حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کسی شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی تھیں، تو انہوں نے فرمایا کہ: وہ تین طلاقوں سے حرام ہوگئی۔''

ان حضراتِ صحابہ کرامؓ کے علاوہ حضرت ابنِ عمر، حضرت ابنِ عباس، حضرت عمران بن حصین اور حضرت مغیرہ بن شعبہ وغیرہم رضی اللہ عنہم کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی۔

اب مذاہبِ اربعہ کی عبارات ملاحظہ ہوں!

قال ابن الهمام الحنفی رحمه الله: وذهب جمهور الصحابة والتابعین ومن بعدهم من أئمة المسلمین الٰی انه یقع ثلاث. (فتح القدیر ج:۳ ص ۲۵)۔(۴)

''جمہور صحابہؓ، تابعینؒ اور بعد میں آنے والے اماموں کا مذہب یہی ہے کہ تین طلاق دینے کی صورت میں تینوں طلاقیں واقع ہوں گی۔''

وقال العلامة الحطاب المالکی رحمه الله: وکلّما طلّق من ذٰلک یلزمه اھ. (مواہب الجلیل ج:۴ ص:۳۹)۔(۵)

''تین طلاقیں شوہر جس طریقے سے بھی دیدے، وہ تینوں نافذ و لازم ہوں گی۔''

وقال العلامة النووی الشافعی رحمه الله: فقال الشافعی ومالک وأبو حنیفة وأحمد وجماهیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلاث اھ. (شرح النووی شرح الصحیح للامام مسلمؒ ج:۱ ص:۴۷۸).(۶)

''حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور اگلے پچھلے علماء میں سے جمہور علمائے کرام کا مذہب یہی ہے کہ تین طلاق دینے کی صورت میں تین ہی واقع ہوں گی۔''

(باقی اگلے صفحے پر)

---

(۱) ج:۵ ص:۱۳ (طبع ادارة القرآن).
(۲) مصنف ابن أبی شیبة ج:۵ ص:۱۳ (طبع أیضًا).
(۳) مصنف ابن أبی شیبة ج:۵ ص:۱۲ (طبع أیضًا).
(۴) ج:۳ ص:۴۵۱ (طبع مکتبه عثمانیه کوئٹه).
(۵) (طبع دار الفکر بیروت).
(۶) (طبع قدیمی کتب خانه).

تین طلاق کے بعد حلالہ کا شرعی طریقہ

سوال:- اگست ۱۹۶۰ء میں میری شادی ہوئی تھی، اگست ۱۹۶۳ء کو ایک لڑکا تولد ہوا، جنوری ۱۹۶۴ء کو میں نے اپنی زوجہ کو تحریری طور پر تین طلاق دے دی، زوجہ ابھی تک لڑکے کے ساتھ والدین کے ہاں ہے، اب والدین بھی بہت ناراض ہیں، میں خود بھی پریشان ہوں، کیونکہ یہ کام میں نے دُوسروں کے ورغلانے سے کیا تھا، اب کوئی صورت ہوسکے تو تحریر فرمائی جائے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بیوی پر طلاقِ مغلّظ واقع ہوچکی ہے، اب حلالہ کے بغیر اس سے دُوسرا نکاح نہیں ہوسکتا، جس کی صورت یہ ہے کہ بیوی کسی دُوسرے شخص سے نکاح کرے اور اس کے ساتھ وظائفِ زوجیت بھی پورے کرے،[1] اس کے بعد اگر وہ شخص کسی وجہ سے اسے طلاق دیدے یا اس کا انتقال ہوجائے تو آپ بیوی کی عدّت گزر جانے کے بعد اس کی صریح مرضی سے دوبارہ نکاح کرسکیں گے،[2] اس عمل کو ''حلالہ'' کہتے ہیں، لیکن حلالہ کی نیت سے دُوسری جگہ نکاح کروانا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ...... وقال العلامة ابن قدامة رحمه الله: وان طلّق ثلٰثًا بكلمة واحدة وقع الثلٰث وحرمت عليه حتّى تنكح زوجًا غيره. اهـ. (بحواله رساله حكم الطلاق الثلٰث بلفظ واحد أعنى فتوىٰ علماء الحرمين الشريفين بالعربية)

''اگر شوہر نے بیوی کو تین طلاقیں دیں، تو تینوں واقع ہوں گی۔''

والله تعالیٰ اعلم
عصمت اللہ عصمہ اللہ
۱۴۱۹/۷/۲۹ھ

الجواب صحیح
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۹/۸/۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد عبداللہ عفی عنہ

الجواب صحیح
بندہ عبدالرؤف سکھروی

الجواب صحیح
محمود اشرف غفر اللہ لہ

الجواب صحیح
محمد کمال الدین الراشدی

الجواب صحیح
محمد عبدالمنان عفی عنہ

الجواب صحیح
اصغر علی ربانی

＊＊＊

(۲،۱) وفى مشكٰوة المصابيح ج:۲ ص:۲۸۴ (طبع قديمى كتب خانه) عن عائشة رضى الله عنها قالت: جاءت امرأة رفاعة القرظى الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت: انى كنت عند رفاعة، فطلّقنى فبتّ طلاقى فتزوّجت بعدهٗ عبدالرحمن بن الزبير وما معه الا مثل هدبة الثّوب، فقال: اتريدين أن ترجعى الى رفاعة؟ قالت: نعم! قال: لا! حتّى تذوقى عُسَيْلته ويذوق عسيلتكِ.

وفى الهندية ج:۱ ص:۴۷۳ (طبع ماجديه) وان كان الطّلاق ثلٰثًا فى الحرّة وثنتين فى الأمَة لم تحلّ لهٗ حتّى تنكح زوجًا غيرهٗ نكاحًا صحيحًا ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها.

وفى الهداية كتاب الطّلاق، باب الرّجعة، فصل فيما تحلّ به المطلّقة ج:۲ ص:۳۹۹ (طبع شركت علميه ملتان) وان كان الطّلاق ثلٰثًا فى الحرّة أو ثنتين فى الامة لم تحلّ لهٗ حتّى تنكح زوجًا غيره نكاحًا صحيحًا ويدخل بها ثم يطلّقها أو يموت عنها والأصل فيه قوله تعالىٰ: "فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ." والمراد الطلقة الثالثة.

جائز نہیں ہے۔[۱]

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۲/۵/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۱۰/ ۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلند شہری

تین طلاق کے بعد شوہر کا بیوی کو اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا

سوال:- میرے خاوند مسمّٰی سردار خان نے عرصہ تین سال ہوا طلاقِ مغلّظہ مثلثہ سہ بار طلاق، طلاق، طلاق دے کر مجھے آزاد کردیا، اور میرے اصرار پر ایک چھوٹے سے کاغذ پر لکھ کر میرے حوالہ کردیا، بعدۂ تین سال تک مکمل میری کوئی خبر نہیں لی، اور نہ ہی مجھے اس کا پتہ معلوم ہوسکا، اب تین سال بعد آیا اور مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں اس کے ساتھ رہ کر حقوقِ زوجیت ادا کروں، قرآن وسنت اور حنفی مسلک کی روشنی میں کیا میں اس کے ساتھ رہ کر حقوقِ زوجیت ادا کرسکتی ہوں؟

جواب:- مفتی عالم الغیب نہیں ہوتا، بلکہ جو صورت سوال میں بیان کی جاتی ہے، اُس کے مطابق جواب دے دیتا ہے، چنانچہ اگر یہ صحیح ہے کہ آپ کے شوہر نے آپ کو تین مرتبہ زبانی طور پر طلاق دے دی تھی تو آپ اس کے نکاح میں نہیں رہیں، بلکہ آپ پر طلاقِ مغلّظہ واقع ہوچکی ہے،[۲] اب شوہر کو نہ رُجوع کا اختیار ہے اور نہ حلالۂ شرعیہ کے بغیر آپ سے دوبارہ نکاح کرسکے گا،[۳] لہٰذا اب اُس کا یہ مطالبہ کہ آپ اس کے ساتھ رہیں سراسر ناجائز مطالبہ ہے جس کی تعمیل آپ کے لئے حرام ہے، آپ ہرگز اُس کے پاس نہ جائیں اور اگر طلاق کے بعد آپ کو تین ماہواریاں گزر چکی ہیں تو آپ دُوسری جگہ جہاں چاہیں نکاح کرسکتی ہیں۔[۴]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۶/۳/۱۴۰۱ھ
(فتویٰ نمبر ۴۳۸/۳۲ الف)

تین طلاق کے بعد غلط بیانی کرکے بیوی کو ساتھ رکھنے کا حکم

سوال:- اورنگی ٹاؤن سیکٹر نمبر 13C کراچی نمبر ۴۱ کا رہنے والا بنام شمس العالم زوج ماجدہ خاتون بنت سلطان احمد نے اپنی ساس لباس خاتون سے جھگڑا کرکے اپنی بیوی ماجدہ خاتون کو تین

---

(۱) وفی مشکوٰۃ المصابیح ج:۲ ص:۲۸۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المحلّل والمحلّل لہٗ. رواہ الدارمی ورواہ ابن ماجۃ عن علیّ وابن عباس وعقبۃ بن عامر.
وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۴۱۴ (طبع سعید) وکرہ التزوّج للثّانی تحریمًا لحدیث لعن المحلّل والمحلّل لہٗ بشرط التحلیل کتزوجتک علٰی أن أحللک وان حلّت للأوّل لصحّۃ النکاح .... الخ.
(۲ تا ۴) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

طلاق دے دی، مؤرخہ ۷۷/۶/۵ء کی رات کو محلے کے معتبر اشخاص کو لے جاکر سارے جھگڑے کی نوعیت بتائی اور صاف الفاظ میں سب کے سامنے تین طلاق کا اقرار کیا اور بیان دے کر دستخط بھی ثبت کئے، اور متواتر تین چار روز مختلف آدمی اور محلے کے ذی استعداد علماء کے سامنے بار بار تین طلاق کا اقرار کیا، جس کی بناء پر علمائے کرام نے طلاقِ مغلّظہ کا فتویٰ دے دیا، اور آپ سے اور دُوسرے معتبر مفتی صاحب سے تائیداً مہر اور دستخط لے گیا، اس نے خفیہ طور سے اپنے اصلی بیان کو مولوی محمد یونس کے ذریعہ تبدیل کراکے دارالعلوم سے جواز کا فتویٰ لیا، آپ مہربانی فرماکر اس فتویٰ کو منسوخ قرار دے دیں تاکہ لوگ اس کو زنا سے باز رکھ سکیں۔

جواب:- اصل یہ ہے کہ مفتی کو علمِ غیب نہیں ہوتا، اُس کا کام صرف یہ ہے کہ جیسا سوال اس کے سامنے آئے اُس کا جواب سوال کے مطابق دیدے، اگر کوئی شخص تین طلاقیں بیان کرے گا تو مفتی اس کا حکم بتادے گا، اور اگر کوئی شخص ایک یا دو طلاق بیان کرے گا تو اس کا حکم بتادے گا، اصل واقعے کی تحقیق نہ مفتی کا فرض ہے اور نہ اس کے لئے ممکن ہے۔

لہٰذا اگر کسی شخص نے غلط سوال مرتب کرکے اپنی مرضی کا جواب حاصل کرلیا تو اس کا سخت وبال اُس شخص پر ہوگا، لہٰذا اگر واقعۃً اس شخص نے تین طلاقیں دی تھیں اور پھر اس بات کو چھپا کر عورت کے حلال ہونے کا فتویٰ حاصل کرلیا تو اس نے کئی سخت گناہوں کا ارتکاب کیا، جھوٹ بولنے اور مفتی کو دھوکا دینے کا گناہ الگ ہے، اور ساری عمر زنا میں مبتلا رہنے کا گناہ الگ ہے، اس کو چاہئے کہ خدا سے اور آخرت کے حساب و کتاب سے ڈرے، اور بیوی کو فوراً علیحدہ کرکے توبہ و اِستغفار کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۱/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳/۲۹ الف)

عورت اگر اپنے کانوں سے طلاق سن لے تو اسے "المرأۃ کالقاضی" کے مسئلے پر عمل کرنا لازم ہے

سوال:- میری بیٹی انجم ظفر اور داماد (سابقہ) سردار محمود علی خان کے درمیان طلاق کا مسئلہ چل رہا ہے، دونوں نے اپنے تحریری بیان دے کر بنوری ٹاؤن مسجد کے مفتی صاحب سے فتویٰ لیا جو ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔

انجم ظفر نے آپ کے سامنے بیان دیا کہ اُسے ۱۹۷۶ء میں دو مرتبہ طلاق اس کے خاوند سردار

محمود علی خان نے زبانی دی، اور تیسری اور آخری مرتبہ ۱۹۸۰ء میں لکھ کر دی۔

سردار محمود علی خان جو ابھی آپ کے سامنے موجود ہیں، اُس نے بیان دیا کہ ۱۹۷۶ء کے متعلق اُسے کچھ یاد نہیں، ہاں! ۱۹۸۰ء میں ایک بار اُس نے لکھ کر طلاق دی، مگر علاوہ اس کے وہ حلفیہ بیان کرتا ہے کہ اُس نے پوری زندگی میں انجم ظفر کو طلاق نہیں دی۔ اپنی شرعی حتمی رائے سے نوازیں، مہربانی ہوگی۔

جواب:- میں نے پشت پر لکھے ہوئے فریقین کے مشترک سوال اور منسلکہ تحریروں کا مطالعہ کیا جن میں ہر فریق نے اپنے طور پر مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن کے دار الافتاء سے سوالات کئے ہیں، پھر احتیاطاً دونوں فریقوں سے زبانی بھی ان کا موقف سن لیا، سردار محمود علی خان صاحب کا بیان یہ ہے کہ انہوں نے صرف ایک مرتبہ ۱۹۸۰ء میں تحریری طور پر اپنی بیوی انجم کو طلاق دی ہے، اور ۱۹۷۶ء کا جو واقعہ انجم صاحبہ بیان کرتی ہیں وہ انہیں یاد نہیں، لہٰذا وہ اس بات پر حلف کرنے کو تیار ہیں کہ انہوں نے صرف ایک طلاق ۱۹۸۰ء میں دی ہے۔ دُوسری طرف انجم ظفر صاحبہ پورے وثوق سے کہتی ہیں کہ ۱۹۷۶ء میں ان کے شوہر سردار محمود علی صاحب نے ان کو دو مرتبہ "میں نے تمہیں طلاق دی" کے الفاظ استعمال کر کے طلاق دی، اور اس کے بعد کہا کہ: "ان کو پکی سمجھو" اس کے بعد کچھ اعزّہ کے کہنے سننے سے رُجوع ہوگیا، پھر ۱۹۸۰ء میں ایک مرتبہ انہوں نے میرے کہنے پر تحریری طور پر مجھے طلاق دی، جس میں انہوں نے لکھا کہ: "میں بہ ہوش و حواس طلاق دیتا ہوں۔" ان حالات میں شرعی حکم یہ ہے کہ جب مسماۃ انجم نے خود اپنے کانوں سے دو مرتبہ طلاق کا لفظ سنا ہے، اور تیسری بار تحریراً دیکھا ہے تو معروف فقہی قاعدے "المرأة كالقاضي"[1] کے اُصول پر اب ان کے لئے سردار محمود علی خان صاحب کے ساتھ بیوی کی حیثیت میں رہنا کسی طرح جائز نہیں، اُن پر شرعاً واجب ہے کہ وہ محمود علی خان صاحب سے علیحدہ رہیں، اور انہیں وظائفِ زوجیت کا موقع نہ دیں[2]، اور جب اُن کے لئے یہ امر ناجائز ہے تو سردار محمود علی خان صاحب کو بھی چاہئے کہ وہ انہیں اپنے ساتھ رکھنے پر اصرار نہ کریں، تاکہ وہ بیوی کو گناہ میں مبتلا کرنے کا سبب نہ بنیں، دیانت کا حکم یہی ہے[3]، اور اب اسی میں فریقین کے لئے عافیت ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۰/۹/۱۴۰۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۳۸/۳۵ د)

(۱، ۲) وفي ردّ المحتار ج:۳ ص:۲۵۱ (طبع سعید) والمرأة كالقاضي اذا سمعته أو أخبرها عدل لا يحلّ لها تمكينه .... الخ.

(۳) "المرأة كالقاضي" کے مفہوم کی مفصل تشریح اور "دیانت" کے حکم سے متعلق مزید تفصیل کے لئے ص:۳۴۹ تا ۳۶۱ پر حضرت والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

رُخصتی سے پہلے اور رُخصتی کے بعد تین طلاق کی صورت میں مہر کی ادائیگی کی تفصیل

سوال:- زید نے بیوی سے کہا کہ: ''اگر تو عمر سے بات کرے گی تو تجھے تین طلاق ہے'' چنانچہ بیوی نے جان بوجھ کر عمر سے بات کی، کیا طلاق ہوگئی؟ اور مہر کتنا دینا ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاقِ مغلّظہ واقع ہوگئی،[1] اب وہ زید کے لئے حلالہ کے بغیر ہرگز حلال نہیں ہوسکتی،[2] اور اگر زید نے اب تک اس کا مہر ادا نہیں کیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ فوراً بیوی کو مہر ادا کرے۔[3]

اگر یہ طلاق رُخصتی کے بعد دی ہے تو پورا مہر ادا کرنا ہوگا،[4] اور اگر رُخصتی سے پہلے دی ہے تو آدھا۔[5]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۸/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۸/۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

تین طلاق کا حکم اور تین طلاق کے بعد کسی اور فرقے کے عالم سے فتویٰ لے کر بیوی کو اپنے ساتھ رکھنا

سوال ا:- ایک شخص نے ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی چند افراد کی موجودگی میں، نشست تبدیل کر کے، یہ طلاق مغلّظہ ہوگئی یا نہیں؟ اس کے بعد شوہر نے بیوی کو زبردستی لے جاکر مباشرت بھی کی ہوگی، اور عورت اس پر قطعاً راضی نہیں۔

۲:- طلاق دینے کے وقت جو افراد موجود تھے وہ اب بھی یہی کہتے ہیں کہ اس عورت کا اب تجھے گھر رکھنا جائز نہیں، اور کچھ افراد کہتے ہیں کہ طلاقیں نہیں ہوئیں، اس عورت کو پاس رکھنا شرعی نقطۂ نگاہ سے قطعاً جائز ہے۔ وہ مرد کہیں شہر سے فتویٰ بھی لے کر آیا ہے اور کہتا ہے کہ عورت میرے نکاح سے باہر نہیں ہوئی۔

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۹۰ اور ۳۹۱۔ (۲) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳، ۴) وفي الهندية كتاب النكاح الباب السابع الفصل الثاني ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع ماجديه) والمهر يتأكد بأحد معان ثلثة: الدخول والخلوة الصحيحة وموت أحد الزوجين .... حتى لا يسقط منه شئ بعد ذلك إلّا بالابراء من صاحب الحق.

(۵) وفي الدّر المختار كتاب النكاح باب المهر ج:۳ ص:۱۰۴ ويجب نصفه بطلاق قبل وطءٍ أو خلوة ....الخ.

جواب ا:- صورتِ مسئولہ میں عورت پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اور مغلّظہ ہوگئی[1]، یعنی اب وہ حلالہ کے بغیر سابق شوہر کے لئے حلال نہیں ہوسکتی، ایسی صورت میں اسے زبردستی پکڑ کر لے جانا گناہِ عظیم کا ارتکاب ہے، عورت کو چاہئے کہ وہ جس طرح ممکن ہو اس سے اپنی جان چھڑائے، اور امکانی حد تک اسے مباشرت کا موقع نہ دے۔

۲:- جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عورت شوہر پر حرام نہیں ہوئی، غلطی پر ہیں، ائمہ اربعہ یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ کسی کے مذہب میں حلال ہونے کی گنجائش نہیں ہے،[2] اور کسی فرقہ کے کسی عالم سے فتویٰ کا سہارا لے کر اپنا مطلب حاصل کرلینا سخت ظلم اور گناہ ہے، معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، بیوی جس مسلک سے تعلق رکھتی ہو اسی مسلک کے علماء کا فتویٰ اس کے حق میں معتبر ہوگا۔

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۸۸/۶/۲۸ھ

جواب صحیح ہے، اگر شوہر کو اس کے رکھنے ہی پر اصرار ہے تو حرام سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ حلالہ کے بعد شریعت کے مطابق دوبارہ نکاح کرکے رکھے۔ بندہ محمد شفیع

زبان سے تین مرتبہ طلاق دی مگر بعد میں صرف ایک مرتبہ لکھ کر دی تو کیا حکم ہے؟

سوال:- زید نے زبان سے اپنی بیوہ زہرہ کو تین مرتبہ یہ کہا کہ: ''میں نے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی'' بعد میں لکھ کر ایک مرتبہ دی، واضح رہے زہرہ حاملہ بھی ہے۔

جواب:- صورتِ مذکورہ میں زید کی بیوی زہرہ پر تین طلاقیں اسی وقت واقع ہوگئی تھیں جب اس نے زبان سے یہ الفاظ کہے تھے، اس وقت اگر زہرہ حاملہ تھی تو اس کی عدّت بچے کا پیدا ہونا ہے،[3] بچے کی پیدائش کے بعد وہ جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، اب وہ زید کے لئے ہرگز حلال نہیں

---

(۱) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی شرح الصّحیح لمسلم للعلامۃ النّوویؒ کتاب الطّلاق باب طلاق الثلث ج:۱ ص:۴۷۸ (طبع قدیمی کتب خانہ) وقد اختلف العلماء فیمن قال لامرأتہ أنت طالق ثلاثا، فقال الشافعی ومالک وابوحنیفۃ وأحمد وجماھیر العلماء من السلف والخلف یقع الثّلاث .... الخ.

وفی الشّامیۃ کتاب الطّلاق ج:۳ ص:۲۳۳ (طبع سعید) وذھب جمھور الصّحابۃ والتّابعین ومن بعدھم من أئمۃ المسلمین الی أنّہ یقع ثلاث وبعد أسطر وقد ثبت النقل عن اکثرھم صریحًا بایقاع الثّلاث ولم یظھر لھم مخالف، فماذا بعد الحق الا الضّلال! نیز دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳۔

(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر۲۔

ہوسکتی اور حلالہ کے بغیر دونوں دوبارہ نکاح بھی نہیں کرسکتے۔[1]

والله سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۳/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۳۳۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

تین طلاق کا مسئلہ اور بیوی کی طرف سے مہر معاف کرنے سے مہر معاف ہوجائے گا

سوال:- آج مؤرخہ ۱۷ رستمبر ۱۹۷۶ء کو مسمّٰی سیّد سلطان اختر نے اپنی بیوی کنیز فاطمہ بنتِ سیّد یعقوب علی کو اُس کے بار بار کے مطالبے پر کہ مجھے طلاق دے دو، یہ سمجھایا کہ اس سے تمہارا اور بچوں کا مستقبل تباہ ہوجائے گا، اس پر اُس نے کہا کہ مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، چھوٹی بچی میرے پاس رہے گی اور باقی دو بچیاں تم لے جاؤ اور میں نے اپنا مہر اور ہر قسم کا خرچ نان نفقہ معاف کیا، اُس کی اس وضاحت اور شدید مطالبے پر خلع کا فیصلہ ان الفاظ پر: ''میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی'' کیا گیا، ''اب اس صورت میں تم آزاد ہو اور مجھ پر سگی بہن اور ماں کی طرح حرام ہو'' جو اُس نے قبول کرلیا۔

جواب:- مذکورہ صورت میں تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، اور طلاقِ مغلّظ واقع ہوگئی ہے،[2] جس کا حکم یہ ہے کہ اب وہ حلالہ کے بغیر شوہر کے لئے حلال نہ ہوگی،[3] اور چونکہ عورت نے مہر معاف کردیا ہے، اس لئے مہر بھی شوہر پر واجب نہیں۔[4]

والله سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۴۰۶ ء)

(۱ تا ۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص.۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ا تا ۳۔

(۴) وفی الھندیة کتاب النکاح الباب السابع الفصل الثانی ج: ۱ ص ۳۰۳۰ (طبع ماجدیه) والمھر یتأکد باحد معان ثلثة: الدخول، والخلوة الصحیحة .... حتّی لا یسقط منه شیء بعد ذٰلک الّا بالابراء من صاحب الحق.

وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۱۱۳ (طبع سعید) (وصحّ حطّھا) لکلّه أو بعضه (عنه) قبل او لا. وفی الشامیة تحت (قوله وصحّ حطّھا) الحطّ الاسقاط کما فی المغرب .... الخ. وفی الشامیة أیضًا کتاب النکاح باب المھر ج:۳ ص:۱۰۲ واذا تأکّد المھر .... لا یحتمل السقوط الّا بالابراء. وفی الھدایة باب المھر ج:۲ ص:۲۹۵ (طبع شرکت علمیه) وان حطّت عنهٔ من مھرھا صحّ الحطّ، لأنّ المھر حقّھا والحطّ یلاقیه حالة البقاء .... الخ.

تین طلاق کا مسئلہ اور عدّت کے اَحکام

سوال:- ایک شخص نے اپنی بی بی سے جہالت میں کہہ دیا کہ: ''تجھ کو طلاق دیا، طلاق دیا، طلاق دیا'' اس میں حکمِ شرعی کیا ہے؟ اور عدّت اپنے میکے میں گزارے یا اور کہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اب وہ حلالہ کے بغیر آپ کے لئے حلال نہیں ہوسکتیں(۱)، عدّت شوہر کے گھر میں گزارنی چاہئے(۲)، لیکن پردہ وغیرہ کا اہتمام کیا جائے۔(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۱/۱۱/۱۳۹۰ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۷/۲۱ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

غصّے کی حالت میں بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے اور صدقہ سے طلاق کا اثر زائل ہونے کا مسئلہ غلط ہے

سوال:- ایک شخص نے غصّے میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، اس طرح کہ: ''تم کو طلاق دیا، تم کو طلاق دیا، تم کو طلاق دیا'' اس صورت میں عندالاحناف کس قسم کی طلاق واقع ہوئی؟ اگر شوہر بیوی سے رجعت کرنا چاہے تو کیا صورت ہوگی؟ ایک مولوی صاحب نے بتایا کہ: غصّے کی حالت میں طلاق نہیں ہوتی اور غریب و مسکین کو کھلا پلا دینے سے اور عزیزوں پر صدقہ کردینے سے طلاق کا اثر زائل ہوجائے گا، کیونکہ غصّے میں طلاق دینے کی نیت اُس کی نہیں تھی۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اُس شخص کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں(۴)، اب وہ شوہر کے لئے حرام ہوچکی ہے اور حلالۂ شرعیہ کے بغیر اس سے دُوسرا نکاح بھی نہیں ہوسکتا(۵)، طلاق غصّے کی

---

(۱) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار باب العدّة ج:۳ ص:۵۳۶ (طبع سعید) وتعتدّان ای معتدّة طلاق وموت فی بیت وجبت فیه ولا یخرجان منه الّا أن تخرج او ینهدم المنزل او تخاف انهدامه أو تلف مالها .... الخ

وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۵۳۵، والبحر الرّائق ج:۴ ص:۱۵۴۔

(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۳۷ (طبع سعید) ولا بدّ من سترة بینهما فی البائن وأن ضاق المنزل علیهما أو کان الزّوج فاسقًا فخروجه أولٰی .... الخ. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۵۳۵ والبحر الرّائق ج:۴ ص:۱۵۴۔

(۴ و ۵) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

حالت میں بھی واقع ہو جاتی ہے،[1] اور تین طلاقوں کے بعد رجعت نہیں ہو سکتی،[2] اور صدقہ کرنے سے بھی طلاق کا اثر زائل نہیں ہوتا، جن صاحب نے یہ مسئلہ بتایا ہے، بالکل غلط بتایا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۲/۲۸ ب)

تین طلاق کے لئے تین ماہ میں ہونا ضروری نہیں

سوال:- ایک شخص نے شادی کی اور شادی کے چار پانچ یوم کے بعد اس کی بیوی کے والدین نے بیوی دینے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ یہ لڑکا شادی کے قابل نہیں، اس کشمکش میں ایک ماہ گزر گیا، اور اُس شخص کو طلاق پر مجبور کر دیا، اس مجبوری کی حالت میں چند آدمیوں کے سامنے طلاق نامہ لکھوایا اور زبانی دو دفعہ اس نے کہا کہ: ''میں نے اپنی بیوی کو جدا کر دیا'' ایک مہینے کے بعد چیئرمین کی طرف سے نوٹس آیا کہ تمہاری طلاق نہیں ہوئی ہے، چونکہ تین ماہ میں تین طلاق نہیں دی ہے اس لئے تمہاری طلاق واقع نہیں ہوئی، اور پھر اس کی بیوی واپس کر دی سات مہینے سے ساتھ رہ رہی ہے، از رُوئے شریعت یہ بتائیے کہ طلاق ہوگئی ہے یا نہیں؟ جواب تک پاس رکھا ہے یہ کیسا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اس شخص کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں، اب وہ بغیر حلالہ کے اس کے لئے ہرگز حلال نہیں ہو سکتی،[3] تین طلاقوں کے لئے تین ماہ میں ہونا ضروری نہیں ہے، ایک وقت میں تین طلاقیں دی جائیں تب بھی واقع ہو جاتی ہیں۔[4]

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۹/۱۹ الف)

''لا الٰہ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ تین طلاق'' الفاظ اور عدّت کے نفقہ کا حکم

سوال:- حاجی فضل احمد صاحب نے اپنی بیوی کو بوجہ جھگڑے کے یہ الفاظ کہے: ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تین طلاق''، (ساتھ دو مردوں اور تین عورتوں کی گواہی بھی حسبِ ذیل تھی):-

۱:- ایک شخص مسمّٰی عبدالرشید کہتا ہے کہ: طلاق کے الفاظ یہ تھے: ''تین طلاق دیدیا ہو۔''

---

(۱) وفی ردّ المحتار کتاب الطّلاق مطلب فی طلاق المدھوش ج:۳ ص:۲۴۴ (طبع سعید) ویقع طلاق من غضب خلافًا لابن القیم وھٰذا الموافق عندنا لما مرّ فی المدھوش۔

(۲) وفی الھدایة کتاب الطّلاق باب الرّجعة ج:۲ ص:۳۹۹ (طبع شرکت علمیہ ملتان) وان کان الطّلاق ثلثًا فی الحرّة أو ثنتین فی الأمَة لم تحلّ لهٗ حتّٰی تنکح زوجًا غیرہ نکاحًا صحیحًا ویدخل بھا ثم یطلّقھا أو یموت عنھا والأصل فیه قوله تعالٰی: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ... الخ۔

(۳ و ۴) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

۲:- دُوسرا شخص مسمّٰی عبدالہاشم کہتا ہے کہ: طلاق کے الفاظ یہ تھے: ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تجھے تین طلاق دیا ہوں۔'' یاد رہے کہ یہ دو گواہی اقرار کی ہے یعنی شاہد نہیں۔

۳:- وہ تین عورتیں جو عینی شاہد ہیں کہتی ہیں کہ: طلاق کے الفاظ یہ تھے: ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تین طلاق۔''

طلاق بتاریخ ۲۲راپریل کو دی تھی، عدّت کب سے شروع ہوگی؟ اگر طلاق واقع ہوئی ہو، پردہ، خورد و نوش کا کیا انتظام ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں حاجی فضل احمد صاحب کی بیوی پر تین طلاقِ مغلّظہ واقع ہوگئی ہے، اور اب وہ حلالہ کے بغیر اس کے لئے حلال نہیں ہوسکتی۔[1] جس دن طلاق دی تھی (۲۲راپریل) اسی دن سے عدّت شمار کی جائے گی،[2] اور عدّت تین مرتبہ ایامِ ماہواری کا گزرنا ہے، عدّت کے دوران شوہر پر نان و نفقہ اور رہائش کا انتظام کرنا واجب ہے۔[3]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی
۱۳۸۸/۲/۸ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۱۷/۱۹ الف)

''ایک طلاق، دو طلاق، تین طلاق'' الفاظ کا حکم

سوال:- آج سے تقریباً پانچ مہینے ہوئے ہیں کہ میں بہنوئی کے مکان پر گیا، وہاں کچھ رشتہ داروں کے ساتھ بات چیت ہو رہی تھی، دورانِ گفتگو میری بیوی کا تذکرہ آیا، میرے ساتھیوں نے میری بیوی کی بداخلاقی، فحش حرکات کے سلسلے میں بہت کچھ کہا، مجھے اس پر سخت غصہ آیا، میں نے غضبناکی کی حالت میں ''ایک طلاق، دو طلاق، تین طلاق'' لفظ استعمال کیا، لیکن دیا اور کس کو دیا، اس کا تلفظ نہیں کیا، اس وقت میری بیوی وہاں ایک میل دُور فاصلے پر سسرال کے ہاں تھی اور چار ماہ کی حاملہ تھی، اب حضرتِ والا سے درخواست ہے کہ شرعی حکم سے مطلع فرماویں۔

نوٹ:- اس سوال کے ساتھ کئی شہادتیں بھی آئی تھیں، جن میں سے کچھ تو وہی الفاظ کہتے تھے جو کہنے والے نے کہے تھے، اور دو شاہدوں نے لفظ ''دیا'' کو ذکر نہیں کیا۔

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۳ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ا تا ۳۔

(۲) فی الشامیة ج:۳ ص:۵۲۹ (طبع سعید) ویظهر انّ ابتداء العدّة من وقت وقوع الطّلاق .... الخ.
وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۲۰ (طبع سعید) ومبدأ العدّة بعد الطّلاق علی الفور.

(۳) وفی الفتاویٰ الهندیة کتاب الطّلاق، الباب السابع عشر فی النّفقات، الفصل الثالث فی نفقة المعتدّة ج:۱ ص:۵۵۷ (طبع ماجدیه کوئٹه) المعتدّة عن الطّلاق تستحق النّفقة والسکنیٰ کان الطّلاق رجعیًا أو بائنًا أو ثلثًا حاملًا کانت المرأة أو لم تکن کذا فی فتاویٰ قاضی خان.

جواب:- صورتِ مسئولہ میں سائل کی بیوی پر تین طلاقِ مغلظہ واقع ہوگئیں، اب وہ بغیر حلالہ کے اس کے لئے ہرگز حلال نہیں ہوسکتی،[1] سیاق و سباق نسبت الی الزوجہ کو معین کرنے کے لئے کافی ہے۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۱/۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

تین طلاق کے بعد مہر اور پردے کی تفصیل

سوال:- میری شادی ۱۹۶۹ء میں ہوئی، پھر میرے شوہر نے ۱۹۹۴ء میں الگ الگ ۴ مرتبہ مجھے یہ الفاظ کہے میرا نام درشہوار لے کر کہا کہ: ''میں نے تم کو طلاق دی'' بچے لڑکے ۲۵ اور ۲۶ سال کے ہیں۔

۱:- طلاق کے الفاظ جب کہے تو ۲ مرتبہ لڑکے موجود تھے۔

۲:- اور ۲ مرتبہ تنہائی میں کہے۔

مسئلہ عرض یہ ہے کہ اس ایک سال کے عرصے میں اُن کی شادی ہوگئی ہے، انہوں نے فتویٰ دِکھا کر کہا کہ اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔

۳:- کچھ عرصے بعد اُن کی طرف سے مسئلہ اُٹھا کہ پردہ نہ کرو، اور یہ کہ میں نے تم کو طلاق نہیں دی ہے، اگر تم چاہتی ہو تو اب دے دُوں گا، اور یہ بھی کہ کورٹ کے ذریعہ دُوں گا، وغیرہ یا گھر سے جاؤ۔

۱:- ان کا کہنا ہے کہ میری نیت نہیں تھی کہ طلاق دُوں۔

۲:- چار مرتبہ صاف کہا ہے کہ: ''درشہوار تم ایک طلاق'' پھر اس طرح کہا کہ: ''تم کو دُوسری طلاق''، پھر اسی طرح مختلف مواقع پر ۲ مرتبہ پھر کہا، اب کہتے ہیں کہ: ''ہر دفعہ میں نے پہلی سمجھ کر کہا ہے، مجھ سے پردہ نہ کرو۔''

۱:- وہ اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ الگ رہتے ہیں۔

۲:- میں اپنے بچوں کے ساتھ الگ گھر میں رہتی ہوں، پردے کی وجہ سے انہوں نے کئی بار گھر میں آکر مارا ہے، گالیاں وغیرہ دی ہیں۔

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳۔

(۲) وفی ردّ المحتار کتاب الطّلاق باب الصّریح تحت مطلب "سن بوش" یقع به الرّجعی ج:۳ ص:۲۴۸ (طبع سعید) ولا یلزم کون الاضافة صریحة فی کلامه لما فی البحر لو قال طالق فقیل لهٗ من عنیت؟ فقال امرأتی، طلّقت امرأتهٗ ....الخ.

مجھے فتویٰ دیں طلاق اور پردے کے بارے میں کیا اَحکام ہیں؟ شادی کے وقت میرا مہر سکہ رائج الوقت ۵ ہزار تھا، اُس کا کیا مسئلہ ہوگا؟ وہ بھی مجھے نہیں ملا ہے۔

پہلا فتویٰ بنوری ٹاؤن سے عبدالوہاب صاحب نے دیا تھا، وہ انہوں نے جلا دیا کہ بیٹی جوان ہے، اُس کے لئے مسئلہ نہ ہو کہ ماں کو طلاق ہوگئی ہے۔

جواب:- اگر سوال میں مذکورہ واقعہ دُرست ہے تو آپ پر تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں،(۱) اور اب شوہر کو طلاق سے رُجوع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، اور نہ آپ کے درمیان حلالہ کے بغیر دُوسرا نکاح ہوسکتا ہے،(۲) آپ دونوں پر واجب ہے کہ ایک دُوسرے سے الگ رہیں اور پردہ کریں،(۳) نیز اگر انہوں نے اب تک آپ کو مہر ادا نہیں کیا ہے تو ان کے ذمے ضروری ہے کہ فوراً آپ کو مہر ادا کریں۔(۴)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۶/۶/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۹/۱۷)

تین مرتبہ طلاقِ صریح کے الفاظ میں نیت اور غصّے کا اعتبار نہیں

سوال:- زید نے طیش میں آکر تین بار یہ جملہ کہا کہ: ''جا میں نے تجھے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی'' شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں،(۵) الفاظِ صریح میں نیت اور غصّے کی حالت سے کوئی فرق نہیں پڑتا،(۶) لہٰذا اب زید کی بیوی اس کے لئے حلالہ کے بغیر ہرگز حلال نہیں ہوسکتی، حلالہ کے بغیر نکاحِ ثانی بھی نہیں ہوسکتا۔(۷)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۳/۲۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱ و ۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳۔

(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۳۷ (طبع سعید) ولا بدّ من سترة بینهما فی البائن وان ضاق المنزل علیهما أو کان الزّوج فاسقًا فخروجه أولٰی .... الخ. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۵۳۵ (طبع ماجدیه)، والبحر الرّائق ج:۴ ص:۱۵۴ (طبع رشیدیه).

(۴) وفی الهندیة کتاب النکاح، الباب السابع، الفصل الثانی ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع ماجدیه) والمهر یتأکّد بأحدِ معان ثلثة: الدخول والخلوة الصّحیحة وموت أحد الزّوجین .... الخ.

(۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳۔

(۶) وفی الشّامیة ج:۳ ص:۲۵۰ (طبع سعید) (قوله أو لم ینو شیئًا) لما مرّ أن الصّریح لا یحتاج الی النیة ولٰکن لا بدّ فی وقوعه قضاءً ودیانةً من قصد اضافة لفظ الطلاق الیها عالمًا بمعناهُ. وفی الهدایة ج:۲ ص:۳۵۹ (طبع شرکت علمیه ملتان) فالصّریح قوله أنتِ طالق ومطلقة وطلقتک فهٰذا یقع به الطّلاق الرجعی .... ولا یفتقر الی النیة لأنه صریح فیه.

(۷) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

معاملات میں نہایت سادہ شخص کی طلاق کا حکم

سوال:- سلطان محمد نے رسم و رواج کے مطابق تین پتھر مارے اور کہا کہ: ''یہ ہیں میری عورت کی طلاقیں، اب یہ مجھ سے آزاد ہے۔'' سلطان محمد کو باؤلا سمجھا جاتا ہے، ویسے پہاڑ سے جانوروں کے لئے گھاس بھی لاتا ہے، اور یہ شخص خرید وفروخت بھی کرتا ہے، اس نے ایک بکری چالیس روپے پر تین میل دُور فروخت کردی ہے، جبکہ اس کے قرب و جوار والے اس سے یہی بکری چار پانچ روپے کم پر طلب کرتے تھے، علیٰ ہذا القیاس اس کے اکثر و بیشتر افعال صحت پر مبنی ہوتے ہیں، چونکہ سادہ ہے اس وجہ سے بیوقوف کہلاتا ہے، مگر درحقیقت اس کے افعال و اطوار پاگلوں جیسے نہیں، سلطان محمد کو عارضہ صرع (مرگی) کا لاحق ہے، یہ عارضہ پانچ دس منٹ تک رہتا ہے اس کے بعد پھر صحیح تندرست ہوجاتا ہے، آیا اس کی طلاقیں واقع ہوئی ہیں یا نہیں؟

جواب:- سوال میں سلطان محمد کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں، اگر وہ دُرست ہیں تو اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں،[۱] مندرجہ حالات کے پیشِ نظر اس کو معتوہ کہنا مشکل ہے۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۲۵ھ

دو یا تین طلاق دینے میں شک ہو اور گواہ تین طلاق کی گواہی دیں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- رشید احمد نے گواہ نمبر۱ شہادت علی کو بلوایا اور گواہ نمبر۲ عبدالرشید پہلے سے مزاج پُرسی کے لئے آئے ہوئے تھے، رشید احمد صاحب تقریباً ایک برس سے بیمار ہیں، رشید احمد صاحب نے ان دونوں گواہوں کی موجودگی میں طلاق دی، دونوں گواہوں کی گواہی اس کاغذ کی پشت پر درج ہے، لیکن رشید احمد صاحب کا بیان ہے کہ: ''مجھے یاد نہیں کہ میں نے دو طلاقیں دی ہیں یا تین'' اور ثمینہ بیگم کو بھی اس طلاق کی اطلاع نہیں دی گئی، وہ شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔

کل رات گواہ نمبر۲ سے دوبارہ دریافت کیا تو انہوں نے جو بیان دیا کیفیت کے عنوان کے تحت درج ہے، اب آپ اس کا شرعی حکم بتائیں کہ بیوی شوہر کے پاس رہ سکتی ہے یا نہیں؟

بیان گواہ نمبر۱:- 22-8-1977 بوقت دن کے گیارہ بجے یہ بیان خدا کو حاضر و ناظر جان کر

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳۔
(۲) ''معتوہ'' کی تعریف کے لئے دیکھئے: ردّ المحتار ج:۱ ص:۱۴۳ اور ج:۲ ص:۲۵۸، اور ''معتوہ'' کی طلاق کے حکم کے لئے دیکھئے: رد المحتار ج:۳ ص:۲۴۳ (طبع سعید)، اور ہندیۃ ج:۱ ص:۳۵۳ (طبع رشیدیہ)۔

دیتے ہیں: گواہ نمبرا صوفی شہادت علی: مجھے گھر سے بلایا گیا اور کہا کہ: میں طلاق دے رہا ہوں، میں نے ثمینہ بیگم کو طلاق دی، یہی الفاظ تین دفعہ دُہرائے، کلمہ طیبہ بھی پڑھا۔ دستخط شہادت علی۔

گواہ نمبر۲:- عبدالرشید: میں ملنے خود آیا تھا اور کہنے لگے کہ: میں طلاق دے رہا ہوں، میں نے ثمینہ بیگم کو طلاق دی، یہی الفاظ تین دفعہ دُہرائے۔ دستخط عبدالرشید۔

مدعی یعنی صاحبِ واقعہ کا بیان:- رشید احمد خودمختار، میں نے ان دونوں اشخاص کی موجودگی میں طلاق دی، لیکن مجھے یہ نہیں پتہ کہ طلاق میں نے دو دفعہ دی یا تین دفعہ۔ دستخط رشید احمد۔

کیفیت:- میری طبیعت خراب تھی کافی عرصے سے بیمار ہوں اور اُس وقت مجھے بہت تیز بخار تھا، حالت ٹھیک نہیں تھی، میں نے کلمہ یا بسم اللہ نہیں پڑھی تھی۔ عبدالرشید۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر صوفی شہادت علی اور عبدالرشید دونوں گواہ ایسے ہیں کہ عام طور سے جھوٹ نہیں بولتے اور اُن کی گواہی قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے تو ثمینہ بیگم پر تین طلاق واقع ہوگئی ہیں، اب وہ اپنے شوہر پر حرام ہوچکی ہے اور نہ اب طلاق سے رُجوع ہوسکتا ہے اور نہ حلالہ کے بغیر دُوسرا نکاح ممکن ہے، لما فی الدر المختار ولو شک أطلق واحدة أو أکثر بنی الأقل۔ (۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳۰/۲۸ ج)

تین طلاق ایک وقت میں دینے سے تینوں واقع ہوجانے پر ائمہؒ کا اجماع ہے، تین طلاقوں کے بعد بیوی کو اپنے پاس رکھنا

سوال۱:- ایک شخص نے اپنی بیوی کو لفظِ واحد کے ساتھ تین طلاقیں دیں، اب یہ ایک طلاق پڑی ہے یا تین؟ اس میں کوئی ائمہ کا اختلاف ہے؟

۲:- اگر یہ شخص بغیر نکاحِ ثانی کے اس کو پھر بیوی بنالے تو شریعت کی رُو سے اس کے ساتھ تعلقات رکھنا کیسا ہے؟

جواب۱:- تین طلاق ایک مجلس میں ایک لفظ سے دی جائیں یا مختلف الفاظ سے، بہرصورت تینوں واقع ہوجاتی ہیں، اور بیوی مغلّظہ ہوجاتی ہے، اس مسئلے پر چاروں ائمہ، امام ابوحنیفہؒ،

---

(۱) ردّ المحتار قبیل باب طلاق غیر المدخول بها ج:۳ ص:۲۸۴ (طبع سعید). وفی الهندیة ج:۱ ص:۳۶۳ (طبع رشیدیه کوئٹه) فان قال الزوج عزمت علی انها ثلاث او هی عندی علی انها ثلاث أضع الأمر علی أشدّه فأخبره عدول حضروا ذلک المجلس وقالوا کانت واحدة قال اذا کانوا عدولا أصدّقهم وآخذ بقولهم.

امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا اتفاق ہے، چاروں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔[۱]

۲:- ایسا شخص حرام کاری کا مرتکب ہے، اس کو راہِ راست پر لانے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا چاہئے اور اگر وہ باز نہ آئے تو اس سے میل جول کے خصوصی تعلقات نہ رکھنے چاہئیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۱۱/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۰۰/۲۹ ج)

تین طلاق کے بعد بغیر حلالہ دوبارہ نکاح کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص اپنی عورت کو تین عدد طلاقیں دے کر کافی مدت کے بعد بغیر حلالہ کے اسی عورت سے نکاح کر لیتا ہے، اب یہ شخص شریعت میں کیسا سمجھا جائے گا؟ جو لوگ ان کے نکاح میں شریک تھے ان پر کیا کفارہ ہے؟ اب اگر یہ شخص حلالہ کے لئے تیار ہوجائے تو کیا طریقہ ہے؟

۲:- اس شخص کے بارے میں علماء کیا فرماتے ہیں کہ جس نے مسجد میں کھڑے ہوکر، ایک شخص کو دھوکا دے کر یا جھوٹ بول کر کہا کہ حلالہ ہو چکا ہے، اور نکاح پڑھوالیتا ہے، کیا اس نکاح خواں کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- تین طلاقوں کے بعد بیوی شوہر پر بالکل حرام ہوجاتی ہے،[۲] اور حلالہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی جائز نہیں رہتا،[۳] لہٰذا جس شخص نے اپنی مغلّظہ بیوی کو حلالہ کے بغیر نکاح کر کے اپنے پاس رکھا اس کا نکاح باطل ہے،[۴] اور اس کو ساتھ رکھنا حرام ہے، اگر اس نے صحبت کی تو زنا کے حکم میں ہے، اسے فوراً توبہ و اِستغفار کر کے الگ ہوجانا چاہئے۔ عورت کو چاہئے کہ وہ عدّت گزار کر کسی اور شخص سے نکاح کرے، اور وہ شخص مر جائے یا از خود طلاق دیدے، تو اس کی عدّت گزار کر پہلے شوہر سے نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔

۲:- جن صاحب نے حلالہ کے بغیر پہلے شوہر سے نکاح پڑھایا، اگر انہیں پوری بات کا علم تھا کہ عورت مغلّظہ ہے اور حلالہ نہیں ہوا، تو توبہ کرنی چاہئے، اور اگر وہ توبہ نہ کریں تو اُن کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۳۵/۲۷ و)

(۱ تا ۳) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) دیکھئے حوالہ سابقہ اور ص:۴۱۹ کا حاشیہ نمبر۱ و۲۔

''تم کو طلاق دی اور تم کو چھوڑ دیا'' کے الفاظ کئی مرتبہ کہے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- میرے شوہر نے مجھے کہا کہ: ''تم کو طلاق دے دیا'' اور بیسیوں دفعہ یہ کہا کہ ''ہم نے تم کو چھوڑ دیا اور چھوڑ دیا''، تو کیا طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

جواب:- اگر سائلہ کا بیان دُرست ہے اور اس کے شوہر نے واقعۃً یہ الفاظ کہے تھے کہ: ''تم کو طلاق دے دیا اور تم کو چھوڑ دیا''،[1] تو اس کے شوہر کی طرف سے اس پر طلاق واقع ہوچکی، اور عدّت گزار کر جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، عدّت تین مرتبہ ایامِ ماہواری کا گزرنا ہے، اور یہ اس وقت سے شمار ہوں گے جب طلاق دی گئی تھی،[2] اگر اس کے بعد تین مرتبہ ماہواری آچکی ہے تو عدّت گزر گئی اور اب سائلہ آزاد ہے، اور کسی مزید انتظار کے بغیر نکاح کرسکتی ہے۔　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح　　احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ　　۱۳۹۱/۴/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۵۵۶ الف)

''ان کو طلاق دیتا ہوں'' کے الفاظ تین مرتبہ کہنے کے بعد آخری دو جملوں میں تاکید کی نیت کا دعویٰ کرنا

سوال:- میرے شوہر مسمّٰی سیّد ظفر احمد ولد سیّد احمد نے اُمورِ خانہ داری پر معمولی گفتگو شروع کی، لیکن ہمارے مابین اختلاف ہوا، یہاں تک کہ بات بڑھی، دورانِ گفتگو میرے شوہر مذکور نے نہایت غضب ناک ہوکر غصّے کی حالت میں میرے بھائی کی طرف مخاطب ہوکر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ: ''ان کو طلاق دیتا ہوں'' یہ جملہ تین مرتبہ دُہرایا ہے۔

دُوسرے تیسرے روز مسئلہ کی نزاکت کو سمجھنے لگے اور غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد بھی شوہر موصوف نے کہا اور یہی کہتے ہیں کہ: ''میرا ارادہ تو صرف ایک طلاق کہنا تھا، میں نے صرف غصّے کی حالت میں ایسا کہہ دیا، میرا ارادہ اور میری نیت صرف ایک طلاق کی تھی۔'' دُوسری خاص بات یہ کہ جس وقت طلاق کے الفاظ اور یہ واقعہ ہوا ہے اُس وقت میں (سائلہ) ایامِ حمل میں ہوں، بہرحال ایامِ حمل میں اور غصّے کی نہایت شدّت کی حالت میں یہ واقعہ ہوا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر

---

(۱) لفظ ''چھوڑ دیا'' سے متعلق تفصیل کے لئے ص:۳۶۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ و۲، اور ص:۳۴۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۱۸ کا حاشیہ نمبر۳، اور ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب:۔ صورتِ مسئولہ میں آپ پر تینوں طلاقیں قضاءً واقع ہوگئی ہیں، یعنی اب آپ کے لئے اُن کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہنا جائز نہیں، اور اب حلالہ کے بغیر اُن سے دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا، اور طلاق حالتِ حمل میں بھی ہوجاتی ہے، لما فی الدر المختار کرّر لفظ الطّلاق وقع الکل وإن نوی التأکید دیّن. وقال الشامیؒ أی ووقع الکل قضاءً وکذا اذا أطلق أشباہ: أی بأن لم ینو استئنافًا ولا تأکیدًا، لأن الأصل عدم التأکید. (شامی ج:۲ ص:۳۶۰)(۱)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۹/۲۸ ج)

عدالت میں تین طلاقوں کی گواہی کے لئے جن گواہوں کی ضرورت ہے وہ گواہ کیسے ہونے چاہئیں؟

سوال:۔ میں مسمّی محمد سوار خان ولد افسر خان کی شادی مسماۃ سکینہ بیگم دختر شیر زمان کے ساتھ ایک سال قبل ہوئی تھی، لیکن اسی دوران لڑائی جھگڑے ہوتے رہے اور مجھے بیوی نے قتل کرانے کی کوشش کی، اور یہی کوشش اب تک جاری ہے، اس لئے میں مجبور ہوکر اپنی زوجہ مسماۃ سکینہ بیگم مذکورہ بالا کو (اور جو تین چار جگہ بدنام بھی ہوچکی ہے) تین دفعہ طلاق شرع کے بموجب بتکرار سہ بار "طلاق، طلاق، طلاق دیتا ہوں، ایسی عورت کو اپنے نکاح میں رکھنا نہیں چاہتا، اور جو حق مہر تھا اُس کو اداء کردیا ہے، لہٰذا اب یہ عورت مجھ پر حرام ہے، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔" محمد سوار خان

گواہ: محمد صدیق خان۔ گواہ: محمد حسین خان۔ گواہ: محمد سلیم خان۔

مندرجہ بالا طلاق نامے کی رُو سے شرعی حکم کیا ہے؟ اور طلاق کا مسئلہ اگر عدالت میں پیش ہو، اور طلاق دہندہ منکر ہو تو گواہان کی ضرورت ہوگی، شرعاً گواہ کیسے ہونے چاہئیں؟

جواب:۔ مندرجۂ پشت طلاق نامے کی رُو سے سکینہ بیگم پر تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، اور وہ اپنے شوہر پر طلاقِ مغلّظہ سے حرام ہوچکی ہے، اب حلالۂ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا، اور گواہوں کے بارے میں جو بات آپ نے پوچھی ہے اس میں بڑی تفصیل ہے، جسے مکمل طور پر یہاں لکھنا مشکل ہے، یہ کام حاکم کا ہے کہ وہ گواہیاں لیتے وقت اس بات کی تحقیق کرے کہ ان میں شرعی

(۱) الدّر المختار مع ردّ المحتار ج:۳ ص:۲۹۳ (طبع سعید).

شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ اُن کی طرف سے استصواب ہو تو حکم بتادیا جائے گا۔ واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۸۱/۱۲۷/۲۷ و)

تین طلاق کے بعد عدّت کے اَحکام اور طے شدہ حلالہ کی شرعی حیثیت

سوال:- مسماۃ ساجدہ باجازتِ شوہر بغیر کسی تنازع کے اپنے والدین کے گھر کچھ عرصہ کے لئے رہنے گئی، چند ہی ایام کے بعد ساجدہ کو بذریعہ ڈاک طلاق نامہ موصول ہوا، ساجدہ کے والد نے شوہر زید کو طلاق نامہ دِکھایا، زید نے طلاق نامے سے انکار کیا اور بولا کسی دُشمن کی کاروائی ہے، زید اپنی بیوی ساجدہ کو پھر اپنے گھر لے گیا، کچھ عرصہ بعد لڑکی پھر اپنے میکے گئی، اُسے پھر زید نے بذریعہ ڈاک طلاق نامہ بھیج دیا، استفسار پر پھر زید نے طلاق نامے سے انکار کیا، تیسری مرتبہ بھی مسماۃ مذکورہ کے ساتھ ایسا ہی ہوا، مسمّٰی زید نے پہلے تو حسبِ سابق طلاق سے انکار کیا، مگر مزید دریافت اور تفتیش پر اپنے ہم عمر دوستوں اور عزیزوں کو صاف بتلادیا کہ اُس نے ساجدہ کو طلاق دی ہے، اس سے قبل بھی دو مرتبہ طلاق نامے بھجوائے تھے، ساجدہ خاتون اُسی مکان میں رہائش پذیر ہے، جس میں شوہر رہتا ہے، زید کے دو تین برادران بھی اُسی میں رہتے ہیں، ساجدہ کے والدین اور برادری کے لوگ چاہتے ہیں کہ اُس کو والدین کے گھر لے آئیں، اور ساجدہ کا عقدِ ثانی بکر سے کر کے بکر سے طلاق لینے کے بعد ساجدہ کا نکاح پھر زید سے کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ اوّل اور دُوسری طلاق کے درمیان ساجدہ کے بطن سے ایک بچہ بھی پیدا ہوا ہے جو حیات ہے۔ نمبر۱: کیا ساجدہ کا اُسی مکان میں رہنا جائز ہے جہاں زید و بکر رہتے ہیں؟

نمبر۲:- کیا پہلے سے طے کر کے کہ بکر سے نکاح کے بعد طلاق لے کر زید سے نکاح ہوگا، یہ حلالہ شرعی ہوگا؟

نمبر۳:- اگر متذکرہ بالا صورت جائز ہے تو ان لوگوں سے جو ایسا کرنا چاہتے ہیں اُن سے تعلقات رکھنا، ساتھ کھانا پینا شرعاً کیسا ہے؟

نمبر۴:- مابین دو طلاقوں کے جو اولاد ہوئی ہے اُس کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ساجدہ پر طلاق واقع ہو چکی ہے، اور طلاق کے بعد بچے کی پیدائش سے عدّت بھی ختم ہوگئی ہے، لہٰذا اب ساجدہ کا زید کے مکان میں رہنا شرعاً کسی طرح دُرست

نہیں، بالخصوص جبکہ کمرہ ایک ہی ہے،[1] اور اس میں دُوسرے بھائی بھی رہتے ہیں۔

۲:- پیشگی طے شدہ پروگرام کے تحت حلالہ کی غرض سے نکاح کرنا شرعاً جائز نہیں،[2] حدیث میں اس پر وعید آئی ہے، البتہ بغیر حلالے کی غرض کے دُوسرا شوہر اتفاقاً طلاق دیدے تو عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہوسکتی ہے، لیکن حلالہ کی ضرورت اس وقت ہے جبکہ پہلے طلاق نامے میں ہی تین طلاقیں دی گئی ہوں، اور اگر پہلے طلاق نامے میں تین طلاقیں نہ دی ہوں، بلکہ بعد کے طلاق ناموں کو شمار کر کے تین طلاقیں پوری ہوئی ہوں تو اس کا حکم الگ ہوگا، اس صورت میں پہلا طلاق نامہ بھیج کر دوبارہ مسئلہ پوچھ لیں، اور یہ کاغذ ساتھ ضرور بھیجیں۔

۳:- جو لوگ ایسا کرنا چاہتے ہیں اُنہیں خدا کا خوف دِلا کر فہمائش کرنی چاہئے۔

۴:- اگر اولاد طلاق کے بعد دو سال کے اندر اندر پیدا ہوجائے تو اس کا نسب طلاق دینے والے شوہر سے ثابت ہوگا، بشرطیکہ عورت نے اس دوران عدّت ختم ہونے کا اقرار نہ کیا ہو۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۲۸/۲۷ ء)

ایک وقت میں تین طلاق دینے سے اَئمہ اربعہؒ کے نزدیک تینوں واقع ہوجاتی ہیں

سوال:- گزارش یہ ہے کہ میرے (شمیم اختر کے) شوہر نے مجھ سے لڑکر معمولی بات پر میرے خالہ اور خالو کے بولنے پر تین طلاقیں لکھ بھیجیں ہیں، جو کہ شدید غصّے کی حالت میں لکھیں اور میرے نام اور میرے پتے پر بھیجنے کے بجائے میری خالہ کے گھر بھیجیں، اب وہ خود بہت سخت نادم ہے اور معافی مانگتا ہے، میں بھی بہت پریشان ہوں، میں نہیں چاہتی کہ علیحدہ ہوں، وہ اب فتویٰ بھیجتا ہے اور مجھے بلاتا ہے، بتایئے میرے لئے کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟ میری ڈیڑھ سال کی بچی بھی ہے اور میں سخت پریشان ہوں، وہ بھی بہت پریشان ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں شمیم اختر پر اس کے شوہر کی طرف سے تین طلاقیں واقع ہوچکی

---

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۳۶ کا حاشیہ نمبر۲ و۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) فی الدر المختار ج:۳ ص:۴۱۴ (طبع سعید) وکرہ التزوج للثانی تحریمًا لحدیث لعن المحلّل والمحلّل لہ بشرط التحلیل کتزوجتک علی ان احلّلک وان حلت للأوّل لصحة النکاح وبطلان الشرط .... الخ.

وفی الھندیة ج:۱ ص:۴۷۴ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) رجل تزوّج امرأة ومن نیته التحلیل ولم یشترطا ذٰلک تحل للأوّل بھذا ولا یکرہ ولیست النیة بشیء ولو شرطا یکرہ وتحل عند أبی حنیفة وزفر رحمھما اللہ تعالٰی کذا فی الخلاصة.

نیز دیکھئے ص:۴۲۰ کا حاشیہ نمبر۱۔

ہیں، اور وہ اپنے شوہر پر حرام ہوچکی ہے، اور بغیر حلالہ کے اس کے لئے سابقہ شوہر سے نکاح بھی جائز نہیں ہے۔[1] امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ چاروں بلکہ جمہور فقہائے اُمت کا یہی مسلک ہے،[2] شمیم اختر پر واجب ہے کہ وہ حلالہ کے بغیر شوہر کے پاس جانے سے مکمل اجتناب کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۸۶۹/۲۸ ج)

تین طلاقیں مجتمعاً یا متفرقاً دینے سے تینوں واقع ہو جاتی ہیں

سوال:- ہمارے ہاں مسمّٰی زید نے اپنی بیوی ہندہ کو یکدم تین طلاقیں دے دیں، اور باقاعدہ کچہری سے عرض نویسی لکھوا کر دو شہادتیں تحریر کرا کر دستخط اپنے بھی اور گواہوں کے بھی کرا کر اپنی بیوی کو دے دی، میرے پاس طلاق نامہ لائے، میں نے کہا یہ طلاقِ مغلّظہ واقع ہوگئی، زید کسی اور مفتی سے فتویٰ لے کر آیا کہ ایک ہی طلاق رجعی ہوئی ہے، اور میاں بیوی رہنے لگے، گاؤں کے باشندے معترض ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ زید اور ہندہ کے ساتھ کیا برتاؤ شرعاً کرنا چاہئے؟

جواب:- تین طلاقیں خواہ بیک وقت دی جائیں یا متفرق اوقات میں، بہرصورت واقع ہوجاتی ہیں،[3] اور ان کے بعد نہ رُجوع ہوسکتا ہے اور نہ حلالہ کے بغیر ازسرِنو نکاح ممکن ہے،[4] اس مسئلے پر چاروں ائمہ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا اجماع ہے،[5] لہٰذا اگر زید نے واقعۃً ہندہ کو تین طلاقیں دی تھیں تو ہندہ اپنے شوہر پر حرام ہوگئی اور حلالہ کے بغیر اس سے دوبارہ نکاح بھی ہرگز جائز نہیں۔[6] بعض ایسے حضرات جو چاروں ائمہ مجتہدینؒ میں سے کسی کی تقلید نہیں کرتے، جمہورِ اُمت کے برخلاف تین بیک وقت دی ہوئی طلاقوں کو ایک شمار کر کے رُجوع کا فتویٰ دے دیتے ہیں، لیکن یہ فتویٰ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کسی فقہ کی رُو سے صحیح نہیں ہوتا،[7] محض خواہشِ نفس کی خاطر ایسے لوگوں سے فتویٰ لے کر مطلقہ کو اپنے گھر میں رکھ لینا بدترین گناہ ہے، زید اور ہندہ کو فوراً الگ ہوجانا واجب ہے، ورنہ وہ

---

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۲۳ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۳) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۴) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔
(۵) دیکھئے حاشیہ نمبر۲۔
(۶) دیکھئے حاشیہ نمبر۱، اور ص:۴۱۹ کا حاشیہ نمبر۱ و ۲۔
(۷) دیکھئے حاشیہ نمبر۲۔

ساری عمر حرام کاری کے مجرم رہیں گے، احباب و اقارب کو بھی چاہئے کہ اپنا اثر و رُسوخ استعمال کر کے انہیں سمجھائیں اور اگر وہ باز نہ آئیں تو ان سے دوستانہ تعلقات نہ رکھیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸۶/۲۹ ب)

تین طلاق کے بعد عدت کے دوران پردے کا اہتمام واجب ہے

سوال:- میاں بیوی کا آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہوگیا تھا، اور میاں نے بیوی کو غصے میں آکر ایک ہی دفعہ بول دیا کہ: "جاؤ تم مجھ پر تین شرط طلاق ہو، جاؤ تم طلاق ہو اور یہ ماں بہن ہے" صرف ایک دفعہ کہا ہے، لڑکی کے ماں باپ کا نام نہیں لیا اور لڑکی خود موجود تھی، اب یہ عورت اس مرد کے گھر میں رہنے کے قابل ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، اور وہ مغلظہ ہوچکی ہے،[1] اب دونوں کے درمیان نکاح بھی حلالۂ شرعیہ کے بغیر نہیں ہوسکتا،[2] عدت کے دوران بیوی شوہر کے گھر میں رہے، لیکن پردے کا پورا اہتمام کیا جائے،[3] کیونکہ اب وہ اپنے شوہر کے لئے بالکل اجنبی عورت کے حکم میں ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲۵/۲۸ ب)

طلاق کی تعداد یاد نہیں مگر کم از کم تین بار کا گمانِ غالب ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال:- کسی بات پر میری بیوی سے میرا جھگڑا ہوگیا تھا، دورانِ جھگڑا میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا، اور نہ ہی مجھے کسی بات کا علم تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ ماں کے کہنے پر کہ طلاق دے دو، میں نے اچانک اپنی ماں کی آواز پر لفظِ "طلاق" کہہ دیا، میرا اندازہ ہے کہ میں نے تین دفعہ کہا ہے، لیکن مجھ کو یہ پتہ نہیں کہ میرے منہ سے لفظِ "طلاق" کتنی مرتبہ نکلا؟ اور نہ ہی میں اس کی شہادت دے سکتا ہوں، میں نے اپنی بیوی سے پوچھوایا کہ بتاؤ تم کو طلاق دی ہے؟ اس نے یہ کہا کہ: "میں نے طلاق کے لفظ اپنے کان سے نہیں سنے۔"

(۱ و ۲) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۲۶ کا حاشیہ نمبر ۲ و ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

بیوی کا بیان:- میرا جھگڑا ہو رہا تھا، میں اس جھگڑے میں اتنی پریشان تھی کہ میرے شوہر نے لفظِ "طلاق" کہا یا نہیں کہا میں نے کچھ سنا نہیں، جس کی شہادت میں اللہ اور رسول کو رکھتی ہوں۔ نور النساء

ماں کا بیان:- میں نے لڑکے کے منہ سے لفظِ "طلاق" نہیں سنا، میں خدا اور رسول کو گواہ کرتی ہوں۔

جواب:- سائل سے زبانی معلوم ہوا کہ اس نے کئی بار طلاق کے الفاظ کہے، اور کہتا رہا، لیکن صحیح عدد یاد نہیں، غالب گمان اُس کا یہ ہے کہ کم از کم تین مرتبہ ضرور کہے ہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، اور وہ مغلّظہ ہوچکی ہے،[1] اب اس کی بیوی آزاد ہے کہ عدت گزار کر دُوسرا نکاح کرسکتی ہے، اب سائل سے اس کا دُوسرا نکاح بھی بغیر حلالۂ شرعیہ کے نہیں ہوسکتا۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۳/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۸/۲۸ ب)

تین طلاق کے بعد حاملہ کی عدت اور حلالہ کا مسئلہ

سوال:- مسمّٰی بشیر احمد نے اپنی زوجہ ہاجرہ کو بحالتِ غصہ یہ الفاظ کہے: "طلاق، طلاق، طلاق" جبکہ اس کا نہ کوئی پہلے سے ارادہ طلاق دینے کا تھا، اور نہ اس وقت، بس غصّے میں بغیر سوچے سمجھے تین چار مرتبہ لفظِ "طلاق" استعمال کیا۔ بصورتِ مذکورہ بالا مسماۃ ہاجرہ پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ اگر ہوئی تو کون سی طلاق؟ اور باہمی رضامندی کی کیا صورت ہے؟

مسماۃ ہاجرہ کسی بھی صورت سے (یعنی یہ کہ اگر طلاق واقع ہوگئی تب بھی) بشیر احمد کے گھر سے جانے کے لئے تیار نہیں، اور اس وقت مسماۃ ہاجرہ حاملہ بھی ہے، چار بچے زیرِ پرورش ہیں، کسی صورت میں مسماۃ ہاجرہ بشیر کے گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ رہ سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مسمّٰی بشیر احمد کی زوجہ ہاجرہ پر تین طلاقیں ہوگئی ہیں، یہ طلاق مغلّظہ ہے،[3] لہٰذا اب شوہر نہ رُجوع کرسکتا ہے اور نہ حلالۂ شرعیہ کے بغیر دوبارہ باہم نکاح ہوسکتا ہے،[4] اور طلاق حمل کی حالت میں بھی ہوجاتی ہے،[5] البتہ اس کی عدت بچے کی پیدائش ہے،[6] بچہ پیدا ہونے تک وہ شوہر کے گھر میں پردے کے ساتھ رہے،[7] اور میاں بیوی کی حیثیت میں ایک دُوسرے سے ملنا اور

(۱ تا ۴) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔
(۵) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۳۲۱ کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۶) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۷) حوالہ کے لئے ص:۴۲۶ کا حاشیہ نمبر ۲ و ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

بے پردہ سامنے آنا سب ناجائز ہے، بچے کی پیدائش کے بعد مسماۃ ہاجرہ جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے[1]، پھر اگر وہ شوہر ہم بستری کے بعد از خود طلاق دیدے یا اس کا انتقال ہوجائے تو اس وقت وہ مسمّیٰ بشیر احمد کے ساتھ نئے مہر پر نکاح کرسکتی ہے، اس کے سوا باہم ملنے کی کوئی صورت نہیں۔　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳۱/۲۸ ج)

رُخصتی سے پہلے تین دفعہ لفظِ ''طلاق'' استعمال کرنے کا حکم

سوال:- علماء کیا فرماتے ہیں اس مسئلے میں کہ جس وقت میری عمر ۱۳ سال کی تھی، میری والدہ نے میرا نکاح ایک غیر ملکی باشندے سے جس کا نام حمیروز ولد نادر خان تھا، منگنی کی، رُخصتی نہیں ہوئی، غیر ملک سے بغیر پاسپورٹ کے آیا تھا، مذکورہ شخص نے اپنی چالاکی سے میری بیوہ والدہ کو مرعوب کیا اور بنگلہ، موٹر کار وغیرہ کا لالچ دے کر میرا نکاح حاصل کیا، اس شخص نے میری والدہ کے تقریباً ۱۴ ہزار روپے بھی غبن کردیئے، میری والدہ اور عزیزوں نے اس شخص پر زور دیا کہ وہ رُخصتی تک کا خرچ اور وہ رقم جو اس نے میری والدہ سے ہتھیالی تھی واپس کرے، مگر اس نے نہ ہی والدہ کی رقم ادا کی اور نہ ہی رُخصتی کا بندوبست کیا، جون ۱۹۶۸ء کی ایک شب تقریباً ساڑھے گیارہ بجے جبکہ میرے والد کے گھر عزیز و اقرباء اور محلے دار بھی جمع تھے حمیروز ولد نادر خان نے مجھے زوردار الفاظ میں تین دفعہ ''طلاق، طلاق'' کہا اور گواہوں کے سامنے اس نے مجھے تین روپیہ دیا اور سب کے سامنے کہا کہ: ''تم میری ماں بہن ہو'' یہ کارروائی بحضورِ گواہان ہوئی۔

اب سوال یہ ہے کہ اس وقت میری عمر ۱۴ سال ہے، میں بالغ ہوں اور چاہتی ہوں کہ اپنی پسند سے شادی کروں، میری والدہ بیوہ ہیں، کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہی ہوں، اس صورت میں میرے لئے شرعی کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں، اور حمیروز ولد نادر خان نے واقعۃً رضیہ بیگم کو طلاق دی تھی تو ایک طلاقِ بائن واقع ہوچکی[2]، اور چونکہ اس واقعے کو تین سال گزر چکے ہیں اس لئے عدت بھی ختم ہوگئی، اب رضیہ بیگم جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ　　　　الجواب صحیح
　　　　بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۹۱/۷/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۸۶۳/۲۲ ب)

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) دیکھئے اگلے صفحے کا حاشیہ نمبر۲۔

اگر خلوت ہوئی ہو تو تین طلاق سے بیوی مغلّظہ ہو جائے گی

سوال:- مسمّیٰ زید نے اپنی بیوی بنتِ بکر کو ایک رجسٹری بھیجی، آپس میں طویل جھگڑے کی بناء پر بنتِ بکر نے اسے وصول کرنے سے انکار کر دیا، مسمّیٰ زید نے اسی رجسٹری کی نقل متعلقہ چیئرمین یونین کمیٹی کو بھیجی، جس کی عبارت مندرجہ ذیل تھی: ''بنتِ بکر کو جو کہ میری منکوحہ بیوی ہے جس کے بطن سے میرے نطفے سے کوئی اولاد نہیں ہے، میں چند وجوہات (جن کا ذکر یہاں میں مناسب خیال نہیں کرتا ہوں) کی بناء پر اسے طلاق دے کر اپنی زوجیت سے خارج اور آزاد کرتا ہوں، میں اسے طلاق، طلاق، طلاق دیتا ہوں، وہ میری زوجیت سے خارج ہے اور آزاد ہے .... الخ۔'' اس واقعے کو پانچ ماہ گزر چکے ہیں، بنتِ بکر کے لئے شریعت کی روشنی میں کوئی راستہ متعین کرلیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی طرف سے اس کی بیوی پر تین طلاق واقع ہوگئی ہیں اور وہ مغلّظہ ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ اب حلالہ کے بغیر دونوں میں نکاحِ ثانی بھی جائز نہیں ہے،(۱) لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ نکاح کے بعد رُخصتی ہو چکی ہو، اور شوہر و بیوی میں خلوت ہو چکی ہو،(۲) اگر خلوت نہیں ہوئی تھی تو مسئلہ دوبارہ پوچھ لیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۲/۱۷ھ

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی غفرلہٗ

(فتویٰ نمبر ۲۶۴/۲۲ الف)

ایک وقت میں تین طلاق دینے سے تینوں واقع ہونے پر ائمہ کا اتفاق ہے اور اس کے خلاف فتویٰ کا اعتبار نہیں

سوال:- اس سوال کے ساتھ ایک طلاق نامہ منسلک ہے جو سہیل احمد فیضی صاحب نے اپنی بیوی کو دیا اور یونین کونسل کے چیئرمین صاحب کو اس کا نوٹس ارسال کیا۔ دریافت طلب اَمر یہ ہے کہ اس طلاق نامہ کی رو سے سہیل احمد صاحب کی اہلیہ پر طلاق واقع ہوگئی ہے یا نہیں؟ اور اگر واقع ہوگئی ہے تو کونسی؟ نیز یہ کہ سہیل احمد صاحب نے اس طلاق کے بعد طلاق سے رُجوع کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے، کیا شرع میں ان کو رُجوع کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ جبکہ اس تحریر میں تین طلاق صاف

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳۔

(۲) وفی الدر المختار باب الطلاق غیر المدخول بها ج:۳ ص:۲۸۶ (طبع سعید) وان فرّق بانت بالأولیٰ ولم تقع الثانیة بخلاف الموطوٴة حیث یقع الکل رعم التفریق. وفی الشامیة تحته (قوله بخلاف الموطوٴة) أی ولو حکمًا کالمختلی بها فانها کالموطوٴة فی لزوم العدّة وکذا فی وقوع طلاق بائن آخر فی عدّتها .... الخ.

الفاظ میں لکھی ہوئی ہیں، اورانہوں نے کہیں سے تین طلاقوں کے ایک ہونے پر فتویٰ بھی لیا ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب:- مندرجہ پشت طلاق نامے (۱) پر غور کیا گیا، شرعی اعتبار سے اس طلاق نامے کی رُو سے سہیل احمد فیضی صاحب کی بیوی خاور سلطانہ صاحبہ پر تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں (۲)، اور طلاقِ مغلّظہ واقع ہونے کی بناء پر وہ سہیل احمد فیضی صاحب کے لئے حرام ہوچکی ہیں، اب نہ رُجوع ہوسکتا ہے اور نہ نیا نکاح ہوسکتا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: "فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" (سورۃ البقرۃ: ۲۳۰)۔ یعنی "پس اگر شوہر اسے تیسری طلاق دیدے تو وہ شوہر کے لئے اس وقت تک حلال نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرلے۔" نیز نبی کریم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سے احادیث کا یہی تقاضا ہے۔ مثلاً حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ایما رجل طلق امرأته ثلاثا عند الاقراء او ثلاثا مبهمة لم تحل لهٗ حتّی تنكح زوجًا غيره." (سنن البیهقی ج:۷ ص:۳۳۶) (۳)۔

اس کے علاوہ تمام صحابہؓ وتابعینؒ کا بھی یہی فیصلہ ہے اور ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے تمام مقلدین قرآن وسنت کے ان دلائل کی روشنی میں اسی بات کے قائل ہیں کہ تین طلاقیں خواہ ایک مرتبہ دی جائیں یا مختلف اوقات میں، ان سے بیوی حرام ہوجاتی ہے، اور جن بعض لوگوں نے اس کے خلاف کوئی فتویٰ دیا ہے، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کسی مذہب کے علماء نے اس کو قابلِ اعتبار قرار نہیں دیا۔ تفصیلی دلائل مفصل کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً ملاحظہ ہو: تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۱۵۴ تا ۱۶۱ (۴)۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں طلاقِ مغلّظہ واقع ہوچکی ہے اور طلاق کی تاریخ سے تین مرتبہ اَیامِ ماہواری گزرنے کے بعد مسماۃ خاور سلطانہ صاحبہ شرعاً آزاد ہیں کہ جہاں چاہیں نکاح کرلیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۶/۳/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۵۱۷/۳۷ ب)

---

(۱) نقلِ فتاویٰ کے ریکارڈ میں یہ طلاق نامہ موجود نہیں ہے، تاہم اس میں شوہر کی طرف سے تین طلاقوں کا ہونا جواب سے واضح ہے۔ (محمد زبیر)

(۲) وفی السنن لأبی داوٗد ج:۱ ص:۳۰۶ (طبع حقانیه ملتان) عن مجاهد قال: كنت عند ابن عباس فجاءه رجل فقال انه طلق امرأته ثلاثا، قال: فسكت حتّی ظننت انه رادها اليه ثم قال: ينطلق احدكم فيركب الحموقة ثم يقول يابن عباس يابن عباس وان الله قال: "وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا" وانك لم تتق الله فلا احد لك مخرجًا عصيت ربك وبانت منك امرأتك.

(۳) (طبع نشر السنة ملتان) باب ما جاء فی امضاء الطّلاق الثلاث وان كن مجموعات.

(۴) (طبع مكتبة دار العلوم كراچی).

﴿فصل فی الخلع وأحکامه والطّلاق علی المال﴾
(خلع اور مال کے بدلے طلاق کے اَحکام)

خلع کے لئے شوہر اور بیوی دونوں کی رضامندی ضروری ہے، نیز خلع کی بنیاد پر فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- فیصلہ:- مدعیہ نے اپنے دعویٰ میں تحریر کیا ہے کہ وہ مدعا علیہ سے شادی شدہ تھی، اُس سے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہوا، بعد میں مدعیہ کو علم ہوا کہ مدعا علیہ کے اس کی بھاوج کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں، مدعیہ کے منع کرنے پر مدعیہ پر جھوٹا زنا کا الزام لگایا اور زدوکوب کیا، حق مہر ادا نہیں کیا گیا، نیز ان حالات میں مدعیہ اور مدعا علیہ کے درمیان گزارہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی حدود حقوق اللہ قائم رہ سکتی ہیں، مدعا علیہ نے ان الزامات کی تردید کی اور اُس نے اس بناء پر مقابلہ کیا کہ اصل میں مدعیہ وہ رقم ہضم کرنا چاہتی ہے جو کہ بوقت نکاح مدعا علیہ نے ادا کی تھی، اس لئے مقدمہ مدعیہ کا فسخ کیا جائے اور ۳/۱۱/۱۹۷۳ء کو مدعا علیہ نے ایک علیحدہ دعویٰ حقوقِ زن وشو دائر کردیا جو مندرجہ ذیل تنقیحات پر ۸/۵/۱۹۷۳ء کو وضع کی گئی اور کاروائی مثل تنسیخِ نکاح پر عمل میں لائی گئی۔

تنقیح نمبر۴:- مدعیہ نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ تنسیخِ نکاح کے عوض اپنا حق مہر معاف کرتی ہے جو کہ ابھی تک ادا نہیں ہوا اس کے متعلق مدعا علیہ نے کوئی واضح جواب نہیں دیا، اور شہادت جو صفحہ مثل پر ہے وہ ہر لحاظ سے کافی ہے کہ مدعیہ کے حق میں تنسیخِ نکاح قرار دیا جائے کیونکہ جانبین فریقین مقدمہ بازی فوجداری زنا کے الزام میں رہی ہے، بیوی کی رائے خاوند کے متعلق اچھی نہیں ہے، اُس نے اپنی بھاوج کے ساتھ شوہر کے ناجائز تعلقات کا الزام لگایا ہے، میں اس مقدمے کو صحیح قرار دیتے ہوئے خلع کی بنیاد پر تنسیخِ نکاح کی ڈگری اُس رقم کے عوض جو کہ مدعا علیہ نے حق مہر دینی ہے دیتا ہوں وہ رقم کافی ہے۔

دادرسی:- میری تمام تنقیحات کا نتیجہ یہ ہے کہ مدعیہ کا مقدمہ بابت تنسیخِ نکاح مقدمہ نمبر ۵۶ آف ۱۹۷۲ء مدعیہ کے حق میں ڈگری برخلاف مدعا علیہ کے صادر کیا جاتا ہے، اور اس کے نتیجے میں مدعا علیہ کا مقدمہ حقوقِ زن وشو مقدمہ نمبر ۵ آف ۱۹۷۳ء بمعہ خرچہ فسخ کیا جاتا ہے، نیز ڈگری بابت تنسیخِ

نکاح یونین کونسل تلہ گنگ کو سات دن کے اندر اندر برائے ضروری کارروائی زیر دفعہ (8) مسلم فیملی لاء آرڈیننس بھیجی جائے، کھلی عدالت میں سنایا گیا۔ ۱۹۷۵/۱۲/۴ء

دستخط سول جج تلہ گنگ

جواب:- منسلکہ فیصلے کے ساتھ کوئی سوال مستفتی نے نہیں لکھا، اگر مقصد یہ ہے کہ اس فیصلے کی شرعی حیثیت سے آگاہ کیا جائے تو عرض یہ ہے کہ منسلکہ عدالتی فیصلہ ائمہ اربعہ کے مذہب کے مطابق قرآن وسنت کی رُو سے شوہر کی رضامندی پر موقوف ہے، کیونکہ اس فیصلے میں خلع کا حکم صادر کیا گیا ہے اور خلع باجماعِ اُمت زوجین کا ایک معاملہ ہے، جو باہمی رضامندی پر موقوف ہوتا ہے، لہٰذا اگر شوہر خلع کرنے پر راضی ہو تو خلع کرے اس صورت میں عورت کا نکاح اس سے ختم ہوجائے گا، اور اگر وہ خلع پر راضی نہ ہو تو شرعاً اس کو عورت کو علیحدہ کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، البتہ چونکہ نوبت ایسی مقدمہ بازی تک پہنچ چکی ہے اس لئے شوہر کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ خلع کو منظور کر کے بیوی کو الگ کردے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۲۶/۲۷ ج)

اگر قصور لڑکی کا ہو تو شوہر خلع کے بدلے بیوی سے رقم لے سکتا ہے

سوال:- منکہ محمد اسحاق کی شادی بچپن میں ہوگئی تھی، اُس وقت ہم دونوں کے مابین کوئی اختلاف نہیں تھا، اور نہ ہی کوئی ناچاقی تھی، شادی کے عرصہ تین سال بعد ناچاقی ہوئی، اب بندہ بالغ ہے لیکن سسرال والے منکر ہیں، اب اُنہوں نے یہ شرط رکھی ہے کہ آپ کو گھر داماد رہنا ہوگا اور لڑکی کو ہمارے گھر ہی پر رکھنا ہوگا، جب میں نے ان کی یہ شرط منظور کی تو انہوں نے ایک اور شرط لگادی کہ اگر آپ ۵ تولہ سونا، ۱۲ چھٹانک چاندی کے زیورات لاسکتے ہیں تو ہم لڑکی بھیجیں گے اور ماہانہ خرچ بھی دینا پڑے گا۔ میں نے کہا سردست میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے، اگر تمہیں اپنی لڑکی ان شرائط کے بغیر بھیجنی ہے تو میں تیار ہوں، کیونکہ سسرال والوں کی طرف سے تقاضا ہے کہ لڑکی جوان ہوگئی ہے، زیادہ دن تک ہم گھر لڑکی رکھنے کو تیار نہیں ہیں، میں غریب آدمی ہوں بڑی مشکل سے شادی کے بوجھ سے ابھی ہلکا ہوا ہوں، سسرال والے اس پر تقاضا کر رہے ہیں کہ تم فوراً ہماری لڑکی کو چھٹکارا دے دو، میں غریب آدمی ہوں وہ مجھ سے جبراً چھٹکارا حاصل کر رہے ہیں، سسرال والے مال دار ہیں، میری شادی پر خوب خرچ کروایا ہے، لہٰذا سسرال والوں کو کہا کہ مبلغ ۵۰۰۰ روپے نقد ادائیگی کے بعد چھٹکارا دے سکتا ہوں، کیا یہ پانچ ہزار میرے لئے جائز ہوں گے؟

جواب :- صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ واقعات دُرست ہیں تو زیادتی لڑکی والوں کی طرف سے ہے، لہٰذا اگر آپ پانچ ہزار روپے پر خلع کریں تو آپ کے لئے جائز ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ مہر معاف کروانے پر اکتفاء کرلیں اور اس سے زائد کچھ نہ لیں، لما في الدر المختار: وكره أخذ شئ ان نشز وان نَشَزَت لا، ولو منه نشوز أيضًا، ولو بأكثر مما أعطاها على الأوجه "فتح" وصحح الشمني كراهة الزيادة وتعبير الملتقى لا بأس به يفيد أنها تنزيهية وبه يحصل التوفيق. (شامی ج:۳ ص:۵٦۱)۔[1]

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۴۲ ج)

نفرت کی بناء پر دعویٰ تنسیخِ نکاح کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں؟ فتویٰ چاہتا ہوں۔

مسئلہ :- اگر لڑکی رُخصتی سے پہلے تنسیخِ نکاح کے دعویٰ میں یہ بیان دیتی ہے کہ اُسے اپنے خاوند سے نفرت ہوگئی ہے (بغیر کسی جائز شرعی وجہ کے) تو کیا قانونِ اسلام کے مطابق تنسیخِ نکاح کی ڈگری عدالت کو صادر کردینی چاہئے یا نہیں؟ یا پھر دعویٰ تنسیخِ نکاح خارج کرکے لڑکی کو اور ایسا جھوٹا دعویٰ کروانے والوں کو عدالت کو کیا سزا دینی چاہئے؟ اور کیا بغیر کسی جائز شرعی وجہ کے خلع کی بنیاد پر لڑکی تنسیخِ نکاح یا تکذیبِ نکاح کی ڈگری حاصل کرسکتی ہے؟

جواب :- اس مسئلے میں تفصیل ہے، لہٰذا سوال کا جواب اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب لڑکی کا مفصل بیان سامنے ہو۔

والسلام
۱۴۲۰/۴/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷۳/۱۳)

---

(۱) ج:۳ ص:۴۴۵ (طبع سعید).

﴿فصل فی فسخ النّکاح عند کون الزّوج مفقودًا أو عنّینًا أو متعنّتًا أو مجنونًا﴾

(شوہر کے مفقود، نامرد، متعنّت اور مجنون ہونے کی بناء پر فسخِ نکاح کے اَحکام)

زوجۂ مفقود کا حکم

سوال:- مسماۃ ہندہ کا شوہر تقریباً چار سال ہوئے کہ لاپتہ ہو چکا ہے، والدین اور بیوی کے ساتھ بنگلہ دیش سے کراچی آیا، حکومت نے ان کو کسی اور جگہ بھیج دیا اور بیوی کو کیمپ میں رکھا، اس کے بعد سے لاپتہ ہے، ہر چند تلاش بسیار کے بعد بھی کوئی سراغ نہ مل سکا، اب تک ہندہ انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہے، ایسی صورت میں ہندہ کیا عقدِ ثانی کرسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مسماۃ ہندہ کو یہ حق ہے کہ وہ مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ دائر کرکے پہلے یہ ثابت کرے کہ میرا نکاح فلاں شخص سے ہوا تھا، پھر اُس کے بعد گواہوں سے اس کا مفقود اور لاپتہ ہونا ثابت کرے، بعد ازاں عدالت خود بھی مفقود کی تفتیش اور تلاش کرے اور جب پتہ ملنے سے مایوسی ہوجائے تو عورت کو چار سال تک مزید انتظام کا حکم دے، پھر اگر ان چار سال کے اندر بھی مفقود کا پتہ نہ چلے تو مفقود کو چار سال کی مدّت ختم ہونے پر مردہ تصوّر کیا جائے گا، اس وقت حاکم کے پاس دوبارہ درخواست دے کر عدالت سے اُس کے مردہ ہونے کا حکم حاصل کرے، اور پھر چار مہینے دس دن عدّتِ وفات گزار کر وہ دُوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔ اور یہ ساری تفصیل اُس وقت ہے کہ جب کہ عورت مزید چار سال صبر و تحمل اور عفت کے ساتھ گزار سکتی ہو، لیکن اگر عورت کے لئے اتنا عرصہ صبر کرنا مشکل ہو اور گناہ میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہو تو صورتِ مسئولہ میں حاکم کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ چار سال کے بجائے صرف ایک سال انتظار کرنے کا حکم دے، اور ایک سال کے بعد شوہر مذکور

کی طرف سے اس کو طلاقِ رجعی یعنی تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزار کر وہ دُوسری جگہ نکاح کر سکے گی۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۱/۱۰/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۴۳/۲۸ ج)

(۱) ''زوجۂ مفقود کے حکم'' سے متعلق تفصیل وتحقیق کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کا مصدقہ درج ذیل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:-

سوال:- مفقود کی بیوی کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ تفصیل سے وضاحت فرمائیں۔

جواب:- مفقود کی بیوی کے لئے اصل حکم تو یہ ہے کہ وہ عفت وعصمت کے ساتھ اپنی زندگی گزارے، لیکن اگر وہ مفقود شوہر کے نکاح سے رہائی حاصل کرنا چاہے تو درج ذیل صورت اختیار کر کے حاصل کرنے کی گنجائش ہے:-

مفقود کی بیوی اپنا یہ مقدمہ مسلمان قاضی کی عدالت میں پیش کرے اور گواہوں سے ثابت کرے کہ میرا نکاح فلاں شخص کے ساتھ ہوا تھا، پھر گواہوں سے اس کا مفقود اور لاپتہ ہونا ثابت کرے، اس کے بعد قاضی خود اپنے طور پر اس کی تفتیش وتلاش کرے، جہاں اس کے جانے کا غالب گمان ہو وہاں آدمی بھیجا جائے، اور جس جس جگہ جانے کا غالب گمان نہ ہو صرف احتمال ہو وہاں اگر خط ارسال کرنے کو کافی سمجھے تو خطوط ارسال کر کے تحقیق کرے، اور اگر اخبارات میں شائع کردینے سے خبر ملنے کی اُمید ہو تو یہ بھی کرے۔

الغرض تفتیش وتلاش میں پوری کوشش کرے اور جب پتہ چلنے سے مایوسی ہوجائے تو قاضی، عورت کو چار سال تک مزید انتظار کا حکم دے، پھر ان چار سالوں کے اندر بھی اگر مفقود کا پتہ نہ چلے تو عورت قاضی کے پاس دوبارہ درخواست کرے، جس پر قاضی اس کے مردہ ہونے کا فیصلہ سنادے، اس کے بعد چار ماہ دس دن عدّتِ وفات گزار کر عورت کو دُوسری جگہ نکاح کرنے کا اختیار ہوگا۔

اور اگر عورت زنا کا شدید خطرہ ظاہر کرے تو ایسی صورت میں چار سال کے انتظار کا حکم ضروری نہیں بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ شوہر کے غائب ہونے کے وقت سے اب تک کم از کم ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہے یا نہیں؟ اگر گزر چکا ہو تو قاضی مزید مہلت دیئے بغیر اس وقت بھی نکاح ختم کرسکتا ہے، اسی طرح اگر زنا میں مبتلا ہونے کا خطرہ تو نہیں لیکن مفقود کا اتنا مال موجود نہیں جو ان چار سالوں میں اس کی بیوی کے نان ونفقہ کے لئے کافی ہو، یا بیوی کے لئے مفقود کے مال سے نان ونفقہ حاصل کرنا مشکل ہو تو اس صورت میں اگر نان ونفقہ دیئے بغیر کم از کم ایک ماہ گزر ا ہو تو قاضی نکاح ختم کرسکتا ہے۔

واضح رہے کہ آخری ان دونوں صورتوں میں عورت عدّتِ وفات کے بجائے عدّتِ طلاق گزارے گی، جو قاضی کے فیصلے کے وقت سے شمار ہوگی۔

في البحر: (قوله: ولا يفرق بينه وبينها: أي بين زوجته، لقوله عليه السلام في امرأة المفقود: انها امرأته حتى يأتيها البيان، وقول علي رضي الله عنه فيها: هي امرأة ابتليت فلتصبر حتى يتبين موت أو طلاق اهـ. (ج:۵ ص:۱۶۴).[1]

في شرح الجليل على مختصر الخليل: فيؤجل أربع سنين ان دامت نفقتها .... فان لم تدم نفقتها من ماله فلها التطليق لعدم النفقة بلا تأجيل، وكذا ان خشيت على نفسها الزنا فيزاد على دوام نفقتها عدم خشيتها الزنا. (ج:۲ ص:۳۸۵).

وفي حاشية الدسوقي: فيؤجل أي المفقود الحر أربع سنين ان دامت نفقتها من ماله والا طلق عليه لعدم النفقة اهـ. (ج:۲ ص:۴۷۹).[2]

وفي الشرح الصغير: والا فلها التطليق عليه لعدم النفقة .... أي ولم تخش العنت والا فتطلق عليه لضرر فهي أولى من معدومة النفقة. (ج:۲ ص:۶۹۴).[3]

وفي الفقه الاسلامي وأدلته للشيخ الزحيلي: ورأى المالكية والحنابلة جواز التفريق للغيبة اذا طالت وتضررت الزوجة بها، ولو ترك لها الزوج مالاً تنفق منه اثناء الغياب، لأن الزوجة تتضرر من الغيبة ضررًا بالغًا، والضرر يدفع بقدر الامكان لقوله صلى الله عليه وسلم: "لا ضرر ولا ضرار" ... وجعلوا حد الغيبة الطويلة سنة فأكثر على المعتمد، وفي قول ثلاث سنوات اهـ. (ج:۷ ص:۵۳۳).[4] (باقی اگلے صفحے پر)

(۱) (طبع ماجدیه کوئٹه). (۲) (طبع دار الفكر بيروت).
(۳) (طبع دار المعارف بمصر). (۴) (دار الفكر بيروت).

زوجۂ مفقود کا حکم

سوال:- ثریا کی شادی زید سے تقریباً سترہ برس ہوئے ہوچکی تھی، کسی جرم کی بناء پر زید کو سات سال سزا ملی، سات سال گزرنے کے بعد زید لاپتہ ہوگیا، ثریا اب بھی انتظار میں ہے، حکام جیل سے پتہ کیا جاتا ہے وہ بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، آخرکار ثریا مجبور ہوکر بکر کے گھر رہنے لگی، بغیر نکاح کے، اور بکر سے دو تین بچے بھی حرام طریقے پر پیدا ہوگئے، یاد رہے کہ زید ابھی تک لاپتہ ہے، کیا ثریا بکر سے نکاح کرسکتی ہے کہ اس جرمِ عظیم سے بچ جائے؟ جو صورت ہو تحریر فرمائی جائے۔

جواب:- ثریا کو چاہئے تھا کہ جونہی اس کا شوہر لاپتہ ہوا تھا وہ فوراً عدالت کی طرف رُجوع کرکے اپنا نکاح فسخ کرالیتی، بہرحال اب اس کو چاہئے کہ بکر سے فوراً میاں بیوی کے تعلقات منقطع کرکے سابقہ عمل پر توبہ و اِستغفار کرے اور عدالت میں نان نفقہ نہ ہونے اور عصمت کے خطرے کی بنیاد

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)......وفي الأحوال الشخصية للشيخ محمد أبو زهرة: والتفريق للتضرر من الغياب هو مذهب مالك وأحمد، لأن المرأة قد تقع في جريمة دينية باهمالها . . . ولا بد للتفريق بالغياب ان تمضي مدة تستوحش فيها الزوجة وتتضرر فعلًا، لأن الفرقة بسبب ذلك هي للضرر الواقع لا للتضرر المتوقع فقط، وقد جعل أحمد أدنى مدة يجوز أن تطلب التفريق بعدها ستة أشهر .... أما مذهب مالك رضي الله عنه فقد اختلف في الحد الأدنى للتضرر، فقيل: ثلاث سنين، وقيل: سنة، وبهذا أخذ القانون اهـ. (ص:۳۹۰)

وفي الشرح الصغير: وتعتد زوجة المفقود حرة أو أمة صغيرة أو كبيرة في أرض الاسلام متعلق بالمفقود عدة وفاة على ما تقدم، ابتداءها بعد الأجل اهـ. (ج:۲ ص:۶۹۴).[1]

وفي شرح منح الجليل: ثم بعد التلوم وعدم وجدان النفقة والكسوة طلق وان كان غائبًا .... يعني ان الغائب البعيد الغيبة وليس له مال أو له مال لا يمكنها الوصول اليه الا بمشقة حكمه حكم العاجز الحاضر اهـ.

وفيه: وله أي الزوج المطلق عليه لعدم النفقة الرجعة للزوجة المطلقة لأنه طلاق رجعي، ابن عرفة.

(ج:۲ ص:۳۴۳)

وفي اخر فتوىٰ العلامه هاشم رحمه الله مفتي المالكية بالمدينة المنورة زادها الله شرفًا: وهذا (التطليق) بعد التلوم بنحو شهر أو باجتهاده عند المالكية (يعني في صورة عدم النفقة) .... وان كان لخوفها الزنا وتضررها بعدم الوطي والعنانة مع وجود النفقة والغنا فبعد صبرها سنة فأكثر عند جل المالكية اهـ. (الحيلة الناجزة ص:۱۲۴).[2]

واللہ تعالیٰ اعلم
عصمت اللہ عصمہ اللہ
۱۴۱۸/۸/۱۴ھ

الجواب صحیح
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۸/۸/۱۷ھ

الجواب صحیح
محمد عبدالمنان عفی عنہ

الجواب صحیح
بندہ محمد عبداللہ عفی عنہ

الجواب صحیح
بندہ عبدالرؤف سکھروی

---

(۱) ج:۲ ص:۶۹۴ (طبع دار المعارف مصر).
(۲) دار الاشاعت کراچی۔

پر تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کردے، عدالت کو اختیار ہوگا کہ وہ معاملات کی تحقیق کر کے زید سے ثریا کا نکاح فسخ کردے، اس کے بعد عدت گزار کر وہ بکر سے نکاح کر سکے گی۔[۱] فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳/۱۲/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۴۴/ ۱۸ الف)

حاکم کے پاس مقدمہ لے جانے پر وہ تحقیق کرائے، اس کے بعد ایک سال کی مدّت کی مہلت دے، اس مدّت میں شوہر نہ آئے تو نکاح فسخ کردے، اس کے بعد ثریا عدّت گزار کر شادی کر سکتی ہے۔[۲] محمد عاشق الٰہی

زوجۂ مفقود کے لئے فسخِ نکاح کا طریقۂ کار

سوال:- میری بیٹی مختار بیگم کا نکاح مؤرخہ ۳۱ راگست ۱۹۷۶ء کو بمقام راولپنڈی ہوا تھا، لڑکا (محمد پیارے جان) دُبئی میں ملازم تھا، نکاح کے تقریباً دو ماہ بعد وہ واپس اپنی ملازمت پر دُبئی چلا گیا، اس دوران لڑکی کو وہ کراچی تک ساتھ لے گیا اور سارا زیور غائب کردیا، لڑکے نے کہا کہ گم ہوگیا ہے، اس پر ہم سے اور ہماری لڑکی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا، اُس تاریخ سے آج تک تقریباً دس سال گزر چکے ہیں، ہم نے ان کے تمام رشتہ داروں سے دریافت کرلیا، اس کا کوئی پتہ نہیں، نہ خط ہے، نہ خرچہ ہے، بیوہ ہوں میرا کوئی سہارا نہیں، لڑکی جوان ہے میں پریشان ہوں کیا میں اُس کا دُوسری جگہ نکاح کر سکتی ہوں؟ (انوری بیگم)

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مختار بیگم کے لئے زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کی تلاش جاری رکھے اور فسخِ نکاح نہ کروائے، لیکن اگر وہ شوہر کے بغیر صبر نہ کر سکتی ہو یعنی یا تو اُس کے نفقہ کا انتظام نہ ہو یا اُسے اپنی عفت کے بارے میں خطرہ ہو تو وہ یہ کر سکتی ہے کہ وہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ دائر کر کے پہلے یہ ثابت کرے کہ میرا نکاح محمد پیارے جان سے ہوا تھا، اس کے بعد گواہوں کے ذریعہ اُس کا مفقود اور لاپتہ ہونا ثابت کرے، اس پر حاکم خود بھی اس کی تفتیش اور تلاش کرے، اور جب پتہ ملنے سے مایوسی ہوجائے تو عورت کو چار سال تک مزید انتظار کا حکم دے، اگر ان چار سال کے اندر بھی مفقود کا پتہ نہ چلے تو اس مدّت کے اختتام پر شوہر کو مُردہ تصوّر کیا جائے گا، اس کے

(۱، ۲) زوجۂ مفقود کے مسئلے سے متعلق مزید تفصیل اور دلائل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم ہی کا مصدقہ فتویٰ پچھلے فتویٰ کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

بعد چار ماہ دس دن عدّتِ وفات گزار کر مختار بیگم دُوسری جگہ نکاح کرسکیں گی، لیکن اگر مختار بیگم کے لئے چار سال کی مدت گزارنا بھی ممکن نہ ہو، اور چونکہ اس نے دس سال تک پہلے ہی صبر کیا ہے اور عاجز ہوکر درخواست دی ہے، اس لئے معصیت میں مبتلا ہونے کا قوی خطرہ ہو تو اس صورت میں اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ حاکم چار سال کے بجائے صرف ایک سال کے انتظار کا حکم دے اور ایک سال گزرنے کے بعد عورت کے طلب کرنے پر اس کا نکاح فسخ کردے، اس صورت میں فسخِ نکاح کے بعد تین ماہواری عدّت گزار کر وہ جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۴/۲۸ ب)

شوہر کے نفقہ نہ دینے یا غائب ہونے کی بناء پر فسخِ نکاح کی صورت

سوال:- جس عورت کا خاوند بیوی کو چھوڑ کر چلا جائے، طلاق بھی نہ دے اور اپنے گھر بھی نہ لے جائے، وہ لڑکی کتنی دنوں کے بعد دُوسرے مرد سے نکاح کرسکتی ہے؟ اگر ایسا نہیں کرسکتی تو کتنے دنوں تک بیٹھی رہے؟

جواب:- پہلے خاوند کو تلاش کرکے اس سے طلاق حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، اگر وہ اس پر آمادہ نہ ہو تو اُسے خلع پر راضی کرنے کی کوشش کی جائے، اگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہو تو عدالت میں اس کے خلاف نان ونفقہ نہ دینے کی بنیاد پر، اور اگر اس کا پتہ نہ چلے تو اس کے گمشدہ ہونے کی بنیاد پر تنسیخِ نکاح کا دعویٰ دائر کیا جائے، عدالت اپنے طور پر اس کی تلاش کرے، اگر پتہ معلوم ہوجائے اور وہ آجائے تو اسے حکم دے کہ یا بیوی کو آباد کرو یا طلاق دو، اگر وہ آباد کرے تو ٹھیک ہے، اور اگر انکار کرے یا اطلاع یابی کے باوجود حاضرِ عدالت نہ ہو تو عدالت نکاح فسخ کرسکتی ہے، اور اگر عدالت کو تلاش کے باوجود نہ ملے تو چار سال انتظار کے بعد نکاح فسخ کرسکتی ہے،[2] جب تلاش میں ناکامی ہوجائے تو اس کی تفصیلات معلوم کرلی جائیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۷۲/۳۲ ج)

(۱و۲) تفصیلی حوالے اور دلائل کے لئے ص:۴۴۷ اور ص:۴۴۸ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

۱:- زوجۂ مفقود کا حکم

۲:- شوہر کو مردہ سمجھ کر دُوسرا نکاح کرنے کی صورت میں پہلا شوہر واپس آجائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک عورت جس کا شوہر اگر کہیں گم ہوجائے اور کہیں بھی اس کا پتہ نہ مل سکے تو اس صورت میں عورت شوہر کا کب تک انتظار کرے؟

۲:- اگر کسی صورت سے اس بات کی تصدیق ہوجائے کہ اس عورت کا شوہر فوت ہوچکا ہے، (مدّتِ معین کے دوران) تو پھر عدّت کب سے شروع ہوگی اور کب ختم ہوگی؟

۳:- اگر صورت نمبر۲ کے مطابق عورت عدّت پوری کر کے دُوسرا نکاح بھی کرلیتی ہے لیکن اس کے پہلے شوہر کی موت کسی غلط فہمی کے باعث یقینی صورت اختیار کرگئی تھی، لیکن اب اس کا پہلا شوہر بھی واپس آجاتا ہے، اس صورت میں عورت کس کے نکاح میں رہے گی؟ اوّل کے یا ثانی کے؟ اگر کسی ایک نکاح کی تنسیخ فوری طور پر ہو تو کون سے نکاح کو ترجیح دی جائے گی۔

جواب:- ایسی صورت میں عورت کو چاہئے کہ وہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت سے رُجوع کر کے شرعی ضابطۂ شہادت سے یہ بات ثابت کرے کہ میرا نکاح فلاں شخص سے ہوا تھا، اس کے بعد اس کا لاپتہ ہونا ثابت کرے، پھر حاکم خود بھی شوہر کی تلاش و تفتیش کرے، اور جب پتہ ملنے سے مایوسی ہوجائے تو عورت کو چار سال تک مزید انتظار کا حکم دے، اگر ان چار سال میں بھی مفقود کا پتہ نہ چلے تو ان چار سال کی مدّت کے اختتام پر اسے مُردہ تصوّر کیا جائے گا، نیز چار سال ختم ہونے کے بعد چار ماہ دس دن عدّتِ وفات گزار کر عورت کو دُوسری جگہ نکاح کرنے کا اختیار ہوگا۔[1] اگر عورت اپنے نفقہ کا انتظام نہ ہونے یا گناہ میں مبتلا ہونے کے اندیشے سے چار سال تک صبر نہ کرسکتی ہو تو شدید ضرورت کے موقع پر حاکم، انتظار کی مدّت چار سال کے بجائے ایک سال بھی قرار دے سکتا ہے۔[2]

۲:- اگر شوہر کی وفات کا یقین ہوجائے تو عدّت اس کی تاریخِ وفات سے چار مہینے دس دن شمار کی جائے گی۔[3]

۳:- ایسی صورت میں بیوی بدستور پہلے شوہر کے نکاح میں رہے گی، دُوسرے شوہر کے

(۱، ۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۴۷ اور ۴۴۸ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔

(۳) قال الله تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا. (سورة البقرة: ۲۳۴) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۵۱۰ (طبع سعید) والعدة للموت أربعة أشهر وعشر من الأيام .... الخ.

ساتھ اس کا نکاح خود بخود باطل ہوجائے گا،[۱] البتہ پہلے شوہر کو اس کے ساتھ صحبت کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ وہ دُوسرے شوہر کی عدّت پوری نہ کرلے،[۲] عدّت کے دوران وہ پہلے شوہر ہی کے پاس رہے گی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۲۲۸/۱۹ الف)

۱:- سیلاب میں غائب ہونے والے شوہر سے فسخِ نکاح کا حکم
۲:- سیلاب میں شوہر کے غائب ہونے کے گیارہ دن بعد دُوسرے نکاح کا حکم

سوال:- پاکستان کے جزیرہ ہاتیہ میں سیلاب کے باشندے ہیں جس پر گزشتہ ۱۲ر نومبر کو سیلاب آیا تھا، اس میں صالحہ نامی عورت کا شوہر گم ہوگیا، اب تک یقینی پتہ نہیں کہ مرگیا یا نہیں؟ غالب خیال ہے کہ مرگیا ہوگا۔ کیا اس پر مفقود کا حکم لگایا جائے گا؟

۲:- اس میں کریمہ کا شوہر عبدالرحیم بھی گم ہے، سیلاب سے گیارہ دن بعد کریمہ کا نکاح ہوگیا، اب یہ نکاح باطل ہے یا فاسد؟

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں شوہر پر مفقود ہی کے اَحکام جاری ہوں گے، کیونکہ اس کی موت کا یقین نہیں ہے، البتہ جس وقت ایسے مفقود کی بیوی فسخِ نکاح کے لئے مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ کرے تو حاکم کے لئے یہ گنجائش ہے کہ وہ طوفان کے حالات پر نظر کرکے اگر یہ گمان غالب سمجھے کہ شوہر طوفان میں ہلاک ہوگیا ہے اور اتنی مدت گزر چکی ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس کی کوئی خبر مل جاتی تو وہ مزید انتظار کئے بغیر بھی تفریق کردے، لما فی رد المحتار ومقتضاہ انہ یجتھد ویحکم القرائن الظاھرۃ الدالۃ علٰی موتہ وعلٰی ھٰذا یبتنی ما فی جامع الفتاوىٰ حیث قال واذا فقد فی المھلکۃ فموتہ غالب فیحکم بہ کما اذا فقد فی وقت الملاقاۃ مع العدو أو مع قطاع الطریق أو سافر علی المرض الغالب ھلاکہ أو کان سفرہ فی البحر وما أشبہ ذٰلک حکم بموتہ لأنہ الغالب فی ھٰذہ الحالات .... لٰکن لا یخفٰی أنہ لا بُدّ من مضی مدۃ طویلۃ حتی یغلب علی الظن موتہ لا بمجرد فقدہ عند ملاقاۃ العدو أو سفر البحر ونحوہ الا اذا کان ملکا عظیمًا فانہ

(۱، ۲) تفصیل کے لئے دیکھئے ''حیلۂ ناجزہ'' ص:۶۷ تا ۷۰ ''واپسی مفقود کے اَحکام''۔

اذا بقی حیًا تشتهر حیاته فلذا قلنا ان هذا مبنی علٰی ما قاله الزیلعی تأمل۔ (شامی ج:۳ ص:۵۱۲، بولاق)۔[1]

۲:- یہ نکاح بالکل باطل اور کالعدم ہے،[2] کریمہ اور عبداللہ پر واجب ہے کہ فوراً علیحدہ ہوجائیں اور جب تک مذکورہ طریقہ پر عدالت سے سندِ تفریق حاصل نہ ہو اور عدّتِ وفات نہ گزر جائے، کریمہ کے لئے کسی دُوسری جگہ نکاح جائز نہیں، اب تک جو نکاح کے تعلقات قائم کئے ان پر دونوں توبہ و اِستغفار کریں اور نکاح کے معاملے میں باطل اور فاسد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔[3]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۸/۲۱ الف)

شوہر کے لاپتہ ہونے کی بناء پر بیوی کا نکاح دُوسری جگہ کرنے کی صورت میں پہلا شوہر واپس آجائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک شخص کی ۱۹۳۹ء میں شادی ہوئی تھی، یہ شخص ۱۹۴۰ء میں برطانیہ کی فوج میں بھرتی ہوگیا، جاپان، سنگاپور، ملایا میں جاکر قید ہوگیا، لہٰذا ۵ سال تک لاپتہ رہا، کوئی پتہ نہ چلا مرگیا یا زندہ ہے، گورنمنٹ کے دفتروں سے بھی معلوم کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا، پنچایت سے انتظار کے بعد اس شخص کے وارثوں نے فیصلہ کرایا کہ بڑا بھائی نہ معلوم مرگیا یا زندہ ہے؟ ۵ سال سے کچھ خبر نہیں، لہٰذا چھوٹے بھائی سے نکاح کروادیا، نکاح کے بعد لڑکا بھی پیدا ہوا، جو شخص لاپتہ تھا وہ ۱۹۴۶ء میں قید سے چھوٹ کر آگیا، اب سوال یہ ہے کہ پہلے خاوند کا نکاح باقی رہا یا نہیں؟ پہلا خاوند بیوی کو گھر میں رکھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس شخص نے بیوی کو گھر میں رکھ لیا ہے تو اس کی امامت دُرست ہے یا نہیں؟ براہِ کرم جواب دیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں عورت بدستور پہلے شوہر یعنی بڑے بھائی ہی کے نکاح میں ہے،[4] اور اس کی واپسی کے بعد اس پر فرض ہے کہ اسی شوہر کے پاس جائے اور اسی کے پاس رہے، اور

---

(۱) رد المحتار کتاب المفقود ج:۴ ص:۲۹۷ (طبع سعید)

(۲) وفی الشامیة کتاب الطلاق، بابُ العدّة، مطلبٌ فی النّکاح الفاسد والباطل ج:۳ ص:۵۱۶ (طبع سعید) أما نکاح منکوحة الغیر ومعتدّته .... لم یقل أحدٌ بجوازه فلم ینعقد اصلًا .... الخ. وفی الهندیة کتاب النکاح الباب الثالث ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع ماجدیه) لا یجوز للرجل أن یتزوّج زوجة غیرہٖ وکذٰلک المعتدّة .... الخ.

(۳) وفی الشامیة تحت مطلب فی النکاح الفاسد والباطل ج:۳ ص:۵۱۶ (طبع سعید). أنه لا فرق بین الفاسد والباطل فی النکاح بخلاف البیع .... الخ.

(۴) تفصیل کے لئے دیکھئے ''حیلۂ ناجزہ'' ص:۶۷ تا ۷۰ ''واپسی مفقود کے اَحکام''۔

وہ پہلا شوہر اسے بیوی بنا کر رکھے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بلکہ اسے رکھنا ہی چاہئے اور اس کی غیر حاضری میں چھوٹے بھائی سے جو نکاح ہوا اس کا حکم اور اس سے ہونے والی اولاد کا حکم اس بات پر موقوف ہے کہ پنچائیت نے کیا فیصلہ کیا تھا؟ کس بنیاد پر کیا تھا؟ اس پنچایت میں کون لوگ شامل تھے؟ اور انہوں نے پہلے شوہر کو تلاش کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا تھا؟ اگر ان باتوں کا جواب معلوم ہو جائے تو اس نکاح کا حکم بتایا جاسکتا ہے۔

بہر حال اب عورت پر واجب ہے کہ وہ اپنے سابقہ شوہر کے پاس چلی جائے[1]، البتہ جب تک دُوسرے شوہر کے نکاح کا حکم معلوم نہ ہو جائے اس پہلے شوہر کو چاہئے کہ وہ احتیاطاً تین ایام ماہواری گزرنے تک اس بیوی سے ہم بستری نہ کرے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۲/۳ھ

تقسیمِ ہند و پاک کے وقت فسادات میں لاپتہ ہونے والے شوہر کی بیوی کا حکم

سوال:- خلاصۂ سوال یہ ہے کہ بوقتِ تقسیمِ ہند و پاک بیوی دہلی سے پاکستان منتقل ہوگئی، اور شوہر وہیں رہا، اب معلوم نہیں کہ وہ فسادات کی نذر ہوگیا یا زندہ ہے؟ بہر حال لاپتہ ہے کہ زندہ ہے یا مردہ؟ اور کہاں ہے، اگر ہے؟ تو اب اس بیوی کی اس کی زوجیت سے گلوخلاصی شرعاً ہو چکی ہے یا نکاح قائم ہے؟ اگر قائم ہے تو کیسے خلاصی ہو؟ ....الخ۔

جواب:- آپ کی ہمشیرہ کا نکاح ابھی مسمّٰی غلام محمد سے قائم ہے، اگر اس کا کسی طرح پتہ معلوم ہو سکے تو اس سے طلاق حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، اور اگر وہ لاپتہ ہو تو کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں شوہر کے مفقود الخبر ہونے کی بناء پر فسخِ نکاح کا دعویٰ کیا جائے۔[3] عدالت کے فسخ کئے بغیر نکاح فسخ نہ ہوگا۔[4]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۴۴/۱۸ الف)

(۱،۲) دیکھئے حیلہ ناجزہ ص:۶۷ تا ۷۰ ''واپسی مفقود کے اَحکام''۔

(۳،۴) مذکورہ صورت میں فسخ نکاح کا مفصل و مدلل طریقہ کار سابقہ ص:۴۴۷ اور ۴۴۸ کے فتویٰ اور اس کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

زوجۂ غائب غیر مفقود کے فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- زید نے ہندہ کے ساتھ نکاح کیا، دو چار دن ہندہ کو گھر میں رکھنے کے بعد زید اپنے بڑے حقیقی بھائی کی بیوی زینت کو اغواء کر کے لے گیا اور ہندہ میکے واپس آگئی، اب زید کا کہیں پتہ نہیں ہے، البتہ وہ اپنے والدین کی طرف خط بھیجتا رہتا ہے، ہندہ پانچ سال سے ازدواجی زندگی سے محروم ہے، ہندہ کسی دُوسرے مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ شوہر کا خط اس کے والدین کے پاس آتا ہے، اس لئے یہ صورت غائب غیر مفقود کی ہے، اس صورت میں اوّل تو ہندہ کو یہ چاہئے کہ وہ زید کے والدین کے ذریعہ زید سے طلاق حاصل کرنے یا خلع کرنے کی کوشش کرے، لیکن اگر وہ اس پر راضی نہ ہو اور ہندہ کے خرچ کا انتظام نہ ہو، یا اس کو اپنی زندگی عفت کے ساتھ گزارنی مشکل ہو تو اس کے لئے مندرجہ ذیل صورت ہوسکتی ہے:-

ہندہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ دائر کر کے گواہوں سے زید کے ساتھ اپنا نکاح ہونا ثابت کرے، پھر یہ ثابت کرے کہ وہ مجھ کو نفقہ دے کر نہیں گیا، اور نہ وہاں سے اس نے میرے لئے نفقہ بھیجا، نہ یہاں کوئی انتظام کیا، اور نہ میں نے نفقہ معاف کیا، اور ان سب باتوں پر حلف بھی کرے، عدالت زید کے پاس حکم بھیجے کہ یا تو خود حاضر ہو کر اپنی بیوی کے حقوق ادا کرو یا اس کو بلالو یا وہیں سے کوئی انتظام کرو، ورنہ اس کو طلاق دے دو، اور اگر تم نے ان باتوں میں سے کوئی بات نہ کی تو پھر ہم خود تم دونوں میں تفریق کردیں گے، اور یہ حکم بذریعہ ڈاک بھیجنا کافی نہیں بلکہ عدالت یہ حکم نامہ دو ثقہ آدمیوں کو سنا کر اُن کے حوالے کرے، یہ دونوں شخص زید کو حکم نامہ پہنچا کر اس سے جواب طلب کریں اور جو کچھ جواب تحریری یا زبانی دے اُسے محفوظ رکھ کر عدالت کے سامنے آکر اس کی گواہی دیں، ہاں! اگر زید ایسے دُور دراز ملک میں ہو جہاں آدمی بھیجنا ممکن نہ ہو تو پھر آدمی بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ بہرصورت! اگر اس تمام کاروائی کے بعد بھی زید کوئی صورت قبول نہ کرے تو عدالت ایک مہینے کے مزید انتظار کا حکم دے اس مدّت میں بھی اگر اس کی شکایت رفع نہ ہوئی تو اس عورت کو زید کی زوجیت سے الگ کردے، اس کے بعد ہندہ عدّتِ طلاق گزار کر دُوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۲/۲۸ الف)

---

(۱) مزید تفصیل اور حوالہ جات کے لئے ص.۴۶۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

زوجۂ مفقود کا حکم

سوال:- ایک بیوی کا شوہر تقریباً دو سال سے نہیں ہے، اور کچھ پتہ نہیں چلتا، اب یہ بیوی نان نفقہ کی وجہ سے کسی دُوسرے آدمی کے ساتھ نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مذکورہ عورت کی خلاصی کی صورت یہی ہے کہ مذکورہ عورت کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں نان ونفقہ نہ ہونے اور مبتلا بالمعصیۃ ہونے کے اندیشے کی بناء پر فسخِ نکاح کا مقدمہ دائر کرے، عدالت شوہر مذکورہ کو عدالت میں حاضر ہونے پر مجبور کرے، اور اگر ثابت ہوجائے کہ وہ نہیں آتا تو اس کی طرف سے یہ عورت کو طلاق دیدے، اس کے بعد عورت عدّتِ طلاق گزار کر دُوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے، اگر عدالت مذکورہ بالا کاروائی کرلے تو اس کا فیصلہ شرعاً نافذ ہوگا[1]، ہاں! دعویٰ دائر کرنے میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ خلع یا شوہر کے مفقود ہونے نہ ہونے کا دعویٰ نہ ہو بلکہ شوہر پر نان ونفقہ ادا نہ کرنے کا دعویٰ ہو کیونکہ خلع اور مفقود کے دعوؤں سے متعلق موجودہ عدالتیں جو فیصلے کر رہی ہیں ان میں شرعی شرائط کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۴/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۴۶۸/۲۲ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

فسخِ نکاح سے متعلق برطانوی شرعی کونسل کے اہم سوالات کے جوابات

سوال:- بگرامی خدمت اقدس حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر وعافیت ہوگا

برطانیہ میں مسلمانوں کے عائلی مسائل کے حل کے لئے شرعی ضرورت کے ماتحت شرعی کونسل کا قیام چند سال ہوئے کیا گیا جس کا عمل جاری ہے، شرعی کونسل وہ عائلی مسائل حل کرنے کی کوشش کرتی ہے جو عموماً فسخِ نکاح سے متعلق ہوتے ہیں، برطانیہ میں مابین زوج و زوجہ، ہونے والے اختلافات میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ زوجہ کو مار پیٹ اور دُوسری اذیتوں سے ستایا جاتا ہے اور طلاق دے

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۴۷ اور ۴۴۸ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔

کر علیحدہ بھی نہیں کیا جاتا، بناء بریں زوجہ برطانوی کورٹ سے رُجوع کرتی ہے تاکہ کورٹ دونوں کے درمیان علیحدگی کردے، کورٹ اپنی کوشش دونوں کے درمیان میل ملاپ کی کرتی ہے، ناممکن ہونے پر دونوں کے درمیان علیحدگی کا فیصلہ کردیتی ہے، چونکہ فیصل عیسائی غیرمسلم ہونے کی وجہ سے اس فیصلے سے عورت شرعاً علیحدہ نہیں ہوتی، اس لئے وہ شرعی کونسل سے رُجوع کرتی ہے۔

شرعی کونسل دوبارہ دونوں کے درمیان تنازع کے پیشِ نظر میل ملاپ کی سعی کرتی ہے، ناکام ہونے کی صورت میں شرعی کونسل کی علماء کی کمیٹی دونوں کے درمیان نکاح فسخ کرکے شرعی علیحدگی کردیتی ہے۔

مذکورہ صورتِ حال کے بارے میں درج ذیل چند ضروری باتوں میں جناب کی فوری رہبری کی ضرورت ہے، اُمید ہے کہ جناب زحمت گوارا فرما کر جلد جواب سے نوازیں گے۔

۱:- برطانیہ کی کورٹ سے عورت کی علیحدگی کے فیصلے کے بعد شرعی کونسل اگر اس فیصلے پر اس معنیٰ میں مطمئن نہ ہو کہ واقعی دونوں کے درمیان میل ملاپ کی کوئی صورت ممکن نہیں اور علیحدگی کے سوا چارۂ کار نہیں تو کیا اس کے بعد بھی شرعی کونسل دونوں کے درمیان علیحدگی کے لئے مکمل کاروائی کی شرعاً مکلّف ہے؟ یا برطانوی کورٹ کی کاروائی کافی ہے؟

۲:- زوجین پاکستانی ہوں اور نکاح بھی پاکستان میں ہوا ہو پھر دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک:- زوج پاکستان میں ہے قانونی رُکاوٹوں کی وجہ سے وہ برطانیہ آنہیں سکتا، اور لڑکی پاکستان رہنے پر تیار نہیں اور لڑکا طلاق دینے پر آمادہ نہیں، اس صورت میں مقدمہ شرعی کونسل میں آتا ہے، اس صورت میں شرعی کونسل اس میں کیا طریقہ اختیار کرے؟

۳:- زوجین کا نکاح پاکستان میں قانونی طور پر رجسٹر ہونے کی صورت میں اور لڑکا پاکستان میں ہے اور لڑکی برطانیہ میں اور لڑکی شرعی کونسل سے رُجوع کرتی ہے، لڑکا یہ کہتا ہے کہ عقدِ نکاح پاکستان میں ہوا ہے اس لئے فسخ بھی پاکستان ہی میں ہوگا، ایسی صورت میں شرعی کونسل اس نکاح کے فسخ کرنے کی شرعاً مجاز ہے یا نہیں؟

۴:- برطانیہ کی کورٹ میں لڑکی کے فسخِ نکاح کے جواب میں زوج اپنے وکیل کی معرفت یہ لکھواتا ہے کہ یہ شادی نبھنے والی نہیں اس لئے اسے فسخ کرنے اور توڑنے میں مجھے حرج نہیں، یہ اور اس کے ہم معنیٰ بات لکھواتا ہے، (ایک کاپی بطور نمونہ ساتھ منسلک ہے) تو کیا اس صورت میں یہ بات لڑکے کی طلاق یا فسخِ نکاح پر رضامندی میں شمار ہوکر یہ شرعی جدائی ہوگی یا نہیں؟ ان چند ضروری باتوں

کے بارے میں جناب ہی سے اطمینان ہوسکتا ہے، بناء بریں جناب کی گوناگوں مصروفیات کے احساس کے باوجود زحمت کی گستاخی کر رہا ہوں اور متوقع ہوں کہ جلد جواب سے نوازیں گے۔

محترم حضرت مولانا محمد رفیع مدظلہ کی خدمت میں سلامِ مسنون اور دُعا کی درخواست۔

احقر

یعقوب منشی القاسمی

۴رذیقعدہ ۱۴۱۷ھ

۱۴رمارچ ۱۹۹۷ء

Dear Sirs,

Re: Hashim V Hashim

We have now been instructed by Mr. Mohammad Amjad Hashim in relation to the unfortunate breakdown of his marriage. He has, in addition to this, brought with him a copy of the Divorce Petition which he has received from the Court. Mr. Hashim is very upset about the particulars contained in the divorce petition, he denies each and every allegation but realises that the marriage has innetrievably broken down and is therefore prepared to agree to the divorce proceeding on the basis of your client's allegations of behaviour.

Our client is advising us under the Green Form as he is a full-time student.

We would be obliged if you could confirm that your client would be prepared to withdraw her claim for costs as we not that she also is instructing you under the Green Form. If your Client is not prepared to withdraw her claim for costs we reserve the right to raise counter allegations at any subsequent hearing in relation to the issue of costs.

We look forward the hearing from you in relation to this. Once we have comfirmation from you in relation to the costs issue we will forward the Acknowledgement of service to the court.

جواب:- سوال پر غور کیا گیا، اور ذکر کردہ مسائل کی تحقیق کی گئی، ذیل میں نمبروار جواب ملاحظہ ہو:-

۱:- اس صورت میں شرعی کونسل کو میاں بیوی کے درمیان نکاح فسخ کرنے کے لئے مکمل شرعی کاروائی کرنا ضروری ہے، صرف یہ بات کہ زوجین کے درمیان نبھاؤ مشکل نظر آتا ہے، شرعی کونسل کی طرف سے فسخِ نکاح کی بنیاد نہیں بن سکتی، خواہ یہ نتیجہ برطانوی عدالت نے اخذ کیا ہو یا شرعی کونسل نے، بلکہ شوہر کا متعنّت ہونا، سخت مار پیٹ کرنا، مفقود ہونا، مجنون ہونا، اور عنّین وغیرہ ہونا اس میں داخل ہیں، اور ان اسباب کی تحقیق کے لئے بھی صرف برطانوی عدالت کی کاروائی کافی نہیں، کیونکہ اوّلاً تو جج غیر مسلم ہوگا، دُوسرے وہ ان شرعی اُمور کا احاطہ نہیں کرے گا جو فسخِ نکاح کے لئے شرعاً درکار ہیں، پھر اگر معتبر اسبابِ فسخ میں سے کوئی سبب نہ پایا جائے اور نبھاؤ مشکل ہو تو شرعی کونسل شوہر کو خلع یا طلاق علیٰ

مالِ پر راضی کرنے کی کوشش کرے، اس سے زائد کوئی کاروائی اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے، لہٰذا وہ مقدمہ خارج کردے۔

۲:- اگر لڑکا پاکستان میں ہے، اور وہ لڑکی کو پاکستان میں خوش اُسلوبی کے ساتھ رکھنے پر تیار ہے، اس لئے وہ طلاق دینا نہیں چاہتا تو یہاں فسخِ نکاح کی شرعاً کوئی وجہ نہیں، لہٰذا شرعی کونسل کو بجائے فسخِ نکاح کے، لڑکی کو پاکستان آنے، اور شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادہ کرنا چاہئے، بصورتِ دیگر مقدمہ خارج کردینا چاہئے، البتہ اس صورت میں بھی اگر معتبر اسبابِ فسخ میں سے کوئی سبب موجود ہو، مثلاً شوہر مجنون یا عنّین ہو تو شرعی کونسل برطانیہ میں رہتے ہوئے بھی شوہر کو نوٹس جاری کرکے فسخِ نکاح کی کاروائی کرسکتی ہے، مگر اس میں تمام شرائط ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اور اگر معتبر اسبابِ فسخ میں سے کوئی سبب موجود نہ ہو اور شرعی کونسل شوہر و بیوی کے درمیان خوش اُسلوبی سے رہنے کی کوشش کو کامیابی سے ہمکنار ہوتا نہ دیکھے تو پھر باہمی رضامندی سے ان کے درمیان خلع کرادے یا کسی قدر مال کے عوض شوہر سے طلاق دِلوادے۔

۳:- اگر یہاں بھی یہ صورت ہے کہ لڑکا خوش اُسلوبی سے لڑکی کو پاکستان میں رکھنے کے لئے تیار ہے، لیکن لڑکی برطانیہ سے پاکستان آنا پسند نہیں کرتی تو یہ لڑکی کی غلطی ہے، اس کو چاہئے کہ پاکستان آئے اور شوہر کے ساتھ رہے، لہٰذا شرعی کونسل یہاں بھی لڑکی کو اسی پر آمادہ کرے اور ان کا نکاح فسخ نہ کرے، کیونکہ فسخِ نکاح کی کوئی شرعی وجہ یہاں موجود نہیں ہے، اور اگر کوئی معتبر وجہِ فسخ موجود ہو تو صورتِ مسئولہ میں فسخِ نکاح کی کاروائی برطانیہ میں کی جائے یا پاکستان میں؟ اس معاملے میں کوئی صریح حکم تو کتبِ فقہ میں نہیں ملا، نہ ملنے کی اُمید ہے، لیکن قواعد کا تقاضا یہ ہے کہ اگر عورت ناشزہ ہوکر برطانیہ میں رہ رہی ہے تو شوہر کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے کہ فسخِ نکاح کی کاروائی پاکستان میں کی جائے، لیکن اگر شوہر خود اُسے وہاں اپنی رضامندی سے چھوڑ کر چلا گیا ہے، اور اس کے پاس پاکستان جانے کے وسائل نہیں ہیں تو اس صورت میں شرعی کونسل کاروائی کرسکتی ہے، البتہ جہاں شوہر کے حالات کی تحقیق مثلاً جنون یا نامردی کا ثبوت درکار ہو، وہاں وہ متعلقہ ثبوت کی کاپی شوہر کو بھیج کر اس کا موقف معلوم کرلے، اور ضرورت ہو تو اس کام کے لئے پاکستان میں علماء کی کسی مجلس کو اپنا نمائندہ بنا کر بھی حالات کی تحقیق کرسکتی ہے۔

۴:- شوہر کے وکیل نے منسلکہ کاپی میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ اگرچہ طلاق پر شوہر کی رضامندی کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن بذاتِ خود انشاءِ طلاق کے لئے کافی نہیں، کیونکہ ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ:
"لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ نکاح ناقابلِ تلافی طور پر ٹوٹ چکا ہے، لہٰذا وہ طلاق کی کاروائی سے اتفاق

کرنے کے لئے تیار ہے'' یہاں نکاح ٹوٹنے کے لئے صرف محسوس کرنے کا ذکر ہے، نیز اگلے جملے سے یہ وضاحت ہو رہی ہے کہ طلاق کی کاروائی ابھی نہیں ہوئی گو وہ آئندہ کرنے سے متفق ہے، ان میں سے کوئی لفظ انشاءِ طلاق کا نہیں ہے۔ البتہ وکیل سے شوہر نے جو الفاظ کہے، یا اسے لکھ کر دیئے، اگر وہ انشاءِ طلاق کے الفاظ ہوں تو انہیں طلاق کے لئے کافی سمجھا جاسکتا ہے، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ٹھیک ٹھیک وہی الفاظ لکھ کر بھیجے جائیں، منسلکہ پرچے میں وکیل کے الفاظ ہیں، شوہر کے الفاظ نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۷/۱۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۰/۶۱)

زوجۂ متعنّت کا حکم

سوال:- زید نے ہندہ کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا، مسلسل سات سال ہو چکے ہیں، نہ تو آج تک نان نفقہ دیتا ہے، نہ زوجیت میں رکھنا چاہتا ہے، معلق کر دیا ہے، ہر چند ثالثین نے سمجھایا کہ اگر رکھنا نہیں چاہتے تو طلاق دے دو، زید کسی بات پر راضی نہیں ہوتا، بینوا توجروا۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ہندہ اور اس کے اولیاء کو چاہئے کہ وہ شوہر سے خلع کرنے کی کوشش کریں، اگر وہ اس پر راضی نہیں، تو مسلمان عدالت میں نان ونفقہ نہ ہونے کی بنیاد پر فسخِ نکاح کا دعویٰ دائر کیا جائے، عدالت شوہر کو حکم دے گی کہ وہ یا تو عورت کے حقوق ادا کرے یا طلاق دے، اگر شوہر ان میں سے کسی صورت پر راضی نہ ہو تو عدالت کو اختیار ہوگا کہ وہ شوہر کے قائم مقام ہو کر عورت کو طلاق دیدے۔[1]

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۲۶ الف)

---

(۱) اس مسئلے کی مفصل تحقیق اور حوالہ جات اور فسخ نکاح کا مکمل طریقہ کار حضرتِ والا دامت برکاتہم کے مصدقہ درج ذیل فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

استفتاء:- کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ جو شوہر استطاعت کے باوجود اپنی بیوی کو نان ونفقہ نہیں دیتا اور عورت کے پاس نان ونفقہ کا کوئی انتظام نہ ہو اور شوہر طلاق یا خلع کے لئے بھی راضی نہ ہو تو ایسی صورت میں عورت کے لئے مذکورہ شوہر سے خلاصی حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

(باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

الجواب حامدًا و مصلیًا

۱:- اگر کوئی شوہر ایسا ہو جو باوجود استطاعت کے اپنی بیوی کو نان ونفقہ نہیں دیتا، اور عورت کے پاس نان ونفقہ کا کوئی انتظام نہ ہو اور شوہر طلاق یا خلع کے لئے بھی تیار نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ مالکی مذہب کے مطابق اس شوہر سے عدالت کے ذریعہ خلاصی حاصل کرسکتی ہے۔

۲:- خلاصی حاصل کرنے کے لئے عورت اپنا مقدمہ کسی مسلمان جج کی عدالت میں پیش کرے اور یہ ثابت کرے کہ وہ فلاں کی بیوی ہے اور وہ باوجود استطاعت کے اس کو نان ونفقہ نہیں دیتا اور نہ اس کے پاس نان ونفقہ کا کوئی انتظام ہے، جس سے اس کو سخت ''ضرر'' لاحق ہے اور وہ اس وجہ سے اس کی زوجیت سے نکلنا چاہتی ہے۔

۳:- عورت ''فلاں'' کے ساتھ نکاح اور اس کا مذکورہ رویہ گواہوں سے ثابت کرے، اور اگر اس کے پاس گواہ نہ ہوں، یا گواہ ہوں لیکن اس نے پیش نہ کئے تو اگر شوہر عدالت میں حاضر ہو تو اس سے قسم لی جائے گی، اگر اس نے قسم کھانے سے انکار کیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ عورت کا دعویٰ دُرست ہے، اب جج شوہر سے کہے کہ اپنی بیوی کے حقوق ادا کرو، یا طلاق/خلع دو، ورنہ ہم تفریق کردیں گے، اس کے بعد بھی اگر وہ ظالم کسی صورت پر عمل نہ کرے تو قاضی کوئی مہلت دیئے بغیر اسی وقت بیوی پر طلاق واقع کردے۔

۴:- لیکن شوہر یا اس کا وکیل عدالت میں حاضر نہ ہو، جیسا کہ آج کل عموماً ایسا ہی ہے، اور عدالت کے بار بار نوٹس اور سمن جاری کرنے اور شوہر نوٹس اور سمن کے بارے میں مطلع ہونے کے باوجود حاضرِ عدالت نہ ہوتا ہو، تو اگر بیوی کے پاس گواہ موجود ہوں اور وہ پیش بھی کرے تو جج ان کی گواہی کی بنیاد پر بیوی کے حق فسخِ نکاح کا فیصلہ جاری کرے، اور اگر عورت کے پاس گواہ موجود نہ ہوں، یا ہوں لیکن وہ پیش نہ کرے تو شوہر کا بار بار بلانے کے باوجود عدالت میں حاضر نہ ہونا اس کی طرف سے قسم سے انکار (نکول) سمجھا جائے گا، اور اس انکار کی بنیاد پر عدالت شوہرِ غائب کے خلاف اور بیوی کے حق میں فسخِ نکاح کا فیصلہ جاری کرے گی۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شوہر اگر غائب ہو اور عورت کے پاس گواہ موجود نہ ہوں، یا موجود ہوں لیکن عورت نے پیش نہ کئے تو اس صورت میں اس غائب شوہر کے خلاف اور عورت کے حق میں فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟ تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ یہ ''قضاء علی الغائب'' کا مسئلہ ہے، جو مذہبِ حنابلہ سے لیا گیا، یعنی ان کے ہاں غائب کے خلاف فیصلہ جائز ہے، اور یہی موقف حضراتِ شافعیہؒ کا بھی ہے، اور ان کے ہاں مدعی کے پاس گواہ ہوتے ہوئے بھی اگر مدعی گواہ پیش نہ کرے، تو مدعا علیہ سے قسم لینا اور اس کی بنیاد پر فیصلہ کرنا دُرست ہے، یہی موقف حضراتِ شافعیہؒ کا بھی ہے، اور حضراتِ حنفیہؒ میں سے حضرت امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ بھی اس کے قائل ہیں۔ لیکن اگر مدعا علیہ غائب ہو تو اس پر قسم پیش کرنا چونکہ متعذر ہوتا ہے اس لئے بار بار بلانے کے باوجود اس کا عدالت میں حاضر نہ ہونا اس کی طرف سے قسم سے انکار (نکول) سمجھا جائے گا، اور اب اس انکار کی بنیاد پر مدعی کے حق میں فیصلہ جاری کرنے کے لئے مدعی سے قسم لینا ضروری نہیں، جیسا کہ حنفیہؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔

۵:- بیوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ درخواست برائے فسخِ نکاح، نان ونفقہ نہ دینے کی بنیاد پر دے، اور جج اپنے فیصلے میں بھی اسی کو بنیاد بنائے۔ ''خلع'' کا طریقہ کار ہرگز اختیار نہ کرے، اس لئے کہ یک طرفہ خلع شرعاً کسی کے نزدیک بھی جائز اور معتبر نہیں۔ تاہم اگر کسی فیصلے میں بنیادِ فیصلہ فی الجملہ صحیح ہو، یعنی شوہر کا ''تعنّت'' ثابت ہو رہا ہو، البتہ عدالت نے فسخ کے بجائے خلع کا راستہ اختیار کیا ہو، اور خلع کا لفظ استعمال کیا ہو، .... (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)..........تو ایسی صورت میں خلع کے طور پر تو یک طرفہ فیصلہ دُرست نہ ہوگا، تاہم فسخ نکاح کی شرعی بنیاد پائے جانے کی وجہ سے اس فیصلے کو معتبر قرار دیں گے اور یہ سمجھ جائے گا کہ اس فیصلے کی بنیاد پر نکاح فسخ ہوگیا ہے، اور عورت عدّتِ طلاق گزار کر کسی دُوسری جگہ اگر چاہے تو نکاح کر سکتی ہے، بشرطیکہ یہ فیصلہ مذکورہ بالا شرائط اور طریقۂ کار کے مطابق ہو۔

یاد رکھئے! کہ شرعاً فیصلہ معتبر ہونے کی صورت میں عدّت کا اعتبار فیصلہ جاری ہونے کی تاریخ سے ہوگا۔

(عربی حوالہ جات ملاحظہ ہوں)

فی المغنی لابن قدامة: فان امتنع (المدعٰی علیه) من الحضور أو تواری فظاهر کلام أحمد: جواز القضاء علیه لما ذکرنا عنه فی روایة حرب. وروی عنه أبوطالب فی رجل وجد غلامه عند رجل فأقام البینة أنه غلامه فقال الذی عنده الغلام: أودعنی هذا رجل، فقال أحمد: أهل المدینة یقضون علی الغائب یقولون: انه لهٰذا الذی أقام البینة وهو مذهب حسن وأهل البصرة یقضون علی غائب یسمونه الاعذار وهو اذا ادّعٰی علٰی رجل الفًا وأقام البینة فاختفی المدعٰی علیه یرسل الٰی بابه فینادی الرسول ثلثًا فان جاء والا قد اعذروا الیه، فهٰذا یقوّی قول أهل المدینة وهو معنی حسن قد ذکر الشریف أبوجعفر وأبوالخطاب أنه یقضی علی الغائب الممتنع وهو مذهب الشافعی، لأنه تعذر حضوره وسؤاله فجاز القضاء علیه کالغائب البعید، بل هٰذا أولٰی لأن البعید معذور وهٰذا لا عذر له اهـ.(ج:۹ ص:۱۱۱).[1]

وفی الانصاف فی معرفة الراجح من الخلاف: فان امتنع من الحضور سمعت البینة وحکم بها فی احدی الروایتین وهو المذهب اهـ.(ج:۱۱ ص:۳۰۲).[2]

وفی الحاوی الکبیر للعلامة الماوردیؒ: فان قال المدعی: لیست لی بینة، فقد اختلف أصحابنا، هل یکون هٰذا الامتناع من الحضور کالنکول فی ردّ الیمین علی المدعی أم لا؟ علٰی وجهین: احدهما: انه لا یجعل نکولا .... والوجه الثانی: وهو أشبه أن یجعل کالنکول بعد النداء علٰی بابه بمبلغ الدعوی واعلامه بأنه یحکم علیه بالنکول لوجود شرطی النکول فی هٰذا النداء اهـ.(ج:۱۶ ص:۳۰۲).[3]

وفی المبدع: وان نکل قضی علیه بالنکول نصّ علیه واختاره عامة شیوخنا اهـ.(ج:۱۰ ص:۶۳).[4]

وفی الانصاف: هو المذهب.(ج:۱۱ ص:۲۵۴).[5]

وفی الفقه الاسلامی وأدلّته: لٰکن المختار عند الحنابلة القول بعدم ردّ الیمین.(ج:۶ ص:۵۱۷).[6]

وفی المغنی لابن قدامةؒ: وان قال المدعی: لا أرید اقامتها (البینة) وانما أرید یمینه اکتفی بها استحلف لأن البینة حقه فاذا رضی باسقاطها وترک اقامتها فله ذٰلک کنفس الحق اهـ. (ج:۹ ص:۸۹).[7] کذا فی الانصاف (ج:۱۱ ص:۲۶۳) و المبدع (ج:۱۰ ص:۶۷) وروضة الطالبین (ج:۲ ص:۴۰) وزاد المحتاج (ج:۴ ص:۵۴۱).

وفی البدائع: حتی لو قال المدعی: لی بینة حاضرة ثم أراد أن یحلف المدعی علیه لیس له ذٰلک عنده، وعندهما له ذٰلک اهـ. (ج:۶ ص:۲۲۶).[8]

واللہ تعالٰی أعلم

عصمت اللہ عصمہ اللہ

دار الافتاء دار العلوم کراچی ۱۴

۱۴۱۹/۹/۱۴ھ

الجواب صحیح

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد عبدالمنان عفی عنہ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	محمود اشرف غفر اللہ لہ

(۱) ج:۱۴ ص:۹۶ (طبع دار عالم الکتب، الریاض).
(۲) (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت).
(۳) (طبع دار الکتب العلمیة بیروت).
(۴) (طبع المکتب الاسلامی بیروت).
(۵) (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت).
(۶) (طبع دار الفکر بیروت).
(۷) ج:۴ ص:۷۲ (طبع دار عالم الکتب، الریاض).
(۸) (طبع رشیدیه کوئٹه).

نفقہ نہ دینے کی بناء پر فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- میری بہن کی شادی ہوئے سولہ۱۶ سال ہوگئے، نکاح کے بعد ایک ہفتہ سسرال رہی، پھر والدین کے گھر چلی آئی، شوہر نے آٹھ سال تک کوئی خرچہ وغیرہ نہیں دیا، آٹھ سال بعد پھر بیوی کو لے گیا، تھوڑا عرصہ رکھنے کے بعد پھر گھر سے نکال دیا، اس دوران بیوی کو اُمیدواری تھی جس سے ایک بچی پیدا ہوئی، جس کی عمر اس وقت دس سال ہے، اس کی پرورش نانا، نانی نے کی، بچی کی پیدائش کے بعد ابھی تک لڑکی میکے میں ہے، لڑکی کے باپ نے پھر بھی کوئی خبر نہیں لی، یہاں تک کہ لڑکی کا نانا چند ماہ ہوئے فوت ہوگیا، پھر بھی نہ تو سسرال والوں نے اور نہ ہی بیوی کا خاوند باپ کی تجہیز وتکفین میں شامل ہوا۔ اب ستم بالاستم یہ کہ چند دن ہوئے اطلاع ملی کہ خاوند نے دُوسری شادی کرلی ہے، میری بہن کہتی ہے کہ اب میں اپنے شوہر سے خلاصی چاہتی ہوں اور سولہ سال کا اپنا خرچہ اور بچی کے خرچے کا مطالبہ کرنا چاہتی ہوں، نیز بچی کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ دائر کر کے یہ ثابت کریں کہ آپ کا نکاح فلاں شخص سے ہوا تھا اور یہ کہ وہ اتنے عرصے سے نہ اپنا گھر آباد کرتا ہے اور نہ نفقہ کا انتظام کرتا ہے، اس پر عدالت آپ کے شوہر کو بلوا کر اُسے مجبور کرے گی کہ یا تو وہ نفقہ کا انتظام کرے اور تمام حقوقِ زوجیت ادا کرے، یا آپ کو طلاق دے، اگر آپ کا شوہر دونوں میں سے کوئی بات تسلیم کرلے تو ٹھیک ہے، ورنہ عدالت آپ کا نکاح اس سے خود فسخ کردے گی، اس کے بعد عدت گزار کر آپ جہاں چاہیں نکاح کرسکتی ہیں(۱)، آپ کا اور آپ کی بچی کا پچھلے تمام سالوں کا نفقہ آپ کے شوہر پر دیانۃً واجب ہے، اور اُسے ادا کرنا چاہئے، ادا نہ کرنے سے وہ سخت گناہگار ہوگا، لیکن عدالت کے ذریعہ پچھلی مدّت کا نفقہ حاصل کرنے میں جو تفصیل ہے وہ آپ کو پہلے لکھی جاچکی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۲۴ ج)

نان ونفقہ نہ ہونے اور عصمت کے خطرے کے پیشِ نظر عورت کے لئے فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- مسمّٰی محمد صدیق ولد گل زمان عمر ۱۳ سال کا عقد نکاح بحالت غائب ہونے محمد

(۱) تفصیل اور حوالہ جات کے لئے سابقہ ص:۴۶۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

صدیق کے ہمراہ زرینہ دختر کالا عمر ۸ سال تخمیناً، بحالتِ نابالغی بوکالت پدر ہوا، والدین ہی نے ایجاب وقبول کیا، تین سال کے بعد لڑکا بسلسلۂ ملازمت امریکہ چلا گیا، دو سال تک لڑکے سے خط و کتابت کا رابطہ قائم رہا، لڑکی جوان ہونے پر ورثاء نے لڑکے کو لکھا کہ رُخصتی پوری ہوجائے، لڑکے نے جواب میں لکھ دیا کہ میں یہاں شادی کرچکا ہوں، میری پیدائشی سرٹیفکیٹ بھیج دو، چنانچہ سرٹیفکیٹ بھیج دیا گیا، مگر تین ماہ بعد رجسٹری جس کے ذریعہ سرٹیفکیٹ بھیجا گیا تھا واپس آگیا، اس لڑکی والوں نے لڑکے کو بلانے اور شادی پر زور دیا کہ اندیشہ عصمت دری کا ہے، مگر لڑکے نے مزید خط و کتابت بند کردی، اس کے بعد متعدد خطوط بھیجے گئے، مگر کسی کا جواب نہ آیا، یہاں تک کہ دو سال گزر گئے، باوجود کوشش بسیار کے لڑکے کا کوئی سراغ نہ مل سکا، اور لڑکی جوان ہے، جس کو گھر پر رکھنا مشکل ہے، جو حکم ہو تحریر فرمایا جائے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر مندرجہ واقعات دُرست ہیں تو عورت کو چاہئے کہ وہ نان و نفقہ نہ ہونے اور عصمت کو خطرہ ہونے کی بنیاد پر عدالت میں فسخِ نکاح کا دعویٰ کرے، عدالت شریعت کے مقرّرہ اُصولوں کے مطابق تحقیق کرے، اگر یہ محسوس کرے کہ عورت حالتِ مجبوری میں ہے، تو وہ ایک سال صبر کے بعد نکاح فسخ کرسکتی ہے۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۲ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۴۲/۱۹ الف)

نفقہ نہ دینے کی بنیاد پر فسخِ نکاح کا عدالتی فیصلہ شرعاً دُرست ہے

سوال:- ایک عورت مسماۃ شمیم کی شادی آج سے دس گیارہ برس قبل ایک شخص ڈاکٹر کرامت مرزا سے ہوئی، اور شمیم کے بطن سے ڈاکٹر کرامت کی ایک لڑکی پیدا ہوئی، شادی کے ایک سال بعد ڈاکٹر کرامت مرزا صاحب ولایت چلا گیا، ولایت جانے کے بعد اپنی بیوی اور بچی کی کفالت نہیں کی، اور خرچہ بھی روانہ نہیں کیا، اور نہ کوئی خط و کتابت کی، بیوی سخت پریشان و حیران پھرتی رہی، اس کے بعد اُس نے مجبور ہوکر سول کورٹ لاہور میں دعویٰ تنسیخِ نکاح وائر کردیا، عدالت میں فسخِ نکاح کا مقدمہ تقریباً آٹھ دس ماہ تک جاری رہا، اس دوران بھی کرامت مرزا نے عدالتی اطلاع پر توجہ نہ دی، نہ اصالتہً نہ وکالتہً۔

چنانچہ عدالت نے ضروری کاروائی کے بعد مسماۃ شمیم کے حق میں تنسیخِ نکاح کا فیصلہ صادر کردیا جس کی نقل ہمراہ سوال ہذا مرسل ہے، اس کے بعد مسماۃ شمیم نے تین ماہ عدّت گزار کر ایک

(۱) مکمل تفصیل سابقہ فتویٰ ص:۴۶۱ کے حاشیہ نمبر۱ میں حضرت والا دامت برکاتہم کے مصدقہ فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

دُوسرے شخص مسمّیٰ ڈاکٹر احمد سے نکاح کرلیا، مگر مقامی نکاح خواں نے یہ نکاح پڑھنے سے انکار کردیا اور یہ نکاح ایک دُوسرے شخص سے پڑھوا دیا گیا، اس کے بعد یہ عورت مسماۃ شمیم، ڈاکٹر احمد کے گھر آباد ہوگئی اور اس کے بطن سے ڈاکٹر احمد کے دو بچے بھی پیدا ہوئے، چار پانچ سال گزر جانے کے بعد ڈاکٹر احمد کو بعض لوگوں نے شک میں مبتلا کردیا کہ یہ نکاح صحیح نہیں ہے اور بعض نے تو یہاں تک وہم ڈال دیا کہ یہ بدکاری ہے، اس کی وجہ سے مسماۃ شمیم کے خاندانی افراد بھی پریشان ہیں، اب فتویٰ مطلوب ہے کہ

۱:- یہ نکاح دُرست ہے یا نہیں؟

۲:- یہ کہ اب اس موجودہ صورت میں صحیح طریقِ کار کیا ہونا چاہئے؟

تنقیح:-

۱:- آپ نے عدالت کا پورا فیصلہ ساتھ نہیں بھیجا، پورا فیصلہ روانہ فرمائیے۔

۲:- یہ وضاحت ضروری ہے کہ ڈاکٹر کرامت کے نام عدالت نے کوئی نوٹس بھیجا تھا یا نہیں؟ اگر بھیجا تھا تو کس مضمون کا تھا؟ اور اس میں اس کو نان ونفقہ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا تھا یا نہیں؟

پچھلے دنوں دار الافتاء میں سوالات بہت زیادہ آگئے تھے، اس لئے آپ کے لفافے کا نمبر بہت دیر میں آیا، آپ ان سوالات کا جواب ارسال فرمائیں گے اور ساتھ یہ کاغذ بھی واپس بھیج دیں گے تو اِن شاء اللہ جواب جلد روانہ کردیا جائے گا۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

جوابِ تنقیح:-

۱:- جواباً عرض ہے کہ عدالت کا فیصلہ مفصل ومکمل بصورت فوٹو اسٹیٹ پہلے بھی ارسال کیا تھا، اب پھر دوبارہ حاضرِ خدمت ہے، اور یہ نقلِ فیصلہ ہر طرح مکمل اور مفصل ہے۔

۲:- دورانِ مقدمہ عدالت نے ڈاکٹر کرامت مرزا کا پتہ معلوم کرکے باقاعدہ بذریعہ رجسٹری کرامت مرزا کے نام نوٹس روانہ کیا، بلکہ دو یا تین مرتبہ نوٹس جاری کیا، جواب نہ ملنے کی صورت میں باقاعدہ طور پر عدالتی کارگزاری کے مطابق اخبار میں بھی اشتہار شائع کرایا، اور اُس اشتہاری نوٹس کا اخبار باقاعدہ طور پر کرامت مرزا کو بھیجوایا گیا۔

اس کے بعد جب ہر طرف سے عدالت کو عدمِ تعمیل کی وجہ سے مایوسی ہوئی تو پھر کرامت مرزا کے والد سے عدالت نے رابطہ قائم کیا اور اُس کو عدالت میں طلب کیا، اس مرتبہ طلبی پر کرامت مرزا کے والد نے قطعی توجہ نہ دی، تمام حالات سے مایوس ہوکر عدالت نے ملحقہ فیصلہ صادر فرمادیا، سوئے اتفاق

سے اس وقت کرامت مرزا کے نام جاری کئے گئے نوٹس وغیرہ اور اخبار اشتہار کی کاپی یا اس اشاعت کی تاریخ وغیرہ اس وقت معلوم نہیں ہے۔

یہ ممکن ہے کہ اگر عدالت سے پھر اُس مقدمے کا نمبر وغیرہ دے کر نوٹس وغیرہ کے متعلق معلومات فراہم ہوسکتی ہیں، مگر یہ معاملہ بہت طویل ہوجائے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ نوٹس روانہ کئے گئے، اشتہار شائع کیا گیا، کرامت مرزا کے پتے پر بھیجا گیا، اُس کے والد سے رابطہ قائم کیا گیا، اس کے بعد ہی فیصلہ صادر ہوا، اور یہ واقعات حقائق ہیں۔

جواب:- منسلکہ فیصلہ جو آپ نے پہلے ارسال فرمایا تھا اور اس مرتبہ پھر وہی بھیج دیا ہے، عدالت کا پورا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ صرف ڈگری کے الفاظ ہیں، جج جو فیصلہ لکھتا ہے اس میں پورے واقعات تفصیل کے ساتھ درج ہوتے ہیں، وہ فیصلہ آپ نے اس مرتبہ بھی نہیں بھیجا، تاہم تنقیحات کے جواب میں جو باتیں آپ نے لکھی ہیں اُن کی روشنی میں حکم یہ ہے کہ اگر عورت نے نان ونفقہ نہ ہونے کی بنیاد پر ڈاکٹر کرامت سے نکاح فسخ کرنے کا دعویٰ کیا تھا اور عدالت نے اس کو اسی بنیاد پر حاضرِ عدالت ہونے کا حکم جاری کیا، لیکن وہ خود حاضر نہ ہوا، یا اس کے والد اس کی طرف سے پیش ہوئے اور اُنہوں نے نان ونفقہ کی ادائیگی کے سلسلے میں کسی ایسے معقول انتظام کا وعدہ نہیں کیا جو عدالت کو مطمئن کر سکے تو عدالت کا منسلکہ فیصلہ صحیح ہے، اور اس کی بناء پر ڈاکٹر کرامت سے مسماۃ شمیم کا نکاح فسخ ہوگیا،[1] اور فسخِ نکاح کے بعد اگر عدت گزار کر مسماۃ شمیم نے ڈاکٹر احمد سے نکاح کیا ہے تو یہ نیا نکاح دُرست ہے، ڈاکٹر احمد کو کچھ تردّد نہ کرنا چاہئے۔ اور اگر اس کے سوا کوئی اور صورت ہو تو مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیا جائے، لیکن اس صورت میں عدالت کا مکمل فیصلہ بھیجنا ضروری ہوگا۔ منسلکہ فیصلہ مکمل نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۸/۲۸ ب)

زوجۂ متعنّت کا حکم

سوال:- ایک لڑکی کو اُس کا خاوند پانچ برس سے نہیں لے جاتا، اور طلاق بھی نہیں دیتا، پانچ بچے لڑکی کے ساتھ ہیں، خرچہ بھی ۵ سال سے نہیں دیتا، لڑکی کا والد بوڑھا اور غریب ہے، جب کہا جاتا ہے کہ تم اپنی بیوی کو لے جاؤ، وہ کہتا ہے کہ میں نہیں رکھتا اور طلاق بھی نہیں دیتا۔ اس کا شرعی حکم بتادیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں عورت کو چاہئے کہ شوہر کو طلاق دینے یا خلع کرنے پر راضی

---

(۱) دلائل کے لئے ص:۴۶۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبرا ملاحظہ فرمائیں۔

کرے، اگر وہ اس پر رضامند نہ ہو تو عدالت میں اس کے خلاف نان ونفقہ نہ ہونے کی بنا پر فسخِ نکاح کا دعویٰ دائر کرے؛ عدالت مرد کو بلاکر کہے کہ یا تو تم اپنی بیوی کو اپنے گھر آباد کرو اور اس کے حقوق نان ونفقہ ادا کرو، ورنہ اس کو طلاق دے دو، اگر وہ نفقہ دینے پر آمادہ نہ ہو اور ساتھ لے جائے تو مقصد حاصل ہے، اور اگر نہ نفقہ ادا کرے اور نہ طلاق دے تو عدالت اس شوہر سے عورت کا نکاح فسخ کرسکتی ہے، جس کے بعد عدت گزار کر عورت دُوسری جگہ نکاح کرسکے گی۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۷/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۷۹۳ ب)

زوجۂ متعنّت کا حکم

سوال:- آپ کا فتویٰ مؤرخہ ۱۳۹۰/۱۲/۲ھ کے مطابق بندی نے برما میں وہاں کے مسٹر عبدالرحیم چودھری صاحب کے ہاں اپنی عاجزی اور بے کسی بیان کرکے شوہر کو یہاں بھیج دینے یا نان نفقہ دینے کے لئے خط بھیجا تھی، فی الحال شوہر عابدالرحمٰن پہاڑی باغیوں میں شامل ہوکر وہیں جنگلات کے اندر زندگی گزار رہا ہے، اور انہوں نے میری خبر پاکر مجھے نان نفقہ دینے کے بجائے مجھ سے روپے مانگا ہے جیسا کہ اس لیٹر سے جو کہ وہاں سے بھیجا ہے حضورِ والا کو پتہ لگ جائے گا، لہٰذا بندی کو خلاصی کی کوئی شرعی صورت بتائی جائے۔ میں تین چھوٹے چھوٹے بچوں سمیت بڑی مصیبت میں ہوں، نہ میں برما جاسکتی ہوں اور نہ شوہر یہاں آنے کو تیار ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مسماۃ گورابائی کو حق ہے کہ وہ عدالت میں اپنے شوہر پر نان و نفقہ کا دعویٰ کرے، عدالت شوہرِ مذکور کو نفقہ ادا کرنے پر مجبور کرے، اگر وہ اطلاع کے باوجود حاضر نہ ہو یا نان ونفقہ ادا کرنے سے انکار کرے تو عدالت کو حق ہوگا کہ وہ مسماۃ گورابائی سے شوہرِ مذکور کا نکاح فسخ کردے، اگر عدالت اس طور پر مکمل تحقیق کرکے نکاح فسخ کرے گی تو گورابائی تاریخِ فسخ سے عدت کی مدت گزار کر جہاں چاہے نکاح کرسکے گی۔ (۲)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۷/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۸۴۱ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱ و ۲) تفصیلی طریقۂ کار اور حوالہ جات سابقہ ص:۴۶۱ کے فتویٰ اور اس کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

عدم ادائیگیٔ نفقہ کو فسخِ نکاح کی بنیاد بنانے کا حکم

سوال:- ابھی میری عمر پانچ سال کی تھی کہ میرے والدین نے میری شادی ایک شخص مسمّٰی مظفر حسین شاہ ولد نادر شاہ سے کردی، جب چند سال بعد میں بالغہ ہوگئی تو میں نے اپنے خاوند کو نہیں پایا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ علاقہ پاکستان میں مزدوری کر کے پیٹ پالتا ہے، بعد میں چند دفعہ گھر بھی آیا تھا، میں نے اس کے ساتھ چلنے کا مطالبہ کیا، مگر وہ انکاری ہوگیا، اور کہا: مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ والد صاحب نے جرگہ پنچایت کو جمع کر کے اس سے کہا کہ یا تو بیوی کو ہمراہ لے جا، یا اپنے گھر چھوڑ جا، مگر وہ ایک بات ماننے کو تیار نہیں ہے۔ عالیجاہ! میرا والد غریب سفید پوش آدمی ہے، آج تک انہوں نے میرا خرچہ برداشت کیا، اب اگر کوئی صورت ہو تو فرما کر ممنون فرمائیں۔ نیز وہ کہتا ہے کہ اگر ایک ہزار روپیہ دو گے تو طلاق مل جائے گی۔ مگر عالیجاہ! ایک ہزار روپیہ میں کہاں سے لاؤں؟ بہرصورت اگر اب بھی ہم آپس میں مل جائیں تو تعلقات کے بہتر ہونے کا خیال نہیں، ایسے شوہر پر کیا اعتبار؟ براہِ کرم شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کو حق ہے کہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں نان ونفقہ نہ ہونے کی بناء پر فسخِ نکاح کا دعویٰ دائر کریں، عدالت شوہر کے نام نوٹس جاری کرے گی کہ یا تو بیوی کے حقوق ادا کرو یا طلاق دو، ورنہ تمہارے نکاح کو فسخ کردیا جائے گا، اگر اس پر شوہر حقوق کی ادائیگی نہ کرے اور طلاق بھی نہ دے، تو عدالت شوہر کے قائم مقام ہوکر آپ کو طلاق دیدے گی، اس کے بعد عدّت گزار کر کہیں اور نکاح کرسکیں گی۔ (۱)

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۷۵ الف)

بیوی کو جنوبی افریقہ چھوڑ کر خود مستقل پاکستان آنے والے سے بیوی کے فسخِ نکاح کا طریقہ

سوال:- میں ایک مسلمان عورت ہوں، ساکنہ جنوبی افریقہ، میرا خاوند آج سے ڈھائی سال کا عرصہ ہوا ہے کہ میرے اکلوتے لڑکے اسماعیل کو لے کر بغیر رُخصت کے وطن ترک کر کے پاکستان میں مقیم ہے، روانگی کے وقت میرے خاوند نے رُخصت تو درکنار مجھے اطلاع تک نہیں دی کہ وہ پاکستان

(۱) مکمل تفصیل اور حوالہ جات کے لئے ص:۴۶۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

جارہے ہیں، نہ میری رہائش اور بود و باش کا انتظام کیا۔ جنوبی افریقہ میں ایک غیر مسلم حکومت ہے، مسلمان قاضی یا جج کے عہدے پر کوئی نہیں ہے، لہٰذا آپ کے شعبۂ دار الافتاء سے متوجہ ہوں، میرے خاوند نے اپنے قیام کے دوران پاکستان میں عقدِ ثانی کیا ہے، مزید پاکستان سے جنوبی افریقہ آنے والے مسافروں کی زبانی میرے خاوند نے یہ پیغام مجھے بھیجا ہے کہ میں تا عمر ان کو طلاق نہیں دوں گا، اور اپنے وطنِ پیدائش جنوبی افریقہ آنے کا ارادہ بھی ترک کردیا ہے۔ ان حالات کو پیشِ نظر رکھ کر مجھ مظلومہ کے لئے کوئی راستہ ہموار فرما کر کوئی فیصلہ صادر فرماویں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ جنوبی افریقہ میں علماء کی کسی جماعت سے رُجوع کریں، یہ جماعت کم از کم دِین دار اور مستند علماء پر مشتمل ہونی چاہئے، علماء کی یہ جماعت معاملے کی غیر جانبدارانہ تحقیق کرے اور اگر یہ دعویٰ صحیح ثابت ہو کہ مرد باوجود وسعت کے خرچ نہیں دیتا تو یہ جماعت شوہر کے نام نوٹس جاری کرے کہ یا اپنی بیوی کے حقوق ادا کرو، ورنہ ہم نکاح ختم کردیں گے، اس کے بعد بھی اگر وہ کسی صورت پر عمل نہ کرے تو علماء کی یہ جماعت شوہر کے قائم مقام ہوکر طلاق واقع کردے، اس طلاق کی عدّت (تین حیض) گزار کر آپ جہاں چاہیں نکاح کرسکیں گی[1]، لیکن علماء کی جس جماعت کے پاس آپ اپنا مقدمہ لے جائیں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام متعلقہ مسائل سے باخبر ہونے کے لئے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب "الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ" کا ص:۲۴ سے ص:۳۱ تک، اور ص:۶۳ سے ص:۶۴ تک غور سے مطالعہ کریں اور جس جگہ کوئی اُلجھن ہو، دُوسرے علماء سے رُجوع کریں۔

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۸ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲۸/۱۹ الف)

شوہر کی ضربِ شدید اور ناقابلِ برداشت جسمانی اذیت کی بناء پر فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- بخدمت جناب مفتی صاحب دار العلوم کراچی

گزارش ہے کہ علمائے دین اس مسئلے میں کیا فرماتے ہیں جو یہ ہے کہ فسخِ نکاح کا فیصلہ عدالت نے کیا ہے، اس مسئلے میں ہمیں اطمینان دِلایا جائے، عین نوازش ہوگی۔

محمد عرفان ڈرائیور
دار العلوم کراچی

(۱) مزید تحقیق اور حوالہ جات کے لئے سابقہ ص:۴۶۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- منسلکہ فیصلہ احقر نے پڑھا، اس فیصلے[1] میں شوہر کے ضربِ شدید اور ناقابلِ برداشت جسمانی اذیت رسانی کی بنیاد پر مسماۃ شمیم اختر کا نکاح محمد سرور سے فسخ کر دیا گیا، فسخِ نکاح کی بنیاد مالکی مذہب کے مطابق دُرست ہے، اور فقہائے حنفیہ نے ضرورت کے موقع پر اس مسلک کو اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، لہٰذا عدالت کے فیصلے کے بعد مسماۃ شمیم اختر کا نکاح محمد سرور سے ختم ہو چکا ہے، اب وہ عدت پوری کرے، یعنی تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزارنے کے بعد کہیں اور نکاح کرسکتی ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۰۰/۱۱/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۹۵/۳۱ د)

نان و نفقہ نہ دینے کی بناء پر فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- ممتاز بی بی کی گیارہ سال ہوگئے شادی ہو چکی ہے، ان گیارہ سالوں میں سے ایک سال بمشکل ممتاز بی بی نے سسرال میں گزارا ہوگا، کئی طرح کی باتیں ہوئیں، ممتاز بی بی کے شوہر سے کئی بار اپیل کی گئی کہ یا تو طلاق دے دیں یا خرچ دے دیا کریں، یا آپ ہمارے پاس آتے رہا کریں یا آپ ہمیں بلالیں، تاکہ کوئی فیصلہ ہو جائے، مگر سوائے پریشانی کے عبدالقیوم نے کوئی فیصلہ اس میں نہیں کیا، اور نہ وہ بیوی کو پاس بلاتا ہے اور نہ خرچ دیتا ہے، اس صورت میں شریعت کیا حکم دیتی ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ممتاز بی بی کو چاہئے کہ اپنے شوہر کو سمجھا بجھا کر طلاق حاصل کرلے، اگر وہ اس پر راضی نہ ہو تو خلع کرلیں، مثلاً اگر اپنا مہر معاف کر کے اس سے طلاق حاصل کرنے کی کوشش کرے، اگر وہ کسی طرح اس پر آمادہ نہ ہو تو کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں نان و نفقہ نہ دینے کی بنیاد پر دعویٰ دائر کیا جائے، عدالت شوہر کو بلا کر یہ کہے گی کہ یا طلاق دو یا نان و نفقہ ادا کرو، اور اگر شوہر ان میں سے کچھ ماننے پر تیار نہ ہو تو شوہر کے قائم مقام کی حیثیت سے عدالت کو طلاق دینے کا اختیار ہوگا۔[2]

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۳ھ

زوجۂ متعنّت کا حکم

سوال:- میری شادی محمد سرور کے ساتھ ڈیڑھ سال قبل ہوئی تھی، اور اُس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کی عمر دس ماہ ہے، ڈیڑھ سال کا عرصہ محمد سرور کے ساتھ بڑی ہی تکلیف سے گزارا، مجھے وہ

---

(۱) انگریزی میں فسخِ نکاح کا یہ عدالتی فیصلہ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے خود پڑھ کر مذکورہ فتویٰ صادر فرمایا، یہ فیصلہ اگرچہ رجسٹر میں محفوظ نہیں تاہم فتویٰ سے عدالتی فیصلے کے مندرجات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔
(۲) تفصیلی طریقۂ کار اور حوالہ جات سابقہ ص:۴۶۱ کے فتویٰ اور اس کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

اکثر مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتا تھا، میں والدین کے گھر آجاتی، والدین مجھے روپے، کپڑے وغیرہ دے کر واپس بھیجتے، محمد سرور محنت مزدوری نہیں کرتا، وہ زیادہ تر رات کو کوارٹر میں تالا لگا کر چلا جاتا اور صبح آکر تالا کھول دیتا، نہ معلوم کہ رات بھر وہ کہاں رہتا، ایک دن یہ بول کر گھر سے نکال دیا کہ دو سو روپے لے کر آؤ ورنہ ذبح کر دوں گا۔ میرے والدین محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں، وہ کہاں تک دیتے رہتے، اب میرے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ طلاق لے لوں، لہٰذا مجھے طلاق دِلائی جائے۔ اگر وہ پریشان کرنے کے لئے طلاق نہ دے تو میں کیا عدالت سے اپنا نکاح فسخ کرا سکتی ہوں اور وہ شرعاً معتبر ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں پہلے تو اس بات کی کوشش کی جائے کہ شوہر کو خدا کا خوف دِلا کر اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ ازخود طلاق دیدے، لیکن اگر وہ اس پر آمادہ نہ ہو اور نفقہ وغیرہ بھی ادا نہ کرے تو پھر مسماۃ شمیم اختر کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ دائر کر کے پہلے یہ ثابت کرے کہ اس کا نکاح محمد سرور کے ساتھ ہوا تھا، اور یہ کہ وہ نان ونفقہ ادا نہیں کرتا، حاکم معاملات کی شرعی تحقیق کے بعد اگر یہ دیکھے کہ شوہر نہ نان ونفقہ دیتا ہے، اور نہ اس کا اطمینان دِلاتا ہے، تو وہ نکاح فسخ کر سکتا ہے، اس طرح اگر اس نے نکاح فسخ کر دیا تو وہ شرعاً معتبر ہوگا۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۳۰/۲۷ د)

زوجۂ متعنّت کا حکم

سوال:- ایک عورت کا شوہر عرصہ بارہ چودہ سال سے چلا گیا ہے، وہ فوج میں ملازم اور کراچی میں رہتا ہے، اس درمیان میں ہر طرح کوشش کی گئی کہ وہ بیوی کو اپنے پاس رکھے یا طلاق دے لیکن وہ نہیں مانتا، کیا حکمِ شرعی ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں عورت کو چاہئے کہ وہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں نان نفقہ نہ ہونے کی بنیاد پر شوہر کے خلاف تنسیخِ نکاح کا دعویٰ دائر کرے، عدالت شوہر کو عدالت میں حاضر کر کے اسے نان ونفقہ اور حقوق کی ادائیگی پر مجبور کرے گی اور اگر وہ راضی نہ ہو یا عدالت میں حاضر نہ ہو تو اسے نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۶۲ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۶۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبرا۔

شوہر کے نامرد ہونے کی بناء پر فسخِ نکاح کی شرائط، نیز عدم ادائیگیٔ نفقہ کی بناء پر فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- رائج الوقت ملکی قانون میں عدم فراہمیٔ نفقہ اور عدم ادائیگیٔ حقوقِ زوجیت کی صورت میں عورت کو دو سال تک انتظار کرنے کے بعد تفریقِ نکاح کا حق پہنچتا ہے۔

شریعت میں کیا اس طرح کی تحدید ہے؟ اگر نہ ہو تو جرم کے تحقق کے لئے کچھ مدّت کا گزرنا ضروری ہے، وہ مدّت کتنی ہے؟

(مولانا قاضی) بشیر احمد
(قاضی عدالت باغ ضلع پونچھ، آزاد کشمیر)

جواب:- جہاں تک عدم ادائیگیٔ حقوقِ زوجیت کا تعلق ہے شرعاً یہ اُس وقت فسخِ نکاح کا موجب ہوسکتی ہے جبکہ شوہر عنّین ہو، اور اس صورت میں عورت کو دعویٰ دائر کرنے کے لئے کسی انتظار کی ضرورت نہیں، البتہ شرط یہ ہے کہ عورت کو نکاح سے قبل شوہر کے عنّین ہونے کا علم نہ ہو، نکاح کے بعد ایک مرتبہ بھی شوہر نے وطی نہ کی ہو، عنّین ہونے کا علم ہونے کے بعد عورت نے شوہر کے نکاح میں رہنے پر ایک مرتبہ بھی رضامندی ظاہر نہ کی ہو، ہاں! اس صورت میں جب قاضی کے پاس معاملہ پہنچے تو وہ شوہر کو ایک سال کی مہلت دے گا، اس ایک سال میں بھی وہ تندرست نہ ہو تو عورت کو فسخ کا اختیار دے گا، اگر وہ اسی مجلس میں تفریق کو اختیار کرے تو نکاح فسخ کردے گا، عنّین ہونے کے بغیر اگر کوئی شخص حقوقِ زوجیت ادا نہ کرتا ہو تو یہ اس کے لئے گناہ تو ہے لیکن فسخِ نکاح کا سبب نہیں، **لما فی الدر المختار لحصول حقها بالوطء مرة وقال الشامی وما زاد علیها فهو مستحق دیانة لا قضاء، بحر، عن جامع قاضی خان ویأثم اذا ترک الدیانة متعنتا مع القدرة علی الوطء (باب العنین** ج:۲ ص:۹۷۷)[1]۔ اور عدم ادائیگیٔ نفقہ کی بنیاد پر فسخِ نکاح کا جو حق عورت کو دیا گیا ہے، یہ مسئلہ مذہبِ مالکی سے ماخوذ ہے، اس میں دعویٰ کے لئے کوئی انتظار شرط نہیں، ہاں! یہ شرط ہے کہ شوہر خلع پر راضی نہ ہو، اور عورت کے خرچ کا کوئی دُوسرا انتظام نہ ہو۔ ان شرائط کے تحقق کے بعد مذہبِ مالکی پر عمل کیا جائے گا، اور مذہبِ مالکی میں اس بنیاد پر فسخِ نکاح کے لئے کسی مدّت کے انتظار اور مہلت کی باتفاقِ مالکیہ ضرورت نہیں (الحیلة الناجزة ص:۷۸)[2]۔

ھٰذا ما عندی واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۷/۶/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۲۸ ب)

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار باب العنین ج:۳ ص:۴۹۵ (طبع سعید)۔ نیز ''زوجۂ عنّین'' کے فسخِ نکاح کی مذکورہ شرائط کی تفصیل کے لئے حیلۂ ناجزہ ص:۴۳ تا ۴۹ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) ص:۷۳،۷۴ (طبع دارالاشاعت کراچی)۔

صرف مردانہ کمزوری کی بناء پر عورت کو فسخِ نکاح کا حق حاصل نہیں

سوال:- ایک لڑکی بالغہ نے ایک بالغ لڑکے سے نکاح کیا تھا، اس کے بعد لڑکی کہتی ہے کہ میرا شوہر طاقتِ مردانہ کے اعتبار سے کمزور ہے، میں اس شوہر کے ساتھ رضامند نہیں ہوں، اس لئے میں نکاح کو فسخ کرنا چاہتی ہوں، اور لڑکا اقرار کرتا ہے کہ میں تندرست ہوں۔ اس کا کیا حکم ہے؟ لڑکا کہتا ہے کہ اگر طلاق ہو جائے تو مہر دینا پڑے گا یا نہیں؟

جواب:- صرف مردانہ کمزوری سے عورت کو فسخِ نکاح کا حق حاصل نہیں ہوتا، جب تک کہ مرد کا بالکل نامرد ہونا ثابت نہ ہو،[1] لہٰذا اس صورت میں اس پر مکمل مہر واجب ہوگا، شوہر کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ اگر زیادتی عورت کی طرف سے ہو تو طلاق دینے کے لئے مہر معاف کرنے کی شرط لگائے، اس صورت میں اگر عورت مہر معاف کر دے تو مہر معاف ہو جائے گا۔

(نوٹ) مرد کو چاہئے کہ جب وہ طلاق دے تو طلاق کا لفظ صرف ایک مرتبہ کہے، اور ایک مرتبہ سے زیادہ طلاق نہ دے، تین طلاق دینا ناجائز ہے۔[2]

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۷/۴ھ

نامردی کے دعویٰ کو رَدّ کر کے صرف ظلم کی بناء پر فسخِ نکاح کے عدالتی فیصلے کی شرعی حیثیت

سوال:- بیوی نے شوہر کے خلاف دو وجہ سے فسخِ نکاح کا دعویٰ کیا، ایک نامردی، دُوسرے ظلم کی بناء پر خلع بذریعۂ عدالت، عدالت نے نامردی کے سبب کو رَدّ کر دیا، اور ظلم کی بناء پر خلع کے دعویٰ کو صحیح مان کر نکاح فسخ کر دیا، کیا نکاح فسخ ہوگیا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں لڑکی کے فسخِ نکاح کی شرعی صورت صرف یہ تھی کہ شوہر کا نامرد ہونا ثابت ہو جاتا اور علاج کے باوجود اس کی اصلاح نہ ہوتی، لیکن منسلکہ فیصلے میں تصریح کی گئی ہے کہ عورت کا یہ الزام دُرست ثابت نہیں ہوا، اگر واقعہ یہی ہے تو عورت کو فسخِ نکاح کا حق حاصل نہیں ہے، خلع کی جو بنیاد بیان کی گئی ہے وہ شرعاً دُرست نہیں، کیونکہ خلع کا معاملہ صرف زوجین کی باہمی رضامندی سے انجام پاسکتا ہے، اگر شوہر اس پر راضی نہ ہو تو اسے خلع پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، ہاں! جس ظلم کی بنیاد پر خلع کا دعویٰ کیا گیا ہے، اس ظلم کے ازالے پر بزورِ عدالت مجبور کیا جاسکتا ہے، لیکن حنفی فقہ کی رُو سے ہر ظلم کی بناء پر عدالت شوہر کو خلع پر مجبور کرنے کی مجاز نہیں ہے، قال الامام أبوبکر الجصاص رحمہ

---

(۱) تفصیل کے لئے پچھلا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) حوالہ کے لئے ص:۳۲۰ اور ۳۲۳ کا حاشیہ نمبر۱ و۲ ملاحظہ فرمائیں۔

الله لو كان الخلع الى السلطان شاء الزوجان أو أبيا اذا علم انهما لا يقيمان حدود الله لم يسئلهما النبي صلى الله عليه وسلم عن ذلك ولا خاطب الزوج بقوله اخلعها بل كان يخلعها منه ويرد عليه حديقته، وان أبيا أو واحد منهما لما كانت فرقة المتلاعنين الى الحاكم لم يقل للملاعن خل سبيلها بل فرق بينهما. (أحكام القرآن للجصاص ج:۱ ص:۳۶۸)[1] وقال فى العالمگيرية وشرطه شرط الطلاق (ج:۱ ص:۵۱۵)[2] وقال السرخسى لأنه عقد يعتمد التراضى. (المبسوط ج:۶ ص:۱۷۳)[3] مذکورہ نصوص سے معلوم ہوا کہ صورتِ مسئولہ میں شرعی حیثیت سے نکاح فسخ نہیں ہوا، اور عورت کو دُوسری جگہ شادی کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۱/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۷۰۳/۲۱ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

نان ونفقہ دینے سے انکار کی بناء پر فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- مسمّٰی مختار بیگم کی شادی ایک آدمی کے ساتھ کروائی تھی، حالانکہ ان کی مرضی نہیں تھی، لیکن مجبوری کی بناء پر نکاح کرلیا، اور اب تین سال کے بعد اس کو گھر سے نکالا جارہا ہے اور شوہر نان و نفقہ سے انکار کرتا ہے، اور یہ بھی کہہ رہا ہے کہ تم پیسے کماؤ زنا پر، تو شریعت میں ایسے آدمی کا کیا حکم ہے اور بیوی کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب:- مذکورہ صورت میں مختار بیگم کو چاہئے کہ وہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں شوہر کی طرف سے نان ونفقہ نہ ہونے کی بناء پر فسخِ نکاح کا دعویٰ کرے، حاکم، شرعی شرائط کے مطابق شوہر کو حاضرِ عدالت کرکے اسے مجبور کرے کہ وہ مختار بیگم کو نان ونفقہ دے اور اس کے ساتھ نیک سلوک کرے، بصورتِ دیگر اسے طلاق دے، اگر شوہر حاضرِ عدالت نہ ہو یا نان ونفقہ اور طلاق دونوں سے انکار کرے تو عدالت شوہر کی طرف سے طلاق دے سکتی ہے، اس کے بعد مختار بیگم تین مرتبہ ایام ماہواری بطور عدّت گزار کر جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۵۷۲/۲۲ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

---

(۱) ج:۱ ص:۳۹۵ (طبع سهيل اكيڈمى لاهور).
(۲) عالمگيرية ج:۱ ص:۴۸۸ (طبع رشيديه كوئٹه).
(۳) (طبع دار المعرفة بيروت).
(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۹ کا حاشیہ نمبر ا و ۲۔

﴿باب العدّة وأحكامها﴾

(عدّت اور اُس کے اَحکام)

تین طلاق کے بعد عدّت کی مدّت اور نفقہ و سکنیٰ کے اَحکام

سوال:- میری بیوی سے رات کو تلخ کلامی ہوئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ میری بیوی کو مجھ پر شک تھا کہ میں نے اپنی پڑوسن سے بات کی تھی، لیکن میں نے قسم کھا کر تسلی دے دی تھی، لیکن فجر کی نماز کے بعد دوبارہ پھر تلخ کلامی ہوئی اور میں نے انہیں گھر سے باہر نکال دیا، تو وہ اندر آگئی تو میں نے کہا: ''تجھے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے''، کیا اس سے طلاق ہوئی یا نہیں؟ نباہ کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ نیز بیوی کو چھ سات مہینے کا حمل بھی ہے، اور اگر طلاق ہوگئی ہے تو عدّت اور نان و نفقہ کے بارے میں بھی ذکر کردیں، اور ساتھ رہ سکنے کے بارے میں بھی بتادیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی طرف سے آپ کی بیوی پر طلاقِ مغلّظہ واقع ہوگئی ہے، اور اب وہ آپ کے لئے حرام ہوچکی ہے، نہ رُجوع ہوسکتا ہے اور نہ حلالۂ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے،[1] اور طلاق حمل کی حالت میں بھی ہوجاتی ہے،[2] اب آپ کی بیوی کی عدّت بچے کی پیدائش پر ختم ہوگی،[3] اس دوران آپ پر ان کا نان و نفقہ اور رہائش کا انتظام واجب ہے،[4] وہ آپ کے گھر میں الگ کمرے میں پورے پردے کے اہتمام کے ساتھ رہیں،[5] میاں بیوی کی طرح آپس میں ملنا بالکل حرام ہے، بچے کی پیدائش کے بعد وہ جہاں چاہیں نکاح کرسکتی ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳۹/۲۸ ج)

---

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۳۲۱ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) وفي الهداية كتاب الطلاق باب النفقة ج:۲ ص:۴۴۳ (طبع شركت علميه ملتان) واذا طلّق الرّجل امرأته فلها النّفقة والسكنىٰ في عدّتها رجعيًا كان أو بائنًا. وكذا في الشامية باب النّفقة مطلب في نفقة المطلّقة ج:۳ ص:۶۰۹ (طبع سعيد). وكذا في الهندية كتاب الطّلاق الفصل الثالث في نفقة المعتدّة ج:۱ ص:۵۵۷ (طبع ماجديه كوئٹه).

(۵) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۲۶ کا حاشیہ نمبر۲ و۳ اور اگلے صفحے کا حاشیہ نمبر۳ ملاحظہ فرمائیں۔

خلوت کے بعد خلع کی صورت میں عدّت واجب ہے

سوال:- میری ایک عزیزہ کی شادی مئی ۱۹۷۴ء میں ہوئی، چند روزہ تعلقات کے بعد لڑکی اپنے بھائی کے گھر آگئی، اب جبکہ عرصہ دو سال کا ہوگیا لڑکی نے اپنے شوہر کی شکل تک نہیں دیکھی، اور ماہِ رواں کے شروع میں خلع لے لیا، اس کی عدّت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر شوہر اور بیوی کے درمیان خلوت ہوچکی تھی تو صورتِ مسئولہ میں آپ کی اس عزیزہ پر عدّت واجب ہے[1]، خواہ دو سال سے اس نے شوہر کی صورت نہ دیکھی ہو اور عدّت تین ماہواریوں کی تکمیل ہے[2]، اس دوران اس کے لئے اپنے گھر سے باہر نکلنا بالکل جائز نہیں ہے[3]، اور یہ حکم اس وقت ہے جبکہ اس نے اپنے شوہر سے جو خلع کیا ہے وہ شوہر کی رضامندی سے کیا ہو، اگر کوئی اور صورت ہوتو سوال دوبارہ بھیج کر اس کا حکم معلوم کرلیا جائے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱۱/۲۸ ب)

شوہر کے گھر عدّت گزارنا ضروری ہے

سوال:- ایک خاتون، پاکستان کوارٹرز میں رہتی تھیں، ان کے شوہر بیمار ہوئے، ہسپتال میں گئے وہاں انتقال ہوگیا، ان کے بھائی یعنی دیور بورہ پیر اپنے گھر متوفی کو لے آئے، یہیں سے تدفین کی، خاتون کو بھی یہیں عدّت کرنے کو کہا، وہ بورہ پیر پر ہی عدّت گزار رہی ہیں۔ پاکستان کوارٹرز یعنی ان کے گھر انڈیا سے مہمان آگئے، بورہ پیر جانے سے یعنی دیور کے مکان پر پردے کا اور غیر ہونے پر دُوسری پریشانیاں بھی ہیں، یہ مہمان خاتون کے بہن اور بھائی ہیں حقیقی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ خاتون اپنے گھر میں منتقل ہوکر عدّت کے باقی دن پورے کرے، بہن بھائی سب ایک جگہ جمع ہوجائیں۔ شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مرحوم کی بیوہ کو اپنے شوہر کے مکان (پاکستان کوارٹرز) ہی

---

(۱) وفی تنویر الأبصار مع الدر المختار ج:۳ ص:۵۰۴ (طبع سعید) (وسبب وجوبها) عقد (النكاح المتأكد بالتسليم وما جرى مجراه) من موت أو خلوة اى صحيحة.

(۲) وفی تنویر الأبصار مع الدر المختار ج:۳ ص:۵۰۴، ۵۰۵ (طبع سعید) (وهی فی) حق (حرة تحيض لطلاق بعد الدخول حقيقة أو حكمًا ثلاث حيض كوامل).

(۳) وفی الدر المختار كتاب الطّلاق باب العدّة فصل فی الحداد ج:۳ ص:۵۳۶ (طبع سعید) (وتعتدان) اى معتدة طلاق وموت فی بيت وجبت فيه ولا يخرجان منهٗ الّا أن تخرج أو ينهدم المنزل أو تخاف انهدامه .... الخ.

میں عدت گزارنی چاہئے تھی،[۱] تاہم مذکورہ اعذار کی بناء پر اب بھی وہ دیور کے مکان سے پاکستان کوارٹر اپنے مکان میں منتقل ہوسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۹/۱/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۶۵/۱۹ الف)

عدّت کے دوران سودا سلف کے لئے باہر جانے کا حکم

سوال:- ایک خاتون کے شوہر ۲۷رشوال ۱۴۰۰ھ کو انتقال کرگئے ہیں، گھر میں کوئی مرد نہیں جو گھر کا سودا سلف اور دیگر بازار کے کام کرسکے، ان کا بازار جانا لازم ہے، شام ۴ بجے سے صبح ۷ یا ۸ بجے تک گھر میں رہیں، باقی وقت میں وہ سودا سلف لاسکتی ہیں؟ ان کی عدّت کب ختم ہوگی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مذکورہ خاتون دن کے وقت یعنی طلوعِ آفتاب کے بعد سے مغرب سے قبل قبل سودا سلف لانے کے لئے گھر سے نکل سکتی ہیں، لیکن رات سے پہلے پہلے گھر واپس آنا ضروری ہے، اور رات گھر ہی میں گزارنی ضروری ہے،[۲] اگر وہ حاملہ نہیں ہیں تو ان کی عدّت چار مہینے دس دن ہیں۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۷/۱۲/۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۵۶/۳۶ د)

عدّت کے دوران گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت رسم نہیں، بلکہ شرعی حکم ہے

سوال:- ایک صاحب کا انتقال ہوگیا، اُن کی بیوہ جن کی عمر ۵۰ سال ہے، عدّت گزار رہی تھیں کہ کراچی سے بیوہ کو اپنے بھائی کی علالت اور حالت زیادہ خراب ہونے کی اطلاع ملی، چنانچہ بیوہ نے محلے کی مسجد کے امام صاحب سے اس معاملے میں فتویٰ مانگا تو انہوں نے کہا کہ عدّت ایک رسم ہے جس کی مدت ۴ ماہ ۱۰ دن مقرّر کی گئی ہے، تاکہ اگر مرنے والے سے حمل وغیرہ ہو تو اس عرصے میں ظاہر

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۳۶ (طبع سعید) (وتعتدان) أی معتدّة طلاق وموت فی بیت وجبت فیه ولا یخرجان منه، إلّا أن تخرج أو ینهدم المنزل أو تخاف انهدامه .... الخ.
وفی الهدایة .... کما اذا خافت علٰی متاعها او خافت سقوط المنزل أو کانت فیها بأجر ولا تجد ما تؤدّیه. وفی فتح القدیر (قوله خافت علٰی متاعها اللّصوص) أی فانها تخرج لأنه عذر. (فتح القدیر ج:۴ ص:۱۶۷).

(۲) فی الدّر المختار ح:۳ ص:۵۳۶ (طبع سعید) ومعتدة موت تخرج فی الجدیدین وتبیت اکثر اللیل فی منزلها لان نفقتها علیها فتحتاج للخروج حتّٰی لو کان عندها کفایتها صارت کالمطلقة فلا یحل لها الخروج فتح وجوز فی القنیة خروجها لاصلاح ما لا بد لها منه کزارعة ولا وکیل لها.

(۳) قال الله تعالٰی: وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا. (البقرة:۲۳۴)

ہوجائے، اس کے علاوہ اور کوئی دینی اہمیت نہیں ہے، چونکہ بیوہ اس عمر سے تجاوز کرچکی ہیں اور حقیقی بھائی کا آخری دیدار بھی ضروری ہے، لہٰذا آپ کراچی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ وہ محترمہ کراچی چلی گئیں، کچھ دنوں کے بعد بھائی کا انتقال ہوگیا، وہ ابھی تک کراچی ہی میں ہیں، اس کا شرعی حکم صادر فرمائیں۔

جواب:- مذکورہ امام صاحب نے یہ بات صحیح نہیں کہی کہ "عدتِ وفات کا اصل مقصد صرف حمل کا معلوم کرنا ہے، نیز یہ کہ عدت کے دوران گھر سے نکلنے کی ممانعت کوئی شرعی حکم نہیں بلکہ محض رسم ہے" امام صاحب کی یہ دونوں باتیں نادُرست ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عدت کے دوران گھر سے نکلنے کی ممانعت ایک شرعی حکم ہے[1] محض رسم کی بات نہیں، اور صورتِ مسئولہ میں مذکورہ خاتون کو چاہئے تھا کہ دن دن کے وقت اپنے بھائی کی عیادت کرآتیں اور رات شوہر کے گھر میں گزارتیں۔ بہرحال! اب بھی اُن پر واجب ہے کہ وہ فوراً واپس آکر عدت کے باقی ایام شوہر کے گھر میں پورے کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۱۵ ج)

سابقہ بیوی کو پردے کے بغیر گھر پر رکھنے کا حکم

سوال:- زید کی شادی اپنی چچازاد بہن سے ہوئی تھی، تقریباً دس سال سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، بقضائے خدا اس کو آنتوں کا مرض ہوا، مرض شدت اختیار کر رہا تھا جس میں فوت ہونے کی زیادہ توقع تھی، عورت نے یہ کہا کہ میری زندگی کی اُمید نہیں ہے، اس لئے میری زندگی میں زید کی شادی میری چھوٹی بہن سے ہوجائے تو بہتر ہے۔ برضائے والدین مریضہ و زید یہ طے ہوا کہ زید مریضہ کو طلاق دیدے، زید نے طلاق دے دی، اور دُوسری بہن سے شادی ہوگئی، قدرتِ الٰہی مریضہ قدرے صحت یاب ہوجاتی ہے، لیکن وہ دائم المریض ہے، اس صورت میں زید بحیثیت بہن اس کو گھر میں کفیل بن کر رکھ سکتا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی سابقہ بیوی اب اس کے لئے اجنبی ہوچکی ہے، لہٰذا اسے پردے کے بغیر اپنے گھر رکھنا جائز نہیں[2]، پردے کے ساتھ عام عورتوں کی طرح کبھی کبھی آجائے تو مضائقہ نہیں، لیکن مستقل طور پر گھر میں رکھنا پردے کے ساتھ بھی مناسب نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۴۳/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

---

(۱) حوالہ کے لئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲، اور ص: ۴۳۶ کا حاشیہ نمبر ۲ و ۳۔

﴿فصل فی الحضانۃ و النسب﴾
(بچوں کی پرورِش اور نسب کے اَحکام)

سات ماہ بعد پیدا ہونے والی بچی کا نسب ثابت ہے

سوال:- عمر سے ایک عورت کی شادی ہوئی، تین چار ماہ کے اندر اُس نے طلاق دے دی، تاریخ نکاح سے پورے سات ماہ بعد اس عورت مطلقہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی، اب یہ لڑکی اس عمر کی جائز اولاد ہے اور اس کی وارث ہوسکتی ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں وہ لڑکی جو عمر سے نکاح کرنے کے سات ماہ بعد پیدا ہوئی تھی، اس کا نسب عمر سے ثابت ہے،[1] اور وہ عمر کی (بصورتِ عدم موانع ارث) جائز وارث ہے، کیونکہ وضعِ حمل کی کم سے کم مدت شرعاً چھ ماہ ہے، کما فی الهداية وأقل مدة الحمل ستة أشهر۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۳۱۹/۱۸ الف)

نو سال کی عمر تک بچی کی پرورِش کا حق ماں کو حاصل ہے
بچی کے نامحرَم سے ماں کی شادی کی صورت میں بچی کی پرورِش کا حق نانی کو ملے گا

سوال:- میاں بیوی کے مابین ناچاقی کی وجہ سے مرد نے عورت کو طلاق دے دی، عورت مذکورہ کی اس مرد سے ایک بچی بھی موجود ہے، اب صورتِ مسئولہ یہ ہے کہ بچی کی کفالت کا حق یعنی

---

(۱) وفي الهندية كتاب الطلاق الباب الخامس عشر في ثبوت النّسب ج:۱ ص:۵۳۶ (طبع ماجديه) واذا تزوج الرّجل امرأةً فجاءت بالولد لأقل من ستة أشهر منذ تزوّجها لم يثبت نسبه، وان جاءت به لستة أشهر فصاعدًا يثبت نسبه منه اعترف به الزّوج او سكت. وفي الشامية ج:۳ ص:۴۹ (طبع سعيد) (قوله والولد لهٗ) أي ان جاءت بعد النكاح لستة أشهر مختارات النّوازل فلو لأقل من ستة أشهر من وقت النكاح لا يثبت النسب ولا يرث منه .... الخ.

(۲) هداية ج:۲ ص:۴۳۳ (طبع شركت علميه ملتان).

دُودھ پلانے کا حق کس کو ہے؟

۲:- اگر عورت نے دُوسری جگہ شادی کرلی ہو تو حقِ حضانت نانی کو حاصل ہے یا نہیں؟ اگر حاصل ہے تو کتنے سال تک نانی کو حضانت کا حق حاصل ہے؟

۳:- اگر عورت کی دُوسری جگہ شادی کردینے کے بعد حضانت کا حق نانی کو حاصل ہو تو نانی اپنی خوشی سے بچی کو دُودھ پلانے کے لئے ماں کے سپرد کردے تو بچی کے باپ کو شرعاً رُکاوٹ ڈالنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ اگر حاصل ہے تو کتنے سال تک نانی کو حضانت کا حق ہے؟ ماں اپنی بچی کو دُودھ پلانے کے سلسلے میں دُوسرے شوہر کو کھل کر اجازت دے تو مدّتِ رضاعت کے اندر ماں سے بچی کو چھین لینے کا حق باپ کو شرعاً حاصل ہے کہ نہیں؟

جواب ۱:- بچی جب تک بالغ نہ ہوجائے، اس کی پرورش کا حق اس کی ماں کو ہے،[۱] بشرطیکہ ماں نے کسی ایسے شخص سے نکاح نہ کیا ہو جو بچی کے لئے غیر محرَم ہو۔[۲]

۲:- اگر عورت نے بچی کے کسی نامحرَم شخص سے نکاح کرلیا ہو تو پرورش کا حق نانی کو ملے گا،[۳]

---

(۱) وفی سنن ابی داؤد کتاب الطّلاق، باب من أحق بالولد ج:۱ ص:۳۱۷ (طبع مکتبہ حقانیہ) عن عبداللہ بن عمرؓ انّ امرأة قالت: یا رسول اللہ! ان ابنی ھذا کان بطنی لهٗ وعاء وثدیی لهٗ سقاء وحجری لهٗ حواء، وان أباه طلّقنی وأراد أن ینتزعه منّی، فقال لها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أنت أحقّ به ما لم تنکحی۔

وفی تنویر الأبصار مع الدرّ المختار ج:۳ ص:۵۶۶، ۵۶۷ (طبع سعید) (والأم والجدّة) لأم أو لأب أحقّ بها بالصغیرة حتّی تحیض أی تبلغ فی ظاهر الروایة ... وغیرهما أحقّ بها حتّی تشتهی وقدّر بتسع وبه یفتٰی .... وعن محمد ان الحکم فی الأم والجدّة کذٰلک وبه یفتی لکثرة الفساد زیلعی وفی الشامیة تحت (قوله کذٰلک) أی فی کونها أحقّ بها حتّی تشتهی. (قوله وبه یفتٰی) قال فی البحر بعد نقل تصحیحه، والحاصل أن الفتویٰ علی خلاف ظاهر الروایة.

وراجع أیضًا الهدایة باب حضانة الولد ومن أحق به. ج:۲ ص:۴۳۴ (طبع شرکت علمیہ ملتان). ظاہر الروایۃ یہی ہے کہ لڑکی کے بالغ ہونے تک اس کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے، مگر کئی فقہاء کرامؒ نے فرمایا ہے کہ لڑکی کے حدِ شہوت تک پہنچنے تک ماں کو اس کی پرورش کا حق حاصل ہے اور حدِ شہوت کی عمر میں اختلاف ہے، بعض فقہاء نے اس کی عمر ۹ سال بیان کی ہے اور اسی پر فتویٰ دیا ہے، جیسا کہ مذکورہ عبارت شامی کے علاوہ صاحبِ بحر نے اسے ذکر کرکے اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ مگر چونکہ لڑکی کے حدِ شہوت تک پہنچنے کی مذکورہ مدّت متعین نہیں بلکہ لڑکی کی صحت وتندرستی اور علاقے کے موسم وحالات وغیرہ کی بناء پر یہ عمر مختلف ہوسکتی ہے جیسا کہ علامہ زیلعیؒ نے فرمایا ہے۔ واختلف فی حد الشهوة وفی الولواجیة ولیس لها حدّ مقدر لأنّه یختلف بأختلاف حال المرأة .... الخ. (البحر الرائق ج:۴ ص:۱۶۹) اس لئے کئی فقہاء کرامؒ نے ظاہر الروایۃ کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔ اور ہمارے اکابر نے بھی ظاہر الروایۃ کے مطابق فتویٰ دیا ہے، چنانچہ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے امداد المفتین ص:۲۲۷ میں، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الاحکام ج:۲ ص:۸۷۷ میں، اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عزیز الفتاویٰ ص:۵۶۶ میں اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ لڑکی کے بالغہ ہونے تک اس کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے۔ تفصیل کے لئے اکابر کی ان کتبِ فتاویٰ کی طرف رُجوع فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

(۲) وفی الدر المختار مع رد المحتار ج:۳ ص:۵۶۵ (طبع سعید) والحاضنة یسقط حقّها بنکاح غیر محرمه أی الصغیر .... الخ.

(۳) فی الهندیة کتاب الطّلاق الباب السادس عشر فی الحضانة ج:۱ ص:۵۴۱ (طبع ماجدیہ کوئٹہ) وان لم یکن لهٗ أم تستحق الحضانة بأن کانت غیر أهل للحضانة أو متزوجة بغیر محرم أو ماتت فأم الأم أولٰی من کل واحدة وان علت .... الخ وفی تنویر الأبصار مع الدر المختار ج:۳ ص:۵۶۲، ۵۶۳ (طبع سعید). (ثم) أی بعد الأم بأن ماتت أو لم تقبل أو أسقطت حقّها أو تزوّجت بأجنبی (أم الأم) وان علت.

اور وہ بھی بچی کے بالغ ہونے تک پرورش کرسکتی ہے۔

۳:- ماں اگر نانی کے گھر میں جاکر دودھ پلایا کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر بچی کو اس نے مستقل طور سے شادی شدہ ماں کے پاس چھوڑ دیا ہو تو باپ کو حق حاصل ہے کہ وہ بچی کو خود اپنی تربیت میں لے لے۔ لما فی الدر المختار لو تزوجت الأمّ بآخر فامسکته أم الأم فی بیت الراب فللأب أخذہ. (شامی ج:۲ ص:۶۳۹)۔(۱) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲۳/۲۸ ج)

بچیوں کے بالغ ہونے تک اُن کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اور ماں سے اس کی بچیاں عرصہ ڈھائی سال تک زبردستی چھین رکھی ہیں، کیا ماں اپنی بچیوں کو واپس لے سکتی ہے؟ اور کیا ان بچیوں کا باپ خرچہ دے گا جبکہ ایک بچی کی عمر ۵ سال اور دُوسری کی عمر ۴ سال ہے؟ برائے کرم شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- طلاق کے بعد بچیوں کی پرورش کا حق بچیوں کے بالغ ہونے تک بچیوں کی ماں کو ہے،(۲) البتہ اگر ماں دُوسرا نکاح کرلے یا کوئی اَمر پرورش کے حق کے لئے مانع ہو تو بات دُوسری ہے،(۳) اگر بچیوں کی ماں نے دُوسرا نکاح نہیں کیا، اور کوئی دُوسرا مانع بھی موجود نہیں ہے، تو بچیاں اسی کو ملنی چاہئیں، وہی ان کی حق دار ہے،(۴) اور ان بچیوں کا خرچہ باپ کے ذمہ ہے۔(۵) واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۰/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۵۸/۴۰ ه)

نکاح کے سات ماہ بعد پیدا ہونے والی بچی ثابت النسب ہے

سوال:- زید کی شادی کے چار ماہ بعد زید کے گھر والوں کو مع زید یہ پتہ چلا کہ لڑکی حاملہ ہے، اور ظاہراً اس کا پتہ چلتا تھا، اب سسرال والوں نے میکے والوں سے اس حمل کے بارے میں ذکر کیا تو میکے والوں نے کہا کہ لڑکی کو حمل لڑکے ہی کی طرف سے ہے، اور شادی کے سات ماہ بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی، آیا یہ نکاح صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں ہے تو دوبارہ نکاح کی کیا صورت ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ بچی کی ولادت نکاح کے سات ماہ بعد ہوئی ہے، اس

---

(۱) ج:۳ ص:۵۶۵ (طبع سعید).

(۲و۴) دیکھئے پچھلے صفحے کا جواب نمبر۱ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔ (۳) دیکھئے پچھلے صفحے کا جواب اور حاشیہ نمبر۲۔

(۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۸۸ کا حاشیہ نمبر۱۔

لئے یہ بچی شرعاً زید ہی کی قرار دی جائے گی،[۱] اور اس بچی کا نسب زید ہی سے ثابت ہوگا،[۲] اور زید کا نکاح صحیح ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۹۰۱/۲۸ ج)

اگر ماں بچے کی پرورش کا اپنا حق ساقط کردے تو اس کے بعد بھی وہ رُجوع کرسکتی ہے

سوال:- میرے بڑے بھائی جناب سیّد عالم نے اپنی بیوی مسمّیٰ حلیمہ خاتون کو طلاق دے دی، جس کو تقریباً دو سال ہوگئے، طلاق کے وقت ایک بچہ تھا جس کی عمر طلاق کے وقت تقریباً ڈیڑھ سال تھی، تو اس وقت یہ فیصلہ طے پایا کہ بچہ ماں کی پرورش میں ایک سال رہے گا اور پرورش کے چھ ماہ تک ۱۵ روپیہ لے گی، چھ ماہ کے بعد سے بیس روپیہ کے حساب سے لے گی۔ میرے بھائی اس حساب سے ادا کرتے رہے، جس کی رسید ہمارے پاس موجود ہے، مگر اب جبکہ ہم لوگ عیدالفطر پر بچے کو لینے گئے تو اُنہوں نے بچہ دینے سے انکار کردیا، شرعی نقطۂ نگاہ سے بچہ کب تک ماں کے پاس رہ سکتا ہے؟

جواب:- مذکر بچہ جب تک سات سال کی عمر کا ہو اُس کی پرورش کا حق ماں کو ہے،[۳] اور شروع میں جو ماں نے صرف ایک سال تک بچہ اپنے پاس رکھنے کا معاہدہ کیا تھا اس سے اس کا حق ساقط نہیں ہوا، بلکہ وہ اب بھی سات سال عمر ہونے تک بچے کو دینے سے انکار کرسکتی ہے، لما فی الدّر المختار واذا أسقطت الأمّ حقّها صارت كميتة .... الخ. وفی رد المحتار تحته واستظهر الرحمتی أن هذا الاسقاط لا يدوم، فلها الرّجوع لأنّ حقّها يثبت شيئًا فشيئًا، فيسقط الكائن لا المستقبل. (شامی ج:۲ ص:۶۳۶)۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۱۹/۲۸ ج)

متبنّٰی (لے پالک) نسبی بیٹے کے حکم میں نہیں

سوال:- مکرمی جناب مفتی صاحب مدظلکم العالی السلام علیکم مزاج گرامی
لے پالک لڑکے کا مسئلہ معلوم کرنے میں جناب کی طرف سے جواب موصول ہوا تھا، جس پر

(۱و۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۸۰ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱و۲۔
(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۶۶ (طبع سعید) والحاضنة اما أو غيرها أحقّ به أی بالغلام حتّی يستغنی عن النساء وقدّر بسبع وبه يفتی .... الخ.
(۴) ج:۳ ص:۵۵۹ (طبع سعید).

نہ دستخط، نہ مہر، نہ تاریخ تھی، مستفتین کو مشتبہ معلوم ہوا، واپس ارسال خدمت ہے، گستاخی معاف ہو جناب نے مشورہ دیا شادی کرلو، ا:- اوّل تو عمر کا تقاضا نہیں، نصف نصف کے قریب ہے۔ ۲:- جس کو بیٹا بنا کر پالا، پرورش کی، یہ کیسے غیرت گوارا کرے گی کہ اُسے شوہر بناؤں؟ ۳:- دُنیا کیا کہے گی؟ یہ تو کوئی حل نہ ہوا ۴:- نہ ہی یہ ایسا عمل ہے کہ جو کہ ناقابلِ معافی ہو، خداوند کریم غفور رحیم ہے، بڑے بڑے گناہ معاف کردیتا ہے، اور کردے گا۔ ۵:- ایک حل یہ سوچا ہے کہ میں اپنی ہمشیرہ کی دختر کے ساتھ شادی کردوں گی جس میں ابھی ۵، ۶ سال کا وقت درکار ہے، فریقین رضامند ہیں، پھر تو یہ میرے اور میری والدہ ہمشیرہ کے لئے نواسہ داماد ہوگا، اب بھی فتویٰ معلوم ہونے پر وہ کوئی پردہ نہیں کرتا ہے، نہ میری محبت اور خدمت اُسے جدا کرنے کو تیار، نہ مجھے پردہ کرنے کی بیٹے کی طرف سے یارہ، وہ میری ہمشیروں کو خالہ، بھائیوں کو ماموں کہتا ہے، صرف والد صاحب واسطہ نہیں رکھتے نہ وہ نانا کہلواتے ہیں، نہ وہ مجھے ملتے ہیں، لے پالک لڑکا اور میں ایک جگہ گھر میں رہتے ہیں، کوئی حل بتلایئے شب و روز کی یومیہ بازاری ضروریات گھریلو زندگی میں پیش رہتی ہیں، کس طرح پوری کرائی جائیں؟ آج کل کے حالات میں کون کسی کا خیال کرتا ہے؟ والدین نحیف ہیں، بازار جاتے نہیں، یہ لڑکا ہی کرتا ہے، آج کل کے نوکر چاکر مرضی کا کام نہیں کرتے، عقل حیران ہے کس طرح زندگی گزرے گی؟ فتویٰ تو دے دیا مگر مجبوری پر غور نہ فرمایا۔

جواب:- مسئلے کا شرعی حکم تو وہی ہے جو سابق فتویٰ میں بیان کیا گیا، قرآنِ کریم نے بڑی تاکید اور وضاحت کے ساتھ یہ حکم بیان فرمایا ہے کہ لے پالک نسبی بیٹے کے حکم میں ہرگز نہیں ہوسکتا،[1] لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دونوں پر ماں بیٹے کے شرعی اَحکام جاری نہیں ہوسکتے، البتہ حسنِ سلوک کے معاملے میں وہ آپ کے ساتھ ماں جیسا اور آپ اس کے ساتھ بیٹے جیسا معاملہ کریں تو اس میں کچھ حرج نہیں، جہاں تک پردے کا تعلق ہے، نامحرَم ہونے کی بناء پر آپ پر اس سے پردہ واجب ہے، اور جو ضروریات آپ نے اس سے وابستہ قرار دی ہیں وہ پردے کے ساتھ بھی پوری ہوسکتی ہیں، آپ کے لئے شریعت کا حکم یہی ہے کہ اس کے ساتھ پردے سے رہیں اور لوگوں کے غلط عمل کی بناء پر شریعت کا حکم نہیں بدل سکتا، اور جب کبھی پردے کی خلاف ورزی ہو اس پر توبہ و اِستغفار کریں۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ آپ اگر اپنی ہمشیرہ کی بیٹی سے اس کا نکاح کردیں گے تب بھی وہ غیرمحرَم ہوگا، البتہ اگر آپ کی کوئی رضاعی بیٹی ہو تو اس سے نکاح کرنے پر وہ آپ کا محرَم بن سکے گا۔　　واللہ اعلم

۷؍۴؍۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۴۹۰/۳۱ ب)

---

(۱) قال الله تعالٰی: "اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآءِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللهِ" سورة الأحزاب: ۵.

نکاح کے چھ ماہ بعد پیدا ہونے والا ثابت النسب ہوگا

سوال:- میری شادی کو سات ماہ ہوئے تھے تو لڑکی پیدا ہوئی، لڑکی سات ماہ کی نہیں تھی پورے نو ماہ کی تھی، کیونکہ اس کے سر کے بال بڑے تھے، اور ناخن بھی بڑے تھے، ٹھیک ایمان سے کہتا ہوں کہ لڑکی میری نہیں ہے، میری بیوی کے پیٹ میں پہلے ہی سے بچہ تھا، لڑکی کے والدین کو یہ واقعات بتادیئے وہ اپنی لڑکی کو اپنے گھر لے گئے اور ہم نے گھر سے نکال دیا، تقریباً گیارہ مہینے ہوگئے ہیں، کیا میں اس عورت کو اپنے گھر میں رکھ سکتا ہوں؟

جواب:- شرعاً اگر نکاح کے بعد چھ مہینے کے اندر بچہ پیدا ہو تو وہ شوہر ہی کا قرار دیا جاتا ہے،[1] اور جب تک آپ کے پاس عورت کے زنا کرنے کا شرعی ثبوت مہیا نہیں ہوتا، صورتِ مسئولہ میں جو بچہ نکاح کے سات ماہ بعد پیدا ہوا وہ شرعاً آپ ہی کا سمجھا جائے گا،[2] آپ اپنی بیوی کو دوبارہ گھر میں لاکر آباد کر سکتے ہیں، بلکہ ایسا ہی کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۶/۱۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۹۰۷/۲۲ ب)

نکاح کے تین ماہ بعد پیدا ہونے والے بچے کے نسب کا حکم

سوال:- جو بچہ نکاح کے تین ماہ بعد پیدا ہوا ہو وہ جائز ہے اور اس کا نسب ثابت ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بچے کا نسب اس شوہر سے ثابت نہیں ہوگا جس سے ولادت سے صرف تین ماہ قبل نکاح ہوا ہے۔[3]

واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۱۷/۳۲ ج)

طلاق کے بغیر دوسری جگہ نکاح کی صورت میں اولاد کے نسب کا حکم

سوال:- ایک شادی شدہ لڑکی اپنے خاوند کو چھوڑ کر دوسرے شخص کے ساتھ چلی گئی، دوسرا

(۱ تا ۳) وفي الدر المختار ج:۳ ص:۴۹ (طبع سعيد) لو نكحها الزّاني حلّ له وطؤها اتفاقًا والولد له ولزمه النفقة. وفي الشامية تحته أي ان جاءت بعد النكاح لستة أشهر مختارات النوازل فلو لأقل من ستّة أشهر من وقت النّكاح لا يثبت النّسب ولا يرث منه. وفي الهندية كتاب الطّلاق الباب الخامس عشر في ثبوت النسب ولو زنى بامرأة فحملت ثم تزوجها فولدته ان جاءت به لستة أشهر فصاعدًا ثبت نسبه .... الخ. وفيها أيضًا ج.۱ ص ۵۳۶ واذا تزوّج الرّجل امرأة فجاءت بالولد لأقل من ستّة أشهر منذ تزوّجها لم يثبت نسبه وان جاءت به لستّة أشهر فصاعدًا يثبت نسبه منه. وكذا في البحر الرائق ج:۴ ص:۱۵۵، وفتح القدير ج:۴ ص:۱۷۸.

شخص مرزائی ہے، پہلے خاوند نے طلاق بھی نہیں دی، پہلے سے کوئی اولاد نہیں، اب اس کے اولاد بھی ہے، وہ اولاد حلال کی کہلائے گی یا حرامی؟ مثلاً اگر وہ مسلمان ہوجائے تو پھر اس کا نکاح دُرست ہوسکتا ہے اگر پہلے خاوند نے طلاق بھی نہیں دی۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اس شادی شدہ عورت نے سخت گناہ کا ارتکاب کیا ہے، اس پر واجب ہے کہ فوراً اپنے شوہر کے پاس آجائے، البتہ جو بچے پیدا ہوئے ہیں ان کا حکم یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے اصل شوہر کے نکاح میں ہے اس وقت تک وہ بچے اُس کے شوہر ہی کے سمجھے جائیں گے،[1] ہاں! اگر شوہر ان بچوں کو اپنی طرف منسوب کرنے سے انکار کرے تو عدالت میں جاکر انکار کردے، جس پر لعان ہوگا،[2] اور یا تو عورت کو زنا کی سزا ملے گی یا دونوں کے درمیان عدالت کی طرف سے نکاح فسخ کردیا جائے گا، اور بچے شوہر کے بجائے اپنی ماں کی طرف منسوب ہوں گے۔　　واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۳۶ ج)

(۱، ۲) وفي ردا لمحتار كتاب الطلاق باب ثبوت النسب مطلب الفراش على أربع مراتب ج: ۲ ص: ۶۸۴ .... وقوى هو فراش المنكوحة ومعتدة الرّجعي فانه فيه لا ينتفي الا باللّعان. وفي الهندية كتاب الطلاق، الباب الخامس عشر في ثبوت النسب: لثبوت النسب ثلاث مراتب الأوّل النّكاح الصحيح وما هو في معناه من النكاح الفاسد والحكم فيه أنه يثبت النسب من غير دعوة ولا ينتفي بمجرّد النفي وانما ينتفي باللّعان فان كان ممن لا لعان بينهما لا ينتفي نسب الولد.

﴿فصل فی نفقة الزّوجة والأولاد والآباء والأمّهات وسکناهم﴾

(زوجہ، اولاد اور والدین کے نفقہ اور سکنیٰ کے احکام)

بیوی کے لئے الگ مکان کے انتظام کا حکم

سوال:- زید شادی شدہ ہے اور ایک مقامی کالج میں لیکچرار ہے، اور تبلیغی جماعت سے وابستہ ہے، عرصہ سے اپنی بیوی کو ساتھ نہیں لے جاتا، وہ کبھی میکے میں ہوتی ہے، اور کبھی سسرال میں، جب زید سے کہا جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے والد کی خدمت کے لئے چھوڑی ہے جبکہ والد کی خدمت کے لئے گھر میں اور لوگ بھی ہیں، اور کہتا ہے کہ اگر بیوی ساتھ لے چلوں تو پھر تبلیغی کام نہیں ہوسکتا، دھیان بیوی کی طرف ہوگا، مجھے اس چیز کی ضرورت نہیں ہے، مجھے خداوند کریم کی ضرورت ہے۔ کیا اس کو مکان الگ کردینا ضروری نہیں جبکہ دُوسرے رشتہ دار بھی اس بات پر ناراض ہیں، جب کالج سے موسمی چھٹیاں ہوجاتی ہیں تو تبلیغی پروگرام میں چلّے کاٹنا چاہتا ہے، عید کے لئے رائے ونڈ جاتا ہے، ان دنوں میں بھی بیوی کے حقوق نہیں ادا کرتا، جب گھر آتا ہے تو پھر یا تو مسجد میں سوجاتا ہے یا مکان سے الگ ایک بیٹھک میں سوتا ہے۔

جواب:- زید کے اُوپر واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کے نان، نفقہ اور رہائش کا اس طرح انتظام کرے کہ وہ کسی کی محتاج نہ رہے، اور رہائش کے لئے ایسا مقفل کمرہ، باورچی خانہ اور بیت الخلاء ہونا ضروری ہے جس میں کسی دُوسرے کا اشتراک نہ ہو[1]، اس کے علاوہ اس کے اُوپر یہ بھی واجب ہے کہ وہ اس کے جائز حقوقِ زوجیت ادا کرکے اس کی دِل داری کرے، اگر ان حقوق کی ادائیگی کے ساتھ وہ تبلیغ کے لئے جائے تو اس کے لئے جائز اور ثواب ہے، لیکن ان حقوق میں کوتاہی کرکے تبلیغ کے لئے جانا شرعاً جائز نہیں۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

---

(۱) وفی الهداية ج:۲ ص:۴۴۱ (طبع سعید) وعلى الزّوج أن يسكنها فی دار مفردة ليس فيها أحد من أهله إلّا أن تختار ذلک. وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۹۹ وكذا تجب لها السكنى فی بيت خالٍ عن أهله ... الخ
وفی البحر الرائق ج:۴ ص:۱۹۳ أی الاسكان للزّوجة على زوجها فتجب لها كما تجب النفقة .... ليس له أن يشترک غيرها لأنّها تتضرّر به ... الخ. وكذا فی الهندية ج:۱ ص:۵۵٦ (طبع رشيديه كوئٹه).

ماں کے پاس پرورش کے دوران بچوں کا نفقہ باپ پر ہوگا

سوال:- مسلم قانون میں کہا گیا ہے کہ نابالغ کا کنٹرول اور سپرویژن باپ کا رہے گا اور کسٹڈی ماں کی رہے گی، اگر لڑکا ہے تو ۷ برس تک، اور لڑکی ہے تو بلوغت تک، کنٹرول اور سپرویژن کے کیا معنی ہیں؟

جواب:- مطلب یہ ہے کہ نان ونفقہ کی ذمہ داری باپ پر ہوگی،[1] اور اس کی تربیت کی پالیسی میں بھی اسی کی رائے معتبر ہوگی بشرطیکہ وہ خلافِ شرع نہ ہو، لیکن بچہ تحویل میں ماں کی رہے گا، وہ اس کو پالے گی۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۹/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۷۵/ ۲۹ ب)

تنگ دست فاسقہ ماں کا نفقہ بیٹے پر واجب ہے

سوال:- ایک عورت زنا کا ارتکاب کرتی ہے، وہ اپنے بیٹے کے احسن طریقے سے سمجھانے سے بھی اس فعلِ بد سے اجتناب نہیں کرتی، ایک دن ماں بیٹے میں اس بات پر تلخ کلامی ہوئی اتنے میں ایک بزرگ تشریف لائے اور انہوں نے بیٹے کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے فرمایا کہ ماں اگر کنجری بھی ہو تو بیٹے کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اس کی بے عزتی کرے۔ اتفاق سے اُس وقت میں بھی وہاں چلا گیا، (پنجاب میں ''کنجری'' اُس عورت کو کہتے ہیں جو حکومت سے لائسنس لے کر پیشہ کرائے)، لیکن مجھے اس بزرگ کی باتوں سے اتفاق نہیں تھا، میں نے ایک عالم سے رُجوع کیا، وہ فرمانے لگے کہ بیٹے کو چاہئے کہ ماں کو احسن طریقے سے سمجھائے، اگر نہ سمجھے تو اُس کا مقاطعہ کردے، لیکن خرچ ضرور دیتا رہے، مقاطعہ کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں کہ گھر سے ماں کو نکال دے یا خود نکل جائے، ماں کو نکال دیا جائے تو بیٹے کی بدنامی ہوگی، گھر میں رہ کر وہ بُرائی کراتی رہے تو بیٹا بھی گناہگار ہوگا، ایسی حالت میں بیٹے کو کیا کرنا چاہئے؟ تاکہ بُرائی رُک جائے اور بیٹا خدا کے نزدیک بھی مجرم قرار نہ دیا جائے۔

جواب:- ماں اگر تنگ دست ہے تو اُس کا نفقہ بیٹے پر واجب ہے، خواہ وہ کتنی بدعمل کیوں

---

(۱) وفی الھدایۃ کتاب الطّلاق باب النفقۃ ج:۲ ص:۴۴۴ (طبع شرکت علمیہ ملتان) نفقۃ الأولاد الصّغار علی الأب لا یشارکہٗ فیھا أحد کما لا یشارکہ فی نفقۃ الزّوجۃ لقولہ تعالٰی: "وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَہٗ رِزْقُھُنَّ" والمولود لہ ھو الأب.
وفی الدّر المختار باب النفقۃ ج:۳ ص:۶۱۲ (طبع سعید) وتجب النّفقۃ بأنواعھا علی الحرّ لطفلہ الفقیر الحر.
وفی الشامیۃ أی ان لم یبلغ حدّ الکسب.

(۲) وفی الدر المختار مع ردّ المحتار کتاب الطلاق باب الحضانۃ ج:۳ ص:۵۵۵ (طبع سعید) الحضانۃ تثبت للأم .... الخ. وفیہ أیضًا ج:۳ ص:۵۶۶ (طبع سعید) والحاضنۃ أمًّا أو غیرھا أحقّ بہ أی بالغلام حتّٰی یستغنی عن النّساء وقدّر بسبع وبہ یفتٰی .... والأم والجدّۃ لأم أو لأب أحق بھا بالصغیرۃ حتّٰی تحیض أی تبلغ فی ظاھر الروایۃ .... الخ.

نہ ہو، زنا تو ایک سنگین معصیت ہے، لیکن تنگ دست ماں باپ اگر کافر و مشرک ہوں تب بھی ان کا نفقہ بیٹے پر واجب ہے اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک اور نرمی سے پیش آنا فرض ہے، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: "وَاِنْ جَاھَدٰکَ عَلٰٓی اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْھُمَا وَصَاحِبْھُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا" الآیة۔[1] یعنی اگر تمہارے والدین تمہیں مشرک بنانے کی کوشش کریں تب ان کی اطاعت تو نہ کرو، لیکن دُنیوی زندگی میں ان کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ۔ اور صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو اپنی کافر ماں کے ساتھ صلۂ رحمی کا حکم دیا،[2] اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے: ونفقة الأصول والفروع للجزئية وجزء المرء في معنى نفسه فكما لا تمتنع نفقة نفسه بكفره لا تمتنع نفقة جزئه. (شامی ج:۲ ص:۶۸۳)۔[3] اور تفسیر مظہری میں ہے: يجب بهٰذه الأية (وهي الأية المذكورة) الانفاق على الأبوين الفقيرين وصلتهما وان كانا كافرين. (مظہری ج:۷ ص:۲۵۶)۔[4] اور جب کفر کے باوجود نفقہ واجب ہے تو محض فسق کی بنا پر وہ ساقط نہیں ہوگا۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بیٹے پر واجب ہے کہ اپنی ماں کو نفقہ دیتا رہے، البتہ ساتھ ہی ایک تو اس کی بدکاری پر اُسے فہمائش مسلسل جاری رکھے،[5] مثلاً جن لوگوں سے وہ ملوّث ہوسکتی ہے اُن کا داخلہ گھر میں بند کردے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۶/۲۸ الف)

۱:- شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی کا گھر سے باہر جانا
۲:- بیوی اپنے لئے الگ گھر کا مطالبہ کرسکتی ہے
۳:- میکے میں رہنے کی صورت میں شوہر پر نفقہ اور زچگی کے اخراجات لازم نہیں

سوال ۱:- کیا بیوی کے لئے شوہر کی مرضی کے بغیر گھر سے چلے جانا جائز ہے؟ ایک خاتون

---

(۱) سورۃ لقمان: ۱۵.

(۲) وفي صحيح البخاري باب صلة المرأة أمّها ولها زوج ج:۲ ص:۸۸۴ (طبع سعيد) عن أسماء قالت: قدمت أمّي وهي مشركة في عهد قريش ومدتهم اذ عاهدوا النبي صلى الله عليه وسلم مع أبيها فاستفتيتُ النبي صلى الله عليه وسلم فقالت ان أمّي قدمت وهي راغبة، قال: نعم صِلِي أُمّكِ.

(۳) ج:۳ ص:۶۳۱ (طبع سعيد). (۴) (طبع بلوچستان بک ڈپو).

(۵) وفي رد المحتار كتاب الحدود باب التعزير ج:۴ ص:۷۸ (طبع سعيد) اذا رأى منكرًا من والديه يأمرهما مرّة فان قبلا فبها وان كرها سكت عنهما واشتغل بالدّعاء والاستغفار لهما فان الله تعالى يكفيه ما أهمّه من أمرهما .... الخ.

صفیہ سلطانہ شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے میکے چلی گئی ہے، کیا اس کے لئے یہ جائز ہے؟

۲:- صفیہ سلطانہ عرف شاہینہ مذکورہ اور ثناء الرحمٰن کی شادی فریقین کی رضامندی اور اولیائے ہر دو جانب کے مابین طے ہوکر قرار پائی تھی، اب مسماۃ مذکورہ کہتی ہے کہ مجھے شوہر کی شکل اچھی نہیں لگتی، اور شوہر کے ساتھ اس شرط کے ساتھ رہنے کو تیار ہے جبکہ ڈرگ کالونی میں کرایہ کا مکان لے کر وہیں رہا جائے، اور ساس وسسر کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہے، بلکہ شوہر نے اپنے والدین سے علیحدہ رکھا ہوا ہے، پھر بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ شرعاً کیا حکم ہے؟

۳:- صفیہ سلطانہ عرف شاہینہ حاملہ تھی، اور یہاں سے جانے کے پندرہ روز کے بعد وضعِ حمل کے مراحل سے دوچار ہوئی، حالانکہ صفیہ کے شوہر ثناء الرحمٰن نے ان مراحل سے گزرنے کے لئے (یعنی زچگی کے لئے) تین چار اچھے اسپتالوں میں انتظام کر رکھا تھا، لیکن شاہینہ مذکورہ کے والدین نے زبردستی اُسے روکے رکھا اور کسی معمولی زچہ خانے میں داخل کرادیا، اس صورت میں شوہر بیوی کی کفالت کا ذمہ دار ہوگا یا نہیں؟

جواب ۱:- شوہر کی اجازت یا مرضی کے بغیر اس کے گھر سے جانا بیوی کے لئے سخت گناہ کی بات ہے،[۱] صورتِ مسئولہ میں صفیہ سلطانہ پر واجب ہے کہ وہ فوراً شوہر کے گھر آجائے اور اپنے سابقہ عمل پر اللہ سے توبہ و اِستغفار کرے اور شوہر سے معذرت کرے۔[۲]

۲:- بیوی کو حق ہے کہ وہ اپنے لئے ایسے گھر کا مطالبہ کرے جس میں ساس، سسر کا کوئی عمل دخل نہ ہو، لہٰذا صفیہ سلطانہ کا مطالبہ اگر اسی قدر ہے تو بجا ہے اور اس کا پورا کرنا شوہر کے لئے ضروری ہے، لیکن کسی خاص جگہ کی تعیین کا بیوی کو حق نہیں کہ مثلاً ڈرگ کالونی میں ہی رہوں گی، یہ شرط لگانا بیوی کے لئے ناجائز ہے اور اس کی پابندی بھی شوہر پر واجب نہیں بلکہ علیحدہ مکان کا جہاں بھی شوہر انتظام کردے بیوی کے حق کی ادائیگی ہوجاتی ہے، لما فی الدر المختار وبیت منفرد من دار له غلق .... کفاها. وفی البحر عن الخانیة یشترط ان لا یکون فی الدر أحدٌ من أحماء الزوج یؤذیها[۳] .....

وقال الشامیؒ: فینبغی الافتاء بلزوم دار من بابها .... فعلی المفتی أن ینظر الیٰ حال أهل زمانه .... الخ. (شامی ج:۲ ص:۶۶۴)۔[۴]

(۱، ۲) وفی جامع الترمذی باب ما جاء فی حقّ الزّوج علی المرأة ج:۱ ص:۲۱۹ (طبع سعید) عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: لو کنت امر أحدًا أن یسجد لأحد لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها.

وفی الدرّ المختار کتاب النکاح، باب القسم ج:۳ ص:۲۰۸ (طبع سعید) وحقّه علیها أن تطیعه فی کل مباح یأمرها.

(۳) الدرّ المختار ج:۳ ص:۶۰۰، ۶۰۱ (طبع سعید)

(۴) ردّ المحتار ج:۳ ص:۶۰۱، ۶۰۲ (طبع سعید) وفی الهدایة کتاب الطّلاق باب النفقة ج:۲ :۴۴۳ (طبع سعید) وعلی الزّوج أن یسکنها فی دار مفردة لیس فیها أحد من أهله الّا أن تختار ذٰلک.

۳:- صورتِ مسئولہ میں زچگی کا خرچہ شوہر پر واجب نہیں ہے، اور جب تک بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے میکے میں رہے گی اس کا نفقہ بھی شوہر پر واجب نہ ہوگا، اجرة القابلة علی من استأجرها من زوجة وزوج، ولو جاءت بلا استئجار قیل علیه وقیل علیها. (شامی ج:۲ ص:۶۴۹)۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۶ھ

بیوی کا علاج شوہر کے ذمہ ہے یا نہیں؟

سوال:- بہشتی زیور میں اور دیگر کتبِ حنفیہ میں زوجہ کے نان ونفقہ وکسوہ وغیرہ کو مرد کے ذمے واجب لکھا ہے، ساتھ ہی یہ لکھا ہے کہ زوجہ بیمار ہوجائے تو اس کے علاج معالجے کا خرچ شرعاً شوہر پر واجب نہیں بلکہ اپنے مال سے کرے، ہاں! شوہر تبرعاً علاج کرادے تو وہ اس کا احسان ہے۔

طلبہ نے سبق پڑھتے وقت یہ اِشکال کیا تھا کہ دُکھ بیماری انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے، بعض دفعہ علاج کی فیس، ڈاکٹروں اور آپریشنوں پر ہزاروں روپے لگ جاتے ہیں، تو بیچاری بیوی یہ کہاں سے خرچ کرے گی؟ اس کا کیا حل ہے؟

جواب:- اس مسئلے میں احقر کو بھی مدّت سے تردّد ہے، ایک مرتبہ اس مسئلے پر دُوسرے فقہاء کی کتابوں کی بھی مراجعت کا اتفاق ہوا، اور یہ عجیب بات نظر آئی کہ سب کے ہاں صورتِ حال یکساں ہی سی ہے، یعنی علاج کے خرچے کو نفقہ کا حصہ قرار نہیں دیا گیا۔[2] لیکن تلاش کے باوجود قرآن وسنت کی کوئی ایسی نص بھی نہیں ملی جس میں یہ صراحت ہو کہ علاج کا خرچہ شوہر پر واجب نہیں، اس لئے احقر کو کچھ یہ خیال ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم میں نفقہ کے ساتھ ''بالمعروف'' کی قید لگائی گئی ہے، جس کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ نفقہ کا تعین عرف پر مبنی ہے، پچھلے دور میں چونکہ علاج کا خرچہ کچھ زیادہ لمبا چوڑا نہیں ہوتا تھا اس لئے شاید عرف یہ تھا کہ وہ نفقہ میں شامل نہیں، اگر یہ بات دُرست ہو تو عرف کی تبدیلی سے حکم بدل جانا چاہئے، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دور میں عرفاً علاج، نفقہ کا حصہ ہے، یوں بھی عقلاً یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر شوہر پر علاج کا خرچہ واجب نہ ہو تو بیماری کی صورت میں عورت کیا کرے؟ جبکہ موجودہ دور میں علاج کا خرچہ اتنا ہوتا ہے کہ ایک ایسی بیوی جس کا کوئی ذریعہ روزگار نہ ہو اس کا تحمل نہیں کرسکتی۔ لیکن یہ ساری باتیں ابھی تک سوچ ہی کی حیثیت میں ہیں، چونکہ کہیں منقول نہیں

---

(۱) الدرّ المختار ج:۳ ص:۵۷۹، ۵۸۰ (طبع سعید)

(۲) وفی الشامیة کتاب الطّلاق باب النفقة ج:۳ ص:۵۷۵ (طبع سعید) کما لا یلزمه مداواتها أی اتیانه لها بدواء المرض ولا أجرة الطبیب ولا الفصد ولا الحجامة.

دیکھیں، اور نہ دُوسرے اہلِ علم سے اس پر مشورہ ہوا، اس لئے احقر کو اس پر جزم نہیں ہے، بہتر ہوگا کہ آپ سوال مندرجہ ذیل حضرات کو بھی بھیج دیں:-

۱:- حضرت مفتی رشید احمد صاحب، دارالافتاء والارشاد ناظم آباد نمبر۴، کراچی۔
۲:- مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب، دارالعلوم حقانیہ، ساہیوال ضلع سرگودھا۔
۳:- مفتی عبدالستار صاحب، جامعہ خیرالمدارس، ملتان۔
۴:- مولانا مفتی عبدالواحد صاحب، جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور۔
۵:- مولانا مفتی عبدالقادر صاحب، دارالعلوم کبیر والا، ضلع ملتان۔

احقر نے اُوپر اپنی جو سرسری سوچ لکھی ہے، اگر وہ بھی احقر کے بعینہٖ الفاظ میں ان کو بھیج دیں تو بہتر ہے، ان حضرات کے جو جوابات موصول ہوں ان سے براہِ کرم احقر کو بھی مطلع فرمائیں، والسلام۔

(حضرت مولانا) محمد تقی عثمانی (مدظلہم)
بقلم محمد عبداللہ میمن
(فتویٰ نمبر ۸۵/۴۵)

﴿کتاب الأیمان والنذور﴾

(قسم، منّت اور نذر کے اَحکام)

قسم کا کفارہ اور کسی گناہ پر قسم کھانے کی صورت میں اس گناہ کو ترک کرنا واجب ہے

سوال:- چار سال پہلے ایک کام کرنے کا ارادہ کیا، اس سلسلے میں قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی اور پھر میں نے یہ عہد توڑ دیا، آپ نے فتویٰ میں غریبوں کو کھانا کھلانے کے متعلق لکھا تھا، جن کی تعداد مجھے یاد نہیں، براہِ کرم تعداد بتلا دیں۔

جواب:- قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے، یا دس مسکینوں کو کپڑا دیا جائے، اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو تین روزے رکھے جائیں[1]، آپ نے اگر قسم توڑنے کے بعد دس مسکینوں کو کھانا کھلا دیا تو کفارہ ادا ہوگیا[2]، توبہ و استغفار بھی کرلیں، توبہ اگر سچے دِل سے کی جائے تو اللہ تعالیٰ بڑے سے بڑے گناہ کو معاف فرما دیتا ہے، اِن شاء اللہ یہ گناہ معاف ہوجائے گا، بشرطیکہ جس کام کے کرنے کی آپ نے قسم کھائی تھی وہ مباح کام ہو، اور اگر وہ کام خود گناہ ہو تو اُس کا ترک کرنا واجب ہے[3]، اور مذکورہ کفارہ اس کے لئے کافی نہیں ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۴۳/۲۷ و)

کسی سے ناجائز اَمر پر قسم کے لئے دباؤ ڈالنے اور لفظ ''اللہ'' سے قسم منعقد ہونے کا حکم

سوال:- کسی شخص کی ساس اور سالے نے خسر کی موجودگی میں اُس کی بیوی کی زچگی کے زمانے میں زبردستی داماد سے ہاتھ پر قرآن رکھ کر یہ عہد لیا کہ ''آئندہ سے عہد کرو کہ ہماری بہن کی اولاد نہ ہوگی، یہ چار ہی بچے رہیں گے اور اپنے دِل میں بیوی سے قربت جائز رہے گی''، آیا طلاق

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ: فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ، ذٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ .. الآية (المائدة: ۸۹)
وفي الدر المختار كتاب الأيمان ج:۳ ص:۷۲۵، ۷۲۶ (طبع سعيد) وكفّارته تحرير رقبة أو اطعام عشرة مساكين أو كسوتهم بما يصلح للأوساط .... وان عجز عنها كلّها وقت الأداء صام ثلثة أيام ولاء.
(۲) وفي الدر المختار ج:۳ ص:۷۲۷ (طبع سعيد) ولم يجز التكفير ولو بالمال خلافًا للشافعي قبل حنث .... الخ.
وفي الشامية تحته لأن الحنث هو السبب كما مرّ فلا يجوز الّا بعد وجوده .... الخ.
(۳) وفي تنوير الأبصار ج:۳ ص:۷۲۸ (طبع سعيد) ومن حلف علٰى معصية كعدم الكلام مع ابويه أو قتل فلان اليوم وجب الحنث والتكفير.

ہوگئی؟ اُن کا زور اس بات پر تھا کہ داماد نس بندی کرالے، جس کی داماد نے سخت مخالفت کی اور سختی سے انکار کردیا، اس وجہ سے یہ عہد زبردستی لیا گیا۔

جواب:- مذکورہ عہد کرنا جائز نہیں تھا، نہ بیوی کے رشتہ داروں کے لئے جائز تھا کہ وہ شوہر سے زبردستی ایسا عہد لیں اور اس عہد سے بیوی پر نہ طلاق واقع ہوئی ہے اور نہ قربت حرام ہوئی ہے، بلکہ اس کا حکم یہ ہے کہ قربت کرتا رہے، اور جب استقرارِ حمل ہو تو قسم کا کفارہ ادا کرے، اور قسم کا کفارہ یہ ہے کہ یا تو دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، یا ان کو لباس دے، اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو تین دن روزے رکھے،[1] اور یہ کفارہ بھی اُس صورت میں واجب ہے جبکہ اس نے اللہ کی قسم کھا کر یہ عہد کیا ہو،[2] اور اگر اللہ کی قسم نہیں کھائی تو کفارہ بھی واجب نہیں۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۰۳/۲۷ د)

''قرآن کی قسم'' کا حکم اور قرآن اُٹھائے بغیر بھی قسم منعقد ہوجاتی ہے

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ حسن اللہ دو سال سے ایک کارخانے میں ملازم ہے اور شادی شدہ ہے، شاہدہ بھی چند یوم میں کام پر لگی ہے، جو کہ دوشیزہ ہے، دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ بھی نہیں ہے، حسن اللہ کارخانے میں چند لوگوں کے سامنے لڑکی شاہدہ پر حملہ آور ہوتا ہے اور لڑکی شاہدہ حسن اللہ سے بچنے کے لئے آگے آگے بھاگتی ہے، اور حسن اللہ گالیاں دیتا ہوا پکڑنا چاہتا ہے، شاہدہ کی مدد کو کچھ لوگ دوڑ پڑتے ہیں اور شاہدہ کو اپنی حفاظت میں لے لیتے ہیں، لڑکی شاہدہ ناظم کارخانہ سے شکایت کرتی ہے، حسن اللہ لڑکی کی شکایت دُرست تسلیم نہیں کرتا ہے تو ناظم کارخانہ حسن اللہ اور شاہدہ کی موجودگی میں گواہان کے ہاتھ پر یٰسین شریف کی کتاب رکھ کر حلفیہ بیان لیتا ہے، جس سے حسن اللہ کا قصور ثابت ہوتا ہے، اب حسن اللہ کے آدمی ناظم کارخانہ پر قرآنِ شریف کی بے حرمتی کا الزام لگاتے ہیں، کیا اس بات سے قرآنِ کریم کی بے حرمتی ہوئی ہے؟ جواب سے مشکور فرمائیں۔

جواب:- حلف قرآنِ کریم کو اُٹھائے بغیر، محض اللہ کی قسم کھانے سے بھی ہوجاتا ہے، لیکن

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر۱۔

(۲، ۳) وفی تنویر الأبصار مع الدر المختار کتاب الأیمان ج:۳ ص:۷۱۰ الی ۷۱۲ (طبع سعید) والقسم باللہ تعالٰی وباسم من أسمائه کالرّحمن والرحیم والحق او بصفة من صفاته تعالٰی .... لا یقسم بغیر اللہ تعالٰی کالنبی .... الخ.
وفی الشامیة ج:۳ ص:۷۱۲ (طبع سعید) قوله لا یقسم بغیر اللہ تعالٰی عطف علٰی قوله والقسم باللہ تعالٰی أی لا ینعقد القسم بغیرہ تعالٰی ای غیر اسمائه وصفاته .. . الخ.

اگر قرآنِ کریم کو ہاتھوں پر اُٹھا کر قسم کھائی جائے تو اس سے قرآنِ کریم کی بے حرمتی نہیں ہوتی، اور اس طرح بھی قسم صحیح ہوجاتی ہے۔ کذا یؤخذ مما فی رد المحتار ج:۲ ص:۷۰ نقلًا عن العینی۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۰/۲/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۸۲۴/۲۱ الف)

کئی قسموں کے متعدد کفارے دینا لازم ہے

سوال:- زید نے قسم کھائی کہ میں فلاں کام نہیں کروں گا، اپنی بے اعتدالی کی وجہ سے ایفا نہ کرکے وہ کام کرگزرا، اب تک کفارہ نہ دیا تھا کہ پھر قسم کھایا کہ یہ کام نہ کروں گا، پھر بے اعتدالی کی وجہ سے ایفا نہ کرکے وہ کام کرگزرا، ھلم جرًا آخر میں کفارہ دینے کو چاہا، تو اب ایک کفارہ دے گا یا ہر ایک قسم کا الگ الگ کفارہ ہوگا؟

دُوسری صورت میں بین الکفارتین فصل ہوگی یا متصل ہوگی؟

جواب:- قسم جتنی مرتبہ کھائی جائے گی خلاف ورزی کی صورت میں ہر قسم کا ایک کفارہ دینا ضروری ہوگا، خاص طور سے جبکہ دوسری قسم پہلی قسم کی خلاف ورزی کے بعد کھائی گئی ہو۔

فی الدر المختار وتتعدد الکفارۃ لتعدد الیمین والمجلس والمجالس سواء ولو قال عنیت بالثانی الأول ففی حلفہ باللہ لا یقبل۔ (شامی ج:۳ ص:۷۱)۔[2] البتہ کفارات میں وصل ضروری نہیں، فصل بھی کرسکتا ہے۔

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۰ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۵۶/۱۸ الف)

اللہ تعالیٰ اور قرآن کے لفظ کی قسم کھانے کا حکم اور قسم کا کفارہ کیا ہے؟

سوال:- علی حسین جنرل سیکریٹری یونائیٹڈ فیڈریشن پاکستان اور دُوسرے فریق عبدالغنی،

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۷۱۲، ۷۱۳ (طبع سعید) قال الکمال ولا یخفی أن الحلف بالقرآن الآن متعارف فیکون یمینًا وأمّا الحلف بکلام اللہ فیدور مع العُرف وقال العینی وعندی أن المصحف یمین لا سیما فی زماننا وعند الثلاثۃ المصحف والقرآن وکلام اللہ یمین. وکذا فی الفتاویٰ الھندیۃ کتاب الأیمان، الباب الثانی الفصل الأوّل ج:۲ ص:۵۳ (طبع رشیدیہ کوئٹہ).

(۲) الدر المختار کتاب الأیمان ج:۳ ص:۷۱۴ (طبع سعید) وفی البحر الرائق ج:۴ ص:۲۹۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) وفی التجرید عن أبی حنیفۃ اذا حلف بأیمان فعلیہ لکل یمین کفّارۃ والمجلس والمجالس سواء ولو قال عنیت بالثانی الأوّل لم یستقم ذٰلک فی الیمین باللہ تعالیٰ.

۲:-نوشہ،۳:-ظہیرالدین، ان فریقین نے قرآن پر یہ قسم کھائی تھی کہ ایک دُوسرے کے ساتھ رہیں گے، اور ایک دُوسرے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے جو ناجائز ہوگی۔ اس سلسلے میں علی حسین نے فریق دوم کے تینوں افراد کو ۵، ۵ فٹ جگہ دی اور یہ کہ ڈگری کی رقم ادا کرنا ہوگی جو بھی ہو، تمام خرچہ ملاکر، لیکن غنی ڈگری کی رقم دینے سے انکار کرتا رہا کہ میں نہیں دُوں گا، اور علی حسین یہ کہتا رہا کہ ڈگری کی رقم بعد میں دینا ہوگی۔ فریق دوم نے ڈگری کی رقم ادا نہیں کی، قسطیں کرائیں، ان کو بھی ادا نہیں کیا، بعد میں نوشہ نے ۵ فٹ کی جگہ ۱۵ فٹ جگہ لے لی، ظہیر نے رقومات قسطیں کرانے کے باوجود ادا نہ کیں، اور دُوسرے معاملات جو کہ علی حسین کے مفاد کے خلاف ہیں اس میں بھی غنی، نوشہ، ظہیر مداخلت کرتے ہیں، جبکہ قسم پر کہا تھا کہ ہم کسی معاملے میں نہیں بولیں گے۔

۲:-علی حسین نے غصّے کے عالم میں دُوسرے نادہندگان ڈگری کے سلسلے میں قرآن کی قسم کھائی کہ میں یک مشت ڈگری کی رقم وصول کروں گا اور کورٹ میں لوگوں کو جاکر روپیہ جمع کرنا ہوگا، لیکن دو آدمیوں کا نام زبانی لے لیا محمد یامین اور مُنّا کا اور کہا کہ سب کو ڈگری جمع کرنا ہے۔

۳:- ہم چار افراد ایک مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ ایک شخص ببرالدین آیا اور اس نے کہا کہ چاروں آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھو پانچوں نے ہاتھ پر اپنا اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ قرآن درمیان میں ہے کہ حالانکہ قرآن نہیں تھا، اب نیت میں کچھ فتور پائے جاتے ہیں چونکہ ہر ایک کے معاملے میں مداخلت کر رہے ہیں، رقم تیسرے فریق سے حاصل کی گئی تھی اور اُس رقم سے اسٹال وغیرہ تعمیر کئے گئے تھے، چونکہ مسئلہ کلامِ پاک کا ہے، چونکہ فریق دوم، سوم سب قسطیں چاہتے ہیں، اور مجھ فریق اوّل کو روپیہ کی ادائیگی ان لوگوں کو کرنا ہے جنھوں نے بغیر اپنے مفاد کے روپیہ ہمیں قرض دیا تھا، حالانکہ اگر یہ لوگ روپیہ ادا کرنا چاہیں تو نمبر ۱، ۲، ۳، ادا کرسکتے ہیں، آج ۳ سال سے اس جگہ کی آمدنی سے کافی رقم حاصل کرچکے ہیں۔

جواب:- قسم کھانے کا حکم سمجھ لیجئے، اس سے تینوں مسئلوں کا جواب ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ یا قرآنِ کریم کی قسم کھانے سے قسم منعقد ہوجاتی ہے،[۱] اور اگر یہ قسم کسی ناجائز کام پر نہ کھائی گئی ہو تو اُسے توڑنا گناہ ہے، اور اگر کسی ناجائز کام پر کھائی گئی ہو تو توڑنا واجب ہے۔[۲] دونوں صورتوں میں اس کا کفارہ دینا ہوگا۔ کفارہ یہ ہے کہ یا دس مسکینوں کو فی کس پونے دو سیر گندم کے حساب سے غلّہ یا اس کی

(۱) ''اللہ تعالیٰ'' کے لفظ سے قسم منعقد ہونے کا حوالہ سابقہ ص:۴۹۶ کے حاشیہ نمبر۲ و ۳ میں، اور ''قرآن کریم کی قسم'' سے قسم منعقد ہونے کا حوالہ پچھلے صفحہ:۴۹۷ کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی تنویر الأبصار ج:۳ ص:۷۲۸ (طبع سعید) ومن حلف علی معصیة کعدم الکلام مع أبویه أو قتل فلان الیوم وجب الحنث والتکفیر.

قیمت دے، یا دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کے لباس کا انتظام کرے، اور اگر ان میں سے کسی بات کی استطاعت نہ ہو تو تین دن متواتر روزے رکھے۔[1] صورتِ مسئولہ میں جن باتوں پر آپ نے قسمیں کھائی ہیں، ان کی تفصیل سوال سے سمجھ میں نہیں آئی، اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کام جائز ہیں یا ناجائز؟ بہرصورت قسموں کی خلاف ورزی پر مذکورہ کفارہ ادا کریں اور ہر قسم کے توڑنے پر الگ کفارہ ہوگا۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۲/۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۴۷/۲۸ ج)

''تمہارے ہاتھ کا بھرا پانی پیوں تو سور کے خون کے قطرے پیوں'' الفاظ سے قسم منعقد نہیں ہوتی

سوال:- تین سال قبل رمضان میں روزہ کھولنے سے ۱۵ منٹ قبل پینے کا پانی رکھا تھا، اور اس میں برف ڈال دیتا تھا، لیکن آخر رمضان میں ایسا ہوا کہ میں پانی رکھنا اور برف لانا بھول گیا، جب روزہ کھولنے میں ۵ منٹ رہ گئے تو مجھے اس بات کا خیال آیا، مگر گھڑے کے پاس پانی نکالنے گیا مگر گھڑے میں پانی نہیں تھا، پھر میں صحن میں آیا تو دیکھا کہ میرا ایک لڑکا نثار جس کی عمر ۳۶ سال ہے صحن میں کھڑا ہوا ہے، میں نے اُس سے کہا: نثار! تم نل سے پانی لادو، میں برف لے کر آتا ہوں۔ مگر نثار نے پانی لانے سے انکار کردیا، اس پر میں نے کہا کہ تم برف لے آؤ، پانی میں لے آتا ہوں، لیکن اُس نے برف لانے سے بھی انکار کردیا، مجھے بہت غصہ آیا اور میں نل پر پانی لینے چلا گیا، اتنے میں میرے دُوسرے دو لڑکے نل پر پانی لینے آگئے، ایک نے کہا پانی میں بھر دیتا ہوں، دُوسرے نے کہا برف میں لے آتا ہوں، یہ کام دونوں کے سپرد کر کے گھر واپس آگیا، نثار اُسی جگہ کھڑا تھا جہاں میں چھوڑ کر اُسے باہر گیا تھا، میں نے غصے میں کہا: ''نثار! اگر ہم تمہارے ہاتھ کا بھرا ہوا پانی پئیں تو سور کے خون کے قطرے پئیں'' پھر ڈیڑھ سال تک ہماری اُس سے بول چال بند رہی، اس کے بعد اُس نے معافی مانگی، میں نے معاف کردیا، لیکن پانی نہ پینے کی جو قسم کھائی تھی ہنوز اُس پر قائم ہوں، اگر کوئی شرعی گنجائش ہو تو تحریر فرمائیں، ورنہ ساری عمر اس پر قائم رہوں گا۔

جواب:- سوال کے خط کشیدہ الفاظ سے شرعی قسم متحقق نہیں ہوئی، لہٰذا اگر اب آپ نثار کے ہاتھ کا بھرا ہوا پانی پی لیں تو آپ پر کوئی کفارہ عائد نہیں ہوگا، آپ اس کے ہاتھ سے پانی پی سکتے ہیں،

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۹۵ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۲) حوالے کے لئے دیکھئے ص:۴۹۷ کا فتویٰ اور اُس کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

لما فی الدر المختار وان فعله فعلیه غضبه أو سخطه أو لعنة الله أو هو زان أو سارق أو شارب خمر أو اکل ربا لا یکون قسمًا وفی رد المحتار عن الولوالجیة هو یستحل الدم أو لحم الخنزیر ان فعل کذا لا یکون یمینا. (شامی ج:۳ ص:۵۷)۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۷/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۵۶۴/ ۲۸ ب)

''اگر مزید سونا مانگوں تو کافر ہوجاؤں'' الفاظ سے قسم منعقد ہونے کا حکم

سوال:- تقریباً چار سال قبل ایک مرتبہ میں نے بیوی سے کہہ دیا تھا کہ وہ تو (یعنی ذکر طلاق ہوگیا تھا) تب پڑے گی کہ جب تم کفریہ بات کروگی یا تم کفر و یہ کلمہ کہوگی، غالبًا پہلا فقرہ کہا تھا، آج بیوی سے بات ہورہی تھی اُس کو چھ تولے سونے کا زیور بنواکر دیئے، وہ کہنے لگی کہ ۸ تولے سونے کا زیور بنوادو، پھر اگر بعد میں میں سونا مزید لوں یا یوں کہا کہ اور سونا مانگوں تو کافر ہوجاؤں، اب اگر ۸ تولے سونا لے کر دے دوں اور بعد میں کبھی وہ اور سونا مانگے تو کیا اس سے واقعی کافر ہوجائے گی اور پھر اس سے ایک طلاقِ صریح یا بائن پڑجائے گی؟

جواب:- آپ کی بیوی نے جو یہ کہا کہ ''اگر میں بعد میں مزید سونا مانگوں تو کافر ہوجاؤں'' ان الفاظ سے قسم متحقق ہوگئی ہے، یعنی آئندہ اس کے لئے مزید سونا مانگنا ناجائز ہے، اگر مانگے گی تو اسے قسم کا کفارہ دینا پڑے گا، لیکن وہ اس کی بناء پر کافر نہیں ہوگی، اور نہ اس سے اُس پر طلاق واقع ہوگی، فی الدر المختار وان فعل کذا فهو کافر فیکفّر بحنثه لو فی المستقبل والأصح أن الحالف لم یکفر. (شامی ج:۳ ص:۵۵)۔[۲]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۰۵/ ۲۸ ب)

---

(۱) الدر المختار مع ردّ المحتار ج:۳ ص:۷۲۱ (طبع سعید) وفی الفتاوی الهندیة الباب الثانی فیما یکون یمینًا وما لا یکون یمینًا الفصل الأوّل ج:۲ ص:۵۵ (طبع رشدیه کوئته). لو قال ان فعلت کذا فانا زان أو سارق أو شارب خمر أو اکل ربا فلیس بحالف هٰکذا فی الکافی.

(۲) الدر المختار ج:۳ ص:۷۱۷، ۷۱۸ (طبع سعید). وفی الهندیة کتاب الأیمان الباب الثانی فیما یکون یمینًا وما لا یکون یمینًا ج:۲ ص:۵۴ (طبع رشیدیه کوئته) ولو قال ان فعل کذا فهو یهودی أو نصرانی أو مجوسی أو بریٔ من الاسلام أو کافر أو یعبد من دون الله أو یعبد الصّلیب أو نحو ذٰلک ممّا یکون اعتقاده کفرا فهو یمین استحسانًا کذا فی البدائع حتّی لو فعل ذٰلک الفعل یلزمه الکفارة وهل یصیر کافرًا اختلف المشائخ فیه قال شمس الأئمة السرخسیّ والمختار للفتوی انه ان کان عنده انّه یکفر متٰی أتٰی بهذا الشّرط ومع هذا أتٰی یصیر کافرًا لرضاء بالکفر وکفّارته أن یقول لا اله الّا الله محمد رسول الله وان کان عنده انه اذا أتٰی بهذا الشّرط لا یصیر کافرًا لا یکفر .... الخ.

قسم کی خلاف ورزی کو دیانۃً بہتر سمجھنے کی صورت میں خلاف ورزی کرنا اور کفارہ دینا بہتر ہے

سوال:- ایک لڑکی کو اس بات کا حلف اس کے والدین نے دباؤ ڈال کے اُٹھوایا کہ تم صرف زید کو اپناؤ گی، لڑکی نے دباؤ میں آکر یہ حلف تو اُٹھالیا مگر اب وہ اس حلف کو توڑنا چاہتی ہے، کیا یہ حلف جو کہ دباؤ میں آکر اُٹھایا گیا ہے، حلف کہلانے کا مستحق ہے؟ اور اس کا گناہ کس کے سر پر ہوگا؟

۲:- اگر اس حلف کی کوئی شرعی حیثیت ہے تو اس کو توڑنے کا کیا کفارہ ادا کرنا ہوگا؟

۳:- بالفرض اس نے دباؤ سے نہ بھی اُٹھایا ہو بلکہ دِل سے اقرار کیا ہو، تو کیا کفارہ ہوگا؟

جواب ۱:- کسی شخص پر اس کی مرضی کے خلاف کسی بات پر حلف اُٹھانے کے لئے دباؤ ڈالنا دُرست نہیں ہے، لیکن اس طرح اگر کوئی شخص حلف کرے (یعنی اللہ کی قسم کھا کر کسی بات کا وعدہ کرے) تو حلف صحیح ہوجاتا ہے۔(۱)

۲:- ایسی صورت میں حلف اُٹھانے والا اگر حلف کی خلاف ورزی کو دیانۃً بہتر سمجھتا ہے تو اس کے لئے حلف کی خلاف ورزی جائز ہے،(۲) لیکن اسے قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔(۳) کفارے کا مطلب یہ ہے کہ تین کاموں میں سے کوئی ایک کام کرے، یا دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلائے، یا دس مساکین کو متوسط درجے کا لباس دے، اور اگر ان پر قدرت نہ ہو تو تین روزے رکھے۔(۴)

۳:- اگر دِل سے بغیر کسی جبر کے حلف کیا ہو، لیکن بعد میں دیانۃً دُوسری جانب کا بہتر ہونا سمجھ میں آیا ہو تب بھی قسم توڑنے کی گنجائش ہے،(۵) اس صورت میں بھی وہی کفارہ ادا کرنا ہوگا جس کی تفصیل نمبر۲ میں گزری۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۰/۱۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱۴۳/۲۱ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۹۶ کا حاشیہ نمبر۲ و۳۔

(۲، ۳، ۵) وفی سنن النسائی باب من حلف علٰی یمین فرأی غیرها خیرًا منها ج:۲ ص:۱۴۳ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن أبی موسٰی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما علی الأرض یمین أحلف علیها فاری غیرها خیرًا منها الا أتیتہ. وفی کتاب الأصل (المبسوط للشیبانیؒ) کتاب الأیمان ج: ۳ ص:۱۹۰ قد بلغنا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنہ قال: من حلف علٰی یمین فرای غیرها خیرًا منها فلیأت الذی هو خیر ولیکفر عنه یمینه. وکذا فی الهدایة کتاب الأیمان.

(۴) دیکھئے حوالہ سابقہ ص.۴۹۵ کا حاشیہ نمبر۱۔

قسم کھانے کا حکم اور قسم کے کفارہ کی تفصیل

سوال:- میں نے ایک کام نہ کرنے کے سلسلے میں اللہ کے حضور میں قرآن پاک کی قسم کھائی، اب میں اس کو کرنا چاہتا ہوں، اس کا کیا کفارہ ہے؟

جواب:- اگر اللہ کی قسم کھا کر آپ نے کوئی کام نہ کرنے کا عزم کیا تھا، اور زبان سے کہا تھا تو آپ کے لئے جائز نہیں کہ وہ کام کریں، اِلَّا یہ کہ وہ کوئی نیک کام ہو۔ بہرصورت اگر وہ کام آپ نے کرلیا تو کفارے کے طور پر یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائیں، یا دس مساکین کو ایک ایک جوڑا کپڑا دیں، اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو تین دن روز رکھیں۔ ان میں سے جو کام بھی کرلیں گے کفارہ ادا ہوجائے گا۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۰/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۰۵/۲۱ الف)

جواب صحیح ہے، جس کام کے نہ کرنے کی قسم کھائی تھی اگر وہ کام شرعاً جائز ہے اور اس کے کرنے کی آپ کو ضرورت ہے تو وہ کام کرلیں، پھر کفارۂ قسم دے دیں،[2] جس کی تفصیل جواب میں آگئی ہے۔

محمد شفیع عفا اللہ عنہ

نذر کی قربانی کا گوشت خود کھانا جائز نہیں

سوال:- زید نے نذر مانی کہ میرا فلاں کام ہوجائے تو میں بقرعید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے بکرا قربان کروں گا، چنانچہ قربانی کے موقع پر بکرا قربان کیا گیا، اب اس بکرے کا کیا حکم ہے؟ کیا ناذِر خود کھاسکتا ہے یا صدقہ کرے؟

جواب:- نذر کی قربانی کا گوشت کھانا جائز نہیں، اگر غلطی سے کھالیا تو جتنا گوشت کھایا ہے اس کی قیمت کا صدقہ کیا جائے۔ **ولا یاکل النّاذر منها فان أکل تصدّق بقیمة ما أکل.** درمختار مع الشامی ج:۵ ص:۲۸۵۔[3]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۹۶۸/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب الأیمان ج:۳ ص:۷۲۵ و ۷۲۷ (طبع سعید) وکفارته تحریر رقبة أو اطعام عشرة مساکین (الٰی قوله) صام ثلاثة أیام ولاء. وفی الهندیة کتاب الأیمان فصل فی الکفّارة ج:۲ ص:۶۱ (طبع رشیدیه) وهی أحد ثلاثة أشیاء ان قدر عتق رقبة یجزئ فیها ما یجزئ فی الظهار أو کسوة عشرة مساکین لکل واحد ثوب فما زاد وأدناه ما یجوز فیه الصلٰوة أو اطعامهم (الٰی قوله) فان لم یقدر علٰی أحد هذه الأشیاء الثلاثة صام ثلاثة أیام متتابعات.

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے گزشتہ صفحہ:۵۰۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۲، ۳ و ۵۔

(۳) الدّر المختار ج:۶ ص:۳۲۱ (طبع سعید).

﴿کتابُ الوقف﴾

(وقف کے مسائل)

وقف ہونے کے لئے مالک کا باقاعدہ وقف کرنا ضروری ہے
محض دعویٰ سے زمین وقف نہیں ہوتی

سوال:- عرض اینکہ آج سے نوّے سال قبل ملک مظفر خان کے والد ملک محمد امیر بھچر ہمارے خاندان کے ایک بزرگ میاں احمد کو وال لیچراں لائے، ایک کوٹھی بنا کر اپنی زمین میں بٹھادیا، جب وہ فوت ہوئے تو وہیں دفن ہوئے۔ اس کے قریب کافی جگہ جنگل کی صورت میں ہمارے آباء و اجداد کو دے دی گئی، آج تک ملک صاحبان کی اولاد میں سے کسی نے اس جگہ کا مطالبہ نہیں کیا، ہمارے بزرگوں کو ۱۹۵۶ء میں علم ہوا کہ یہ جگہ دیہہ آبادی ہے، پٹواریوں کے کاغذات میں اس کا قبضہ ہمارے نام ہے۔ ضرورت کے مطابق ہم یہاں رہائشی مکانات بناتے رہے، ہمارے بزرگ کی قبر کے قریب قبریں بھی بنتی رہیں، نہ ہم نے قبریں بنانے سے کسی کو روکا، نہ ہی ہمیں مکان بنانے سے کسی نے روکا۔ ۱۹۷۷ء میں ہمارے رشتہ دار نذر حسین اینڈ برادرز ولد غلام حسین نے ایک کوٹھی کی تعمیر شروع کی، وال لیچراں کے ملک شیر محمد ولد ملک بندہ نے ڈپٹی کمشنر میانوالی کو درخواست دی کہ یہ جگہ قبرستان کے لئے وقف ہے۔ اس پر سماعت شروع ہوئی، ملک عمر حیات، ملک خضر حیات پسران ملک عطاء محمد برادر ملک مظفر خان نے عدالت میں جا کر بیان دیا کہ ہمارے آباء واجداد نے یہ تمام جگہ ان کے بزرگوں کو دے دی تھی، یہ جو کچھ اس جگہ پر تعمیر کریں، ہمیں کچھ اعتراض نہیں۔ فیصلہ ہمارے حق میں ہوا جس کا تحریری ثبوت ہے۔ اس کے بعد کوٹھی اور دیگر درجنوں مکان تعمیر ہوئے، شہر کے کسی فرد نے کوئی رُکاوٹ نہیں ڈالی۔ گزشتہ سال تعمیر اور فیصلے کے گیارہ سال بعد عطاء محمد زمان قوم لیجر وغیرہ نے پھر مسئلہ کھڑا کردیا اور یہ کہا کہ: یہ جگہ قبرستان کی ہے، یہاں مردے دفن ہوتے رہے۔ اس پر قبریں مسمار کر کے مکان تعمیر کئے گئے۔ برائے کرم یہ بتائیں کہ ان لوگوں کا یہ رویہ کہاں تک دُرست ہے؟ جبکہ ان کے پاس وقف کے کوئی ثبوت نہیں ہیں۔

جواب:- کسی زمین کے وقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مالکِ زمین نے اس کو وقف کیا ہو[1]، اور جب تک وقف کرنے کا شرعی ثبوت موجود نہ ہو، کسی زمین کو وقف نہیں کہا جاسکتا۔ محض یہ بات کہ اس زمین میں مُردے دفن ہوتے رہے ہیں، اس بات کی کافی دلیل نہیں ہے کہ یہ زمین قبرستان

---

(۱) دیکھئے اگلے فتویٰ کا حاشیہ نمبرا۔

کے لئے وقف ہے، اور نہ کسی شخص کا محض دعویٰ، وقف کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جب تک مدعیانِ وقف زمین کے وقف ہونے پر کوئی ایسی شہادت پیش نہ کریں جس سے شرعاً یہ ثابت ہو سکے کہ فلاں مالکِ زمین نے اس کو فلاں فلاں مقاصد کے لئے وقف کیا تھا، اس وقت تک اس کو وقف قرار دینا دُرست نہیں، اور اس بناء پر جو لوگ اس پر قابض و متصرف چلے آرہے ہیں اور اس کے مملوک ہونے کے دعوے دار ہیں ان کو اس زمین سے بے دخل کرنا یا ان کے مالکانہ تصرفات کو روکنا بھی جائز نہیں ہے۔ (۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۸/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۲۴۹۴ ج)

۱:- مہتممِ مدرسہ متولیٔ وقف ہے یا چندہ دہندگان کا وکیل؟
۲:- زمین کو خریدنے اور اُس کا مالک بننے سے پہلے اسے وقف کرنا

سوال ۱:- مہتممِ مدرسہ بمنزلہ متولیٔ وقف ہے یا وکیل عن المعطین دَرحق اموالِ مدرسہ؟

۲:- اس شہر کی تمام زمین کو حکومت جو شیعہ اثناعشریہ ہے اپنا خالصہ سمجھتی ہے اور لوگوں کے ہاتھ جب تک وہ پہلے سے کچھ بناء وغیرہ کے ذریعہ تصرف نہ کریں خاص زمین کو فروخت بھی نہیں کرتی ہے، اس لئے شہر کے چند آدمی متفق ہو کر کچھ چندہ جمع کر کے ایک قطعہ زمین کو عیدگاہ کے نام سے دیوار کر کے اپنے تصرف میں لائے اور ایک دو بار اس میں نماز بھی پڑھ چکے ہیں، اس کے بعد نماز پڑھنا اس کے اندر متروک ہو گیا ہے۔ اب وہ آدمی جنھوں نے اس کی دیوار بنانے میں چندہ دیا ہے اس بات پر راضی ہو چکے ہیں کہ اس کو مدرسہ میں جو اس کے قریب ہے شامل کر دیا جائے، کیونکہ یہ جگہ عیدگاہ کے لئے ناکافی ہے اور عیدگاہ دُوسری جگہ بنانا پڑے گی، تو آیا اس زمین کو دینی مدرسہ کے تصرف میں لانا شرع کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

۳:- اس زمین کے شرق سے لے کر شمال تک بیرونی جانب بھی کچھ زمین موجود تھی جس کو

---

(۱) وفی أحكام الأوقاف للخصاف ص:۱۳۴: أرأيت هذه الوقوف الّتي تقادم أهلها ومات الشهود الذين يشهدون عليها ما السبيل فيها؟ قال: ما كان في أيدي القضاة منها وما كان لها رسوم في دواوين القضاة أجريت على الرّسوم الموجودة في دواوينهم استحسانًا اذا تنازع أهلها فيها وما لم يكن لها رسوم في دواوينهم يعمل عليها فالقياس فيها اذا تنازع القوم فيها أن يحملوا على التثبيت فمن ثبت في ذلك شيئًا حكم له به. بحوالہ امداد الاحکام دیکھئے: ج:۳ ص:۲۰۔

وفي رد المحتار كتاب الوقف مطلب في الوقف اذا انقطع ثبوته (ج:۴ ص:۳۹۶ طبع سعيد كراچی) ان الأوقاف الّتي تقادم أمرها ومات شهودها فما كان لها رسوم في دواوين القضاة وهي في أيديهم أجريت على رسومها الموجودة في دواوينهم استحسانًا اذا تنازع أهلها فيها، وما لم يكن لها رسوم في دواوين القضاة القياس فيها عند التنازع ان من أثبت حقا حكم له به.

وفي الاشباه والنظائر ص:۲۰۹ لا تثبت اليد في العقار الا بالبيّنة.

ان لوگوں نے فقط تحجیر کر کے چھوڑ دیا ہے اور خیال اُس وقت یہ تھا کہ اس کو بھی آئندہ عیدگاہ میں شامل کردیں گے، اور اس پر نماز ادا نہیں کی گئی۔ آیا جوازِ تصرف برائے مدرسہ میں ان دونوں مذکورہ بالا زمینوں میں کچھ تفاوت ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- مدرسہ کی زمین، عمارات اور کتابیں وقف ہوتی ہیں، لہٰذا مہتمم ان اوقاف کا متولی ہے، لیکن نقد روپیہ یا استعمالی اشیاء جو مدرسے میں بطور چندہ دی جاتی ہیں وہ وقف نہیں ہوتیں، لہٰذا اُن کے حق میں مہتمم مدرسہ کی حیثیت وکیل المعطین کی ہے، کذا یفهم من امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۵۰۳ سوال نمبر ۶۵۲۔

۲، ۳:- اگر وہ زمین ابھی تک حکومت سے خریدی نہیں گئی تھی بلکہ صرف دیوار بنائی گئی تھی تاکہ اس کی بنیاد پر حکومت سے خریدی جائے تو یہ زمین ابھی عیدگاہ کے لئے وقف نہیں ہوئی، کیونکہ وقف کی صحت کے لئے واقف کا مالک ہونا شرط ہے، لما فی رد المحتار ذکر فی البحر أن مفاد کلام الحاوی اشتراط کون أرض المسجد ملکا للبانی. (شامی ج:۳ ص:۳۷۰)[1]۔

لہٰذا اب اگر اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دُوسری جگہ عیدگاہ بنانا چاہتے ہیں اور اس زمین میں مدرسہ بنانا مقصود ہے تو ایسا کرنا جائز ہے، اور اس حکم میں وہ زمین بھی داخل ہے جس میں نماز شروع کردی گئی تھی، اور وہ زمین بھی جس میں نماز شروع نہیں کی گئی بلکہ صرف دیوار بنائی گئی تھی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۶ھ

مسجد کی تعریف اور تعلیمِ قرآن کے لئے وقف کی گئی جگہ میں امام کا مکان بنانے کا حکم

سوال:- ہمارے محلے کی مسجد جو صدیوں پُرانی ہے، ایک سو سال ہوا کہ ایک نابینا حافظ صاحب جو تونسہ شریف پنجاب کے باشندے تھے آکر اس مسجد کے ملحقہ چھوٹے سے حجرے میں جو ۸ فٹ چوڑا تھا مقیم ہوئے، لیکن استدعا کی کہ ایک بڑا حجرہ ہونا چاہئے جس میں درسِ قرآن جاری کرسکوں۔ محلے والوں سے تو کچھ نہ ہوسکا، امام صاحب نے اپنی جانب سے ایک کشادہ حجرہ ۱۴×۱۴

(۱) وفی الشامیة أیضًا ج:۴ ص:۳۴۰ (طبع سعید) (وشرطه شرط سائر التبرعات) أفاد أنّ الواقف لا بدّ أن یکون مالکه وقت الوقف ملکًا باتًا .... الخ.
وفی الهندیة ج:۲ ص:۳۵۳ (طبع رشیدیه کوئٹه) ومنها الملک وقت الوقف .... الخ.
وفی البحر الرائق ج:۵ ص:۱۸۸ (طبع رشیدیه کوئٹه) الخامس من شرائطه الملک وقت الوقف ... الخ.
وفی قانون الحلال والانصاف ص:۱۱ یشترط لصحة الواقف أهلًا للتبرّع أعنی حرًّا عاقلًا بالغًا وان یکون مالکًا للعین الموقوفة. وکذا فی ص:۲۰.

مربع فٹ کا بنوا کر قرآنی تعلیم کے لئے وقف کردیا اور اپنی رہائش بھی منتقل کرلی، تقریباً پچاس سال درس دیتے رہے، بیسیوں حفاظ اور سینکڑوں ناظرہ خواں طلباء مستفیض ہوئے، آخر داعیٔ اجل کا پیغام آپہنچا اور لبیک کہہ کر اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھار گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے وفات پا جانے کے بعد مقامی دیہات سے ایک اور حافظ صاحب، امام مقرّر ہوئے، جب شادی کی تو پردہ دار رہائشی مکان کا مطالبہ کیا، ان کے لئے مسجد سے علیحدہ کسی مقام کا انتظام تو نہیں ہوسکا مگر چند ایک نے یہ تجویز پیش کی کہ اسی قرآنی تعلیم کی جگہ کے صحن میں دو دیواریں ڈال کر اسی کو پردہ دار مکان بنادیا جائے، مگر میں نے بدلائلِ ذیل اس کی مخالفت کی۔ ۱:- سابق اِمام مرحوم نے جو اپنی جانب سے قرآنی تعلیم کا حجرہ بنا کر وقف کیا اس کے وقف کا حق پامال کرکے کیا واقف کی رُوح کو تڑپانے کے مترادف نہ ہوگا؟ اور کیا ہم گناہگار نہ ہوں گے؟ ۲:- ہر انسان کو چاہے وہ مسلمان ہو یا ہندو، سکھ ہو یا عیسائی، یہودی ہو یا مجوسی مسجد کے کسی حصے میں آنے جانے کا حق رکھتا ہے، بشرطیکہ الف:- پاگل نہ ہو، ب:- ایسا غلیظ لباس نہ رکھتا ہو جس سے دیگر حاضرین کو گھن آئے، ج:- نشے کی حالت میں نہ ہو، د:- کسی سے دُشمنی کا ارادہ نہ رکھتا ہو، وغیرہ وغیرہ، مگر مکان بنانے سے حق چھن جائے گا۔ ۳:- صحنِ حجرہ اتنا وسیع و عریض نہیں جس میں مکان کے علاوہ کسی اور حجرے کے بنانے کی گنجائش ہوتا کہ قرآنی تعلیم جاری کی جاسکے۔ ۴:- پردہ دار مکان بن جانے سے صحنِ حجرہ میں مسجد میں جاتے وقت جوتے اُتارنے کا حق بھی تلف ہوگا۔ ۵:- مسجد کے محراب والا کمرہ اور حجرہ متصل ہیں، اور درمیان میں ایک کھڑکی بھی لگی ہوئی ہے جس سے سابق نابینا اِمام مرحوم بوقتِ امامت جماعت آمد و رفت رکھتا تھا، اب حجرہ جو رہائشی کمرہ بن جائے اور اس میں بال بچے رہنے لگیں اور اگر امام صاحب بھیڑ بکری بھی رکھتے ہوں تو ان کی آواز سے، کمرے متصل ہونے اور بیچ میں کھڑکی ہونے سے نماز میں خلل واقع ہونے کا احتمال ہے۔ ۶:- اپنے شہر میں اور دیگر شہروں میں بھی یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ مکان کو قربان کرکے مسجد بنائی جاتی ہے اور حدیث مبارکہ میں ہے کہ جو مسجد بناتا ہے اس کو جنت میں گھر ملتا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں اس کا کیا بنے گا جو اس کے برخلاف مسجد کو گھر بناتا ہے؟ اس کو آخرت میں کیا ملے گا؟ ۷:- مسجد میں مکان بن جانے سے اس کی ڈیوڑھی کا دروازہ بھی اندرونِ مسجد ہوگا جبکہ مسجد کا اپنا داخلی دروازہ بھی بالمقابل گھر کے ہوگا، اس طرح سے ہوسکتا ہے کہ کبھی کبھی اتفاقاً نمازیوں کا اور گھر میں آنے جانے والی عورتوں کا آمنا سامنا ہوجائے جو ایک معیوب بات ہے۔

کرم فرمائے بندہ! دریں حالات یہ دریافت طلب اَمر ہے کہ اَز رُوئے شریعتِ حقہ احاطۂ مسجد میں جو زیادہ وسیع و عریض بھی نہ ہو، ایک سابق حجرۂ قرآنی تعلیم اور اس کے صحن کے تمام حقوق غصب

کر کے پردہ دار رہائشی مکان بنانا کیسا ہے؟ کیا ہم مکان بنا کر گناہگار نہ ہوں گے؟

جواب:- پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ شرعاً مسجد صرف وہ جگہ ہوتی ہے جس کو بنانے والے نے مسجد قرار دیا ہو، اور صرف نماز پڑھنے کی نیت سے بنایا ہو، لیکن جو جگہ کسی اور مقصد مثلاً تعلیمِ قرآن کے لئے وقف کی گئی ہو وہ نہ شرعاً مسجد ہوتی ہے اور نہ اس پر مسجد کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں صحنِ حجرہ کو اگر بانی یا واقف نے مسجد قرار دیا تھا تب تو اس کو نماز پڑھنے کے سوا کسی بھی مقصد کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں، چنانچہ اس میں رہائشی مکان بھی نہیں بن سکتا، لیکن اگر بانی یا واقف نے اس کو مسجد قرار نہیں دیا بلکہ تعلیمِ قرآن کے لئے یا مسجد کی دیگر ضروریات کے لئے وقف کیا تھا تو اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ واقف کی شرائط کیا تھیں[1]؟ اگر اس نے وقف کرتے وقت کوئی ایسی صراحت کر دی تھی کہ یہ پوری جگہ تعلیم ہی میں استعمال ہوگی، اساتذہ وغیرہ کے مکانات میں نہیں، تب بھی یہاں مکان بنانا جائز نہیں[2]۔ لیکن اگر وقف میں تعلیمِ قرآن کی تمام متعلقہ ضروریات کی نیت کی گئی تھی تو اس میں ضرورت کے وقت اساتذہ کا مکان بنانے کی گنجائش ہے، البتہ تعمیر اس انداز سے کرنی چاہئے کہ حتی الامکان نماز میں کوئی خلل واقع نہ ہو، اور بے پردگی کا بھی احتمال کم سے کم ہو۔ واللہ اعلم

۱۴۰۰/۹/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۸۸/۳۱ د)

دارالعلوم دیوبند کے لئے دُکان کا کرایہ وقف ہونے کی صورت میں کون سے دارالعلوم دیوبند کو کرایہ بھیجا جائے؟

سوال:- باعثِ تحریر آنکہ میرپورخاص میں ایک صاحب جو رحلت فرما چکے ہیں، تقسیمِ پاک و ہند سے پہلے دو دُکانیں دارالعلوم دیوبند کے لئے وقف فرما گئے تھے۔ ان دونوں کا کرایہ وصول یابی کے بعد دارالعلوم کو ترسیل ہوتا رہا ہے، اب چند سالوں سے دارالعلوم کی حیثیت میں نمایاں فرق آیا اور وہاں دو انتظامیہ قائم ہوگئیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ دارالعلوم کی نئی اور پُرانی انتظامیہ دونوں اس کرایہ کے حصول کے لئے متقاضی ہیں، نئی انتظامیہ کا کہنا یہ ہے کہ حسبِ سابق یہ رقم پُرانی عمارت کے دارالعلوم کو ملنی چاہئے، جبکہ پُرانی انتظامیہ جس نے جامع مسجد دیوبند میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے، اس کا کہنا یہ ہے کہ سابقہ عمارت اب وقف نہیں رہی، اس لئے رقم کی ترسیل بھی اس کو نہیں ہوسکتی،

(۱ و ۲) وفی الشامیة ج:۴ ص:۳۶۶ (طبع سعید کراچی) أن شرائط الوقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالک فله أن يجعل ماله حيث شاء ما لم يكن معصية ..... وكذا سيأتي في فروع الفصل الأوّل أن قولهم شرط الواقف كنصّ الشارع، أي في المفهوم والدّلالة ووجوب العمل به.

کیونکہ پُرانی عمارت کی انتظامیہ نے دارالعلوم کو سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹر کرالیا ہے، جس کے تحت وقف املاک کی حیثیت ختم ہوکر سوسائٹی کی ملکیت ہوجاتی ہے، لہٰذا اب جبکہ دارالعلوم وقف ہی نہ رہا تو وقف کے معاملات میں ان کا اطلاق بھی نہ ہوگا۔ صورتِ مسئولہ میں فرمایا جائے کہ رقم سابقہ عمارت کی نئی انتظامیہ کو اِرسال کی جائے، یا جامع مسجد میں قائم کردہ دارالعلوم کی (سابقہ انتظامیہ جو دارالعلوم کو وقف لکھتی ہے) پُرانی انتظامیہ کو اِرسال کی جائے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں میرپور خاص کے وقف کے متولی کو چاہئے کہ دارالعلوم دیوبند کی دونوں قسم کی انتظامیہ میں سے جس کو اپنی تحقیق اور بصیرت کے مطابق دارالعلوم کا جائز متولی سمجھے اس کو وقف کی آمدنی اِرسال کردے، بشرطیکہ وہ دارالعلوم کو ایک مذہبی ادارہ اور اس کی وقف جائیدادوں کو اس پر وقف ہونا تسلیم کرے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۸/۸/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۹۴/۳۹ د)

مسجد میں تنگی کی بناء پر باہر کی جگہ کو مسجد میں شامل کرنے کا حکم

سوال:- ایک مسجد کا صحن کم ہے، نمازی کثرت سے آتے ہیں اور باہر مسجد کی جگہ ہے ایک مسلمان کی، وہ بہ قیمت بھی جگہ نہیں دیتا اور اس جگہ ہوٹل اور دُکانیں تعمیر کرتا ہے جو کہ مسجد کے لئے سخت نقصان کا موجب ہیں۔ کیا زبردستی بہ قیمت جگہ لے کر مسجد میں شامل کردیں تو دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر باہر کی جگہ اس مسلمان کی اپنی ملکیت ہے تو اس پر زبردستی کرکے جگہ کو مسجد میں داخل کرنا جائز نہیں ہے،[1] ہاں! اس کو راضی کیا جائے کہ وہ جگہ مسجد کو فروخت کردے، اور بحیثیت ایک مسلمان اس کو چاہئے کہ وہ مسجد کی ضرورت کا خیال کرے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۵۰/۳۲ ج)

---

(۱) وفی مشکوٰة المصابیح ج:۱ ص:۲۵۵ (طبع قدیمی) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: آلا لا تظلموا، آلا لا یحلّ مال امرئ آلا بطِیْبِ نفس منہ. رواہ البیھقی فی شعب الایمان. وفی حاشیتہ: أی بالاذن أو بالأمر.

﴿فصل فی أحکام المساجد وآدابها﴾

(مسجد کے اَحکام اور آداب کا بیان)

نیچے گودام اور اُوپر مسجد بنانے کا حکم

سوال:- اگر کسی مسجد کے زیرِ زمین حصے میں گودام ہو اور اُوپر کے حصے میں مسجد ہو تو کیا اُوپر کا حصہ بدستور جو بطور مسجد استعمال ہوتا ہے، وہ مسجد کے حکم میں آسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر بنانے والوں نے شروع سے ہی اس طرح تعمیر کیا کہ نیچے مسجد کی ضروریات کے لئے گودام رکھا اور اُوپر مسجد بنائی تو یہ صورت جائز ہے، لیکن اگر شروع میں اس جگہ کو مسجد بنادیا گیا تھا بعد میں گودام بنانا طے کیا گیا تو یہ جائز نہیں، لما فی الدر المختار واذا جعل تحته سردابا لمصالحه أی المسجد جاز کمسجد القدس (الٰی قوله) أما لو تمت المسجدية ثم أراد البناء منع۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ

جو جگہ مسجد بنائی جائے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی

سوال:- ایک مدرسہ ہے، اس میں ایک مسجد بھی ہے جو کمروں کے درمیان میں ہے، اور ایک طرف شارعِ عام بھی ہے، ارکانِ مدرسہ کا خیال ہے کہ مسجد کو شارعِ عام کی طرف منتقل کیا جائے، اور یہ شارعِ عام بھی مدرسہ ہی کا ہے، اور قدیم مسجد میں طلباء کے لئے کمرے بنائے جائیں، کیا یہ اِنتقال جائز ہوگا؟

جواب:- جو جگہ ایک مرتبہ مسجد بن جاتی ہے وہ قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے، اور جب تک وہ جگہ بالکل ویران نہ ہوجائے اسے منتقل کرنا جائز نہیں ہوتا۔[2] دُوسری جگہ مسجد کی ضرورت ہو تو الگ

---

(۱) ردّ المحتار کتاب الوقف ج:۴ ص:۳۵۷ (طبع سعید)۔ وفی الهندية كتاب الوقف ج:۲ ص:۴۵۵ (طبع رشيديه كوئٹه) ولو كان السرداب لمصالح المسجد جاز كما فی مسجد بيت المقدس. كذا فی الهداية.

(۲) وفی الدر المختار ج:۴ ص:۳۵۸ (طبع سعید) (ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجدًا عند الامام والثانی) أبدًا الٰی قيام الساعة (وبه يفتٰی) حاوی القدسی. وفی الشامية (قوله عند الامام والثانی) فلا يعود ميراثًا ولا يجوز نقله ونقل ماله الٰی مسجد اٰخر سواء كانوا يصلّون فيه أو لا وهو الفتوٰی.

بنالی جائے۔ ہاں! اگر یہ جگہ عارضی طور پر نماز پڑھنے کے لئے مقرر کی گئی تھی اور اسے باقاعدہ مسجد نہیں بنایا گیا تھا تو آپ اسے منتقل کرسکتے ہیں۔ كذا فی الدر المختار[1] والبحر[2] وسائر كتب الفقه۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۳/۱۹ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

مسجد کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم

سوال:- جمعہ مسجد کو اپنی جگہ سے ہٹانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جو جگہ ایک مرتبہ مسجد بن گئی، اب وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اور جب تک اس سے کامل استغناء نہ ہوجائے، یعنی وہ جگہ بالکل ویران نہ ہوجائے مسجد کو وہاں سے منتقل کرنا باتفاق جائز نہیں ہے۔ قال أبو يوسفؒ: هو مسجد أبدًا الى قيام الساعة لا يعود ميراثًا ولا يجوز نقلهٗ ونقل ماله الى مسجد اٰخر سواء كان يصلّون فيه أو لا وهو الفتوىٰ. كذا فی الحاوی القدسی وفی المجتبىٰ وأكثر المشايخ علىٰ قول أبی يوسفؒ ورجح فی فتح القدير قول أبی يوسف بأنّهٗ الأوجه. (البحر الرائق ج:۵ ص:۲۷۲)[3]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

فضائل کی کتاب پڑھنے کے لئے مسجد کی بجلی، موم بتی وغیرہ استعمال کرنے کا حکم

سوال:- فضائل کی کتاب پڑھنے کے لئے مسجد کی بجلی، موم بتی وغیرہ جلانا اور پنکھے چلانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اس مسئلے میں اصل مدار واقف کی نیت اور شرط پر ہے، اور اگر واقف کی نیت و

---

(۱) دیکھئے گزشتہ صفحے کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) وفی البحر الرائق ج:۵ ص:۲۵۱ (طبع رشیدیه کوئٹه) قال أبو يوسفؒ هو مسجد أبدًا الى قيام السّاعة لا يعود ميراثًا ولا يجوز نقله ونقل ماله الىٰ مسجد اٰخر سواء كانوا يصلّون فيه أو لا وهو الفتوىٰ.

(۳) البحر الرائق ج:۵ ص:۲۵۱ (طبع سعيد). وكذا فی الدر المختار ج:۴ ص:۳۵۸ (طبع سعيد). (نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حواشیہ)۔

شرط مصرّح نہ ہو تو عرف کا اعتبار ہوتا ہے، یعنی اگر مسجد کی روشنی اور پنکھے وغیرہ کو دُوسرے دینی اُمور میں استعمال کرنا متعارف ہو اور مسجد کے چندہ دہندگان اس پر اعتراض نہ کرتے ہوں تو جائز ہے، اور ہمارے عرف میں اس پر اعتراض نہیں کیا جاتا، اس لئے فتویٰ کی رُو سے جائز ہے۔

لما في العالمگيرية: ولا بأس بأن يترك سراج المسجد في المسجد الٰى ثلث الليل، ولا يترك أكثر من ذٰلك الا اذا شرط الواقف ذٰلك أو كان ذٰلك معتادا في ذٰلك الموضع (عالمگيرية قبيل باب الوتر ج:۱ ص:۱۱۰)[1]۔

وفيها أيضًا: ان أراد انسان أن يدرس الكتاب بسراج المسجد ان كان سراج المسجد موضوعًا في المسجد للصلاة قيل: لا بأس به، وان كان موضوعًا في المسجد لا للصلاة بأن فرغ القوم من صلاتهم وذهبوا الٰى بيوتهم وبقي السراج في المسجد قالوا: لا بأس بأن يدرس به الٰى ثلث الليل وفيما زاد على الثلث لا يكون له حق التدريس كذا في فتاوىٰ قاضي خان. (عالمگيرية كتاب الوقف ج:۲ ص:۴۵۹)[2]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۳/۲۷ و)

مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کو مسجد سے باہر نکال کر جلسے کے لئے استعمال کرنا

سوال:- قصبہ باغ کے مسلمانوں نے چندہ کرکے جامع مسجد کے لئے لاؤڈ اسپیکر خریدا، ضرورت یہ پیش آتی تھی کہ قصبے میں گنجان آبادی کے باعث نمازِ جمعہ وعیدین اور دیگر مجامع میں اذان یا خطبہ کی آواز لوگوں تک نہیں پہنچتی تھی اور مذہبی وتبلیغی مجالس میں بھی لاؤڈ اسپیکر کی اشد ضرورت تھی، اس ضرورت کے پیشِ نظر چندہ سے لاؤڈ اسپیکر خرید لیا گیا۔ اب چند سالوں سے بعض دیہات وغیرہ میں اور فوجی مراکز میں اجلاس ہوتے ہیں، دیہات میں تو مذہبی اجلاس ہوتے ہیں اور فوج میں تو نری نمائش ہوتی ہے، یا خوشی کے دن کچھ مجالس منعقد ہوتی ہیں، اور خالص قصبہ مذکور میں بھی کبھی کبھی سیاسی مجالس ہوتی ہیں، یہ لوگ مسجد کا لاؤڈ اسپیکر لے جاکر استعمال کرتے ہیں، بعض تو کرایہ بھی نہیں دیتے اور بار بار

---

(۱) (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

(۲) الفصل الاوّل (طبع مكتبه رشيديه). وفيها أيضًا كتاب الكراهية ج:۵ ص:۳۲۲ هل يجوز أن يدرس الكتاب بسراج المسجد والجواب فيه انّه ان كان موضوعًا للصلوٰة فلا بأس به وان وضع لا للصلوٰة فان فرغوا من الصلوة وذهبوا فان أخّر الى ثلث الليل لا بأس به وان أخّر من ثلث الليل ليس لهٗ ذٰلك كذا في المضمرات في كتاب الهبة.
وفيه أيضًا كتاب الصلوٰة قبيل باب الوتر ج:۱ ص:۱۱۰ ولا بأس بالجلوس في المسجد لغير الصلوٰة لٰكن لو تلف به شئ يضمن كذا في الخلاصة.

پریشان کرتے ہیں، کبھی کبھی لاؤڈ اسپیکر خراب ہوجاتا ہے تو راولپنڈی لے جاکر مرمت کرانی پڑتی ہے۔ تو گزارش یہ ہے کہ مذکورہ بالا مجالس میں اس لاؤڈ اسپیکر کا استعمال دُرست ہے یا نہیں؟ اور نمازِ جمعہ اسپیکر پر پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں لاؤڈ اسپیکر کو مسجد سے باہر نکال کر کسی بھی جلسے وغیرہ میں استعمال کرنا دُرست نہیں ہے، لقول الفقهاء: ولا يعار (أى الوقف ودخل فيه المنقول المتعارف) ولما فى البحر وليس لمتولّى المسجد أن يحمل سراج المسجد الىٰ بيته ..... ويجوز الدرس بسراج المسجد ان كان موضوعًا فيه لا للصلاة ..... الىٰ ثلث الليل ..... وفيما زاد على الثلث ليس لهم تأخيرها فلا يكون لهم حق الدرس. (البحر الرائق ج:۵ ص:۲۷۱)(۱)۔

اور نمازِ جمعہ لاؤڈ اسپیکر پر پڑھ سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۰۲/۱۹ الف)

مسجد کا لاؤڈ اسپیکر رفاہی ضروریات کے لئے استعمال کرنا

سوال:- مسجد کا لاؤڈ اسپیکر اور مسجد کو سیلاب زدگان کا امدادی فنڈ جمع کرنے کے لئے اور دیگر اعلانات کرنے کے لئے استعمال کرسکتے ہیں؟

جواب:- اصل یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے مسجد کی اشیائے موقوفہ کو مسجد کی ضروریات کے علاوہ استعمال نہ کیا جائے، البتہ جو اشیاء مسجد پر وقف نہ ہوں انہیں چندہ دینے والوں کی اجازت سے کسی اور مقصد میں استعمال کرسکتے ہیں۔ چونکہ جو لوگ مسجد میں لاؤڈ اسپیکر وقف کرتے ہیں اُن کی طرف سے اُس کی اجازت معتاد و متعارف ہے، اور اس معاملے میں مدار عرف و عادت ہی پر ہے، اس لئے مذکورہ مقاصد میں استعمال کی گنجائش ہے۔ لما فى الهندية: ولو وقف علىٰ دهن السراج للمسجد لا يجوز وضعه جميع الليل بل بقدر حاجة المصلّين، ويجوز الىٰ ثلث الليل أو نصفه اذا احتيج اليه للصلاة فيه. كذا فى السراج الوهاج. ولا يجوز أن يترك فيه كل الليل الا فى

---

(۱) البحر الرائق ج:۵ ص:۲۵۰ (طبع سعید). وفى الهندية ج:۲ ص:۴۶۲ متولّى المسجد ليس له أن يحمل سراج المسجد الىٰ بيته وله أن يحمله من البيت الى المسجد كذا فى فتاوىٰ قاضى خان.

وفى البحر الرائق ج:۵ ص:۲۵۰ وفى الاسعاف وليس لمتولّى المسجد أن يحمل سراج المسجد الىٰ بيته. وفى خلاصة الفتاوىٰ ولا يحمل الرجل سراج المسجد الىٰ بيته ويحمل من بيته الى المسجد ج:۱ ص:۲۲۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) بحوالہ امداد الاحکام دیکھئے ج:۳ ص:۱۷۲۔

موضع جرت العادة فيه بذٰلک کمسجد بيت المقدس ومسجد النبی صلی الله عليه وسلم والمسجد الحرام، أو شرط الواقف ترکه فيه کل الليل کما جرت العادة به فی زماننا، کذا فی البحر الرائق. (عالمگيرية کتاب الوقف باب: ۱۱ فصل: ۱ ج:۲ ص:۴۵۹)۔[۱] واللہ اعلم

۱۳۸۸/۳/۲۳ھ

۱:- مسجد کو حتی الامکان آباد کرنا ضروری ہے
۲:- ضرورتِ شدیدہ کے وقت مسجد کو منتقل کرنے کی گنجائش ہے
۳:- ضد کی وجہ سے بنائی گئی مسجد کا حکم
۴:- استغناء کی وجہ سے دُوسری مسجد کو سامان دے دینے کے بعد پھر پہلی مسجد کو ضرورت پیش آئے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- حکومتِ برطانیہ کے دور میں یہاں ایک مسجد آباد تھی، جب ہندو لوگ مشن کرکے چلے گئے اور مسلمان بھی وہاں سے ختم ہوگئے تو ایک صاحب نے اس مسجد کو دُور کے گاؤں والوں کو دے دیا، پھر ہندوستان سے یہاں آکر آباد ہوگئے اور انہوں نے ایک اور مسجد بنوادی جس میں جمعہ وغیرہ ہوتا ہے۔ حال ہی میں ایک بی ڈی ممبر نے ایک تیسری مسجد قائم کردی، چند دنوں سے اس میں نماز بھی ہو رہی ہے اور یہ کہا جارہا ہے کہ مسجدِ ثانی کو نابود کیا جائے۔ سابق مسجد (یعنی سب سے پہلی مسجد) کے متولی کی خواہش ہے کہ اُسی سابق مسجد کی جگہ نئی مسجد قائم کی جائے اور وہاں نماز پڑھا کریں کیونکہ ثانی مسجد کے آس پاس صرف چھ سات آدمی رہتے ہیں، وہ لوگ اس مسجد میں بھی چل کر آسکتے ہیں۔ اب عرض یہ ہے کہ ۱:- سابق مسجد جو برطانیہ کے دور میں آباد تھی اس کو آباد کیا جائے؟ ۲:- دُوسری مسجد کو کیا کیا جائے؟ ۳:- تیسری مسجد ضرار ہے؟ ۴:- سابقہ مسجد کے ٹین جو دُوسری مسجد میں دیئے گئے ہیں کیا کیا جائے؟

جواب ۱:- جب مسلمانوں کے دوبارہ آباد ہونے کی وجہ سے پہلی مسجد کی ضرورت پیش آئی تھی تو اُسے آباد کرنا چاہئے تھا، اور اب بھی اس کو آباد کیا جائے، لأنه مسجد الٰی قيام الساعة علٰی قول الشيخين المفتٰی به۔[۲]

۲:- دُوسری مسجد بھی تمام اَحکام میں مسجد کی طرح ہے، اُسے باقی رکھنا ضروری ہے، ہاں! اگر

---

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

(۲) وفی البحر الرائق ج:۵ ص:۱۵۱ (طبع رشيديه کوئٹه) قال أبو يوسفؒ: هو مسجد أبدًا الٰی قيام الساعة لا يعود ميراثًا ولا يجوز نقله ونقل ماله الٰی مسجد اٰخر سواء کانوا يصلّون فيه أو لا. وهو الفتویٰ، وکذا فی الدّرّ ج:۴ ص:۳۵۸.

یہاں سے مسجد کو منتقل کرنے کی ضرورت شدید ہو اور یہاں نماز پڑھنے والے باقی نہ رہیں، تو ضرورتِ شدیدہ کی بناء پر اس کو منتقل کرنے اور اس کا ملبہ و سامان وغیرہ سابقہ مسجد میں لے جانے کی گنجائش ہے۔[1] وفی جامع الفتاویٰ: لھم تحویل المسجد الٰی مکان اٰخر ان یترکوہ بحیث لا یصلّی فیہ. (رد المحتار ج:۳ ص:۵۱۲).

وقد أفتٰی بجواز ذٰلک شیخنا التھانویؒ عند الضرورۃ الشدیدۃ ۔ (امداد ج:۲ ص:۶۲۳)
لیکن مسجد کی جگہ کو اس طرح محفوظ کردیں کہ بے ادبی نہ ہو، صرف سامان منتقل کرسکتے ہیں۔

۳:- تیسری مسجد بھی تمام اَحکام میں مسجد ہے، اس میں نماز پڑھنا جائز ہے، البتہ اگر بنانے والوں نے واقعۃً ضد کی وجہ سے بنائی ہے اور اس سے دُوسری مسجد کو ویران کرنا مقصود ہے تو بنانے والوں پر اس کا گناہ ہوگا، اس صورت میں بھی اس کو مسجدِ ضرار تو نہیں کہہ سکتے مگر ضد کی وجہ سے اس کے مشابہ ہوگی، لیکن اس سے اس کی مسجدیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔[2]

۴:- یہ جزئیہ تلاش کے بعد بھی نہیں مل سکا کہ ایک مسجد کا سامان جب استغناء کے وقت دُوسری مسجد کو دے دیا گیا ہو پھر پہلی مسجد کو اس کی ضرورت پڑے تو واپس لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ قواعد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ ٹین وغیرہ دُوسری مسجد کے ہوگئے، پہلی مسجد میں نہ لوٹائے جائیں۔ احتیاطاً اس میں دُوسرے علماء سے بھی رُجوع کرلیا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۷ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلند شہری عفی عنہ

---

(۱) وفی البحر ج:۵ ص:۱۵۲ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) وبہ علم أن الفتویٰ علٰی قول محمدؒ فی آلات المسجد (أی فی جواز نقلھا للضرورۃ) وعلٰی قول أبی یوسفؒ فی تابید المسجد.
وفی الشامیۃ ج:۴ ص:۳۶۰ سئل شیخ الاسلام عن أھل قریۃ رحلوا وتداعی مسجدھا الی الخراب، وبعض المتغلبۃ یستولون علٰی خشبہ وینقلونہ الٰی دورھم، ھل لواحد لأھل المحلّۃ أن یبیع الخشب بأمر القاضی ویمسک الثمن لیصرفہ الٰی بعض المساجد أو الٰی ھذا المسجد؟ قال. نعم، وحکی أنہ وقع مثلہ فی زمن سیّدنا الامام الأجل فی رباط فی بعض الطرق خرب، ولا ینتفع المارۃ بہ ولہ أوقاف عامرۃ تسئل ھل یجوز نقلھا الٰی رباط اٰخر ینتفع الناس بہ؟ قال: نعم، لأن الواقف غرضہ انتفاع المارۃ ویحصل ذٰلک بالثانی. وفی الشامیۃ ج:۴ ص:۳۵۹ جزم بہ فی الاسعاف حیث قال: ولو خرب المسجد وما حولہ وتفرق الناس عنہ لا یعود الٰی ملک الواقف عند أبی یوسف فیباع نقضہ باذن القاضی ویصرف ثمنہ الٰی بعض المساجد.

(۲) کل مسجد بنی مباھاۃ أو ریاء أو سمعۃ أو لغرض سوی ابتغاء وجہ اللہ تعالٰی أو بمال غیر طیب فھو لاحق بمسجد الضّرار قال صاحب الکشاف وعن عطاء لما فتح اللہ الأمصار علٰی عمر رضی اللہ عنہ أمر المسلمین أن یبنوا المساجد وأن لا یتخذوا فی مدینۃ مسجدین یضار أحدھما صاحبہ. ھٰذا لفظہ، فالعجب من المشائخین المتعصبین فی زماننا یبنون فی کل ناحیۃ مساجد طلبًا للاسم والرّسم واستعلاء لشأنھم واقتداء بآبائھم ولم یتأمّلوا ما فی ھٰذہ الأیۃ والقصّۃ من شناعۃ حالتھم وسوء أفعالھم. (الاکلیل ج:۳ ص:۲۸۳). بحوالہ فتاویٰ محمودیۃ ج:۱۰ ص:۱۶۷. فراجع الیہ للتفصیل. وفی التفسیرات الأحمدیۃ: وقال فی المنھیۃ ونھی الصلوٰۃ فی مسجد الضّرار مخصوص بہ فلا یتعدّی الٰی ملحقاتہ. (الاکلیل ج:۳ ص:۲۸۳) بحوالہ فتاویٰ محمودیۃ ج:۱۰ ص:۱۶۳.

دیگر مساجد دُور ہونے کی وجہ سے قریب کے علاقے میں مسجد بنانے اور اس کی مخالفت کا حکم

سوال:- ہمارے پاس ایک پلاٹ جو کہ کے.ڈی.اے (گورنمنٹ ادارہ) نے عوام الناس کے رفاہی مقاصد کے لئے مختص کیا ہوا ہے، متذکرہ پلاٹ کے.ڈی.اے کی جانب سے ابھی تک کسی کو الاٹ نہیں کیا گیا، جس سیکٹر میں یہ پلاٹ موجود ہے، اس علاقے کے چند لوگوں نے کراچی کے دیگر علاقوں کے رہائش پذیر حضرات سے مل کر ایک انجمن برائے تعمیرِ مسجد/ مدرسہ تشکیل دی، یہ انجمن خالصتاً مذہبی ہے اور اس کا تعلق فقہِ حنفی سے ہے، کسی سیاسی پارٹی سے اس کا کوئی تعلق قطعاً نہیں ہے۔

اس انجمن نے کے.ڈی.اے کو متذکرہ پلاٹ برائے تعمیرِ مسجد/ مدرسہ حاصل کرنے کے لئے درخواست دی، اس پلاٹ کو الاٹمنٹ جاری کرنے کے لئے کے.ڈی.اے کی جانب سے طلب کردہ نو آبجکشن سرٹیفکیٹ (N.O.C) جو کہ علاقے کے ڈپٹی کمشنر سے لینا ہوتا ہے (یہ سرٹیفکیٹ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ متذکرہ پلاٹ اس انجمن کو برائے تعمیرِ مسجد/ مدرسہ الاٹ کردیا جائے اس سے مقامی انتظامیہ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا)، الحمدللہ سرٹیفکیٹ ڈپٹی کمشنر نے ہماری انجمن کے حق میں جاری کردیا ہے۔

اس صورت سے انجمن کو گورنمنٹ سندھ کے رجسٹرار آفس سے اپنے اغراض و مقاصد تحریری پیش کرکے رجسٹرڈ کروانا ہوتا ہے، الحمدللہ انجمن نے رجسٹرار کی جانب سے رجسٹریشن سرٹیفکیٹ بھی حاصل کرلیا ہے، قانون کے مطابق مسجد اور مدرسہ کی عمارت تعمیر کرنے کے لئے کل خرچ کا دس فیصد انجمن کے پاس موجود ہونا چاہئے، الحمدللہ سرکاری بینک سے یہ سرٹیفکیٹ بھی حاصل کرلیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا تمام سرٹیفکیٹس حاصل کرلینے کے بعد کے.ڈی.اے کے افسرِ اعلیٰ نے ہماری الاٹمنٹ کی درخواست وصول کرتے ہوئے اس پر جو حکم تحریر کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے: ''مکمل کاروائی کرکے الاٹمنٹ کمیٹی کے سامنے فوری پیش کردیا جائے۔ ڈائریکٹر جنرل۔'' خیر انجمن کے ممبران نے اس بات کی تحقیق کرلی ہے کہ مذکورہ پلاٹ کے الاٹمنٹ کے لئے ہماری درخواست سے قبل اور اب تک کسی دُوسرے اور ادارے/ انجمن نے کے.ڈی.اے کو درخواست نہیں دی ہے، لہٰذا انجمنِ ہذا کے تمام ممبران اور علاقے کے دیگر لوگوں کے مشورے سے اس پلاٹ پر سیمنٹ بلاکس کی مسجد تعمیر کرلی گئی ہے، اور اس تعمیر شدہ مسجد میں ایک ماہ سے زائد عرصے سے پنج وقتہ نمازیں باجماعت ہو رہی ہیں۔ ایک مستند عالمِ دِین کے ماتحت علاقے کے بچوں کو دِینی تعلیم اور ناظرہ قرآن پاک پڑھانے کے لئے بھی انتظام

کردیا گیا ہے، جس میں علاقے کے بچے اور بچیاں بلا معاوضہ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

۱:- اب جنابِ والا سے گزارش ہے کہ مندرجہ بالا حقائق کے پیشِ نظر آپ یہ فرمائیں کہ اس قائم شدہ مسجد میں نمازیں ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ علاقے کے کچھ افراد اس قائم شدہ مسجد کی مخالفت کررہے ہیں اور دُوسرے لوگوں کو اس مسجد میں نماز ادا کرنے سے روک رہے ہیں، اور ان کی مخالفت یہاں تک ہے کہ حکامِ بالا سے اپنے اثر و رسوخ استعمال کرکے نعوذ باللہ اس مسجد کو منہدم کروانے کی بھرپور کوشش کررہے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ اس علاقے میں دو مسجدیں کافی ہیں، تیسری کی ضرورت نہیں۔ جبکہ پہلے سے قائم شدہ دونوں مسجدیں اس نئی قائم شدہ مسجد سے کافی فاصلے پر ہیں۔

۲:- فریقِ مخالف اس قائم شدہ مسجد کو منہدم کرواکر اس پلاٹ پر لائبریری یا اس قسم کا کوئی اور سینٹر وغیرہ قائم کروانا چاہتا ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ ان کا یہ پروگرام اَز رُوئے شرع کیسا ہے؟ جبکہ انجمن (جس کے تحت یہ مسجد قائم ہے) کے پروگرام میں یہ بات واضح ہے کہ اس پلاٹ پر مسجد کے ساتھ ساتھ ایک بڑا دِینی مدرسہ قائم کیا جائے گا، جس کے ساتھ مسجد ہونا اشد ضروری ہے۔

جواب:- جب دُوسری مسجدیں فاصلے پر ہیں، تو اس جگہ مسجد بنانے کی کوشش باعثِ اَجر و ثواب ہے،[۱] اور جو لوگ مخالفت کررہے ہیں انہیں اس سے باز آنا چاہئے۔ اس تمہید کے بعد سوالات کا جواب درج ذیل ہے:-

۱:- نماز پڑھنا جائز ہے۔

۲:- مسجد کی تعمیر کی مخالفت جبکہ اس کی ضرورت ہو اور اس کی قانونی کاروائی جاری ہو، کسی طرح جائز نہیں، بلکہ وبال کا اندیشہ ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۸/۹/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۱۷۹۸ و)

مسجد کو اُونچا کرنے کی غرض سے مسجد کے نیچے بنے ہوئے کمروں کا حکم

سوال:- ایک جامع مسجد پہاڑی علاقے میں آج سے تقریباً چالیس برس پہلے تعمیر ہوئی تھی، پہاڑی علاقے کی ڈھلانی سطح کی وجہ سے اس مسجد کے نیچے چار پانچ کمرے بنائے گئے تاکہ ہموار جگہ بن جائے، اور اس کے اُوپر جامع مسجد تعمیر کی گئی، اُس وقت کے بعد کچھ عرصہ تک نیچے والے کمرے قائم

(۱) وفی مشکوٰة المصابیح، باب المساجد ومواضع الصلوٰة ج:۱ ص:۶۸ (طبع قدیمی کتب خانہ کراچی).
عن عثمان رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من بنیٰ للہ مسجدًا بنی اللہ لہٗ بیتًا فی الجنّة. متفق علیہ.

رہے، بعد میں جوں جوں مسجد کی ضروریات بڑھتی گئیں وہ کمرے کرایہ پر دے دیئے گئے، اب اس مسجد کا خطیب زید ہے، کمیٹی مسجد والوں نے اُن کمروں کے ساتھ مسجد سے باہر لیٹرین، غسل خانہ وغیرہ بنادیا ہے تاکہ زید اپنے بال بچوں سمیت ان زیرِ مسجد کمروں میں رہے، کیونکہ رہنے کے لئے ان کمروں کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں ہے، اور ان کمروں کی صفائی وغیرہ اور لیٹرین، غسل خانے پر تقریباً چار ہزار روپے سے زائد رقم بھی خرچ کی جاچکی ہے، اور زید نے عام ماحول کے تحت جبکہ مسجد کے نیچے دُکانیں اور مکانات وغیرہ ہوتے ہیں، اس معاملے میں کوئی التفات نہ کیا، اب جب اُس نے اس معاملے میں مسائل کو دیکھا تو تردّد میں پڑگیا کہ اب کیا کیا جائے؟ یہ کمرے فارغ بھی نہیں چھوڑے جاسکتے، اور اب یہاں سے بال بچوں کو واپس بھیجنے میں مسجد کمیٹی والوں کے معاملے میں کچھ فتنہ وفساد کا بھی خطرہ ہے۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ ان مجبوریوں کی بناء پر زید مسجد کے نیچے اپنے بال بچوں کے ساتھ رہ سکتا ہے یا تحت الثریٰ تک مسجد ہونے کی وجہ سے کسی صورت میں بھی بال بچوں کے ساتھ مسجد کے نیچے والے کمروں میں نہیں رہ سکتا۔ بصورتِ دیگر ان کمروں کو کسی اور کرایہ دار کو جو بال بچے دار ہو کرایہ پر دے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- جس جگہ پر یہ کمرے بنائے گئے ہیں اگر وقف کرنے والے نے اس جگہ کو مسجد پہلے بنادیا تھا اور کمرے بعد میں تعمیر کئے تب تو یہ کمرے مسجد کے ہیں اور انہیں رہائشی مکان میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا، لیکن اگر واقف نے شروع سے ہی یہ تصریح کی تھی کہ نیچے کے کمرے امام کی رہائش یا مسجد کی مصالح میں سے کسی اور مصلحت کے لئے وقف ہوں گے اور ان کی تعمیر کے بعد جب جگہ ہموار ہوجائے گی تو اُس پر مسجد تعمیر کی جائے گی، اور صرف اُوپر کا حصہ مسجد ہوگا، نیچے کا نہیں، تو اس صورت میں یہ نیچے کے کمرے امام کی رہائش کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کمرے مصالحِ مسجد کے لئے وقف تو ہوں گے لیکن ان پر مسجد کے اَحکام جاری نہیں ہوں گے۔

لما في الهداية: ولو كان السرداب لمصالح المسجد جاز كما في مسجد بيت المقدس، وروى الحسن عنه أنه قال: اذا جعل السفل مسجدًا وعلىٰ ظهره مسكن فهو مسجد لأن المسجد مما يتأبد وذٰلك يتحقق في السفل دون العلو، وعن محمدؒ علىٰ عكس هٰذا لأن المسجد معظم واذا كان فوقه مسكن أو مستغل يتعذر تعظيمه، وعن أبي يوسفؒ انه جوز في الوجهين حين قدم بغداد ورأى ضيق المنازل فكانه اعتبر الضرورة وعن محمدؒ أنه حين دخل الريّ أجاز ذٰلك كله. (هدایہ اوّلین ج:۲ ص:۶۲۵)[1]۔ وفي الدر المختار: لو بنى فوقه بيتًا للامام

---

(۱) هداية كتاب الوقف ج:۲ ص:۶۲۴ و ۶۲۵ (طبع شركت علميه ملتان).

لا یضرّ لأنه من المصالح، أما لو تمت المسجدیة ثم أراد البناء منع. (شامی کتاب الوقف احکام المسجد)۔[1] وراجع أیضًا امداد الفتاویٰ[2] وامداد المفتین۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۲۸/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۹۶/۲۸ ج)

قبلے سے بائیس درجے انحراف پر بنائی گئی مسجد کا حکم

سوال:- گوجرہ منڈی ضلع لائل پور کی جس مسجد کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا کہ اُس کا رُخ پُرانی مسجد سے ۲۲ درجہ جنوب کو پھرا ہوا ہے، جناب نے فرمایا تھا کہ صفوف کا نشان پُرانی مسجد کے مطابق لگالیا جائے، منتظمین حضرات صفوں کے نشان پُرانی مساجد کے مطابق لگانے کے لئے تیار نہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ رُخ پُرانی مساجد سے زیادہ سمتِ قبلہ کی جانب ہے، دراصل بات یہ ہے کہ اس طرح تعمیرِ مسجد سہواً نہیں بلکہ عمداً کی گئی ہے، رُخ دُرست کرنے والے صاحب پرویز مسلک کے تھے جیسے کہ علامہ مشرقی نے بھی کہا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی تمام مساجد کا رُخ غلط ہے، پُرانی مسجد کا رُخ، یہ مسجد تعمیر کرتے ہوئے غلط جان کر ترک کیا گیا تھا، اب اگر کوئی شخص نمازِ جماعت میں ذرا رُخ بدل کر جماعت میں شریک ہوجائے تو کیا جائز ہے؟ اور اس کی نماز دُرست ہے یا نہیں؟ اور مذکورہ مسجد کے رُخ پر نماز پڑھنے پر اس کا دِل نہ مانتا ہو۔

جواب:- کوشش اس بات کی کرنی چاہئے کہ اہلِ مسجد سمتِ قبلہ کے سلسلے میں متفق ہوکر اپنا رُخ صحیح کرلیں، تاہم اگر اہلِ مسجد اس پر آمادہ نہیں ہیں تو ۲۲ درجے انحراف سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔[4] دفعِ شر کے لئے اسی رُخ پر نماز پڑھ لینے کی گنجائش ہے جس رُخ پر تمام اہلِ محلّہ نماز پڑھ رہے

---

(۱) فتاویٰ شامیة ج:۴ ص:۳۵۸ (طبع سعید کراچی)۔
(۲) امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۶۸۳ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔
(۳) امداد المفتین ص:۸۱۱ (طبع دار الاشاعت کراچی)۔
وفی البحر الرائق ج:۵ ص:۲۵۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) لو بنی بیتًا علی سطح المسجد لسکنی الامام فانّه لا یضرّ فی کونه مسجدًا لأنه من المصالح .... الخ.
وفی الدر المختار ج:۴ ص:۳۵۷ و ۳۵۸ (طبع سعید) واذا جعل تحته سردابًا لمصالحه أی المسجد جاز کمسجد القدس ولو جعل لغیرها أو جعل فوقه بیتًا وجعل باب المسجد الٰی طریق وعزله عن ملکه لا یکون مسجدًا اھ.
وفی الفتاویٰ التاتارخانیة ج:۵ ص:۸۴۴ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه کراچی) وفی النّوازل: ولو جعل العلو مسجدًا والسفل وقفًا علی المسجد واخرجه من یده یجوز وکذٰلک لو جعل السفل مسجدًا للناس أو سردابًا وقفا علٰی ذٰلک واخرجه من یده یصح لأنّه لله تعالٰی. وکذا فی الهندیة ج:۲ ص:۴۵۵.
نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۶۸۳ تا ۶۸۵۔
(۴) تفصیل کے لئے ''جواہر الفقہ'' (مؤلفہ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) میں رسالہ ''سمتِ قبلہ'' خصوصاً ج:۱ ص:۲۴۲ تا ۲۴۴ ملاحظہ فرمائیں۔

ہیں۔ امام کے رُخ سے منحرف ہوکر اپنا الگ رُخ کرنا اس کے مقابلے میں زیادہ بُرا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۵/۱۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

بوقتِ ضرورت مسجد سے پانی لینے کی نیت سے چندہ دینے کا حکم

سوال:- مسجد کے اخراجات میں چندہ اس نیت سے دیا کہ جب پانی کی ضرورت ہوگی تو مسجد سے لے جائیں گے، اس صورت میں مسجد سے پانی لے جانا جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب:- اگر چندہ دہندگان میں یہ بات معروف ہو کہ ضرورت کے وقت اہلِ محلہ بھی وہاں سے پانی لے سکیں گے تو گنجائش ہے، ورنہ نہیں۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۹۳۶/۴۰ ب)

مسجد میں نکاح کی تقریب میں ویڈیو اور مووی بنانے کا حکم

سوال:- گزارش یہ ہے کہ چونکہ نکاح خوانی عمان میں مسجد میں ہوتی ہے، اور نکاح کی من جملہ تقریبات و پروگرام ویڈیو فلم پر ریکارڈ کئے جاتے ہیں، تاکہ آئندہ مستقلاً بذریعہ کیسٹوں کے دوبارہ یاد تازہ رہ سکے، کیا اسلام میں مسجدوں میں ویڈیو فلموں کی کیسٹیں تیار کرنا جائز ہے؟

جواب:- دُرست نہیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۳/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۵۰۶/۴۰ ب)

مسجد کمیٹی کے اوصاف
اور کیا بے نمازی مسجد کمیٹی کا ممبر بن سکتا ہے؟

سوال:- ایک شخص مسجد کی انتظامی کمیٹی کا ممبر بننے کے لئے خود کو پیش کرتا ہے، اصرار کرتا ہے اور ممبر بن جاتا ہے، حالانکہ مذکورہ شخص متعلقہ مسجد میں کسی بھی وقت کی نماز ادا کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا، جس سے خیال ہوا کہ شاید کسی نظری اختلاف کے باعث کسی دُوسری مسجد میں ادا کرتا ہوگا۔ اگرچہ دیکھا نہیں گیا، مگر عام رائے یہی ہے کہ موصوف چونکہ نماز کا پابند نہیں اس لئے کسی بھی مسجد میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اب سوال یہ ہے کہ:-

---

(۱) وفی الشامیة ج:۳ ص:۱۳۰ (طبع سعید) أنّ المعروف کالمشروط. وکذا فی البحر الرّائق ج:۶ ص:۱۲۴ (طبع دار المعرفة بیروت)

ا:- ایسے شخص کا کسی ایسی مسجد میں جس میں وہ قطعاً نماز ادا نہیں کرتا، انتظامی کمیٹی کا ممبر بننا کیسا ہے؟

۲:- ایسے شخص کا مستقل نمازیوں پر مشتمل کمیٹی کے کاموں میں دخل اندازی کرنا کیسا ہے؟

۳:- ایسے شخص کا مسجد کی مِلک یا جائیداد کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کروانا یا مستقل نمازیوں پر مستقل کمیٹی کے مشترکہ فیصلے کے خلاف استعمال کروانا کیسا ہے؟

جواب:- مسجد کا انتظام نیک، متقی لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے،(۱) اور کم سے کم نماز کا پابند ہونا تو نہایت ضروری ہے۔ جو شخص نماز کا پابند نہ ہو اہل نمازیوں کی موجودگی میں اس کو مسجد کی انتظامیہ کا رُکن بنانا دُرست نہیں۔ بالخصوص جبکہ وہ اَز خود اس رُکنیت کا طالب ہو، اور مسجد کی مصالح کے خلاف کام کرتا ہو۔(۲)

واللہ اعلم

۱۴۱۰/۱/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۲/۴۱ الف)

خانقاہ کے ”تسبیح خانہ“ کے لئے چندہ کرنے کا حکم

سوال:- ایک خانقاہ ہے اس میں ایک تسبیح خانہ ہے جس میں بچھانے کے لئے ایک قیمتی قالین خریدنے کے لئے چندہ کیا جاتا ہے، لہٰذا اس میں چندہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- تسبیح خانے میں کوئی عمل اگر بدعت کا نہ ہو تو اس کی ضرورت کے لئے چندہ جائز ہے، لیکن چندہ جبر کر کے نہ ہو۔(۳)

واللہ اعلم

محمد تقی عثمانی

۱۳۸۸/۲/۳ھ

الجواب صحیح

العبد محمد عاشق الٰہی

وقتی ضرورت کے لئے بنائی گئی مسجد کی جگہ پر دُکان تعمیر کرنے کا حکم

سوال:- ایک کارخانہ دار کے کارخانے کے کونے میں ایک جگہ نماز کے لئے بنا کر رکھی تھی،

(۱، ۲) وفی الهندیة ج:۲ ص:۴۰۸ (طبع ماجدیه کوئٹه) الصالح للنظر من لم یسئل الولایة للوقف ولیس فیه فسق یعرف هٰکذا فی فتح القدیر. وفی الاسعاف: لا یولی الا امین قادر بنفسه أو بنائبه .... الخ. وفی الشامیة ج:۴ ص:۳۸۰ (طبع سعید) (قوله غیر مأمون) قال فی الاسعاف: ولا یولی الا أمین قادر بنفسه أو بنائبه لأنّ الولایة مقیدة بشرط النّظر ولیس من النّظر تولیة الخائن لأنّه یخلّ بالمقصود. وکذا فی الهندیة ج:۲ ص:۴۰۸، و قانون العدل والانصاف ص:۱۲۸.

(۳) وفی المشکوٰة ج:۱ ص:۲۵۵ (طبع سعید) قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: الا لا تظلموا الا لا یحلّ مال امرئ مسلم الا بطیّب نفسٍ منه. رواه البیهقی فی شعب الایمان وفی حاشیته أی بالاذن أو بالأمر.

جہاں اسٹاپ کے لوگ غیر منظم یعنی انفرادی طور پر نماز ادا کرتے تھے، اب کارخانہ ختم ہو چکا ہے اور وہ جگہ مویشیوں کی منڈی میں تبدیل ہوگئی ہے، کیا اس جگہ پر دُکان وغیرہ تعمیر کر سکتے ہیں جہاں نماز پڑھی جاتی تھی؟ کیا یہ فیکٹری والا اس زمین کو کسی دُوسرے کام میں لاسکتا ہے؟

جواب:- دراصل دار و مدار اِس بات پر ہے کہ زمین کے مالک نے اس جگہ کو مسجد بنانے کی نیت سے وقف کیا تھا یا نہیں؟ اگر مسجد بنانے کی نیت سے وقف کیا تھا تب تو اس جگہ کو کسی اور کام میں نہیں لایا جاسکتا، اور اگر اس نیت سے وقف نہیں کیا تھا، بلکہ وقتی ضرورت کے لئے اس جگہ کو نماز کے لئے مخصوص کیا تھا، تو یہ جگہ بحکمِ مسجد نہیں ہوئی اور ضرورت ختم ہونے پر اسے دُوسرے کام میں لایا جاسکتا ہے۔(۱)

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۶/۵/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۶/۱۹ الف)

مسجد کے کسی حصے کو درس گاہ میں شامل کرنے اور مسجد میں دِینی تعلیم دینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دینِ شرعِ متین اندریں مسئلہ کہ ایک درس گاہ برائے حفظ و ناظرہ قرآن مجید زیرِ تعمیر ہے، مسجد سے متصل ایک چمن نما صحن جو داخلِ مسجد ہے، جس میں گرمی، سردی ہر دو موسم میں سایہ اور دُھوپ میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ زیرِ تعمیر درس گاہ اس کے مشرقی جانب بالکل ملحق ہے، اگر درس گاہ کو اپنی جگہ ایک کمرہ اور برآمدہ کی شکل میں تعمیر کریں تو درس گاہ ناکافی ہوگی۔ اس لئے منتظمین کا خیال ہے کہ درس گاہ والی پوری جگہ میں ایک ہال کمرہ بنادیا جائے اور برآمدے کی چھت جو ایک دو صفوں کی مقدار جگہ پر مشتمل ہوگی صحن مسجد سے لے لی جائے، اس طرح مسجد کی زیب و زینت وغیرہ میں کوئی نقصان نہ ہوگا، بلکہ بوقتِ ضرورت بارش یا گرمی میں اس جگہ نماز پڑھی جاسکے گی، جس سے نمازیوں کو فائدہ ہوگا۔ کیا ایسی صورت میں مسجد کی جگہ بہ نیت تعمیر بہ نیت برآمدۂ درس گاہ چھت ڈالی

---

(۱) وفی حلبی کبیر ص:۶۱۴ ولو اتخذ فی بیته موضعًا للصلٰوة فلیس له حکم المسجد اصلًا.
وفی الهندیة ج:۲ ص:۴۵۵ (طبع ماجدیه کوئٹه) (الفصل الأوّل فیما یصیر به مسجدًا) امّا ان وقّت الأمر بالیوم أو الشهر أو السَّنة ففی هذا الوجه لا تصیر الساحة مسجدًا لو مات یورث عنه، کذا فی الذخیرة. وفی الهندیة أیضًا ج:۲ ص:۴۵۵ (طبع ماجدیه کوئٹه) من جعل مسجدًا تحته سرداب أو فوقه بیت ... فله ان یبیعه وان مات یورث عنه.
وفی التاتارخانیة ج:۵ ص:۸۴۳ وان جعل وسط داره مسجدًا وأذن للناس بالدخول فیه فله أن یبیعه.
نیز دیکھئے: کفایت المفتی (طبع جدید دارالاشاعت) ج:۷ ص:۴۷ و ۴۸ اور دیکھئے ج:۷ ص:۵۴۔

جا سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- مسجد کے کسی حصے کو درس گاہ میں شامل کرنا جائز نہیں ہے[1]، البتہ اگر اس جگہ برآمدہ بنانا مسجد کے لئے بھی مناسب اور مفید ہو تو بہ نیت تعمیرِ مسجد وہاں برآمدہ بنا سکتے ہیں، وہ برآمدہ مسجد ہی کا جزء ہوگا، درس گاہ نہیں، اور ضرورت کے وقت اس میں دینی تعلیم کا کام بھی کیا جاسکتا ہے[2]۔ لیکن یہ بات ہر کس و ناکس پر واضح رہنی چاہئے کہ یہ برآمدہ مسجد کا ہے، درس گاہ کا نہیں ہے، جس کی بہتر صورت یہ ہے کہ برآمدے کو درس گاہ سے بالکل متصل بنانے کے بجائے برآمدے اور درس گاہ کے درمیان تھوڑی سی جگہ امتیاز کے لئے چھوڑ دی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۱۰/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۷۳۴ و)

متعارف اور عام طریقے سے ہٹ کر بنائے گئے مسجد کے منبر کو توڑنے یا برقرار رکھنے کا حکم

سوال:- جنابِ عالی! آپ کے پاس ایک استفتاء مورخہ ۳۰؍جولائی ۱۹۸۵ء کا لکھا ہوا

---

(۱) وفی البحر الرائق ج:۵ ص:۲۵۱ (طبع ماجدیه کوئٹه) قال ابو یوسفؒ: هو مسجد ابدًا الی قیام الساعة لا یعود میراثًا ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد اخر سواء کانوا یصلّون فیه أو لا، وهو الفتوی.
وفی الدر المختار ج:۴ ص۳۵۸ (طبع سعید کراچی) (ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجدًا عند الامام والثانی) ابدًا الی قیام الساعة. (وبه یفتی) حاوی القدسی. وفی الشامیة (قوله عند الامام والثانی) فلا یعود میراثًا ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد اخر سواء کانوا یصلّون فیه أو لا وهو الفتوی.
(۲) یہاں حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کے ایک مصدقہ فتویٰ سے "مسجد میں عارضی طور پر تعلیم دینے" کی شرائط اور تفصیل نقل کی جاتی ہے:-
مندرجہ ذیل شرائط کی پابندی کر کے مسجد میں تعلیم دینا جائز ہے:-
۱:- مدرسہ زیرِ تعمیر ہونے کی وجہ سے مسجد میں تعلیم عارضی طور پر دی جارہی ہو۔
۲:- بچے ہوشیار اور عقل مند ہوں، مسجد کا پورا پورا احترام کرتے ہوں، مسجد کو گندا اور ناپاک نہ کرتے ہوں۔
۳- اُستاذ، تعلیم دینے کے لئے مسجد میں بیٹھتے وقت اعتکاف کی نیت بھی کرتے ہوں اور اگر مدرسہ بالکل موجود نہ ہو تو جلدی سے مدرسہ کا انتظام کرنا ضروری ہے، مدرسہ کا انتظام ہونے تک مسجد میں تعلیم دینا شرائطِ بالا کے ساتھ جائز ہے۔
وفی خلاصة الفتاوی ج:۱ ص:۲۲۹ (طبع رشیدیه کوئٹه) واما المعلّم الّذی یعلم الصبیان بأجر اذا جلس فی المسجد یعلم الصبیان لضرورة الحر او غیره لا یکره وفی نسخة القاضی الامام وفی اقرار العیون جعل المسئلة المعلم کمسئلة الکاتب والخیاط فان کان یعلم حسبة لا بأس به وان کان بأجر یکره الا اذا وقع ضرورة وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۱۱۰ وفتح القدیر ج:۱ ص ۳۶۹ والفتاوی الحمادیة ج:۱ ص:۶۵ والاشباه والنظائر ج:۲ ص:۲۳۱
وفی الدر المختار: ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسهم والا فیکره.
وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۳۵ أما هؤلاء المکتبون الّذین یجتمع عندهم الصبیان واللّغط فلا ولو لم یکن لغط لأنّهم فی صناعة لا عبادة از هم یقصدون الاجارة لیس هو لله بل للارتزاق ومعلم الصبیان القرآن کالکاتب ان کان لأجر لا وحسبة لا بأس به. وکذا فی الاشباه والنظائر ص:۲۳۱.
نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۷ ص:۱۰۰ (جدید ایڈیشن دار الاشاعت)۔ (محمد زبیر حق نواز)

متعلق (منبر مسجد خیرالبشر) ایک منبر آیا تھا، جس کا آپ نے جواب تحریر فرمایا تھا، اس استفتاء میں کچھ باتیں تشنہ رہ گئی تھیں، مثلاً یہ کہ مؤذن جب خطبہ کے وقت اذان کہتا ہے تو اس کا چہرہ امام کے پاؤں کے سامنے نہیں ہوتا بلکہ منبر کی اُونچائی فرش سے صرف ساڑھے تین فٹ ہے لہٰذا مؤذن کا پیٹ اور سینے کا حصہ امام کے پیروں کے سامنے ہوتا ہے۔ دُوسری بات یہ کہ یہ منبر بنانے والوں نے مسجدِ نمرہ کے منبر کو دلیل نہیں بنایا بلکہ ایسے منبر کی نشاندہی کے طور پر یہ عرض کیا تھا کہ ایسا منبر مسجدِ نمرہ اور سعودی عرب کی کئی مساجد میں تعمیر کیا گیا ہے۔ تیسری بات یہ کہ مسجدِ نمرہ کے منبر کی جو تاریخ اس استفتاء میں بیان کی گئی ہے، آرکیٹکٹ کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اس بناء پر براہِ کرم یہ فرمائیں کہ کیا اس منبر کو توڑنا ضروری ہے؟ اور اگر اس کو برقرار رکھا جائے تو کیا شریعت کے خلاف کام ہوگا؟ ذیل میں منبر کی شکل کا نقشہ دے رہا ہوں:-

مسجد خیرالبشر میں تعمیر کیا گیا منبر — مساجد میں عام طور پر تیار کیا گیا منبر
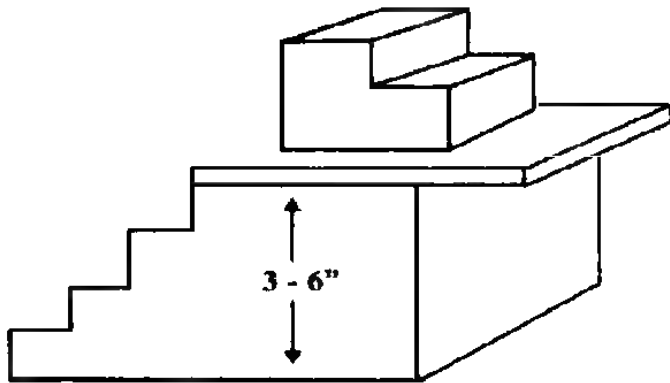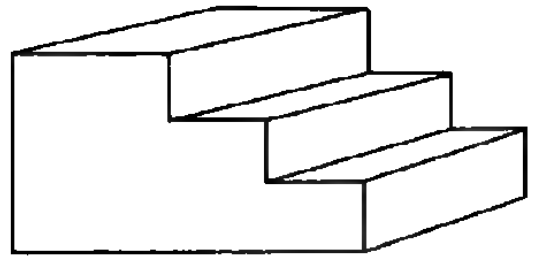
جواب:- پہلے سوال سے یہ مترشح تھا کہ منبر تین سیڑیوں سے زائد پر مشتمل ہے، نیز یہ کہ اس پر امام کے کھڑے ہونے کی صورت میں اس کے پاؤں مؤذِن کے چہرے کے محاذی ہوجاتے ہیں، اس لئے اُسے خلافِ مسنون کہا گیا تھا۔ اب جو صورت سامنے آئی ہے اس میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، اس لئے اس منبر کو ناجائز، مکروہ یا بالکلیہ خلافِ سنت نہیں کہا جاسکتا۔ اور جبکہ منبر بن چکا ہے تو اُسے توڑنا واجب نہیں، اور اس کو برقرار رکھنے کی صورت میں اُسے خلافِ شرع نہیں کہہ سکتے۔ اگر سوال، بنانے سے قبل کیا جاتا تو مشورہ معروف طریقے کا منبر بنانے ہی کا دیا جاتا، کہ وہ اقرب الی السنۃ ہے، تاہم جب منبر بن چکا ہے تو اَب اس کو توڑنا ضروری نہیں ہے، اور اس مسئلے پر خواہ مخواہ زیادہ بحث و مباحثہ اور فتنہ و مجادلہ کی ہرگز ضرورت نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۶/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷/۸۸ الف)

مسجد کی چھت پر امام کے لئے حجرہ بنانے کے مسئلے میں فتاویٰ لکھنویہ اور عزیز الفتاویٰ و امداد المفتین میں تضاد کی تحقیق

سوال:- کیا مسجد کی چھت پر امامِ مسجد کا حجرہ بنانا جائز ہے؟ فتاویٰ لکھنویہ میں جائز ہونا، جبکہ عزیز الفتاویٰ اور امداد المفتین اور آدابُ المساجد میں ناجائز ہونا لکھ ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:- امداد المفتین میں یہ مسئلہ نہیں مل سکا، البتہ آدابُ المساجد میں جو عدمِ جواز مذکور ہے وہ علی الاطلاق نہیں ہے، اسی طرح مولانا عبدالحی صاحبؒ نے جو جواز ذکر کیا ہے وہ بھی مطلقاً نہیں ہے، بلکہ چند شرائط کے ساتھ جائز ہونا لکھا ہے۔ (ص:۲۳)

اور وہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- وقف کرنے والے نے ایک خاص حصے کو مسجدیت سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہو، اور تعمیرِ مسجد سے پہلے پہلے حجرہ بنوادیا ہو یا اپنی نیت کا اعلان کردیا ہو۔

۲:- اور یہ استثناء مصالحِ مسجد کی وجہ سے ہو۔

یہی حکم کتبِ فقہ میں مذکور ہے جیسا کہ درمختار کی کتابُ الوقف میں ہے: لو بنى فوقهٗ بيتًا للامام لا يضرّ لأنّهٗ من المصالح أمّا لو تمّت المسجدية ثم أراد البناء مُنِعَ ولو قال عنيتُ ذٰلك لم يصدق. (شامی ج:۳ ص:۵۱۲)۔[1]

اب یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ وہ حجرہ بحکمِ مسجد ہوگا یا نہیں؟ سو اس بارے میں صحیح یہی ہے کہ وہ بحکمِ مسجد نہیں ہوگا جیسا کہ آدابُ المساجد میں ذکر کیا گیا ہے۔

عزیز الفتاویٰ میں جو حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے کہا ہے کہ ''وہ بحکمِ مسجد ہوگا، اس لئے بول و براز اس پر جائز نہیں ہوں گے'' (ج:۵ ص:۱۳۵)۔[2] اس کا منشاء یا تو یہ ہے کہ اس حجرے کے مسجد سے غایت اِتصال کے سبب تقاضائے ادب و احترام یہ ہے کہ بول و براز سے اس کو بچایا جائے، اور اگر یہ توجیہ نہ ہو تو پھر اس میں تسامح ہوا ہے۔ کیونکہ اس حکم کی دلیل آپ نے یہ بیان فرمائی ہے:-

وبه صرّح في الاسعاف فقال: واذا كان السرداب أو العلو لمصالح المسجد أو كان وقفًا عليه صار مسجدًا اهـ. شرنبلالية قال في البحر وحاصلهٗ ان شرط كونه مسجدًا أن يكون سفلهٗ وعلوهٗ مسجدًا لينقطع حق العبد. (شامی ج:۳ ص:۴۴)۔[3] حالانکہ یہ دلیل اس لئے صحیح نہیں

---

(۱) ردّ المحتار كتاب الوقف ج:۴ ص:۳۵۸ (طبع سعيد)۔

(۲) عزيز الفتاوىٰ ص:۲۱۰ (طبع دار الاشاعت كراچى)

(۳) شامى ج:۴ ص:۳۵۷ (طبع سعيد)

کہ اس میں "صار" کی ضمیر "سفل وعلو" کی طرف نہیں بلکہ "مسجد" کی طرف راجع ہے، جیسا کہ سیاقِ کلام سے یہ بات واضح ہو رہی ہے، کیونکہ ذکر مسجد کی مسجدیت کا ہے، سفل وعلو کی مسجدیت کا نہیں، اور اس اَمر کی تصریح حضرت تھانویؒ نے بھی بالفاظ ذیل فرمائی ہے:-

غالباً آپ نے مرجع ضمیر صار کا سرداب وعلو کو سمجھا ہے، سو یہ مرجع نہیں ہے ..... بلکہ مرجع اس کا وہ مسجد ہے جس کے مصالح کے لئے سرداب وعلو بنی یا وقف کیا گیا۔ (امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۵۹۶)[1]

اور بحر کی عبارت میں "أن یکون سفله وعلوه مسجدًا" کا مطلب "موقوفًا علی مصالح المسجد" ہے۔

بہرکیف! یہ ثابت ہوا کہ حجرۂ امام کا بنانا بشرائطِ مذکورہ جائز ہے، اور ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر حجرہ بنالیا جائے تو وہ بحکمِ مسجد نہیں ہے، البتہ بتقاضائے احترامِ مسجد بہتر یہ ہے کہ اس میں بول و براز نہ کیا جائے، خصوصیت سے جبکہ حجرہ مسجد سے اتنا متصل ہو کہ اس کی بدبو اور دُوسرے اثرات مسجد تک پہنچ کر ایذاء کے موجب ہوں، تو اس صورت میں وہاں بول و براز کرنا مکروہ ہوگا۔ واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۲/۲۴ھ[2]

مسجد کی چھت پر اِمام کے لئے حجرہ بنانے کا حکم

سوال:- مسجد کی چھت پر اِمام کے لئے حجرہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- دُرِّ مختار کتابُ الوقف میں ہے: لو بنٰی فوقهٗ بیتًا للامام لا یضر لأنّهٗ من المصالح أما لو تمّت المسجدیّة ثمّ أراد البناء مُنِعَ ولو قال عنیت ذٰلک لم یُصدَّق. تاترخانیة فاذا کان هٰذا فی الواقف فکیف بغیرہٖ فیجب هدمهٗ ولو علٰی جدار المسجد.

علامہ شامیؒ اس کے تحت فرماتے ہیں: قولهٗ امّا لو تمّت المسجدیّة أی بالقول علی المفتٰی بهٖ أو بالصلاة فیه علٰی قولهما. وعبارة التتارخانیة وان کان حین بناهٗ خلّی بینهٗ وبین النّاس ثمّ جاء بعد ذٰلک یبنی لا یترک اھ. وبهٖ علم ان قولهٗ فی النّهر وأمّا لو تمّت المسجدیّة ثم أراد هدم ذٰلک البناء فِانّهٗ لا یمکن من ذٰلک .... الخ. فیه نظر لأنّهٗ لیس فی عبارة التتارخانیة ذکر الهدم وان کان الظاهر ان الحکم کذٰلک. (شامی ج:۳ ص:۵۱۲)[3]

---

(۱) ج:۲ ص:۶۸۳ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے درجہ تخصص (تمرینِ افتاء) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر)

(۳) ردّ المحتار ج:۴ ص:۳۵۸ (طبع سعید)۔

عالمگیریہ میں ہے: الصعود علیٰ سطح کلّ مسجد مکروہ ولھٰذا اذا اشتدّ الحرّ یکرہ أن یصلّوا بالجماعۃ فوقہٗ الا اذا ضاق المسجد فحینئذ لا یکرہ الصعود علیٰ سطحہ للضرورۃ. (عالمگیریۃ ج:۱ ص:۳۵۶)۔[1]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجدیت کے مکمل ہونے سے پہلے اگر ایسا کیا جائے تو جائز ہے ورنہ نہیں، فتاویٰ لکھنویہ میں جو حکم لکھا ہے وہ صرف چارپائی بچھانے کا ہے، اور انہوں نے جو استدلال کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کے وقت وہاں چارپائی بچھائی تھی، وہ خود محلِ نظر ہے، کیونکہ اعتکاف کی وجہ سے چارپائی بچھانا عذر ہے، اس پر عام حالات کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

واللہ اعلم

۱۳۷۹/۱۲/۲۳ھ[2]

مسجد کی تعمیر سے بچی ہوئی اینٹیں اِمام کے مکان پر لگانے کا حکم

سوال:- مسجد تعمیر کرنے پر جو پُرانی اینٹیں بچ جائیں تو کیا اِمامِ مسجد کے مکان میں اُنہیں لگانا جائز ہے؟

جواب:- لگا سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

محمد عاشق الٰہی ۱۳۸۸/۲/۱ھ

۱:- کیا اِمام صاحب یا مہتمم کو مسجد کمیٹی کی میٹنگ میں بلانا ضروری ہے؟

۲:- نماز کی گستاخی کرنے والے کو مسجد کمیٹی کا ممبر بنانے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین و مفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ:-

۱:- کسی مسجد و مدرسہ کی ایک ہی کمیٹی بنی ہوئی ہو اور اس مسجد و مدرسہ کا مہتمم بھی ایک ہی ہو، اس مسجد و مدرسہ کی تعمیر و انتظامی اُمور کی کوئی میٹنگ ہو تو کچھ ممبر حضرات اِمام و مہتمم صاحب کی میٹنگ میں شمولیت ضروری سمجھیں مگر کچھ ممبر صاحبان یہ دلیل دے کر شامل نہ ہونے دیں کہ اِمام و مہتمم صاحب چونکہ کمیٹی کے ملازم ہیں، ماہانہ تنخواہ لیتے ہیں، لہٰذا تنخواہ دار ملازم اِمام صاحب و مہتمم صاحب کو مسجد و

---

(۱) عالمگیریۃ کتاب الکراھیۃ ج:۵ ص:۳۲۲ (طبع رشیدیہ).

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجہ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر)۔

مدرسہ کی میٹنگ میں بیٹھنے کا کوئی حق نہیں۔ جواب سے مطلع فرماویں کہ جو شخص ایسا عقیدہ اپنے اِمام صاحب کے متعلق رکھتا ہو یعنی اِمام صاحب کو کمیٹی کا ملازم سمجھتا ہو وہ شخص مسجد و مدرسہ کی کمیٹی کا ممبر رہ سکتا ہے یا نہیں؟ اپنے ملازم اِمام کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے یا نہیں؟

۲:- اور یہ کہ جو شخص بغیر جماعت کے صرف اپنے گھر میں اکیلا نماز پڑھنے والا ہو اور وہ یہ کہے کہ میں ایک روز صبح کی نماز باجماعت ادا کرنے کے لئے مسجد میں گیا وہاں نماز میں اتنی دیر لگ گئی کہ میری زندگی کے سارے معمولات اُلٹ پلٹ ہوگئے، یعنی معمولات کا ناس ہوگیا، اس دن سے پھر میں نے کبھی بھی نماز باجماعت کی ہمت نہیں کی۔ جواب سے مطلع فرماویں کہ مذکورہ بالا الفاظ کہنے والے کو مسجد کمیٹی کا ممبر یا عہدیدار بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

۳:- اور یہ کہ مذکورہ بالا شخص اِمامِ مسجد کی غیر حاضریوں کو نوٹ کرنے کے لئے تو مسجد کے محراب کے پاس آ آکر دیکھے کہ اِمام صاحب آج کی نماز میں حاضر ہیں کہ نہیں؟ مگر جماعت کی نماز میں شریک نہ ہو، یعنی مذکورہ کام کے لئے تو وقت نکالے مگر نماز باجماعت کے لئے وقت نکالنا اس کے معمولات میں فرق ڈالتا ہو، ایسے شخص کو مسجد کمیٹی کا ممبر اور عہدیدار بنانا چاہئے یا نہیں؟

۴:- یہ کہ مسجد و مدرسہ کی تعمیر و تنظیمی میٹنگ میں اِمام صاحب و مہتمم صاحب کو شامل کرنا ضروری ہے یا اس کو ملازم سمجھتے ہوئے الگ رکھنا ضروری ہے؟ اسلامی تعلیم اور آئین اس کے لئے کیا حکم دیتا ہے؟

جواب ۱:- کمیٹی کے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اِمام صاحب یا مہتمم صاحب کو ضرور اپنی میٹنگ میں بلائیں، البتہ بلانا اچھا ہے، اور اگر کوئی بات ایسی ہو کہ اِمام صاحب کی موجودگی میں کرنا کمیٹی مناسب نہ سمجھے تو اِمام صاحب کو ضرور شرکت کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے، البتہ اِمام صاحب کو ''تنخواہ دار ملازم'' کے الفاظ سے یاد کرنا بڑی بے ادبی کی بات ہے، جس سے احتراز لازم ہے۔

۲:- ایسے شخص نے بڑی گستاخی کی بات کہی، اگر وہ اس سے توبہ نہ کرے تو وہ کمیٹی کا ممبر بننے کا اہل نہیں۔

۳:- ایضاً۔

۴:- نمبر ۱ میں اس کا جواب آگیا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴ ۱۷/۳۰ د)

بعض غیر مسلم ممالک میں مساجد محدود ہونے اور نمازیوں کی کثیر تعداد کے پیشِ نظر ایک مسجد میں کئی جماعتیں کرانے کی شرعی حیثیت

(وضاحت از مرتب) اُستاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے پاس امریکہ سے مذکورہ مسئلہ سے متعلق ایک سوال آیا، حضرتِ والا دامت برکاتہم کی ہدایت کے مطابق مفتی مجاہد شہیدؒ نے اس کا جواب لکھا، حضرتِ والا دامت برکاتہم نے رائے معلوم کرنے کے لئے یہ جواب حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کے پاس بھیجا، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے مفتی مجاہد شہیدؒ کے جواب کی تصدیق وتصویب فرمائی، بعد میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے دوبارہ غور فرما کر مستقل دُوسرا جواب لکھا، جو مفتی مجاہد شہیدؒ کے جواب سے مختلف تھا، حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کی یہ دُوسری تحقیق مفتی محمد صاحب نے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے معلوم کرنے کے لئے حضرتِ والا کے پاس بھیجی، اس پر حضرتِ والا دامت برکاتہم نے خود مستقل جواب تحریر فرمایا، یہ تمام تحریرات ترتیب وار ذیل میں پیش کی جارہی ہیں۔ (محمد زبیر)

حضرتِ والا دامت برکاتہم کا خط بنام
حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

بگرامی خدمت حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امریکا کی مساجد میں جماعتِ ثانیہ کا حکم:

احقر کے پاس امریکا سے ایک سوال آیا تھا، اس کے جواب میں ایک تحریر ہمارے ایک رفیق نے بطور تجویز لکھی ہے، احقر کا رُجحان اس تحریر کے موافق ہے، لیکن مستفتی کو باقاعدہ جواب دینے سے پہلے آنجناب کی رہنمائی کا طالب ہے، براہ کرم اس سلسلے میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں، نیز اگر تکرارِ جماعت کی اجازت ہو تو اَذانِ ثانی کا کیا ہوگا؟ کیا اس کا بھی تکرار کیا جائے گا۔ والسلام

(حضرت مولانا) محمد تقی عثمانی (مدظلہم)

بقلم: محمد عبداللہ میمن

سوال:- بعض غیر مسلم ممالک مثلاً: امریکا میں یہ صورتِ حال درپیش ہے کہ مساجد محدود ہیں، علاقے کے نمازیوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے تمام نمازی مسجد میں نہیں سما سکتے ہیں اور مسجد کے پہلو اور اطراف و جوانب میں بھی نمازیوں کے کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کی قانوناً اجازت نہیں ہے، ایسی صورتِ حال عموماً جمعہ کے موقع پر پیش آتی ہے۔ بعض مقامات میں یہ تنگی اس لئے پیش آتی ہے کہ

وہاں کسی عمارت میں اجتماع کے لئے قانوناً ایک تعداد محدود ہوتی ہے، اس سے زیادہ افراد کا جمع ہونا قانوناً منع ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال میں ایک ہی مسجد میں ایک سے زیادہ مرتبہ جماعت کی اجازت ہے یا نہیں؟ بینوا توجرا۔

(جواب از مفتی مجاہد شہیدؒ زیرِ ہدایت حضرتِ والا دامت برکاتہم)

جواب:- اس مشکل کا اصل حل تو یہ ہے کہ اہلِ علاقہ کو چاہئے کہ جہاں سابقہ مسجد میں توسیع ممکن ہو وہاں توسیع کی جائے تاکہ تمام نمازی ایک ہی جماعت میں شریک ہوسکیں، اگر یہ ممکن نہ ہو تو اور مساجد تعمیر کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

جہاں یہ دونوں باتیں مشکل ہوں تو مسجد میں گنجائش کم ہونے کی صورت میں ایک بار پوری مسجد بھر کر جماعت ہوجانے کے بعد جو لوگ جگہ میں گنجائش نہ ہونے کی بناء پر پہلی جماعت میں شریک نہیں ہوسکے ان کے لئے اسی مسجد میں دوبارہ جماعت کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جن فقہاء نے تکرارِ جماعت سے منع کیا ہے انہوں نے ممانعت کی دو علتیں ذکر کی ہیں، جو درج ذیل ہیں:-

۱:- اگر تکرارِ جماعت کی اجازت دے دی جائے تو پہلی جماعت کی اہمیت کم ہوگی، جماعتِ اُولیٰ سے تقاعد اور اس میں تقلیل ہوگی، اور یہ بات تکرارِ جماعت سے ممانعت کی محض ایک حکمت نہیں، بلکہ علت ہے، اس لئے کہ جن صورتوں میں تکرارِ جماعت کی اجازت ہے، فقہاء نے اس اجازت کو مذکورہ علت نہ ہونے پر متفرع فرمایا ہے، مثلاً مسجدِ شارع میں جماعتِ ثانیہ کا جواز، بعض فقہاء کے ہاں بلاتداعی تکرارِ جماعت کا جواز، غیر اہلِ محلّہ کے نماز پڑھنے کی صورت میں اہلِ محلّہ کے لئے جماعتِ ثانیہ کا جواز اور بلا اَذان و اقامت تکرارِ جماعت کا جواز اسی علت کے نہ ہونے کی بناء پر ہے، چنانچہ بدائع الصنائع میں ہے: "ولأنّ التكرار يؤدّى ألى تقليل الجماعة لأنّ النّاس أذا علموا أنّهم تفوتهم الجماعة فيستعجلون فتكثر الجماعة واذا علموا انّها لا تفوتهم يتأخّرون فتقل الجماعة وتقليل الجماعة مكروه بخلاف المساجد الّتى علىٰ قوارع الطّريق لأنّها ليست لها أهل معروفون فأداء الجماعة فيها مرّة بعد أخرىٰ لا يؤدّى ألىٰ تقليل الجماعات وبخلاف ما أذا صلّى فيه غير أهله لأنّه لا يؤدّى ألى تقليل الجماعة لأنّ أهل المسجد ينتظرون أذان المؤذّن المعروف" (بدائع ج:۱ ص:۱۵۳)۔[1]

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید)

اِمام سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "ولنا أنا أمرنا بتكثير الجماعة وفي تكرار الجماعة في مسجد واحدٍ تقليلها لأن الناس اذا عرفوا انهم تفوتهم الجماعة يعجّلون للحضور فتكثر الجماعة واذا علموا انه لا تفوتهم يؤخرون فيؤدّي الى تقليل الجماعات وبهٰذا فارق المسجد الذي على قارعة الطريق لأنه ليس لهٗ قوم معلومون فكل من حضر يصلّي فيه فاعادة الجماعة فيه مرة بعد بمرة لا تؤدّي الى تقليل الجماعات .... الخ." (المبسوط للسرخسي ج:۱ ص:۱۳۶)[1]۔

۲:- بعض فقہاء نے تفرق کلمۃ المسلمین کو علت قرار دیا ہے، چنانچہ اِمام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "واذا كان للمسجد امام راتب ففاتت رجلًا أو رجالا فيه الصلوٰة صلّوا فرادىٰ ولا أحب أن يصلّوا فيه جماعة فان فعلوا اجزأتهم الجماعة فيه وانما كرهت ذٰلك لهم لأنهٗ ليس مما فعل السلف قبلنا، بل قد عابه بعضهم، قال الشافعي: وأحسب كراهية من كره ذٰلك منهم انما كان لتفرق الكلمة وان يرغب رجل عن الصلوٰة خلف امام جماعة فيتخلف هو ..... الى أن قال ..... فأما مسجد بني على ظهر الطريق أو ناحية لا يؤذّن فيه مؤذّن راتب ولا يكون له امام معلوم ويصلّي فيه المارّة ويستظلون فلا أكره ذٰلك فيه لأنه ليس في المعنى الذي وصفت من تفرق الكلمة وأن يرغب رجال عن امامة رجل فيتخذون امامًا غيره." (الأمّ ج:۱ ص:۱۵۴)[2]۔

مذکورہ صورت میں یہ دونوں علتیں موجود نہیں، لہٰذا ایسی صورت میں تکرارِ جماعت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ مسجد میں جتنے افراد کی گنجائش ہے پہلی جماعت میں اتنے افراد موجود ہوں، جگہ خالی نہ ہو، اگر پہلی جماعت میں گنجائش ہوتے ہوئے کچھ لوگ دُوسری جماعت میں شریک ہوں گے تو وہ پہلی جماعت میں شریک ہونے میں سستی کے گناہ کے مرتکب ہوں گے۔

واللہ اعلم

احقر محمد مجاہد عفی عنہ

۱۴۱۲/۸/۱۸ھ

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے مذکورہ جواب کی تصدیق وتصویب

جواب صحیح ہے۔ تکرارِ اذان کا تو جواز معلوم نہیں ہوتا، خارج از مسجد جماعت کے لئے مسجدِ محلّہ

---

(۱) ج:۱ ص:۱۳۵ و ۱۳۶ (طبع دار المعرفة بيروت).　(۲) (طبع دار المعرفة بيروت)

کی اَذان کافی ہوجاتی ہے، تو مسجد میں جماعتِ ثانیہ کے لئے بطریقِ اَولیٰ کافی ہوگی۔

تکرارِ اقامۃ کے جواز میں تردّد ہے، بلاعذر جماعتِ ثانیہ میں اِقامت کے ساتھ زیادہ کراہت اور مزدلفہ میں مغرب وعشاء کے درمیان عدمِ اقامہ، ان دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں بھی اقامۂ ثانیہ نہ ہو۔

رُجحان اس طرف ہو رہا ہے کہ اگر دونوں جماعتوں کے درمیان کسی وجہ سے زیادہ فصل ہوا ہو تو اقامت دوبارہ کہی جائے ورنہ نہیں۔　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲۹ رمضان ۱۴۱۶ھ

(اس تصدیق وتصویب کے بعد حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے دُوسرا جواب تحریر فرمایا، یہ جواب حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے اپنے اس خط کے ساتھ حضرتِ والا دامت برکاتہم کو بھیجا)

حضرتِ والا دامت برکاتہم کے نام
حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کا خط

بگرامی خدمت حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی زید مجدہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

چند سال قبل مساجدِ امریکا میں اِقامت جماعتِ ثانیہ سے متعلق آپ کی طرف سے ایک سوال کا جواب تصویب کے لئے آیا تھا، میں نے تصویب کردی تھی، آپ کی طرف جواب ارسال کرنے کے بعد انہی دنوں میں نظرِ ثانی کے بعد جواب تبدیل کردیا تھا، یہ یاد نہیں کہ اس کی نقل آپ کو بھیجی تھی یا نہیں، اب احسن الفتاویٰ کی تبویب کے دوران وہ مسئلہ سامنے آیا تو اس خیال سے کہ شاید اس کی نقل آپ کو نہ بھیجی گئی ہو اب ارسال کی جاتی ہے۔

(حضرت فقیہ العصر مفتی) رشید احمد (صاحب مدظلہم)

بقلم: محمد

دار الافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی

۲۷ محرم ۱۴۲۲ھ

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کا جواب

جماعتِ ثانیہ کی کراہت کو دو علتوں ’’تقلیل الجماعۃ اور تفرق وتشتت‘‘ سے معلول قرار دینا اور

یہ تفصیل کرنا کہ جہاں یہ علتیں پائی جاتی ہوں وہاں کراہت ہے، ورنہ نہیں، دُرست نہیں، اس لئے کہ یہ حکمتیں ہیں، علتیں نہیں، اسی لئے کسی فقیہ نے نہ یہ تفصیل بیان فرمائی ہے اور نہ اس تفصیل کو مدارِ حکم ٹھہرایا ہے۔

اس تفصیل کا مقتضٰی یہ ہے کہ یہ حکم صورتِ سوال کے ساتھ خاص نہ ہو، بلکہ اس کے علاوہ ہر مسجدِ محلّہ میں بھی اگر کچھ لوگ کبھی کسی معتد بہ عذر کی بناء پر جماعت سے رہ جائیں تو ان کے لئے جماعتِ ثانیہ بلا کراہت جائز ہو، بلکہ واجب ہو، کیونکہ دائمی معمول بنانا تو سببِ تقلیل وتشتت ہے، کبھی کبھار ایسے کرنے سے یہ لازم نہیں آتا، ولا قائل بہ احد۔

صحیح حل:- مسجد میں سب کے بیک وقت جماعت میں شریک نہ ہوسکنے کی دو وجوہ ہوسکتی ہیں:-

۱:- قانوناً محدود اجتماع سے زیادہ پر پابندی نہیں، مگر مسجد میں گنجائش نہیں۔

۲:- قانوناً محدود تعداد سے زیادہ اجتماع ممنوع ہے، مسجد میں گنجائش ہے۔

صورتِ اُولیٰ کا حکم:

جماعتِ ثانیہ جائز نہیں، کیونکہ فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمائی ہے کہ ایسی صورت میں صفیں قریب قریب بنائی جائیں اور ہر پچھلی صف کے نمازی اگلی صف کے نمازیوں کی پشت پر سجدہ کریں۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: وان سجد للزحام علىٰ ظهر مصل صلوٰته التي هو فيها جاز وان لم يصلّها بل صلّى غيرها او لم يصل اصلًا او كان فرجة لا يصح.

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: وفي الكلام اشارة الىٰ ان المستحب التأخير الىٰ ان يزول الزحام كما في الجلابي والىٰ انه لا يجوز غير الظهر لٰكن في الزاهدي يجوز علىٰ الفخذين والركبتين بعذر علىٰ المختار وعلى اليدين والكمين مطلقًا والىٰ انه لا يجوز علىٰ ظهر غير المصلي كما قال الحسن لٰكن في الأصل انه يجوز كما في المحيط وفي تيمم الزاهدي يجوز علىٰ ظهر كل مأكول اهـ. (رد المحتار ج: ۱ ص: ۵۰۳)[1]۔

صورتِ ثانیہ کا حکم:

اس صورت میں بھی جماعتِ ثانیہ مطلقاً جائز نہیں، البتہ صحیح صورت جو نصوصِ فقہیّہ سے ثابت ہے، یہ ہے کہ غیر اہلِ محلّہ پہلے جماعت کریں اور اہلِ محلّہ بعد میں جماعت کریں، اس صورت میں یہ بھی شرط نہیں کہ پہلی جماعت کے وقت مسجد میں کوئی جگہ خالی نہ رہے۔

---

(۱) طبع ایچ ایم سعید.

یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ مسجد سے باہر قانوناً محدود تعداد کے اندر کئی جگہ جماعت کا انتظام کریں، سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ مساجد کی توسیع اور تعداد بڑھانے کی کوشش کریں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۲۹؍رمضان ۱۴۱۶ھ

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کے اس جواب پر جناب مفتی محمد صاحب نے اپنے اس خط میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے دریافت کی۔

(خط از مفتی محمد صاحب)

بگرامی خدمت قابلِ صد احترام حضرت شیخ الاسلام صاحب مدظلہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ مسئلہ اب بھی قابلِ غور ہے، اگر جنابِ والا اپنے قیمتی اوقات میں سے کچھ وقت نکال کر اس کے متعلق اپنی رائے سامی سے مطلع فرمادیں تو خدام پر شفقت اور بہت احسان ہوگا۔

محمد ومعاونینِ تبویب
دارالافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی
۱۴۲۲/۱/۲۷ھ

(حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جواب)

گرامی قدر مکرم جناب مولانا محمد صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرتِ والا کی دُوسری تحریر پہلے مجھے نہیں ملی تھی، آپ نے بھیج دی، جزاکم اللہ تعالیٰ خیراً۔ چونکہ آپ نے احقر ناکارہ کی رائے معلوم فرمائی ہے اس لئے عرض ہے کہ احقر کی رائے کا رُجحان اب بھی اسی تحریر کی طرف ہے جو مولانا محمد مجاہد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی تھی، یہ بات کہ فقہاء نے کراہیتِ تکرار کی جو وجوہ لکھی ہیں وہ حکمت ہیں، علت نہیں، اس وقت دُرست ہوتی جب تکرارِ جماعت کی ممانعت پر کوئی نصِ صریح ہوتی۔ لیکن احقر کے ناقص علم کی حد تک اس پر کوئی نصِ صریح نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل سے استدلال کیا گیا ہے، جو ممانعت پر صریح نہیں، لہٰذا جس جگہ اُن مفاسد کا معدوم ہونا یقینی ہو جو فقہاء کرام نے بیان فرمائے ہیں، وہاں تکرارِ جماعت اس بات سے اَہون معلوم ہوتا ہے کہ دُوسروں کی پشت پر سجدہ کیا جائے، جبکہ سجدہ رکنِ صلاۃ ہے، پھر بھی اُن

ممالک میں سے بعض جگہوں پر مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا، بالخصوص جبکہ مسئلہ مجتہد فیہا ہے، تو اس میں گنجائش ہونی چاہئے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۲۲/۲/۱ھ

۱:- مسجد کی تعریف
۲:- کیا جس مسجد میں ہفتے میں چند نمازیں ہوتی ہوں وہ بحکمِ مسجد ہے؟

سوال ۱:- مسجد کی کیا تعریف ہے۔
۲:- کیا ایسی جگہ جہاں ہفتے میں پانچ دن ایک یا دو وقت کی نماز ہوتی ہو، حکم مسجد میں ہے؟

جواب ۱و۲:- ہر وہ جگہ جسے اس کے مالک نے مسجد کے لئے وقف کردیا ہو، اس کے زبانی یا تحریری طور پر وقف کردینے سے مسجد بن جاتی ہے اور اس پر مسجد کے اَحکام جاری ہوجاتے ہیں، خواہ اس میں نماز پڑھی جائے یا نہیں۔ وھٰذا عند أبی یوسفؒ فانہ یکفی عندہ القول بالوقف فی المسجد خلافًا لمحمدؒ وقال الشامیؒ: وقدم فی التنویر والدرر والوقایۃ وغیرھا قول أبی یوسفؒ وعلمت أرجحیتہ فی الوقف والقضاء (شامی)۔[1]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰۶/ ۱۸ الف)

۱:- اِمام صاحب کا مسجد کے محراب میں دروازہ کھول کر آمد و رفت رکھنا
۲:- مچھر مارنے کے لئے بدبودار دَوا مسجد میں استعمال کرنے کا حکم

سوال ۱:- پہلے اِمام صاحب اپنے حجرے کے مشرقی دروازے سے نکل کر پکے راستے پر ہوتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کے برآمدے سے ہوکر مسجد میں نماز پڑھانے آتے تھے اور واپس جاتے تھے، جب سے نئے سورتی اِمام صاحب آئے ہیں، اُنہوں نے مشرقی دروازہ کو بند کروادیا ہے اور محراب کی طرف دروازہ کُھلواکر محراب سے ہوکر آتے ہیں، اور مسجد کے محراب کے دروازے کو اپنے گھر میں آنے جانے کا راستہ بنالیا ہے، کیا یہ مناسب ہے؟

---

(۱) فتاویٰ شامیۃ ج:۴ ص:۳۵۶ (طبع سعید کراچی)۔

۲:- مچھروں کی تکلیف سے بچنے کے لئے مچھر مارنے والی کوئی دوا جس میں بدبو یا خوشبو ہوتی ہے چھڑکنا کیسا ہے؟

جواب ۱:- دونوں امام صاحبان کے طریقے ٹھیک تھے، شرعاً دونوں میں کوئی حرج نہیں، جس طریقے میں سہولت ہو اُسے اختیار کرلیا جائے۔[1]

۲:- مچھر مارنے کے لئے ایسی دوائیں اب ملنے لگی ہیں جن میں بدبو نہیں ہوتی بلکہ خوشبو ہوتی ہے، مسجد میں ایسی دوا استعمال کی جائے۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۰ھ

تعمیرِ مسجد کے لئے غیرمسلموں سے چندہ لینے کا حکم

سوال:- بلاک ایچ شمالی ناظم آباد میں ایک جامع مسجد زیرِ تعمیر ہے، اس میں علاقے کے لوگوں کے علاوہ دُوسرے حضرات بھی سرمایہ پیش کرتے ہیں، اب زیرِ غور مسئلہ یہ ہے کہ اگر ان میں بعض غیرمسلم مگر اہلِ کتاب حضرات کی جانب سے رقم پیش کی گئی تو تعمیر کے لئے لینا دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر یہ اِحتمال نہ ہو کہ کل کو اہلِ اسلام پر احسان رکھیں گے، اور نہ یہ اِحتمال ہو کہ اہلِ اسلام ان کے ممنون ہوکر ان کے مذہبی شعائر میں شرکت یا ان کی خاطر سے اپنے شعائر میں مداہنت کرنے لگیں گے تو قبول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ اپنے مذہب کی رُو سے بہ نیتِ ثواب چندہ دے رہا ہو۔[3] (کذا فی امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۶۰۴ و ۶۰۶)۔[4]

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۲/۱۹ الف)

---

(۱) دار لمدرس المسجد مملوكة أو مستأجرة متصلة بحائط المسجد هل له أن ينقب حائط المسجد ويجعل من بيته بابًا الى المسجد وهو يشترى هذا الباب من مال نفسه فقالوا: ليس له ذٰلك وان شرط على نفسه ضمان نقصان ظهر في حائط المسجد كذا في جواهر الاخلاطى. (عالمگيرية كتاب الكراهية باب اداب المسجد ج:۵ ص:۳۲۰ طبع رشيديه). وفي الدر المختار كتاب الصلٰوة ج:۱ ص:۶۵۶ (طبع سعيد كراچى) وكره تحريما اتخاذه طريق بغير عذر. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۵۶۷ و ۵۶۸ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)

(۲) وفي مشكوٰة المصابيح باب المساجد ص:۶۸ (طبع سعيد) عن جابر رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أكل من هذه الشجرة المنتنة فلا يقربن مسجدنا فان الملائكة تتأذّى ممّا يتأذّى منه الانس. (متفق عليه).

(۳) وفي البحر الرائق ج:۵ ص:۱۹۰ (طبع رشيديه كوئٹه) لو وقف على مسجد بيت المقدس فانه صحيح لأنّه قربة عندنا وعندهم.

وفي ردّ المحتار ج:۴ ص:۳۴۱ (طبع سعيد كراچى) (وأن يكون قربة في ذاته) .... ان شرط وقف الذّمى ان يكون قربة عندنا وعندهم كالوقف على الفقراء أو على مسجد القدس .... الخ. وكذا في فتح القدير ج:۵ ص:۴۱۷. نیز دیکھئے تفسیر معارف القرآن حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان قدس اللہ سرہ ج:۴ ص:۳۳۱۔

(۴) امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۶۶۳ تا ۶۶۶ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔ (محمد زبیر)

مسجد میں گم شدہ بچے یا چیز کے اعلان کا حکم

سوال:- گم شدہ بچے یا اور کوئی چیز اگر گم ہو جائے، مسجد میں لاؤڈ اسپیکر میں اعلان کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب:- مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان کرنے سے حدیث میں ممانعت آئی ہے[1]، فقہاء نے بھی اسے مکروہ قرار دیا ہے، ویکرہ .... انشاد الضالّة (شامی)[2]۔ لہٰذا اعلان ضروری کرنا ہو تو مائیکروفون کو مسجد سے باہر لے جا کر اعلان کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

مسجد میں مٹی کا تیل جلانے کا حکم

سوال:- دیہات کی مسجدوں میں روشنی کے لئے مٹی کا تیل استعمال کیا جاتا ہے، یہ جائز ہے یا ناجائز؟ یہ بھی مشہور ہے کہ مٹی کے تیل کی وجہ سے فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

جواب:- مٹی کا تیل جلانے سے چونکہ بدبو ہوتی ہے اور حدیث میں ہر بدبو کا کام مسجد میں کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ کچی پیاز کھا کر مسجد میں آنے کو منع کیا گیا ہے کہ اس سے فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے[3]، اس لئے فقہاء نے مسجد میں مٹی کا تیل جلانے کو ناجائز بتایا ہے، اس سے پرہیز لازم ہے[4]۔ دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۶۱۴[5]۔ ورسالہ آداب المساجد[6] ص:۱۹، مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۴/۲۸ الف)

---

(۱) فی مشکوٰۃ المصابیح باب المساجد ص:۶۸ (طبع قدیمی کراچی) عن أبی هریرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من سمع رجلًا ینشد ضالّة فی المسجد فلیقل لا رَدّها الله علیک، فان المساجد لم تبن لهذا. نیز دیکھئے: مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج:۲ ص:۱۹۹۔

(۲) ردّ المحتار ج:۱ ص:۶۲۰ (طبع سعید). وفی الهندیة کتاب الکراهیة ج:۵ ص:۳۲۱ (طبع رشیدیه) حرمة المسجد خمسة عشر .... والخامس أن لا یطلب الضّالّة فیه .... الخ.

(۳) فی مشکوٰۃ المصابیح باب المساجد ص:۶۸ (طبع سعید) عن جابر رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من أکل من هذه الشجرة المنتنة فلا یقربن مسجدنا فان الملائکة تتأذّی ممّا یتأذّی منه الانس.

(۴) وفی الدرّ المختار ج:۱ ص:۶۵۶ (طبع سعید کراچی) فلا یجوز الاستصباح بدهن نجس فیه.

(۵) امداد الفتاویٰ احکام المسجد ج:۲ ص:۶۹۸ (طبع مکتبه دار العلوم کراچی).

(۶) آداب المساجد ص:۲۰ و ۲۱ (طبع دار الاشاعت کراچی). (محمد زبیر حق نواز)

مسجد میں غیر حاضر شخص کے لئے جگہ روکنا

سوال:- میں کسی مسجد میں کسی بھی حیثیت سے کام کرتا ہوں اور اس مسجد میں نماز کے وقت سے پہلے کئی ایسے خاص آدمیوں کے لئے جگہ مخصوص کردوں جو اذان کے بعد مسجد میں تشریف لاتے ہیں، اور اس طرح دُوسرے نمازی جو وقت سے بہت پہلے مسجد میں پہنچتے ہیں اُن کے لئے تکلیف کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح جگہ کا روکنا جائز ہے یا نہیں؟ جن کے لئے جگہ روکی جاتی ہے اُن کی نماز میں کچھ فرق آتا ہے یا نہیں؟

جواب:- اس طرح مسجد میں کسی غیر حاضر شخص کے لئے جگہ روکنا دُرست نہیں، البتہ جو شخص پہلے آکر کچھ دیر مسجد میں بیٹھ گیا ہو، پھر کسی ضرورت سے وہاں اپنی کوئی چیز چھوڑ کر چلا جائے تو واپس آنے پر وہ اُس جگہ کا زیادہ مستحق ہوگا۔ (۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۵۲/۲۸ ج)

تعمیرِ مسجد کے لئے ملازم کی تنخواہ سے پیسے کاٹنے کا حکم

سوال:- عمر، زید کے پاس ملازم ہے، تنخواہ دینے کے موقع پر زید بغیر رضامندیٔ عمر کے اس کی تنخواہ سے کچھ رقم تعمیرِ مسجد کے لئے کاٹ لیتا ہے، جس پر عمر ناراض ہے اور لوگوں کے سامنے اس کا اظہار بھی کرتا رہا ہے، مگر بوجہ خوف کے کہ کہیں ملازمت نہ چھوٹے زید کے سامنے بیان نہیں کرتا، کیا ازرُوئے شرع یہ رقم کاٹ لینا جائز ہے؟ اور اگر مدرسہ کے لئے اس طرح چندہ کیا جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب:- چندہ خواہ مسجد کا ہو یا مدرسہ کا، جب تک دینے والا رضامندی اور خوش دِلی کے ساتھ نہ دے اس وقت تک اسے لینا جائز نہیں ہے،(۲) اور نہ اسے تعمیرِ مسجد میں صَرف کرنا چاہئے۔ صورتِ مسئولہ میں زید کا یہ عمل شرعاً دُرست نہیں، بالخصوص جبکہ عمر کا اس سے ناراض ہونا معلوم ہوچکا۔ (۳)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۵/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) ویکرہ .... تخصیص مکان لنفسہ، ولیس لہ ازعاج غیرہ منہ ولو مدرسا، واذا ضاق فللمصلّی ازعاج القاعد ولو مشتغلًا بقراءۃ أو درس. (الدر المختار ج:۱ ص:۶۲۲ طبع سعید کراچی). (وقال العلامۃ الشامی تحتہ) وینبغی تقییدہ بما اذا لم یقم عنہ علی نیۃ العود بلا مہلۃ کما لو قام للوضوء مثلًا ولا سیما اذا وضع فیہ ثوبہ لتحقق سبق یدہ تأمل.
وفی الھندیۃ کتاب الکراھیۃ ج:۵ ص:۳۲۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) حرمۃ المسجد خمسۃ عشر .... والعاشر ان لا یضیق علی أحد فی الصف.

(۲و ۳) وفی مشکٰوۃ المصابیح ج:۱ ص:۲۵۵ (طبع سعید کراچی) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ألا، لا تظلموا، ألا لا یحلّ مال امریٔ الّا بطیب نفس منہ. رواہ البیھقی فی شعب الایمان. وفی حاشیتہ: أی بالاذن أو بالأمر. (محمد زبیر)

سود پر تاریخی فیصلہ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ترجمہ
ڈاکٹر مولانا محمد عمران اشرف عثمانی صاحب